سالِ نو مبارک
شہنشاہِ اسرار
15
سرگزشت
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادرروزگار کا تعارف
شہرِ خیال
16
گفت وشنید
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال
تاریک بین
26
شخصیت
ڈاکٹر ساجد امجد
اس نے مخفی قوتوں سے ارکانِ حکومت کا مسخر کرلیا تھا
پردہ اسرار
51
ذکرِ خاص
کاشف زبیر
پاکستان بھر کے اذہان کو تبدیل کردینے والے کا ذکر
توہم پرستی
73
تجزیہ
اسما صدیقی
ہم سب کس طرح بے معنی باتوں پر یقین رکھتے ہیں
جنوری کی شخصیات
77
تحریر خاص
صائمہ اقبال
اس ماہ سے جڑی اہم شخصیات کا ذکرِ خاص
زومبی
93
لایعنی تخیل
فیصل ظفر
زندہ لاشیں انسانی آبادیوں پر حملہ کریں گی
ننھے شیطان
98
تحقیق
دانیہ
کیا واقعی بچے مستقبل میں جھانک لیتے ہیں
خبردار
103
منظر امام
پاکستان کی وہ جگہیں جہاں آسیب کا بسیرا ہے
مقاماتِ خوف
121
معلومات
ابن کبیر
دنیا بھر کے چیدہ چیدہ خوفناک مقامات
خوفناک فلمیں
137
فلم نگری
انور فرہاد زرین مہدی
پاکستانی فلمیں جو خوفناک کہلائیں

سالِ نو مبارک

جلد 25 ❖ شمارہ 12 ❖ جنوری 2016ء

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی ناز ش	0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 ، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

میرے سامنے آج کا اخبار ہے۔ اس کی ایک خبر نے مجھے شرم سے پانی پانی کر دیا ہے۔ بالکل ایسی ہی خبر میں ہر دوسرے تیسرے دن پڑھ رہا ہوں اور مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے ہم پتھروں کے دور میں آ گئے ہیں۔ ورنہ ملک کے مختلف حصوں سے متواتر ایسی وحشت ناک خبریں کیوں آتیں کہ ہر صاحبِ دل کا کلیجہ کانپ جاتا ..... ہم امت محمدی ہیں۔ اسلام کے اصول ہمارے لیے رہنما ہیں۔ گر ہم ان اصولوں سے روگردانی کرتے ہیں تو خارج از اسلام کہلاتے ہیں۔ پھر بھی ایسی کراہیت آمیز قابلِ نفرت امور ہمارے درمیان رہ رہے لوگ انجام دے رہے ہیں۔ سب سے بڑا گناہ کسی کا قتل ہے اس کی سزا جان کے بدلے جان ہے۔ سر قلم کرنا یا پھانسی چڑھا دینا یعنی بس ایک جھٹکے میں زندگی کی ڈور کاٹ دینا لیکن ایک دوسرے فعل قبیح کی سزا ہے، آدھے دھڑ سے زمین میں گاڑ کر پتھروں سے مار مار کر زندگی کی ڈور کاٹ دینا یعنی نہایت اذیت بھری موت دینا۔ سنگسار کرنا زیادہ اذیت ناک سزا ہے۔ ایسے مجرم کو سسکا کر مارنے کا حکم ہر مسلک میں شریعت متفقہ ہے۔ پھر کلمہ گو گھرانے میں پیدا ہونے والے ہمارے ہم مذہب شخص ایسے گناہ کیوں کر رہے ہیں۔ بالغوں پر دست اندازی سے بڑھ کر معصوم بچیوں پر اب ظلم عظیم ڈھانے کی جسارت کیسے کر رہے ہیں؟ کیا یہ قربِ قیامت کی دلیل نہیں ہے؟ بقول اکبر بخاری

چھپا لیں بیٹیاں سب نے گھروں میں
پسر کس کا جواں ہونے لگا ہے

معراج رسول

شہنشاہِ اسرار

ننھی سی جان کہاں اتنی عقل کے میلے کی بھیڑ میں والد کا دامن نہیں چھوڑنا ہے۔ مگر عید میلے میں لوگوں کا اژدحام دھکا لگی، وہ باپ سے بچھڑ گیا۔ ہزاروں کی بھیڑ میں وہ خود کو اکیلا پا رہا تھا۔ اس لیے رونے بیٹھ گیا۔ والد نے اسے غائب پایا تو پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگے۔ جب وہ ملا تو اسے دو طمانچے لگا کر کہا کہ آیندہ کبھی دامن نہ چھوڑنا۔ اس نے اس بات کو گرہ سے باندھ لی کہ بزرگوں کا دامن تھامے رکھنا ضروری ہے ورنہ لوگ بھٹک جاتے ہیں۔ کم سنی کا یہ عہد ذہن پر نقش تھا۔ نہایت کم سنی سے ہی نماز روزے کا پابند بن گیا۔ غیبت سے اس طرح بھاگتا جیسے جنگلی جانور آگ کو دیکھ کر بھاگتے ہیں کیونکہ استاد نے ایک بار کہا تھا کہ غیبت کرنا ایسا ہے جیسے بھائی کا گوشت کھانا۔ غیبت نہ کرنے کی ایک وجہ اور تھی، والد شب بیدار تہجد گزار تھے۔ اسے بھی ساتھ میں عبادت کی ترغیب دیتے تھے۔ ایک دن وہ والد کے ساتھ عبادت کر رہا تھا کہ اس کی نظر اِدھر اُدھر سوئے ہوئے رشتے داروں پر پڑی، اس نے والد سے کہا ''ان نیند کے متوالوں میں کوئی بھی نماز کے لیے سر نہیں اٹھاتا۔ یہ ایسے غافل ہیں جیسے موت نے انہیں سلا دیا ہے۔'' ننھی سی عمر میں ایسا جملہ، باپ نے غصیلی نظروں سے دیکھا اور ایک جملہ کہا۔ ''بیٹا اگر تم بھی سو جاتے تو غیبت جیسے گناہ سے بچ جاتے۔'' اس نے اسی وقت توبہ کر لی اور زندگی بھر خود کو اس گناہ سے بچاتا رہا۔ کچھ اور بڑا ہوا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے ہٹ گیا۔ اس نے تحصیلِ علم کی ٹھان لی تھی۔ اس لیے ضد کر کے مدرسے میں داخل ہو گیا۔ ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شہر کے حالات خراب ہو گئے۔ شیراز ایک بڑا شہر تھا مگر تاتاریوں کے حملے کی زد پر تھا۔ اس لیے شہر کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ علم کی شمعیں گل ہو چکی تھیں۔ مجبوراً اس نے بغداد جانے کا سوچا۔ بغداد میں نظام الملک طوسی نے 459 میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ مدرسہ خاصا مشہور تھا اسی میں اس نے داخلہ لیا۔ بچپن سے ہی اس کا طبعی رجحان فقر و درویشی تھا اس لیے تحصیلِ علم میں خاص دلچسپی تھی۔ حدیث دانی و علمی قابلیت میں وہ سب سے آگے تھا۔ ایک روز اس نے ایک درویش کو مدرسے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس سے کہا کہ آپ خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے میں آ گئے تو انہوں نے کہا کہ زاہد صرف اپنی بخشش کا سامان اکٹھا کرتا ہے مگر عالم ایک جہان کو ہدایت دیتا ہے۔ اس واقعے نے اسے تحصیلِ علم میں مزید منہمک کر دیا۔ اس نے شیخ شہاب الدین سہروردی کو اپنا روحانی پیشوا بنا لیا۔ جب بغداد کا امن تباہ ہوا تو وہ ان کے ساتھ حجاز چلا گیا۔ ان کے ساتھ اسے جذب وسلوک کی منزلیں طے کرنے میں خاصی مدد ملی۔ ایک دوسرے سفر میں اس کے ساتھ فاریاب کا ایک بوڑھا درویش بھی تھا۔ ایک ندی کنارے پہنچ کر پار جانے کے لیے کشتی کی ضرورت تھی۔ درویش کے پاس کرایہ کے پیسے نہ تھے اور ملاح بغیر پیسے کے لے جانے پر تیار نہ تھا۔ درویش نے تسلی دی کہ تم چلے جاؤ، جو کشتی کو دوسرے کنارے پر پہنچاتا ہے وہ مجھے بھی پہنچائے گا۔ پھر اس نے اپنا مصلیٰ پانی پر بچھایا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا پھر بولا۔ ''تمہیں کشتی لے آئی، مجھے اللہ۔'' اس واقعے نے اس پر خاص اثر کیا۔ دورانِ سفر رود بار میں اس کی ملاقات ایک ایسے درویش سے ہوئی جو چیتے پر سوار تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوا تو اس نے کہا۔ ''اگر تم اللہ کے ہو جاؤ گے تو اللہ کی ہر مخلوق تمہاری ہو جائے گی۔'' وہ سفر در سفر کرتا ہوا ہند آیا۔ یہاں سومنات میں یہ دیکھ کر اسے سخت تعجب ہوا کہ شہر کے بڑے مندر کا ایک بت دعا دینے کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ ایک رات رک کر اس نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ بت کے عقب میں بیٹھا ایک پجاری رسی کھینچتا ہے تو ہاتھ اٹھ جاتا ہے یہ دیکھ کر وہ سخت رنجیدہ ہوا اور واپس فارس کے راستے بغداد چلا گیا۔ یہ سرگزشت اس معروف شاعر کی ہے جسے لوگ اسرار کا بادشاہ شیخ سعدی کے نام سے جانتے ہیں۔ جس کے اشعار میں چھپے رموز پر مسلسل تحقیق ہو رہی ہے۔ جس کی حالاتِ زندگی کی پُر اسرار کہانی سے کم نہیں۔

***

☆ ناصر حسین رند کا مکتوب بہاولپور سے۔ ''ہماری سلور جوبلی نمبر کی تجویز کو آپ نے پُراسرار شکل دے ڈالی۔ بہر حال پُراسرار نمبر کا اچانک اعلان دیکھ کر تمام گلے شکوے دور ہو گئے۔ پراسرار نمبر ایسے خاص موقع پر جب ابتدائی سردی ہو پُراسرار تحریروں کا مزہ اپنا ہوتا ہے۔ رات کے وقت تنہائی میں کمرے میں کوئلوں کی انگیٹھی جل رہی ہو۔ گرم گرم کافی اور کمبل میں گھس کر پڑھنا ماحول کو کافی پُراسرار بنا دیتا ہے (سرگزشت کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے۔ خاص شمارہ تو خاص الخاص ہوتا ہے۔ سلور جوبلی کے لیے موصول تحریریں سرگزشت کے خاص شمارے کے معیاری نہ تھیں اس لیے موخر کرنا پڑا)۔ ان پچیس سالوں میں سرگزشت میں کتنی نایاب پراسرار اور حیرت انگیز کہانیاں داستانیں شائع ہوئیں جو ایک ایک کر کے ہمارے ذہن تازہ کر گئیں۔ سب سے پہلے ''تاوان'' ایک ناقابلِ یقین پُراسرار سلسلہ جس میں شاہ جہاں عرف جہانی استاد جیسا حیرت انگیز کردار۔ نوّے کی دہائی میں یہ سلسلہ سرگزشت کی زینت بنا تھا۔ دوسری کہانی ''خیام'' جو اکتوبر 1999ء میں افسر آذر نے لکھی تھی۔ کیا شاندار سرگزشت تھی۔ نجومی شاعر اور حسن بن صباح جیسے پراسرار انسان نے اس داستان کو ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید کر دیا آج بھی ہمیں یاد ہے۔ ''تلاش'' نامی داستان بھلائے سے بھی نہیں بھولتی۔ ایک پراسرار اور محیر العقول سرگزشت جو ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گی جس کے دو حصے اکتوبر، نومبر 2014ء میں شیراز خان نے لکھا تھا۔ سچ بیانیوں میں آج تک جتنی بھی پراسرار کہانیاں پڑھی ہیں ان میں جو آج تک ذہن میں نقش ہے بلکہ ہمیشہ رہے گی وہ ہے ''اندھیرے کی موت'' جو جولائی 2011ء میں شائع ہوئی۔ ایک ایک حرف پر تجسس سسپنس حیرت انگیز تحریر۔ اس تحریر کو پڑھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور ہم نے سوچا تھا کہ اگر ہمارے پاس اتنا سرمایہ ہوتا تو انڈیا جا کر دلیپ کمار (نوری بابا) اور ہیرو کے کردار میں عامر خان پر ایک دہشت ناک مووی بناتے۔ اسی طرح ''مارگیر'' اکتوبر 1994ء ''بلائے سفر'' نومبر 2001ء ایک پراسرار سفر کی روداد جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سسپنس سے بھرپور شاہکار تحریر۔ ''منت'' ایک پراسرار ملنگ کی سرگزشت جو شیطانی طاغوتی قوت کا حامل تھا۔ اکتوبر 2013ء۔ ''نادیدہ عشق'' اکتوبر 2012ء جس طرح جن کنواری لڑکیوں پر عاشق ہو جاتا ہے اسی طرح جنی بھی کنوارے لڑکوں پر عاشق ہو جاتی ہے۔ ''روحوں کا شکاری'' ایک خبیث صفت اور پراسرار شکاری کا قصہ۔ مارچ 2014ء۔ ''بدلہ'' شیش ناگ کے انتقام کی انوکھی داستان جولائی 2014ء۔ آج تک جتنے بھی نمبر آئے ان میں سے جس نے سب سے زیادہ اثر چھوڑا وہ پراسراریت نمبر 2 جنوری 2012ء تھا۔ 2012ء تھا بھی ویسا پراسرار سال ہمارے نزدیکی گاؤں جھانگی والا میں ایک پراسرار بلا نے سخت ترین سردیوں میں دھند کی راتوں میں کافی لوگوں کو زخمی کیا اور کافی دنوں تک لوگوں کو خوف وہراس میں مبتلا رکھا۔ اسی طرح ''اسرار شناس'' اہرام مصر کی پراسرار تحریروں کو سمجھنے والے جیم چمپولین کی سرگزشت اکتوبر 1999ء اور ''پیش گو'' پراسرار پیش گوئیاں کرنے والی بوڑھی ماں کے لقب سے یاد کی جانے والی دسمبر 2001ء کو یک صفحی سرگزشت کی زینت بنی۔ اسی طرح سال 2015ء میں سرگزشت میں کافی پراسرار تحریریں شائع ہوئیں اگر توجہ دی جاتی تو ایک ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز نمبر کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ ''پراسرار حویلی'' جنوری 2015ء۔ ''آسیب محبت'' اور ''ساحر'' ساحر تو ایک حیران کن اور شیطانی قوت کے مالک کی سرگزشت تھی جس کے کالے کرتوت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ فروری 2015ء ''اسرار'' وادی سندھ میں ایک خون آشام بلا نے خون خرابے اور خوف وہراس کی انتہا کر دی تھی، مئی 2015ء۔ ''جل پری'' اس قدر خوب صورت اور پراسرار مخلوق سمندر یا ہماری زمین پر پائی جاتی ہے، جون 2015ء۔ ''غیر انسانی'' ایک خوب صورت بلا اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ ایک پرتجسس تحریر، جولائی 2015ء۔ ''کاش'' ایک عجیب و غریب کہانی، ستمبر 2015ء۔ اس طرح معلوماتی حصے سے بھی کافی پراسرار مواد شائع ہوا۔ ''آب حیات'' قیامت تک زندہ رکھنے والے پانی پر پراسرار مگر مختصر تحریر، جنوری 2015ء۔ ''سمندر کے بھید'' روایات اور پراسرار کہانیاں منسوب ہیں، فروری 2015ء۔ ''خلا شناس'' ایک عظیم اور پراسرار سائنس داں نیوٹن کی سرگزشت اور ''چار روحوں والا'' پراسراریت کی دھند میں لپٹے مصور مائیکل انجیلو کی کہانی اپریل 2015ء۔ ''چندا ماموں'' پراسراریت کا مظہر، چاند پر ایک تحقیقی معلوماتی تحریر، اپریل 2015ء۔ ''سلطنت انکا'' جو پراسرار طور پر مٹ گئی، جولائی 2015ء۔ ''اسرار'' دنیا میں چھپے چند اسرار کا تذکرہ معلومات سے بھرپور بھید بھری اس دنیا کے مخفی اسرار، مئی 2015ء۔ ''نیند اور خواب'' پراسرار دنیا کی سیر خواب عالم کی پراسرار دنیا کی معلوماتی بھرپور تحریر، اکتوبر 2015ء۔ دسمبر کے شمارے سے آگاہی جانکاری ہوئی کہ

''سراب'' کی جگہ پر نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ پراسرار نمبر کے موقع پر ''شہرِ خیال'' کے چند ساتھی یاد آ رہے ہیں ان میں سے دو تو ایسے ہیں جو عالم فانی سے ہمیں چھوڑ کر عالم برزخ کو روانہ ہو گئے۔ ایک تو ثمینہ شاہد اور دوسرے ہمارے دوست خالد حسن چیمہ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، آمین۔ دوسرے ساتھی جو پراسراریت کی دھند میں گم ہو گئے۔ علی حسنین بھٹی، سالانہ رپورٹ کے بانی نوّے کی دہائی میں کیا خوب لکھا کرتے تھے۔ سیمرا تبسم، یونس بلوچ، تفسیر عباس بابر، ایم اے خالق بھٹی، شہناز ندیم جونیجو، انتساب عباس، روبینہ نفیس انصاری۔ اپنے دیرینہ عزیز ترین ساتھی خالد کبیر سے پُرزور اپیل ہے دوبارہ سے سالانہ رپورٹ کی ذمّہ داری ادا کریں (وحید ریاست بھٹی کا سالانہ تجزیہ انشاء اللہ آئندہ ماہ لگے گا)۔ پچیس سال ریکارڈ کی وجہ سے مختصر شہرِ خیال 2015ء پر نظر۔ سدرہ بانو ناگوری 10 عدد خط اور نومبر میں لیٹ آ گئیں اور دو دفعہ صدارت پر رہیں۔ اپریل اور دسمبر میں ان کے تمام خطوط معلومات اور لگن کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ کم عمری اور دو دفعہ صدارت ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ شاہد جہانگیر شاہد 9 خط کے ساتھ دو دفعہ صدارت پر رہے۔ جنوری اور اکتوبر۔ منشی محمد عزیز مئے 10 خطوط کے ساتھ نومبر میں صدارت پر رہے۔ اگر ان کے اس خط کو اور شاہد جہانگیر شاہد کے اکتوبر کے خط کو بہترین کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس سال صدارت پر یہ نام رہے شاہد جہانگیر شاہد (جنوری، اکتوبر)، رانا محمد سجاد (فروری)، شوکت رحمن خٹک (مارچ)، سدرہ بانو ناگوری (اپریل، دسمبر)، اویس شیخ (مئی)، اعجاز حسین سٹھار (جون)، مجید احمد جائی (جولائی)، بشریٰ افضل (اگست)، منظر علی خان (ستمبر)، منشی محمد عزیز مئے (نومبر)، طاہرہ گلزار آپا آپ کی تحریر سے خوشی ہوئی کہ آپ نے مردوں کے بارے میں مثبت سوچ رکھ لی ہے (شکریہ)۔ عمران جونانی کم کم آئے لیکن لکھا خوب۔ ڈاکٹر قرۃ العین پراسرار تحریروں کی شیدائی کم رہیں۔ صرف ایک بار مارچ میں نظر آئیں۔ پرانے لکھاریوں میں ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی اور طاہر الدین بیگ سال میں صرف ایک بار نظر آئے۔ سہیل احمد عباسی بھی غائب ہیں۔ رانا محمد شاہد کی والدہ کا انتقال اس سال افسردہ کر دیا گیا۔ ''سارے انسان بلاؤں کی طرح ہیں لیکن تیری مخلوق میں کوئی تو بشر بھی ہوگا'' معراج رسول صاحب کے اگست 2015ء اظہاریہ سے اختتام کرتے ہیں اس تحریر کو۔''

☆ فلک شیر ملک کی آمد شاہ گڑھ سے۔ ''اتنا اچھا اور معیاری شمارہ پیش کرنے پر آپ اور ادارے کے تمام ممبران کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ معراج رسول صاحب ہمارے پاکستان پر دشمنوں کی گندی نظریں جمی ہوئی ہیں مگر انشاء اللہ ہم مسلمان ضرور انھیں گے کیونکہ ''گردن دربِ باطل پر جھکائی نہیں جاتی''۔ شہرِ خیال میں بہن سدرہ بانو ناگوری نمبرون پر تھیں۔ بے شک تبصرہ شاندار تھا۔ سدرہ صاحبہ، میں تو بڑے دل گردے والا انسان ہوں۔ یہ نوک جھوک تو زندگی کا حصہ ہے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کا تفصیلی تبصرہ تھا۔ معظم علی بنوں، غلطیاں نکالنے میں پورا صفحہ چٹ کر گئے۔ بہرکیف ان کی باریک بینی پسند آئی۔ ''مجہدِ برق'' ڈاکٹر ساجد امجد نے غلام جیلانی کی زندگی پر مفصل مضمون لکھا۔ بھرپور انداز تھا۔ ایک غریب گھرانے کا ہوتے ہوئے بھی جیلانی نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک اچھا لکھاری ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک درویش صفت انسان بھی تھا۔ ''شمع امید جلا'' سلمیٰ اعوان نے سری لنکا کے مسلمانوں کے حالات کی جو جھلک دکھلائی اور زہرت جیسی باہمت لڑکی کا کردار جس انداز میں اجاگر کیا۔ وہ قابلِ تعریف ہے۔ ''جنگجو'' میں کشمالہ حسن نے زبردست قسم کے جنگجوؤں سے ملوایا۔ کچھ مسلم جنگجو بھی شامل کر لیے جاتے تو سونے پر سہاگہ ہوتا۔ کے ٹو کے متعلق اور اسے سر کرنے کے راستوں کے بارے میں اچھی معلوماتی تحریر تھی۔ ''نانگا پربت'' ایسی داستانیں پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ ایسے مقام دیکھے جائیں مگر ہمت جواب دے جاتی ہے۔ ندیم اقبال نے خوب لکھا۔ اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔ ''تاریخ عالم'' منظر امام سے گزارش کروں گا کہ پلیز اب اس سلسلے کو مختصر کریں۔ اب تو خواب میں بھی ''قتلِ مسیح'' کا لفظ بار بار آنے لگا ہے۔ مشرقی پاکستان کی فلموں کے بارے بہت معلومات فراہم کی گئیں۔ جب بھی سقوطِ ڈھاکا کا ذکر آتا ہے تو دل ریزہ ریزہ ہونے لگتا ہے۔ محمد علی جیسے عظیم فنکار اور فیض احمد فیض جیسے لوگ تو چلے گئے اور پرانے فنکاروں میں ندیم اور شبنم جیسے لوگ موجود ہیں جو زندگی کی گاڑی کو رواں رکھے ہوئے ہیں۔ ''ہمس فٹ'' میں بابا عالم سیاہ پوش کی زندگی کے حالات و واقعات سے اچھی آگہی ہوئی۔ ان کی مکالمہ نگاری کمال کی تھی، خصوصاً پنجابی فلموں کی۔ ''دسمبر کی شخصیات'' اچھا سلسلہ ہے۔ ''بگ تھری'' کرکٹ میں سیاست کی بھرپور داستان تھی۔ انڈیا، انگلینڈ اور آسٹریلیا جو بگ تھری بن بیٹھے ہیں، پاکستان کی کرکٹ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہندو لابی اور گورے ہمیشہ سے ہمارے خلاف ہی رہے ہیں۔ ''سراب'' جاری ہے۔ اُمید ہے جلد اس کی جگہ کوئی نئی اسٹوری آنے والی ہے (جی ہاں وہ کہانی آپ کو اسیر کر لے گی)۔ ''بیت بازی'' میں زبردست اشعار تھے۔ عائشہ اعوان کا شعر قابلِ غور تھا بلکہ نمبرون تھا۔ سچ بیانیاں میں ''درست غلط فیصلہ'' تحریر تو اچھی تھی مگر ایک شادی شدہ عورت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ خاوند اور بال بچوں کے ہوتے ہوئے ایسی گھٹیا حرکت کی مرتکب ہو۔ ''صلہ رحمی'' سبق آموز سچ بیانی تھی۔ جس نے دل پر اثر کیا۔ شاہ بابا جیسے نیک لوگ اب بھی اس دنیا میں موجود ہیں جنھوں نے گمراہوں کو بھی نیکی کا راستہ دکھلایا۔ ''اونچے خواب'' بہت ہی بھلی تحریر تھی۔ جس میں ڈھولو جیسے پیار کرنے والے بھی ہیں اور گوشی جیسی دولت کی ہوس رکھنے والی دوشیزہ بھی۔ انجام اچھا رہا۔ ''میں کون ہوں'' افسوس کہ انیلا، ارسلان کے آنے سے پہلے ہی قبر میں چلی گئی۔ تقدیر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ ''ٹھکانا'' بڑی جامع تحریر تھی جس میں معاشرے کے اچھے برے لوگوں کا موازنہ کیا گیا۔ نیکی کر دریا میں ڈال والی مثال اس تحریر میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ''پس پردہ'' مختصری خوش رنگ کہانی اچھے انداز میں لکھی گئی۔ اس تحریر میں سسپنس کے ساتھ ساتھ ایک شرارت بھی تھی جو کہ آزمائش کی شکل میں تھی اور شرجیل کامیاب رہا۔ ''کہاں جاؤں'' واقعی ان لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے جو ناجائز طریقوں سے لوٹ رہے ہیں۔ کوئی نجومی ہے تو کوئی ڈبہ پیر۔ ہمارے ملک میں ایسے بے شمار ناسور ہیں جو مکروہ دھندوں میں ملوث ہیں۔ بہرکیف حصول روزی میں ہی برکت ہے۔ ''نفرتوں کے پھول'' دشمنیاں اور نفرتیں ہمیشہ سے ہمارے معاشرے کا حصہ رہی ہیں۔ حبیب نے اس نفرت اور دشمنی کو ختم کرنے کی جو کوشش کی زبردست رہی۔ آخری سچ بیانی ''عقل مندی'' کسی کے کام آنا اچھی بات ہے مگر حد سے زیادہ گزر جانا بری بات، شوہر کو راہِ راست پر لانے کے لیے مائرہ نے جو چال چلی کامیاب رہی اور تاشہ

جیسی اوباش عورت نے عادل کا پیچھا چھوڑ دیا۔ مراسلوں میں یمنیٰ سہیل کراچی اور منشی محمد عزیز مئے کے مراسلے پسند آئے۔ اُمید ہے اگلا شمارہ مزید خوب صورت ہوگا۔“

☆ سمیرا ساجد منگلا کینٹ سے رقمطراز ہیں۔ ”لمبی مدت کے بعد اپنے جذبات کو الفاظ کا روپ دینا جس قدر مشکل کام محسوس ہو رہا ہے یہ وہی انسان جان سکتا ہے جو طویل مدت کے بعد اپنی سرزمین پر قدم رکھتا ہے۔ گویا جذبات کے اظہار میں گنگ سا ہو جاتا ہے۔ فرسٹ ایئر میں تھی جب سمیرا انجم اوکاڑا کے نام سے ”شہرِ خیال“ میں آئی تھی۔ 2001ء میں شادی کے بعد جس طرح مائیکے کے ساتھ رشتہ بظاہر کمزور ہو جاتا ہے بالکل ایسے ہی چاہنے کے باوجود سرگزشت سے رابطے بحال رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ سمیرا ساجد بننے کے بعد بھی دو چار مرتبہ یہ خوش نصیبی حاصل ہوئی آرمی میں ساجد کے ہونے کی وجہ سے پیارے وطن کے وہ گوشے بھی دیکھنا نصیب ہوئے جو عام حالات میں نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی دوران 2 بار دورۂ امریکا بھی لگا، تو وہاں کے اسکولز سسٹم کو قریب سے سمجھا۔ ان کی نفسیات جو ان کی اپنی عوام کے لیے اور مستقبل کے لیے پروان چڑھانے والے بچوں کے لیے ان کی حکومتی سطح پر سرگرمیاں ان کا اپنی عوام کے لیے نہایت حساس ہونا، اپنی انا کی بلندی اور دوسری سر اٹھاتی قوم سے ممکنہ مات کھانے سے خوف زدہ ہو کر تیسری دنیا میں بڑھتے شعور کو کچل ڈالنے کی سازشیں، ان کا اپنے شہریوں پر قانون کا نفاذ، نئے زمانے کی آگاہی کے ساتھ فوری اقدامات اور آنے والے کئی سالوں کی پلاننگ۔ وہاں بہت سالوں سے مقیم لوگوں سے بات چیت کے ذریعے جو معلومات حاصل کرتی رہی۔ واپس آ کر کتابی شکل میں لکھنے کا ارادہ تو تھا مگر پھر وہی تیز ترین زندگی کی تیز ترین مصروفیت نے کتاب کے اس منصوبے کو تو تھوڑے عرصے کے لیے موقوف کرنے پر مجبور کر دیا مگر پہلے سے تیار مسودہ جو کہ شاعری کا تھا۔ 2013ء میں کوئٹہ سے ”آنکھ کا ساحل“ کے نام سے شائع کرائی۔ وہیں ایک سال کے لیے او لیول کو پڑھانے کا موقع بھی اقرا آرمی پبلک اسکول اینڈ کالج میں ملا۔ جہاں پر اک نئے احساس نے جنم لیا کہ ہماری ایلیٹ کلاس کے 99 فیصد لینے والے بچے۔ سچے علم سے دوری۔ صرف نمبرز کے لیے آنسو بہاتی نوجوان نسل۔ ہر بات ہر چیز کو اسٹیٹس کی نظر سے دیکھنے والے اذہان۔ میرے کرب میں اضافے کا سبب بنتے رہے۔ شدید تکلیف کے عالم میں کئی کالم نگاروں اور اخبار کے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھے کہ ہم سب کو ذاتی مفاد سے بالا ہو کر آنے والی پود کے اندر اقبال کی روح پھونکنا ہوگی۔ سرسید کے جذبے کو ڈھال بنا کر ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہمیں ملکی مفاد عزیز ہے یا اغیار کے سامنے سوفٹ امیج بحال کرنے کے لیے اپنی غیرت کو بیچنا ہے؟ مگر ہر طرف سے جواب۔ شاید کسی کے پاس بھی میرے سوالوں کے جواب نہیں۔ انہی آبلہ پا سوچوں کے ساتھ منگلا آ گئی۔ یہاں بھی تدریسی کام جاری ہے جو صرف اس سوچ کے ساتھ جاری ہے کہ شاید کسی کے دل میں کوئی تھوڑی سی بات بھی اثر کر جائے اور میرا حصہ کسی کو کچھ اچھا کام سکھانے میں ڈھل جائے۔“

☆ محمد سلیم قیصر نے سینٹرل جیل ملتان سے لکھا ہے۔ ”سال 2015ء زندگی سے 365 دن منہا کر گیا۔ کئی گھر تباہ ہوئے، ہنستی بستی زندگیاں اجڑ گئیں، نفرتوں کی بو بارود کے روپ میں فضا کو سوگوار کر گئی۔ سانحہ پشاور سے سانحہ پیرس تک عالم ارواح کو بے چینی کا روپ دے گیا۔ حصول اقتدار میں صاحب اختیار کے درمیان کشمکش رہی۔ سال 2016ء اس وراثت کو قبول کرے گا یا روایات کو بدلے گا ہمیں انتظار کے ساتھ ساتھ اللہ بزرگ و برتر کے حضور دستِ دعا ہونا چاہیے کہ سال تو ہمارے لیے محبتوں کا، خوشیوں کا، مسکراہٹوں اور امن و آشتی کا پیغام لے کر آئے۔ میں آپ سب کا بہت مشکور ہوں کہ آپ کی مقبول دعاؤں نے سال بھر میری زندگی کو تحفظ بخشا۔ آپ سے ہمیشہ دعاؤں کی اپیل کروں گا تاکہ سال نو میری زندگی کے تحفظ کا ہی نہیں بلکہ میرے لیے قیدِ زنداں سے خلاصی کا سبب بھی بنے۔ میری وہ تحریریں جو سرگزشت کا حصہ بنیں۔ ان کے کسی لفظ سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں معافی کی التجا کرتا ہوں۔ صرف درگزر نہیں بلکہ میری اصلاح ضرور کر دیجیے گا۔“

☆ ایم عمران جونانی کا تبصرہ کراچی سے۔ ”مدیرِ اعلیٰ! مشورہ سر آنکھوں پر۔ اب تک طویل غیر رواں خطوط کی بنا پر آپ کو جو کوفت ہوئی اس کے لیے معذرت۔ ہر پرچہ سرگزشت کا خاص ہوتا ہے، یقیناً جنوری کا شمارہ خاص الخاص ہوگا۔ ”شہرِ خیال“ میں اعجاز سخاور اور انور شاہ کے خطوط زیادہ پسند آئے۔ معزا کبرا! خوش آمدید۔ سدرہ بانو! خوب کہا کہ یہاں دکھ سانا اور ذاتی معاملات ڈسکس کرنا مناسب نہیں۔ تبصرہ کریں۔ لہجے اور خیالات کی عظمت کے کیا کہنے۔ ڈاکٹر ساجد کے قلم سے نکلی مخصوص انداز کی تحریر حسبِ سابق معلومات میں اضافے کا سبب بنی۔ ادباء کی سوانح پڑھ کر لکھنے پڑھنے کے شوق کو نئی زندگی ملتی ہے۔ ”شمع امید جلا“ سلمیٰ اعوان نے خوب صورت انداز میں لکھی۔ ابنِ کبیر کی جھلک نمایاں ہے۔ وہ کہاں ہیں آج کل؟ (عالمی اردو کانفرنس میں مشغول ہیں)۔ ”جستجو“ میں کشمالہ نے زیادہ اختصار سے کام لیا۔ عرصہ کے بعد کوہ پیمائی سے متعلق کوئی تحریر لگی ہے۔ ندیم اقبال نے تو کمال کر دیا۔ سوہنی دھرتی کے ایک خاص حصے کی سیر کروانے لے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی ڈیرہ اسماعیل خان اور ہری پور کی داستانیں بھی چل رہی ہیں۔ ”نانگا پربت“ تارڑ صاحب کی شاندار کتاب میں نے بھی پڑھ رکھی ہے۔ فیری میڈو کا نام پڑھ کر ذہن وہیں گیا۔ آپ ان کے ہم سفر بھی رہے ہیں، بڑی بات ہے۔ ”تاریخ عالم“ کی موجودہ قسط میں منظر امام کے جادوئی قلم نے آنکھ تک نہ جھپکنے دی۔ اندازِ بیان نکھرا نکھرا ہے۔ اُمید ہے اس کے اختتام پر ان کے قلم سے ایسی ہی نئی تحاریر کا سلسلہ شروع ہوگا۔ مرحوم فلمی دنیا کے حوالے سے اس ماہ ڈبل تڑکا موجود ہے۔ پہلے تفصیل عباس جعفری کی مشرقی پاکستانی فلموں نے محظوظ کیا۔ اس قسم کی تحریروں کا خاص مزاج اپنے ساتھ اسی دور میں لے جاتا ہے۔ دسمبر کے حوالے سے بنگال کو آپ اس برس بھی نہیں بھولے۔ آفاقی صاحب کے خلا کو پُر کرنا بچوں کا کھیل نہیں انور فرہاد خوب صورتی سے کوشش میں جٹے ہوئے ہیں۔ سیاہ پوش کی پہلودار شخصیت ایسی ہی تفصیلی تحریر کی متقاضی تھی۔ بہت خوب جناب۔ عاجز کو ملک نے اسی خوب صورت دسمبر کی 9 تاریخ کو حیات بخشی ہے۔ چنانچہ دسمبر کی شخصیات کا تذکرہ زیادہ رغبت سے پڑھا۔ آپ بجا طور پر اسے سب سے زیادہ پسندیدہ

تحریر کیتے ہیں۔ صائمہ اقبال مبارک باد کی مستحق ہیں۔ مریم کے خان نے اس ماہ بھی مایوس نہیں کیا۔ اس خوب صورت تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آج کرکٹ دیکھنے میں وہ پہلے جیسی دلچسپی کیوں باقی نہیں رہی۔ 90-80ء کی دہائی میں ہمارے ہاں کرکٹ کا عروج تھا۔ ٹورنامنٹ کے موقع پر جسے دیکھو کان سے ریڈیو لگائے چلا جارہا ہے۔ عام طور پر فائنل جمعہ کے دن ہوتا تھا۔ شارجہ اور کرکٹ لازم وملزوم ہیں۔ اب بھی بگریٹ پکا اسپانسر تھا۔ لوگ اخبار وطن ہر ماہ پابندی سے پڑھتے اور تبصرے کرتے نظر آتے تھے۔ خواب ہوگیں وہ باتیں۔ اگر اسی طرز کا مضمون WWE ریسلنگ کے بارے میں لگے تو یقیناً پسند کیا جائے گا۔ چائلڈ لیبر اور ملازمین کے حقوق کے حوالے سے لکھی گئی امین بھایانی کی کہانی سیدھی دل کو لگی۔ ہلکے پھلکے انداز میں پیغام بھی پہنچایا اور ساتھ ہی غیر محسوس انداز میں پشاور کی سیر ہوتی رہی۔ خاص علاقوں اور سڑکوں کے نام سونے پر سہاگہ ہیں۔ دعا ہے کہ آنے والا سال ہم سب کے لیے زندگی کے پچھلے تمام سالوں سے زیادہ بہترین ثابت ہو۔“

☆ صائمہ نور نے بہاولپور ملتان سے لکھا ہے۔ ”ادار یہ میں یہی کہا جارہا ہے ”اتحاد“ ہی امن ہے اور اگر بھائی چارے کو پھر سے اپنالیں تو یہود و انصار ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ نامور مدیر شاہد احمد دہلوی کے بارے میں پڑھا۔ حیرت میں غوطہ زن رہی ابھی پچھلے دنوں اشفاق احمد خالق حقیقی سے جا ملے لیکن افسوس حکومت ایسے لوگوں کو مرنے کے بعد بھی نہیں سراہتی۔ یہی ہماری ناکامی کی بڑی وجہ ہے۔ ہم اپنے ہیروز کو زیرو بنادیتے ہیں۔ نہ جانے کیوں؟ ڈاکٹر قدیر احمد کی مثال سامنے ہے۔ ”مشہر خیال“ میں سدرہ بانو ناگوری سرفہرست تھیں۔ تبصرہ جاندار تھا۔ اعجاز حسین سحار، منشی محمد عزیز مے، شائستہ بہاولپور، سہیل احمد کھتری، محمد رضا انصاری، طاہرہ گلزار، منظر علی خان، انور عباس شاہ، عمران جونانی، معظم علی، اشفاق احمد رضوی عطاری کے خیال جاندار تھے۔ ڈاکٹر محمد کاشف اور فلک شیر ملک دونوں کے خیالات مماثلت رکھتے ہیں۔ کیا ایک ہی بندے نے تحریر کیے ہیں (دونوں ڈاکٹر ہیں۔ جعلی ڈاکٹرز پر خیالات کی مماثلت تعجب کی بات نہیں ہے)۔ سچ بیانیوں میں سرورق کی کہانی درست غلط فیصلہ، اونچے خواب اور صلہ رحمی نمبرون رہی۔ پس پردہ، کہاں جاؤں، ٹھکانہ ایک ہی طرز کی تحریریں تھیں۔ ہاں ”عقل مندی“ ہر عورت کو بار بار پڑھنا چاہیے۔ ”میں کون ہوں“ بہترین رہی۔ ”بگ تھری“ نے واقعی کرکٹ کے کھیل کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ جس کھیل میں سیاست آجائے وہ کھیل، کھیل نہیں رہتا اور کرکٹ کا یہی حال ہے۔ ”سراب“ کو ختم ہو جانا چاہیے۔ ”دسمبر کی شخصیات“ کمال کی تھیں۔ انور فرہاد نے ”مس فٹ“ لکھ کر سرگزشت کو چار چاند لگا دیے۔ سفرنامہ ”نانگا پربت“ کا عقاب منفرد تحریر تھی۔ پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہے لیکن ہم پھر بھی دیار غیر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے گن گاتے ہیں اور اپنوں کو فراموش کردیتے ہیں۔ ”جنگجو“ نے واقعی حیرت میں جلا کردیا۔ ”شمع امید جلا“ خوب رہی اور ”مجید برق“ قلم کار کی داستان دل کو لگی۔ ”بیت بازی“ اور ”علمی آزمائش“ ہمیشہ کی طرح چھائے رہے۔ ”میں کون ہوں؟“ آپ حیران ہوئے ہوں گے۔ میں دیہاتی لڑکی ہوں اور سرگزشت گیارہ سالوں سے پڑھ رہی ہوں۔ پہلی بار سرگزشت میں لکھنے کی سعی کی ہے۔ امید کرتی ہوں بھرم رکھیں گے۔ اگر آپ نے اس قابل سمجھا تو آگے لکھنے کی جسارت کروں گی۔“

☆ اویس شیخ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے فرمارہے ہیں۔ ”اس مرتبہ اداریہ کی سطر سطر میں امت مسلمہ کا درد موجود تھا۔ مسلمانوں کی بے وطنی اور کسمپرسی کے حالات کے ذمہ ہم مسلمان خود ہیں۔ رہنماؤں کا اپنا کردار ٹھیک ہو تو کسی غیر کو پر مارنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ روس اور ترکی کا تازہ ترین واقعہ زندہ مثال ہے مگر ہمارے ملک میں زر پرست حکمرانوں کو طاقت ایٹمی ملک ہونے کے باوجود یہ دھمکی دے دی جاتی کہ اگر مزاحمت کی تو اس کے ساتھ مزید دو شہر ملیامیٹ کردیے جائیں گے۔ ایبٹ آباد واقعہ کے یاد نہیں ہوگا۔ خیر نامور ادیب پر تذکرہ کئی بار پڑھا مگر سرگزشت نے اسے اپنے رنگ و انداز میں شائع کیا۔ یہی اس پرچے کا امتیاز ہے۔ ”شہر خیال“ میں سدرہ اپنے تبصرہ کے ساتھ مسند صدارت پر براجمان تھیں۔ اچھا خط تھا۔ طاہرہ گلزار اور میرے فیورٹ تبصرہ نگار عمران جونانی صاحب اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ عظیم علی کے نامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ علم و تحقیق پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ زبردست خط تھا۔ اشفاق احمد رضوی کی چند سطریں دل کو چھو گئیں۔ شاہد جہانگیر شاہد کو خدا صحت دے۔ ”درست غلط فیصلہ“ میں محترمہ کے حالات زندگی محض وقت گزاری کے سوا کچھ نہیں تھے۔ کمال کو قتل کرنے کا فیصلہ غلط تھا۔ سچ کہا تھا کسی نے خوب صورت عورت کی چالیس کسی پہیلی سے کم نہیں ہوتیں۔ ”صلہ رحمی“ ایک پُر اثر تحریر تھی۔ پروین شاکر کہا کرتی تھیں کہ صلہ رحمی پیار و محبت اور خلوص ہم سے کتنی دور ہوتے جارہے ہیں۔ ”اونچے خواب“ دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں مگر ان کی تعبیر پانے کے لیے برسوں کی ریاضت درکار ہوتی ہے۔ جو ہم پاکستانی قوم میں سرے سے موجود نہیں۔ بعد میں انسان کے حصے صرف پچھتاوا اور ہجر وصال ہی باقی بچتی ہیں۔ ”میں کون ہوں“ یہ تو کسی افسانے جیسی سچویشن تھی مگر انسانی زندگی تو حیرتوں کا جہاں ہے۔ ”ٹھکانا“ پڑھی۔ یہ سچ بیانی عورت کی جسمانی، سماجی اور معاشی قربانیوں کا اعتراف تھا۔ بلکہ میں اسے عورت کی قربانیوں کی اعترافی دستاویز کہوں گا۔ پچھلے دو ماہ میں عورتوں کے ساتھ وطن عزیز میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ ”وحشی درندے“ کس طرح پتھر دور کی تاریخ دوہرا رہی ہیں۔ ”پس

عام طور سے لوگ پُراسرار واقعات صرف اسے کہتے ہیں جو سفلی علم، ارواح یا جن جنات سے وابستہ ہوں لیکن یہ تجزیہ کلی طور پر صحیح نہیں۔ ہر اسرار بھرے واقعے کو پُراسرار کہا جاسکتا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ سرگزشت کا مزاج متاثر نہ ہو اور گزشتہ پُراسرار نمبرز کی طرح اس خاص شمارے میں بھی معلومات کا پلڑا بھاری رہے۔ کیونکہ سرگزشت کے قاری معلومات پسند کرتے ہیں۔ اس بار تاریخ عالم، بیت بازی اور علمی آزمائش روک لی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ یہ تینوں سلسلے شامل ہوں گے۔

پردہ'' ایک دلچسپ اور کھلکھلاتی تحریر تھی۔ پسند آئی۔ ''کہاں جاؤں'' میں مزاح پن کے بھرپور لوازمات تھے گو کہ دکھی تحریر تھی۔ ''محبت کرنی ہے یا محبت کروانی ہے'' پوری کہانی کی جان اسی فقرے میں تھی۔ نفرتوں میں پھولوں کی تلاش پھر اس کو خوشبو حاصل کرنے کے بعد کی روایتی صورت حال عجب تھی۔ ''عقل مندی'' میں دانشمندی کا مظاہرہ کیا گیا۔ میں نے کئی تحریریں بھیجیں اور ایک بھی شائع نہیں ہوئی (ہر پرچے کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ آپ سرگزشت کو بغور پڑھیں کہ اس میں کس طرح کی تحریریں چھپتی ہیں۔ آپ ویسی اگر بھیجیں گے تو ضرور چھپے گی۔ جو تحریریں ہمارے ہاں نہیں چھپیں آپ ان کو کسی اور جگہ بھیج سکتے ہیں)۔''

☆ مرزا طاہر الدین بیگ نے میرپور خاص سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت دسمبر کے ''مشہر خیال'' میں دو عدد خواتین زبردست تبصرہ کے ساتھ حاضر تھیں مگر سدرہ بانو ناگوری سرفہرست رہیں، ویلڈن۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ بھی بہت خوب رہا۔ معظم علی نے اچھا تبصرہ کیا اور غلطیوں کی خوب صورت انداز سے نشاندہی کی اور بہت خوب مشوروں سے نوازا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے غلام جیلانی پر قلم اٹھایا ہے اور بہت جامع اور مدلل تحریر رقم کی ہے۔ سلمیٰ اعوان نے سری لنکا کے مسلمانوں کا حال زار لکھا۔ محترمہ سلمیٰ صاحبہ ایک سری لنکا ہی کیا ہر جگہ کے مسلمانوں کا حال زار یہی ہے۔ اللہ کرم کرے، (آمین)۔ انور فرہاد صاحب نے دادا جان اور دادی جان سے ہٹ کر مس فٹ کے عنوان سے بابا عالم سیاہ پوش پر تحریر کیا ہے۔ اچھا لکھا ہے۔ منظر امام ''تاریخ عالم'' لے کر آئے اور خوب رہے۔ دسمبر کی شخصیات صائمہ اقبال کی معلوماتی تحریر ہے نومبر ہو یا دسمبر لکھتے وقت کسی مشہور ہستی کو نظر انداز کرنا زیادتی ہے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ مریم کے خان کی ''بگ تھری'' زبردست تحریر ہے۔ جنگجو اور کے ٹو بھی پسند آئیں۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' نے بازی ماری اچھی کاوش ہے۔ آپ بیتیاں اپنی اپنی جگہ سب اچھی مگر صلہ رحمی اور ٹھکانا زبردست تھیں۔

☆ نذیر احمد راجپوت کی خیال آفرینی شہداد پور سے۔ ''میں گزشتہ ایک طویل عرصہ سے ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں۔ پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں۔ سسپنس، سرگزشت سمیت متعدد ڈائجسٹوں کا مطالعہ کیا۔ خط لکھنے کا مقصد یہ ہے اب صرف ایک ہی ڈائجسٹ زیر مطالعہ ہے اس کا نام سرگزشت ہے۔ یہ میں شہداد پور ضلع سانگھڑ میں آپ کے ڈیلر مغل برادرز سے خرید کر پڑھتا ہوں۔ اس ڈائجسٹ میں سے میں صرف سچ بیانیاں پڑھتا ہوں اور انور فرہاد کی تحریر کردہ فلمی شخصیات بھی پڑھتا ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری طرف سے انور فرہاد کو مشہور نغمہ نگار کہانی نویس بابا عالم سیاہ پوش پر ''مس فٹ'' لکھنے پر مبارک باد دیں۔ بابا عالم سیاہ پوش پر ایسا مضمون تو آج تک نگار والے بھی شائع نہیں کر سکے۔ زندگی میں پہلی بار بابا عالم سیاہ پوش کے متعلق پڑھنے کو ملا۔ اتفاق سے یہ میرے پسندیدہ نغمہ نگار ہیں۔ میری آپ سے گزارش ہے انور فرہاد صاحب والے مضمون کے صفحات میں اضافہ کریں۔ صفحات کی تعداد کم ہے۔ کم از کم فلمی الف لیلہ جتنے تو صفحات ہوں۔ انور فرہاد سے گزارش ہے براہ کرم ایک مضمون میں دو شخصیات کا ذکر کریں۔ علاوہ ازیں ہدایت کار ایم جے رانا، ہدایت کار اسلم ایرانی، ہدایت کار حیدر چوہدری، اداکارہ شیریں، ہدایت کار پرویز ملک، نغمہ نگار خواجہ پرویز، وارث لدھیانوی، حزیں قادری، موسیقار ایم اشرف، سلیم اقبال، وجاہت عطرے پر بھی مفصل مضمون لکھیں۔ انور فرہاد صاحب نے صفحہ 115 پر لکھا ہے۔ بابا عالم سیاہ پوش کی دو فلمیں ''لاڈلی'' اور ''بھر جائی'' ریلیز ہوگئیں۔ فلم لاڈلی ایک میوزیکل کامیڈی فلم تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ جناب عالی ہفت روزہ اخبار جہاں کے ماہ نومبر کے کسی شمارے میں مضمون نگار نے فلم لاڈلی کو کامیاب فلم لکھا ہے۔ اب کس کی بات کو سچ مانا جائے (''فلم ڈیٹا بیس'' کے تجزیہ کو معتبر مانا جاتا ہے۔ اس کے مطابق فلم نے اچھا بزنس نہیں دیا۔ نیٹ پر دیکھ لیں)۔ علاوہ ازیں اداکارہ شیریں کی پہلی فلم تیس مار خان آج کل کے لحاظ سے گولڈن جوبلی فلم تھی پھر بھی اداکارہ شیریں کو دوسرے ہدایت کاروں نے زیادہ چانس نہیں دیا۔ فلم ولایت پاس جو کہ دوسری فلم تھی وہ 23 اگست 1963ء کے بعد 28 اگست 1964ء کو ریلیز ہوئی۔ جب کہ فلمی صنعت کے اصول کے مطابق تو اداکارہ شیریں کو متعدد فلمیں ملنی چاہیے تھیں۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کی تشریف آوری کراچی سے۔ ''سال کا آخری شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ 2015ء کیسے گزرا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ اشتیاق احمد اور جمیل الدین عالی جیسی قد آور شخصیات وفات پا گئیں۔ ''اداریے'' پر کیا لکھیں کہ جن حالات اور معاملات کو ہمارے بڑے بھی سمجھ نہیں پا رہے وہاں ہم بچے کیا رائے دیں۔ ہاں ایک شکوہ ضرور کروں گی کہ اس وطن میں ہر چیز نظر آتی ہے، اوکے۔ بہت خوش ہے یہ قوم اپنا سب کچھ کھو کے۔ ''مشہر خیال'' میں صدارت کی نشست میرے نام رہی۔ اچھا لگا۔ طاہرہ آپا نے کیوپڈ کی تصویر پر خوب تبصرہ کیا۔ بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے یونانی عشق و محبت کے دیوتا کو اتنے غور سے دیکھا اور اس کی ننھی سی توند پر تبصرہ کیا۔ دراصل آپا یہ یونانی بڑے ستم ظریف لوگ تھے اور ان کی نظر بڑی دور تک دیکھتی تھی۔ آپ کا شکریہ آپا کہ آپ نے میری غیر حاضری کو محسوس کیا لیکن آپا مجھے آپ کے اس جملے پر اعتراض ہے کہ درگزر ان سے کیا جائے جو انجانے میں غلطی کریں نا کہ ان پر جو جان بوجھ کر کریں۔ آپ دیکھیں کہ اللہ کے آخری نبیؐ پر کفار مکہ جان بوجھ کر ظلم کیا کرتے تھے اور آپؐ ان کے لیے دعائیں فرماتے تھے۔ یہ درگزر کی اعلیٰ ترین مثال بھی کہ نہیں۔ اچھا لگا کہ آپ نے بھی شاہد جہانگیر کی نگہداشت پر مامور نرس پر وہی تبصرہ کیا جو میں نے کیا تھا۔ بعض اوقات میرے اور آپ کے خیالات کیسے میچ کر جاتے ہیں۔ ویسے مذاق کی بات ہے آپا اگر آپ سے کوئی مرد کی جمع معلوم کرے تو آپ یقیناً مردود بتائیں گی۔ منشی عزیز! آپ نے لکھا کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کو انسان بنانے سے منع کیا تھا۔ کیا مخلوق خالق کو کسی کام سے منع کر سکتی ہے۔ آپ اس موضوع پر مزید مطالعہ کریں (منع نہیں کیا تھا۔ اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ مخلوق فتنہ و فساد پیدا کرے گی۔ مدیر)۔ شاہد جہانگیر جلدی سے صحت یاب ہو کر بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری لگائیں۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی خوب رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ''مجدد برق'' نے متاثر کیا۔ غلام جیلانی کی ماں کو خوابوں کی تعبیر کیا خوب ملی کہ ان کا ہونہار بیٹا تاریخ کے صفحات پر اپنا نام سنہری حروف میں رقم کر گیا۔ ان کی سوانح کے آخری جملوں نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے اپنی حیات کو

رائیگاں نہیں جانے دیا۔ "نانگا پربت" پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہمارا دیس بھی کم خوب صورت نہیں ہے۔ خوب صورت اور شوخ جملوں نے پڑھنے کا مزہ دوبالا کر دیا، ویلڈن ندیم اقبال۔ آپ جیسے لکھاریوں کو جو چبھتے جملے لکھتے ہیں سرگزشت کو ضرورت ہے۔ بہت خوب۔ "جنگجو" پڑھ کر دل دہل گیا۔ وطن عزیز کی پہچان اور پاکستان کی شان "کے ٹو" کی معلومات خوب رہیں۔ "مس فٹ" پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا کہ محمد حسین کو عشق کی ناکامی نے لکھاری بنا دیا مگر افسوس کہ اسے وہ مقام نہ مل سکا کہ جو ایک لکھاری کا حق ہوتا ہے جو اس کی شان ہوتی ہے کاش کہ اس کا باپ اسے واپس نہ بلاتا تو شاید لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے عقیدت تو ہوتی لیکن احترام نہ ہوتا۔ "تاریخ عالم" کا چھٹا حصہ بھی معلومات سے بھرپور رہا۔ "دسمبر" کی ساری کی ساری شخصیات ہماری فیورٹ ہیں۔ سو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ پہلی سچ بیانی "درست غلط فیصلہ" کا انجام برا ہوا۔ خدا نے رومانہ کے عیبوں کا پردہ تو رکھ لیا مگر اسے اس حال میں پہنچا دیا کہ وہ خود اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگئی۔ "میں کون ہوں؟" ایک فضول اور ٹائم پاس تحریر ہے۔ "اونچے خواب" میں گوشی کو دولت کی ہوس نے بڑے برے حالوں میں پہنچا دیا۔ اسے دولت تو مل گئی مگر بدلے میں اسے اپنی عزت اور نفس کا سودا کرنا پڑا جو بڑا مہنگا ثابت ہوا۔ "پس پردہ" بہت اچھے انداز میں لکھی گئی مگر مینا اور ارینا کی دلچسپ شرارتوں نے تحریر کو چار چاند لگا دیے۔ حبیب مسعود نے "نفرتوں میں پھول کھلا" کر اپنے آنگن کو تو خوشبو سے مہکا لیا اور میری دعا ہے کہ وہ در شہوار کے باپ کو بھی منانے میں جلد کامیاب ہو۔ خوشیوں کی یہ مہک ہر آنگن میں کھلے۔"

☆ عبدالحکیم ثمر نے اورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ "میں عرصہ دراز سے سرگزشت کا ایک خاموش شیدائی ہوں۔ اس کی انفرادیت اور دلکش روپ نے مجھے زبان بخش دی۔ سرگزشت کے تمام نگارشات ہمیشہ ایک سے بڑھ کر ہوتے ہیں اس کے تمام لکھاری حضرات اور خواتین اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ہمیں اچھی اچھی تحریر سے نوازتے ہیں۔ تازہ شمارے میں بیشتر تخلیق قابل تعریف ہیں جن میں 'مجبد برق' ڈاکٹر ساجد امجد، "نانگا پربت کا عقاب" ندیم اقبال، "دسمبر کی شخصیات" صائمہ اقبال، "مشرقی پاکستان کی فلمیں" عقیل عباس جعفری، "مس فٹ" انور فرہاد۔ سچ بیانیوں میں اب تک صرف رومانہ شعیب صاحبہ کا "درست غلط فیصلہ" ہی پڑھا ہے۔ پڑھ کر عجیب سی کوفت میں محسوس کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں بندہ اعتراف گناہ اس کے سامنے کرتا ہے جس کا وہ گناہ گار ہوتا ہے۔ نہ کہ غیروں کے سامنے جس سے ان کا کوئی تعلق نہیں وہ بھی اپنی شناخت چھپا کر۔ خود شائستہ، رومانہ شعیب صاحبہ نے جس دریا دلی کے ساتھ نکاح کے تقدس کو پامال کیا ہے۔ اسی طرح کی بہادری کے ساتھ بلاجھجک اپنی عزت و آبرو کے ساتھ ساتھ ہی اپنے شوہر کی غیرت کو بھی ایک غیر مرد کے بستر پر قربان کرکے یقیناً خوشی سے ناچ اٹھی ہوں گی۔ اب جب کہ انہیں یقین ہو چلا ہے کہ وہ پل دو پل کی مہمان ہیں۔ ان کا ضمیر انہیں کچوکے لگا رہا ہے پھر بھی اپنے شوہر کو نظرانداز کرکے غیروں کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں۔ میرا مشورہ ہے جس بہادری کے ساتھ انہوں نے اپنی عزت و آبرو کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دی اسی بہادری سے اپنے شوہر کے سامنے اعتراف گناہ کرکے ان سے معافی مانگ لینی چاہیے۔ ہوسکتا ہے وہ انہیں معاف کردیں ان کے معاف کردینے سے ہوسکتا ہے ان کی عاقبت کسی حد تک سدھر جائے۔"

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا اظہاریہ کورنگی کراچی سے۔ "اداریہ پڑھا۔ اقوام عالم میں ہم مسلمانوں کا بحیثیت قوم نمایاں نہ ہونا دشمنوں سے زیادہ اپنوں کی غداریوں کا مرہون منت ہے۔ عالم اسلام کی نمائندگی کرنے والے ہمارے رہبر ورہنماؤں نے ہماری یکجائی کے لیے کیا اور کیسی کوششیں کی ہیں کہ ہم صدیوں بعد بھی دوبارہ ابھر نہ سکے۔ ہم مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق یہود و نصاریٰ کے خلاف کامیاب ہونا تو دور کی بات ہم تو آج بھی یہ اتفاق نہ کرسکے کہ اللہ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہروں کے حرموں میں باجماعت پڑھی جانے والی نماز ہوتی بھی ہے یا نہیں، یا ہمیں اسے دہرانے کی ضرورت ہے۔ "مجبد برق" غلام جیلانی کا کہنا سو فیصد درست ہے کہ اسلام انسانیت کی ترقی اور انصاف کی ایک عالمگیر تحریک ہے۔ جس کی بنیاد روحانی ہے اور جو انسانوں کی وحدت کے تصور پر قائم ہے اور اسلام کے نادان دوستوں نے اسے متنازعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر انفرادی طور پر ہر دسواں آدمی بھی ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی سی انفرادی سعی کرے تو عالم اسلام کو لاکھوں رہنما ایسے مل جائیں گے جو ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہوں گے۔ ایسے میں کیا دشمن اور کیا دشمن کی سازشیں۔ اگر ہم میں سے ہر کوئی سری لنکا کے لاطف اور زہرت کی طرح اپنے اپنے حصے کی شمع اُمید جلانا شروع کردیں تو یہود و ہنود نصاریٰ کی سازشوں کے پیدا کردہ اندھیرے اپنے آپ چھٹ جائیں گے۔ کے ٹو اور نانگا پربت مناسب اس لیے لگیں کہ معلوماتی تحریریں تھیں۔ لیکن زبان و بیان سے نانگا پربت تمام سفرناموں کو مات کرگیا۔ "تاریخ عالم" کے بارے میں ہم منظر امام صاحب کو بتاتے چلیں کہ پہلی صدی عیسوی تک کی تاریخ کے بعد آپ جب 2015 تک لاکر اپنا مضمون ختم کریں گے تو آپ ایک اور کارنامہ انجام دے دیں گے۔ مشرقی پاکستان کی فلمیں اپنا تاثر اس لیے قائم نہ کرسکیں کہ "فلمی الف لیلہ" میں ان کا تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔ البتہ بابا عالم سیاہ پوش فلمی نگری میں "مس فٹ" کیوں تھے۔ انور فرہاد نے خوب سمجھایا جو ہماری سمجھ میں آ بھی گیا۔ "دسمبر" کی شخصیات کا تذکرہ خوب تھا۔ قائداعظم کی خوب صورت شخصیت کے بعد جتنی بھی شخصیات تھیں۔ سب کی سب خوب صورت تھیں۔ اسی طرح کرکٹ کے بگ تھری بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ مریم کے خان کو سلام۔ "سراب" اور سچ بیانیاں اس ڈر سے نہیں پڑھ رہے کہ خطِ لیٹ ہوکر شہر بدر ہی نہ ہوجائے۔"

☆ احمد خان توحید نے کراچی سے لکھا ہے۔ "شمارہ دسمبر 28 نومبر کو ملا۔ برادر معراج رسول صاحب آپ نے سچ کہا، نااتفاقی سے کتنے مسلم ممالک تباہ ہوگئے۔ اس لیے اتفاق ضروری ہے۔ انتخاب ایک جمہوری طرز ہے مگر ہمارے ہاں دھاندلی کا الزام فطرت بن گئی ہے۔ 5 دسمبر راولپنڈی انتخاب میں تین قتل، لاتعداد زخمی ہوئے۔ گویا برداشت کا مادہ نہیں ہے۔ "نامور مدیر" میں ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی کا پڑھا جیسے حسرت، جمیل الدین عالی جیسے لوگوں کی محفل نصیب ہو۔ وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ محفل شہرِ خیال میں نظر ڈالی۔ مسز سدرہ ناگوری

کری صدارت پر تھیں، اچھا تبصرہ تھا، مبارک باد۔ بے بی گڑیا طاہرہ گلزار، عمران جونانی، معظم علی کے تبصرے اچھے تھے لیکن طویل تھے۔ منظر علی خان، اعجاز سفار، منشی عزیز ہے اور شائستہ کے بھی اچھے تبصرے تھے۔ بھائی فلک شیر "سراب" کی جگہ تبدیلی کی واقعی شدید خواہش ہے۔ ڈاکٹر ساجد کی "مجید برق" اچھی تاریخی اسٹوری تھی۔ شالا کی جنگجو لوگوں کے جنگی حالات اچھی تحریر تھی۔ واہ بھئی طارق عزیز اینڈ ندیم اقبال۔ کے ٹو اور نانگا پربت کا عقاب۔ بیوٹی فل اسٹوریاں، بچے دونوں جگہ جانے کی ضد کر رہے ہیں۔ ہم بوڑھے سیڑھیاں بھی بمشکل چڑھتے ہیں۔ میری طرف سے مبارک باد۔ منظر امام کی "تاریخ عالم" خوب رہی۔ دنیا بھر کی تاریخ مل گئی۔ حضرت موسیٰ کا بھی تذکرہ کیا۔ مشرقی پاکستان کی فلمیں" عقیل عباس جعفری آپ نے مشرقی پاکستان کا نام لکھ کر ہمارے زخم ہرے کر دیے۔ ہمارے کتنے پیارے ہوس کی اقتدار والوں نے کھو دیے۔ انور فرہاد کی فلمی نگری، بچے پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی ایسی فلمیں ہوتی تھیں؟ صائمہ اقبال دسمبر کی شخصیات ہم تو جانتے ہیں بچوں کے لیے یہ دلچسپ سلسلہ جاری رکھیں۔ سچ بیانیاں میں "فیصلہ غلط درست" اچھی تھی۔ "صلہ رحمی" میں رحمت کا بلی جیسے لوگ کسی بے سہارا سے دن رات کام لے کر چند ٹکے دے کر سمجھتے ہیں کہ ہمالیہ سر کر لیا۔ نماز میں سکون شاہ بابا جیسے عظیم لوگوں کا ہی ورثہ ہے۔ "اونچے خواب" میں اپنی چادر سے باہر پاؤں نکالنے والوں کا انجام گوشی جیسا ہی ہوتا ہے۔ باقی سچ بیانیاں بھی اچھی ہیں۔ عقل مندی میں عادل کا واپس آنا اچھی بات ہے۔ طوالت کے باعث فرداً فرداً تبصرہ نہیں کر رہا۔ "سراب" اور "شمع امید جلا" کا مطالعہ باقی ہے۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا خلوص نامہ پشاور سے۔ "نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے۔ خدا کرے کہ نیا سال سب کو راس آئے"۔ ادارہ سرگزشت قارئین "شہر خیال" کے ساتھیوں کو نیا سال مبارک ہو۔ 2015ء تمام تر تلخ یادوں کے ساتھ گزر گیا۔ میرے لیے تو 2015ء ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔ مارچ سے لے کر دسمبر تک کئی بار اسپتال میں داخل ہونا پڑا اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ دعاؤں کا طلب گار ہوں۔ سدرہ بانو آپ کا مشکور ہوں جو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ ویسے میں عمر کے جس حصے میں ہوں وہاں دل چرانے کے کم ہی موقع ہوتے ہیں۔ نرس بے چاری کو خواہ مخواہ بیچ میں گھسیٹ لیا۔ آخر میں ایک بار پھر دوستوں سے التماس ہے کہ میری مکمل صحت یابی کے لیے دعا کرتے رہیں۔ پورا پرچہ پڑھ نہیں سکا ہوں اس لیے تبصرے کے لیے معذرت۔ ندیم اقبال کی تحریر "نانگا پربت کا عقاب" پڑھی۔ جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسی خوب صورت لفظی عکاسی اتنی مہارت سے الفاظ کا تکمیل ماحول کی بنت بہت زیادہ پسند آئی۔

☆ سلمیٰ اعوان کا لاہور سے پیام۔ "میں نے "نانگا پربت کا عقاب" پڑھی دلچسپ انداز میں سفر نامہ بیان ہوا ہے کہ پڑھتے ہی چلے جاؤ۔ مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔"

☆ نزابت افشاں کی میہورہ فتح جنگ سے آمد۔ "پانچ ماہ کی غیر حاضری کے بعد آج پھر شریک ہو رہا ہوں۔ غیر حاضری کا سبب میری علالت تھی۔ اُمید ہے آپ سب ٹھیک ہوں گے۔ دسمبر کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ یک صفحی سرگزشت میں نامور دیر شاہد احمد دہلوی کا تذکرہ اچھا لگا۔ "مجید برق" اپنے ہی ضلع اٹک کے اس نایاب ہیرے کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ "شمع امید جلا" اچھی تحریر تھی۔ "تاریخ عالم" اور "جنگجو" بھی اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ سفر نامہ کا اندازِ بیان خوب تھا۔ دسمبر کی شخصیات اچھا سلسلہ ہے۔ "دھوکے باز" واہ کیا خوب تحریر تھی۔ "عقل مندی" ایک بہترین تحریر تھی لیکن ٹاپ آف دی لسٹ اسٹوری تھی۔ "درست غلط فیصلہ" فیصلہ اچھا تھا مگر اسے یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔"

☆ دولت پور صفن نزد پوسٹ آفس ضلع شہید بے نظیر آباد سے لکھتے ہیں۔ "میں قاری ہوں۔ سرگزشت کا کافی عرصے سے ایک شمارے میں دریائے سندھ سے متعلق ایک مضمون شائع کیا تھا "سنہری لکیر" وہ شمارہ مجھ سے گم ہو گیا۔ وہ شمارہ درکار ہے۔ اُمید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ شکر گزار ہوں گا۔ (فروری 2008ء کا شمارہ ہمارے پاس بھی صرف ایک عدد ہے)۔"

☆ نجمی رحمن امریکا سے لکھتی ہیں۔ "محترم معراج رسول صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو اور محب وطن پاکستانیوں کو سلامت رکھے۔ "شہر خیال" میں خط شائع کرنے کا شکریہ۔ میرا خط تو آپ کو ہمیشہ دیر سے ملے گا۔ رسالہ دیر سے ملتا ہے۔ کچھ دن پڑھنے میں لگتے ہیں کم از کم دو ہفتے پاکستان پہنچنے میں لگتے ہیں (آپ کا خط تاخیر کے باوجود بھی لگ رہا ہے گا یعنی اگر تازہ شمارے میں نہ پہنچ سکا تو آیندہ ماہ لگ جائے گا) بہر حال "شہر خیال" میں شامل ہو کر ہم خود کو وطن عزیز کے بہت قریب سمجھتے ہیں۔ سب ساتھیوں کے خلوص محبت کا ہم وطن سے دور باسیوں کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو سلامتی دے اور سب کی پریشانیوں کو دور کرے۔ کہانیوں میں سلسلہ "سراب" حسب معمول اچھا جا رہا ہے۔ "بیت بازی" میں فلک شیر، عرشیہ سید کے شعر پسند آئے۔ تاریخ عالم، شخصیات، شکاریات، کراچی کی سیر بہت اچھے لگے۔ اے وطن میرے پیارے وطن کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن۔"

☆ وکیل الرحمن کا خط کراچی سے۔ "سرگزشت کا پرانا قاری ہوں۔ سلسلے سب ہی بہت پیارے پیارے ہیں۔ سراب، تاریخی کہانیاں، ادبی شاہکار ہیں۔ یہ ایک کامیاب ڈائجسٹ ہے۔ سب سے بڑی بات پروقار سنجیدہ موضوعات ہوتے ہیں۔ حسن رزاقی صاحب بھی بہت خوب لکھتے ہیں۔ ان کو ضرور شامل کیا کریں وہ بھی غضب کا لکھتے ہیں۔ ہمارے پرانے ساتھی آفاقی صاحب پرچے کو اداس و ویران کر گئے ہیں۔ مطالعہ وسیع ہے لیکن خط لکھنے کی قطعی عادت نہیں، لہٰذا باقی، باقی رہا۔"

☆ عامر کریم نے منگلا کینٹ سے لکھا ہے۔ "میں ایک لائبریری میں لائبریرین ہوں۔ مصروفیات کے باوجود سرگزشت کا ریگولر قاری ہوں

لیکن خط پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ معراج رسول صاحب کے خیالات پڑھ کے دل کو بڑا دکھ ہوا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ نامور ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی کا تعارف ہوا۔ ایک صفحہ میں کسی شخصیت کا نقشہ کھینچ دینا اور حالاتِ زندگی بیان کرنا یہ فخر سرگزشت کو حاصل ہے اور ''مشہرِ خیال'' پڑھ کے میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوا کہ میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور صائمہ اقبال کی تحریر بہت اچھی تھی۔ پڑھ کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ ان میں کچھ میری پسندیدہ شخصیات تھیں۔ جیسے قائد اعظم، بے نظیر بھٹو، نواز شریف، راجا پرویز اشرف اور ڈاکٹر فہمیدہ مرزا۔ ان کے بارے میں ذاتی معلومات جان کے بہت خوشی ہوئی۔''

☆ انور عباس شاہ کا مکتوب دریا خان بھکر سے۔ ''سب سے پہلے تو ہم آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے نئے سال کا پہلا شمارہ پُراسرار نمبر کی صورت میں شائع کرنے کی خوش خبری سنادی۔ ہماری شدید خواہش کہ ایک اور پراسرار نمبر ہونا چاہیے اور اب آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں تو سرگزشت ہر ماہ کی یکم تاریخ سے چار تاریخ تک پہنچتا ہے جو کہ سراسر زیادتی ہے برائے مہربانی اس کا کوئی سدباب ضرور کریں (ایجنٹ سے جواب طلب کیا گیا ہے)۔ آپ کی سچی اور کھری باتیں ہمیشہ کی طرح دل میں اتر گئیں۔ فی الحال تو ہمیں کسی غیر دشمن کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ ہم تو آپس میں ہی لڑ رہے ہیں۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ پوری امت مسلمہ متحد ہو جائے اور دشمن کی سازش ناکام ہو جائے، آمین۔ ''مشہرِ خیال'' میں سبھی بہن بھائیوں کے خطوط شاندار تھے۔ خاص طور پر شائستہ بہاولپور سے منفرد انداز میں تشریف لائیں۔ بے حد پیارا اور قابلِ ستائش خط تھا۔ اُمید ہے ہماری یہ بہن آیندہ بھی ''مشہرِ خیال'' میں جلوہ گر ہوتی رہیں گی۔ باجی طاہرہ گلزار بھی اپنے خوب صورت خط کے ساتھ حاضر تھیں۔ بزرگ اور معتبر ہستی جناب شاہد جہانگیر شاہد کے لیے دلی دعا ہے کہ خداوند کریم ان کو جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ ''اونچے خواب'' ایک دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ ڈھولن عرف ڈھولو کے ساتھ گوشی نے کافی زیادتی کی جس کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی خودکشی کی ذمہ دار بھی گوشی جا ٹھہرتی ہے۔ ویسے ڈھولن کو خودکشی کرنی نہیں چاہیے تھی بلکہ خاموشی سے الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ گوشی کو بھی سیدھے راستے پر آنے کا موقع تو ملا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ ''نانگا پربت کا عقاب'' سپر ہٹ تحریر تھی۔''

☆ خالد محمود نے ملتان کینٹ سے لکھا ہے۔ ''اس دفعہ پرچہ 27 نومبر 2015ء کو مل گیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ ذاتی طور پر میں سرگزشت کو خیرباد کہنے والا تھا مگر دسمبر 2015ء کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں نے بہت محنت کی ہے۔ ''مجید برق'' پڑھ کر برقی رو پیدا ہوئی۔ اگر انسان واقعی محنت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ ''شمع امید جلا'' پڑھ کر مسلمانوں کی داستان کرب جو کہ نہایت معلوماتی اور جذباتی بھی ہے۔ اللہ میاں سری لنکا کے مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ کشمالہ صاحبہ کا مضمون حقیقت میں انسانیت کی پیشانی پر دھبہ ضرور ہے لیکن یہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ میرے خیال میں آج کل جو سپر طاقتیں اپنے کرتب دکھا رہی ہیں وہ قابلِ شرم ہیں۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو مہذب اقوام کہلاتی ہیں۔ کے ٹو اور نانگا پربت تمام دنیا کے لوگوں کے لیے دعوت نظارہ ہے لیکن ہمارا ٹورزم کا محکمہ جو کہ بے انتہا زرمبادلہ کما سکتا ہے بالکل سو رہا ہے۔ ایسے محکمے کو ٹھیکے پر دینا چاہیے۔ خاص طور پر انور فرہاد صاحب نے پاکستان کی فلمی کہانی کا نچوڑ بابا عالم سیاہ پوش کی شکل میں ایک تاریخی دستاویز بنا دیا ہے۔ ''دسمبر کی شخصیات'' بے حد معلوماتی ہے۔ ''ٹھگ تھری'' میں ہندوستان نے اپنی چالاکی اور دولت کا پجاری اور بدمعاشی کا ثبوت پیش کیا ہے جو کہ ہندو قوم کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندو ہر شعبہ زندگی میں دھوکا فریب دیتا ہے۔ اس سے جتنا بچا جائے اچھا ہے۔ میں ادارہ سرگزشت کو ایک بار پھر مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ایک لمبے عرصے کے بعد ایک معیاری رسالہ بحال ہو گیا ہے اور میرا جیسا عام قاری جو اس کو چھوڑ رہا تھا اس نے ارادہ بدل لیا ہے۔ ہم اس میں جگ کہانیاں، آپ بیتیاں جگ بیتیاں ہی دیکھنا چاہتے ہیں نہ کہ کچھ اور (سرگزشت صرف واقعات کا پرچہ ہے)۔''

☆ عبدالباسط سومرو کا پیام خیرپور میرس سے۔ ''عرصہ چھ سال سے ماہنامہ سرگزشت کا مستقل قاری ہوں مگر پہلی بار لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ جدید سندھی ادب کے امام شیخ ایاز کی سوانح حیات ارسال کر رہا ہوں بعنوان آفتاب ادب۔ شیخ ایاز کی کتابوں میں سے منتشر احوال کو جمع کرنے، ترتیب دینے اور پھر سب سے بڑھ کر سرگزشت کے معیار کو سامنے رکھ کر تحریر کرنے میں مجھے کس قدر مشقت سے کام لینا پڑا ہے۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ سوچتا ہوں اگر اب بھی تحریر شائع نہیں ہوئی تو سخت مایوسی ہوگی۔ اُمید کرتا ہوں ناامید نہ کریں گے (پڑھنے کے بعد فیصلہ کرنا ممکن ہے)۔''

☆ عارف شیخ روہیلہ لکھتے ہیں۔ ''پچھلے سال آپ کے آفس میں ہی آپ سے شرف ملاقات ہوئی تھی پھر اس کے بعد ایک عدد تحریر بھی ارسال کی تھی۔ آپ کی جانب سے فون آنے پر مسرت و تشفی ہوئی۔ جناب میں ایک شوقیہ ادیب ہوں بظاہر دوسرے امور بھی ہیں اسی لیے مصروفیت کی بنا پر اب کم ہی لکھ رہا ہوں۔ ان دنوں آپ سے ملاقات اور فون سن کر لگا تھا کہ آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گے اسی لیے ایک عدد تحریر ارسال خدمت ہے اس اُمید کے ساتھ کہ پسندیدگی کی صورت میں شکریے کا موقع عطا فرمائیں گے۔ (انشاء اللہ جلد پڑھ لوں گا)۔''

☆ اکبر بخاری کا تجزیہ شجاع آباد ملتان سے۔ ''عرصہ دراز سے آپ کے رسائل کا قاری ہوں اور روزنامہ نوائے وقت میں عرصہ پچیس سال سے کالم نگاری کا شغل بھی جاری ہے۔ پہلی بار آپ کی خدمت میں ایک جگ بیتی پیشِ خدمت ہے۔ آپ کی رہنمائی میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔ (اس پرچے سے فارغ ہو کر پڑھ لوں گا)۔''

کمال احمد رضوی

راشد اشرف، کراچی

سترہ دسمبر 2015ء کی رات آٹھ بجے کمال احمد رضوی المعروف الن، کراچی میں واقع اپنی قیام گاہ پر دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

قریبی احباب جانتے ہیں کہ راقم نے ان پر لکھا بھی، انٹرویو بھی کیا، تاثرات بھی ریکارڈ کیے۔ الف نون کے چند نایاب ڈراموں کو یوٹیوب پر شامل بھی کیا۔ گزشتہ 6 برسوں میں کمال صاحب سے ان گنت ملاقاتیں رہی تھیں۔ نجی و ادبی محفلوں میں انہیں جب بھی مدعو کیا وہ بلا تامل چلے آتے تھے حالانکہ وہ کم از کم ایک دہائی سے مکمل گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ دسمبر 2014ء میں امریکا سے آئے بزرگ ادیب جناب ابوالحسن نغمی اور کمال صاحب کی ملاقات کی یادیں و باتیں اور جذباتی مناظر تو ذہن میں ہنوز تازہ ہیں۔

سترہ دسمبر کی رات آٹھ بج کر بیس منٹ پر پہلے ایک ٹی وی چینل نے کمال صاحب کے انتقال کی خبر زیریں پٹی میں چلائی، لکھا تھا۔ ''وہ ایک طویل عرصے سے علیل تھے۔''

ایک دوسرے چینل کو خیال آیا کہ بریکنگ نیوز کی اس لاحاصل دوڑ میں ہم پیچھے کیوں رہیں، سو انہوں نے لکھا۔ ''کمال رضوی سانس کی تکلیف کے باعث کچھ دنوں سے ایک نجی اسپتال میں داخل تھے۔'' انہیں یہ علم ہی نہ تھا کہ کمال صاحب محض تین روز قبل لاہور کا ایک بھرپور دورہ کر کے واپس لوٹے تھے جہاں انہوں نے لاہور ٹیلی ویژن کے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور خوب جی بھر کر باتیں بھی کیں۔ وہ لاہور میں منعقد کیے گئے ادبی و ثقافتی میلے میں مدعو تھے۔

پھر وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ درجن بھرٹی وی چینلوں نے ''طویل عرصے سے علیل تھے'' کے جملے کو دہرانا شروع کیا اور آناً فاناً دنیا بھر میں یہ خبر پھیلتی چلی گئی۔ میں نے فیس بک پر کمال صاحب کے انتقال کی خبر آویزاں کی تو اگلے 5 منٹ میں امریکا میں مقیم رفیع خاور المعروف ننھا کے بیٹے اور راقم کے دوست نقی خاور صاحب نے راقم سے رابطہ کیا اور خبر کی تصدیق چاہی۔ علالت والی بات پر وہ بھی پریشان تھے کہ اس کی نوعیت کیا تھی وغیرہ وغیرہ۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ نقی خاور محض دو ہفتے بعد کراچی

آنے والے ہیں اور ماں رضوی صاحب سے ملاقات ان کی پہلی ترجیح تھی۔

اب کون میری بات پر یقین کرے گا کہ میں ان سے زندگی میں پہلی مرتبہ ملاقات کرتا، وہ ملاقات جس کے لیے میں دو سال سے بے چین تھا۔ گرچہ فون پر آپ کے توسط سے کئی مرتبہ بات کر چکا تھا۔'' نقی خاور کہہ رہے تھے۔

راقم نے ایک کمزوری کوشش کی اور دو عدد ٹی وی چینلوں سے رابطہ کر کے انہیں درست صورتِ حال سے آگاہ کیا مگر کون سنتا ہے فغان درویش۔ ٹی وی چینلز کے نقار خانے میں اس قدر شور و غوغا ہے کہ الاامان......

اگلی صبح تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔

ایک اخبار نے لکھا کہ کمال احمد رضوی نے دو شادیاں کی تھیں اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسرے نے لکھا کہ انہوں نے سوگواروں میں اہلیہ، بیٹا اور ماں کو چھوڑا ہے۔ سبحان اللہ۔ 85 برس کے کمال رضوی کی والدہ اگر ہوتیں تو کم از کم ایک سو پانچ یا دس برس کی ہوتیں۔ مگر وہ تو کب کی اس دنیا سے جا چکی ہیں۔

لیکن صاحبو! یہ بات بھی سچ ہے کہ اخبار والوں کے پاس بسااوقات وہ خبریں ہوتی ہیں جن کی عام لوگوں کو بھنک بھی نہیں ہوتی۔ لہٰذا خیال آیا کہ اس کی بھی تصدیق کر لی جائے۔ راقم نے کمال صاحب کی اہلیہ محترمہ عشرت جہاں سے بات کی۔ ان کا جواب ملاحظہ کیجیے:

''تم خود بتاؤ! یہ خبر سچ ہو سکتی ہے؟ یہ تو ایک طرف، کچھ ہی دیر پہلے ایک اخبار سے فون آیا۔ وہ صاحب مجھ سے پوچھ

رہے تھے کہ کمال صاحب کی کتنی بیٹیاں ہیں اور کتنی بیویاں ہیں؟ میں نے بے بسی سے جواب دیا کہ بھیا! ان کی اکلوتی بیوی میں ہی ہوں۔"

یہ بھی سن لیجیے کہ کمال صاحب کی اہلیہ کے لیے یہ تمام بے سروپا خبریں سخت کوفت کا باعث بنی ہیں۔ صرف ایک عقیل عباس جعفری ہیں جنہوں نے پہلے ان کی اہلیہ کو فون کر کے اس افسوس ناک خبر کی تصدیق کی اور اس کے بعد اسے اپنے ٹی وی چینل پر نشر کروایا۔

کمال صاحب کو 22 برس قبل دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کے بعد بہترین علاج اور ان کی اہلیہ کی انتہائی توجہ کی بنا پر انہیں کبھی یہ احساس ہی نہ ہوا کہ وہ دل کے مریض ہیں۔ شام کی چہل قدمی اور باقاعدگی سے نماز کی ادائیگی، یہ ان کے معمولات تھے جن پر وہ آخر دم تک کاربند رہے تھے۔ ذیابیطس کی شکایت ضرور تھی مگر انسولین لیتے تھے اور اس میں کبھی تاخیر نہیں کرتے تھے۔ ان کی شوگر ہمیشہ کنٹرول میں رہتی تھی۔ راقم ایسے کئی موقعوں کا گواہ ہے کہ جب دورانِ تقریب ان کی انسولین کا وقت ہوا اور اسٹیج کے ایک گوشے میں جا کر ان کی اہلیہ نے انہیں انسولین لگائی۔

سترہ دسمبر کے دن کمال صاحب نے صبح کچھ نہیں کھایا تھا۔ گھر پر ہی رہے تھے اور آرام کرتے رہے تھے۔ عشا کی نماز کے بعد ان کی اہلیہ عشرت جہاں نے ان کو گلوکوز کا ایک گلاس بنا کر دیا کہ مبادا ان کی شوگر کم نہ ہو جائے۔ وہ اپنے کمرے میں تھے۔ بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ ان کی اہلیہ نے ان کو سہارا دے کر دو تکیے ان کے سر کے نیچے آرام کی خاطر لگا دیے تھے۔ ان کو گلوکوز کا گلاس بنا کر دیا جسے تھامنے کے لیے وہ بمشکل اٹھے اور اسی اثنا میں دوسرے تکیے کے اوپر گر گئے۔ طب کی اصطلاح میں یہ ایک Massive Heart Attack تھا۔

ان کے فلیٹ کی دوسری منزل پر ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی ہیں جو کمال رضوی کی اہلیہ کی دوست ہیں۔ کمال صاحب کی اہلیہ بھاگی ہوئی گئیں اور انہیں بلا لائیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے نبض دیکھی مگر کمال صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ آناً فاناً، بنا کسی کو تکلیف دیے، چلتے پھرتے، اس انداز سے جس کے لیے ہمارے بزرگ ہمیشہ دعا گو رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اسی طور دنیا سے اٹھائے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں بلا لیا۔ وہ ہماری محفل سے اٹھ گئے مگر راقم کے پاس ان کے دیے کئی یادگار و کمیاب تحفے رہ گئے جو تا عمر حیات مجھے رلاتے رہیں گے۔ مثلاً ان پر کیے گئے ایم فل کا مقالہ جسے میں نے اسکین کر کے محفوظ کر لیا ہے، ایک تحفہ تو غضب ہے۔ یہ پی ٹی وی کی وہ ڈاکیومنٹری ہے جس کا عنوان ہے: A Portrait of Kamal Ahmed Rizvi اسے کمال صاحب نے وی سی آر کی کیسٹ کی شکل میں عنایت کیا تھا جسے میں نے ڈی وی ڈی میں منتقل کروالیا تھا۔ یہ کمال صاحب کے پرستاروں کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے کیونکہ بقول کمال صاحب یہ ٹی وی والوں کے پاس بھی نہیں ہے۔ ایک صاحب کا فون آیا۔ کہہ رہے تھے کہ یہ آپ نے کیا غضب کیا، یہ تو انٹرنیٹ پر بھی نہیں ہے۔ اس پروگرام کو تو آپ کسی کے ہاتھوں فروخت کر دیتے۔ عرض کیا کہ کمال صاحب کے پرستاروں کے ہاتھوں 'فروخت' کر چکا ہوں۔

اب سے کچھ ہی عرصہ قبل ایک روز کمال صاحب کا فون آیا تھا۔ وہ اپنی بھاری آواز میں کہہ رہے تھے: "بھئی راشد! اتوار کی صبح آجاؤ، معراج جامی صاحب کو بھی لے آؤ۔ ناشتا ہمارے ساتھ کرنا۔"

اور ہم دوڑے چلے گئے تھے۔

ان کی اہلیہ کے بنائے گرم گرم خشخاش کے پراٹھوں اور دیگر فواکہات سے ہماری تواضع کی گئی اور کمال صاحب کی دلچسپ باتیں، کبھی ہنسانے والی اور کہیں کہیں افسردہ کر دینے والی، اس پر مستزاد۔

وقت کی شاخ سے وہ چند پُرمسرت ساعتیں علیحدہ ہو کر گری تھیں اور تیزی سے ماضی کا حصہ بنتی چلی گئی تھیں۔

ایک بار وقت سے لمحہ گرا کہیں
وہاں داستان ملی لمحہ کہیں نہیں

تھوڑا سا ہنسا کے، تھوڑا سا رلا کے، پل یہ بھی جانے والا ہے

یہ سب کچھ اب کبھی نہیں ہوگا۔ یہ محبت، یہ خلوص۔ میں اس سے محروم ہو گیا ہوں۔ ہم سب اس سے محروم ہو گئے ہیں۔

اس وقت جب میں یہ سطور رقم کر رہا ہوں۔ کینٹ اسٹیشن، کراچی کے علاقے میں نماز جنازہ کے بعد ڈیفنس کراچی کے قبرستان میں کمال احمد رضوی صاحب کی تدفین کی جا چکی ہے۔

الن اور ننھا...... الف اور نون ...... ایک مرتبہ پھر یک جا ہو گئے ہیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون٥

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ ایک آوارہ برگ نما، دیدئہ حیراں کا عنوان بنا، شہر در شہر پھرتا رہا۔ اسے تلاش تھی مخفی قوتوں کی تاکہ اوج پر پہنچ سکے۔ اس تلاش میں جب اسے کامیابی ملی، پُراسرار قوتوں پر دسترس حاصل ہوا تو وہ مجسم شیطان بن گیا۔ اس نے حکامِ وقت کو ذہنی غلام بنایا، شہزادیوں کو کھلونا اور پھر گناہوں کی تبلیغ میں مبلغ شیطان بن کر آدھے یورپ میں دہشت کی علامت سے مشہور ہو گیا۔

ایک رسوائے زمانہ، انتہائی پراسرار شخص کا زندگی نامہ

سوویت یونین کے ایشیائی علاقے سے تعلق رکھنے والا سائبیریا ان دنوں سخت سردی کی لپیٹ میں تھا۔ سخت سردی کی وجہ سے فصلیں سمٹ گئی تھیں اور دریائے تورا کا پانی برف کی ایک بڑی سِل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہڈیوں میں اتر جانے والی سردی کے باوجود گاڑی بان انفیم اینڈری وچ اپنی گھوڑا گاڑی لیے تیار کھڑا تھا جو سامان سے لدی ہوئی تھی۔ اسے یہ سامان قریب کے ایک گاؤں تک لے جانا تھا۔ وہ اس سردی میں کبھی باہر نہ نکلتا۔ وہ کیا نہ نکلتا اس کی بیوی اینا ایگورواسے کبھی نہ جانے دیتی کیونکہ وہ حاملہ تھی اور ولادت کا وقت نزدیک آ گیا تھا۔ انفیم اینڈری وچ کو سامان لے جانے اور واپس آنے میں دو دن لگ سکتے تھے۔ انفیم اینڈری وچ محض اس لیے یہ مشقت اٹھانے پر تیار ہو گیا تھا کہ بھاری معاوضہ اس کا منتظر تھا۔ کوئی اور گاڑی بان اس سردی سے ٹکرانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تین گنا معاوضے کی بات کی تھی۔ چلنے سے پہلے وہ اپنی بیوی سے بات کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر گھر کے اندر گیا۔

”میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا مگر کیا کروں اتنا معاوضہ مل جائے گا کہ اس شدید سردی میں بہت سے دن آرام سے گزر جائیں گے۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔“

”تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیا مجھے نہیں معلوم کہ میری خیریت سے زیادہ اس گھر کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں تو تمہیں اس لیے روک رہی تھی کہ کہیں اس سردی میں ہمارا گھوڑا بیمار نہ پڑ جائے۔ تمہارے روزگار کا یہی تو ایک ذریعہ ہے۔“

”فکر مت کرو، ہمارا گھوڑا بہت سخت جان ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔“

”تم بھی اپنا خیال رکھنا۔“

”ہمارے پڑوس کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے تو ”میشا“ کو بھیج کر کسی کو بلا لینا۔“ اس نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

پیشا، اس کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔

افیم اینڈری وچ خوب اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر گاڑی پر سوار ہوا اور گھوڑوں کو آگے بڑھا دیا۔ گاڑی میں جتے دونوں گھوڑے چابک کا اشارہ پاتے ہی آگے بڑھ گئے۔ گاڑی کے پہیوں سے نکلنے والی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔

دو دن بعد وہ واپس آیا تو گاؤں میں داخل ہوتے ہی اسے یہ خوش خبری مل گئی کہ اس کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ سن کر تعجب ہوتا۔ البتہ اسے یہ فکر ضرور ہوئی تھی کہ نہ جانے اس کی بیوی کی حالت کیسی ہو کیونکہ اسے ابھی تک یاد تھا کہ پہلے بیٹے کی پیدائش پر اس کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ گاؤں کی دائی نے اپنے تجربے کی روشنی میں صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب کوئی ولادت ہوئی تو اس کا زندہ رہنا مشکل ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے گھوڑے کو چابک پر رکھ لیا گھر دور ہی کتنا رہ گیا تھا۔ پلک جھپکتے وہ گھر کے سامنے تھا۔ اس نے گھوڑوں کو اصطبل تک پہنچانا بھی ضروری نہیں سمجھا اور بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوگیا۔ اس کی بیوی آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی تھی۔

''اینا، دیکھو میں آگیا۔''

''میرا دل کہہ رہا تھا تم آج ضرور آؤ گے۔''

''تم کیسی ہو۔ مجھے تمہاری بڑی فکر تھی۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم اپنے بیٹے کو نہیں دیکھو گے؟''

''ارے میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ہمارے گھر میں فرشتہ اترا ہے۔'' افیم اینڈری وچ بچے پر جھک گیا۔ وہ کمزور ضرور تھا لیکن اس کی لمبی انگلیاں اور لمبے ہاتھ پاؤں بتا رہے تھے کہ وہ بڑا ہو کر دراز قد نکلے گا۔ بال بھی نہایت گھنے تھے جب کہ اس کے گاؤں میں گھنے بالوں والے بچے پیدا نہیں ہوتے تھے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔'' اس کی بیوی نے اس کی محویت کو توڑا۔

''دیکھ رہا ہوں ہمارے گھر میں کتنا خوب صورت بچہ پیدا ہوا ہے۔''

''اپنے بچے سب ہی کو خوب صورت لگتے ہیں ورنہ یہ تو ویسا ہی بچہ ہے جیسے سب کے گھروں میں ہوتے ہیں۔''

''کوئی نہیں۔ اس کے بال دیکھو، پورے گاؤں میں ایسے بال کسی کے ہوں گے؟''

''اس کے بالوں کی طرف تو میں نے بھی غور سے دیکھا تھا۔ ایسے بال واقعی یہاں کے بچوں کے نہیں ہوتے۔''

''اس کا کوئی نام بھی تو ہونا چاہیے۔''

''تم کیا سمجھتی ہو، میں نے اس کا کوئی نام سوچا نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا بھی ہے اور اچھی طرح یاد بھی کر لیا ہے۔ اس کا نام گریگوری یوفیمو وچ راسپوتین ہوگا اور پیار سے ہم اسے گریشا کہہ کر پکاریں گے۔''

اسے اس دن کے بعد سے گھر میں گریشا اور گھر کے باہر راسپوتین کہہ کر پکارا جانے لگا۔

وہ اور اس کا بھائی ساتھ ساتھ بڑے ہو رہے تھے لیکن وہ اپنے بڑے بھائی سے مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا بھائی نسبتاً سنجیدہ اور پڑھاکو تھا لیکن راسپوتین نہایت شرارتی اور پڑھائی سے دور بھاگنے والا تھا۔ اسے اسکول بھیجا ضرور گیا لیکن اسکول کی دیواریں اسے قید نہ کرسکیں۔ اسکول جانے کی بجائے وہ اصطبل میں گھس جاتا اور گھنٹوں عبادت کے انداز میں بیٹھا رہتا۔ گھوڑوں کی آنکھوں میں گھورتا اور ان کے نتھنوں سے نکلنے والی آواز کو سنتا رہتا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی ہوتی جیسے یہ گھوڑے اس سے باتیں کررہے ہوں اور وہ ان کی زبان سمجھ رہا ہو۔ اس کا باپ اسے اس عالم میں کئی بار دیکھ چکا تھا اور حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ بچے جانوروں کو پسند کرتے ہیں لیکن اسے دیکھ کر تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان گھوڑوں کی پرستش کررہا ہو۔ اس نے اس معاملے میں سختی بھی دکھانی چاہی تھی لیکن اس کا اثر بہت برا ہوا تھا۔ وہ بیمار پڑ گیا تھا اور اس وقت تک ٹھیک نہیں ہوا جب تک اسے اصطبل جانے کی دوبارہ اجازت نہیں مل گئی۔ اس کے باپ نے آہستہ آہستہ ہتھیار ڈال دیئے اور یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ راسپوتین ان گھوڑوں سے واقفیت کے بعد ایک اچھا گاڑی بان ضرور بن جائے گا۔ اس کے نام اور اس کے کام کو آگے بڑھائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے راسپوتین کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ گھوڑا گاڑی پر لوگوں کا سامان یا پھر مسافروں کو آس پاس کے دیہات میں لے جاتا تھا۔ ان میں سے بہت سے علاقے سیاحت، کاروباری اور معاشرتی نقطۂ نظر سے مشہور تھے۔

راسپوٹین بھی باپ کے ساتھ ان بارونق علاقوں میں جانے لگا اور نہایت کم عمری میں اس نے گویا دنیا دیکھ لی۔ اس کی عمر کے دوسرے بچے حتیٰ کہ اس کا بھائی تک گاؤں کی محدود دنیا تک محدود تھے لیکن وہ دور دراز کے علاقوں کی معاشرت سے واقف ہو چکا تھا۔

اصطبل اور گھوڑوں کی محبت سے ہٹ کر اس کی دوسری محبت اس کا بھائی ''میشا'' تھا۔ جب راسپوٹین کی عمر دس گیارہ سال ہو گئی تو اس نے اپنے سے بڑے بھائی کو بھی کھیل کود میں لگا لیا۔ وہ دونوں آوارہ گردی کرتے ہوئے گھر سے بہت دور نکل جاتے تھے۔ ان کا پسندیدہ مقام دریائے تورا کا کنارہ تھا جہاں وہ دن دن بھر کھیلتے رہتے تھے۔ ایک روز کھیل کے دوران میشا کا پاؤں پھسلا اور وہ دریا میں گر پڑا۔ پانی ٹھنڈا بھی تھا اور بہاؤ تیز بھی تھا۔ میشا گرتے ہی آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ راسپوٹین نے جب بھائی کو ڈوبتے ہوئے دیکھا تو بھائی کو بچانے کے لیے اس نے بھی دریا میں چھلانگ لگا دی۔ پانی کے تیز بہاؤ میں اس کی ایک نہ چلی۔ جلد ہی ہاتھ پاؤں شل ہو گئے اور وہ بے بس ہو گیا۔ دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ ایک راہ گیر کا ادھر سے گزر ہوا جس کی بروقت مدد سے وہ دریا سے باہر آ گئے۔

ان کی جان بچ گئی تھی لیکن میشا کی حالت غیر تھی۔ اس کے پھیپڑوں میں پانی بھر گیا تھا اور سرد پانی کے باعث نمونیا بھی ہو گیا۔ راسپوٹین بہت کم پانی میں رہا تھا اس لیے اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔

دیہات کے ڈاکٹر نے میشا کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ میشا موت کی آغوش میں چلا گیا۔ راسپوٹین کو یہ احساس ستانے لگا تھا کہ وہ میشا کو ڈوبنے سے بچا نہیں سکا۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا کہ وہی اسے لے کر کھیلنے کے لیے گیا تھا ورنہ میشا تو کھیل کود سے دور ہی رہتا تھا۔ راسپوٹین کا احساسِ جرم اتنا بڑھا کہ وہ بیمار رہنے لگا۔ اسے ایک ایسی نادیدہ بیماری لاحق ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر اس کے علاج سے عاجز آ گئے۔ وہ ہر وقت بخار کی گرمی سے جلتا رہتا۔ رفتہ رفتہ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ کمزور ایسا ہو گیا کہ اٹھنے کی سکت نہ رہی۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ وہ کوئی آسیب زدہ مخلوق نظر آتا تھا۔ گھر والوں نے اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس کا بستر باورچی خانے میں لگا دیا۔ موسم بہار گزر چکا تھا۔ سائبیریا والوں کو ٹھٹھرتی راتوں کا سامنا تھا۔ گاؤں کے لوگ شام کو کاموں سے فارغ ہونے کے بعد کسی ایک گھر میں چولہے کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے۔ جب اتنے لوگ ایک ساتھ بیٹھیں تو جملہ باتیں چھڑ ہی جاتی تھیں۔ باتیں کیا گاؤں کے مسائل زیرِ بحث آتے تھے۔ راسپوٹین کا تو بستر ہی باورچی خانے میں تھا۔ اسے چولہے کی گرمی بھی ملتی رہتی تھی اور باتوں سے دل بھی بہلتا رہتا تھا۔ ایک روز یہ لوگ جمع ہوئے تو ان کی گفتگو کا محور گھوڑے کی چوری تھا۔ ایک گھوڑا چوری ہو گیا تھا لہٰذا اس وقت یہ بحث ہو رہی تھی کہ چور کون ہو سکتا ہے اور اگر وہ پکڑا گیا تو اس کو کیا سزا دی جائے۔ ان لوگوں میں گاؤں کا معزز اور دولت مند شخص پیٹر الیگزینڈر روچ بھی شامل تھا۔ وہ نہ صرف شامل تھا بلکہ سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر وہی بول رہا تھا۔ ایک موقع پر اس نے کہا۔

''اب تک اس گاؤں میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور اب پیش آ ہی گیا ہے تو ہم سب کو متحد ہونا پڑے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سب مل کر اس چور کا سراغ لگائیں اور ایسی سخت سزا دیں کہ دوسروں کو عبرت ہو۔''

ابھی وہ کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ باورچی خانے میں راسپوٹین کی نحیف آواز نے شور مچایا۔

''گھوڑے کا چور پیٹر الیگزینڈر روچ ہے۔''

یہ جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو سب کو نظر آ رہی تھی لیکن یہ ایسی اطلاع تھی کہ سب دم بخود رہ گئے۔ راسپوٹین کے والدین تو سخت سراسیمہ ہو گئے کہ اب نہ جانے ان پر کیا افتاد پڑے۔ پیٹر کو پورا گاؤں احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور راسپوٹین نے اس پر چوری کا الزام لگا دیا تھا۔ پیٹر غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

''میں ایسے .... ہزار گھوڑے خرید سکتا ہوں۔ مجھے چوری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس گھر میں اب مجھ پر یہ الزام بھی لگنے والا تھا۔''

اسے غصے میں دیکھ کر راسپوٹین کی ماں سامنے آ گئی۔

آپ ایک بیمار بچے کی باتوں کا کیوں اثر لیتے ہیں۔ اس کا تو دماغ چل گیا ہے۔ اول فول بکتا ہی رہتا ہے۔ ہم آپ سے معافی مانگتے ہیں۔ اُمید ہے آپ معاف کر دیں گے۔

دوسرے لوگوں نے بھی تائید کی اور سب نے مل کر پیٹر الیگزینڈر روچ سے معافی مانگی اور بڑی مشکل سے اس کا

غصہ ٹھنڈا کیا۔ معاملہ رفع دفع ہوا اور یہ مجلس برخاست ہوئی۔

سب لوگ اٹھ کر چلے گئے تھے۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی رات آدھی گزری تھی کہ گاؤں میں شور مچ گیا گھوڑے کا چور پکڑا گیا تھا۔ یہ چور کوئی اور نہیں وہی دولت مند اور محترم الیگزینڈر وچ تھا۔ راسپوٹین کی طرف سے الزام عائد کرنے کے بعد وہ سوچ رہا ہوگا کہ اس پر شک ہوگیا ہے۔ لہٰذا وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اس گھوڑے کو گاؤں سے باہر کہیں لے جانا چاہتا تھا کہ لوگوں کی نظروں میں آگیا۔ سب نے مل کر اسے اتنا مارا کہ ادھ موا کر دیا۔

صبح ہوتے ہی راسپوٹین کے گھر کے سامنے لوگ جمع ہوگئے اور راسپوٹین کے حق میں نعرے لگانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ ماورائی طاقتیں ہیں جو راسپوٹین کے ساتھ ہیں۔ اسے غیب کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ کچھ شیطانی طاقتیں تھیں جنھوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا اور اس پیش گوئی کے ذریعے اپنا اظہار بھی کر دیا تھا۔ آیندہ زندگی میں یہ طاقتیں اس سے بہت سے کام لینے والی تھیں اور دنیا کو حیران کرنے والی تھیں۔

اس دن کے بعد سے راسپوٹین کو عقیدت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ کوئی اسے ولی اللہ کہتا تھا کوئی اوتار کہتا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے گھرانے کی عزت بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ لوگ اس کی دعائیں لینے اور اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے اس کے پاس آنے لگے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ جس کے بارے میں جو کہہ دیتا وہی ہو جاتا۔

اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ بچنے کی اُمید نہیں تھی لیکن پھر ایسا ہوا کہ اس کی صحت تیزی سے بحال ہونے لگی۔ اس کے رخساروں کی سرخی لوٹ آئی۔ کانپتی ہوئی ٹانگوں میں جان آگئی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسے بھی اس کی غیبی طاقت کا کمال سمجھا گیا۔

طاقت بحال ہوتے ہی وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا اور ایسے شریر اور بدتمیز لڑکے کے روپ میں ظاہر ہوا جس سے جلد ہی پورا گاؤں تنگ آگیا۔ کسی کے کھیت میں گھس جاتا اور فصلیں برباد کر دیتا، کسی کے ذخیروں میں آگ لگا کر بھاگ جاتا، لڑکوں کے ساتھ کھیلتا تو انجام مار کٹائی ہوتا۔ گاؤں والوں کو اس سے اتنی عقیدت ہوگئی تھی کہ اس کی بدتمیزیاں برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے تھے کہ اس کے والدین سے شکایت کریں لیکن ان کے پاس بھی اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ ان سے بھی اسی بدتمیزی سے پیش آتا تھا۔

ان ہی بدتمیزیوں اور شرارتوں میں اس کا لڑکپن گزر گیا۔ اب وہ حدود بلوغت میں قدم رکھ رہا تھا۔ اب اس کی شرارتوں کا رخ کسی اور طرف مڑ گیا۔ دن بھر کھیتوں میں کام کرتا اور رات کو شراب پیتا، جوا کھیلتا اور لڑکیوں کا پیچھا کرتا۔ روس میں شراب پینے کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ روسیوں سے زیادہ شراب پی کر مدہوش ہونے والا شاید ہی کوئی ہو۔ روس میں ہر پارٹی شراب کے دور سے شروع ہوتی اور جنسی بہیمیت پر ختم ہوتی تھی۔ راسپوٹین اس شغل کا مکمل نمائندہ بن گیا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں جس لڑکی کا چاہتا ہاتھ پکڑ لیتا۔ کہیں اس کی حوصلہ افزائی ہوتی کہیں بری طرح لتاڑا جاتا۔ شراب پی کر مدہوش ہونے اور غل غپاڑا کرنے کی عادت کو تو برداشت کر لیا جاتا لیکن اس کی بوالہوسی نے گاؤں والوں کو بدظن کر دیا۔ لڑکیوں کی ماؤں نے اس کے گھر کے سامنے مظاہرہ کیا اور اس کی ماں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ باتیں واقعی ایسی شرمناک تھیں کہ اس کی ماں شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے پہلی مرتبہ راسپوٹین کی ایسی خبر لی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے سدھر گیا لیکن ذہین تھا کچھ دنوں کا وقفہ دینے کے بعد اس نے یہ حرکتیں پھر شروع کر دیں لیکن اب وہ ہوشیار ہوگیا تھا۔ اب اس نے چوری چھپے کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ کوئی دیکھ بھی لیتا تو لڑائی جھگڑے کے خوف سے نظرانداز کر دیتا۔

گاؤں کے باہر میدان میں میلہ لگا تھا۔ ایسی تفریحات تو اس کی جان تھیں۔ گاؤں میں میلہ لگے اور وہ نہ جائے یہ کیسے ہو سکتا تھا جب کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں کی ہر لڑکی میلہ دیکھنے ضرور جاتی ہے۔ اس نے بھی تھوڑی سی روسی واڈکا چڑھائی اور میلے میں پہنچ گیا اس کا مقصد خریداری نہیں، میلے میں آئی ہوئی لڑکیوں کا پیچھا کرنا اور ان سے چھیڑ چھاڑ کرنا تھا۔ جس دکان پر لڑکیوں کا جھرمٹ دیکھتا وہاں پہنچ جاتا۔ لڑکیاں اسے دیکھتے ہی دوسری دکان کا رخ کرتیں۔ وہ وہاں بھی موجود ہوتا۔ اپنے میلے دانت نکالتا اور لڑکیوں پر فقرے کسنے لگتا۔

دن بھر انھی بے ہودگیوں میں گزار کر واپس آگیا۔
دوسرے دن وہ پھر میلے میں پہنچ گیا۔ یہ شغل جاری

تھا کہ اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی اور پہلی ہی نظر میں اس کے دل میں وہ جذبہ جاگا جس سے وہ کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ نہایت حسین لڑکی تھی اور اکیلی تھی۔ کوئی لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس کی عقابی نظریں ہر لڑکی کے گرد چکر کاٹ چکی تھیں لیکن اس لڑکی کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

"اے سیاہ آنکھوں والی حسین لڑکی، تم حسن میں سب سے الگ ہو اس لیے اکیلی ہو۔"

"مجھے اکیلی دیکھ کر ہی تم نے میرے قریب آنے کی جرأت کی ہے۔"

"تم سب کے ساتھ بھی ہوتیں تو میں تمہیں اکیلا کر لیتا۔"

"واہ جی، بڑا ناز ہے خود پر۔"

"تمہارے حسن نے مجھے بے خوف کر دیا ہے۔"

"یہ بے خوفی اپنے پاس رکھو اور یہاں سے چلتے بنو۔ میرے گھر والے بھی پہنچنے والے ہی ہوں گے۔ تمہاری درگت بنا دیں گے۔"

"مجھے تمہاری خاطر مرنا بھی قبول ہے کیونکہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں، پہلی نظر کی محبت۔ میں تم سے شادی کروں گا۔"

"صورت دیکھی ہے اپنی۔ شراب کی بدبو تمہارے منہ سے آرہی ہے۔ یہ تو چھن ہیں تمہارے۔"

"یہاں کون ہے جو شراب نہیں پیتا۔ تم سے شادی کے بعد یہ بھی چھوڑ دوں گا۔"

"بڑی خوش فہمی ہے اپنے بارے میں، میں کیوں تم سے شادی کرنے لگی۔" اس لڑکی نے کہا اور بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اسی وقت کچھ اور لڑکیاں بھی اس کے ساتھ آکر شامل ہو گئیں۔ راسپوٹین جہاں تھا وہیں رک گیا لیکن وہ اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ جہاں جاتی تھی راسپوٹین کی نگاہیں اس کے تعاقب میں ہوتی تھیں۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ لڑکی میلے سے باہر نکل رہی ہے لیکن اب وہ اکیلی نہیں ہے چند لڑکیاں اس کے ساتھ ہیں۔ اگر چھیڑ چھاڑ ہی مقصد ہوتا تو وہ لڑکیوں کی موجودگی کی پروا بھی نہ کرتا، وہ تو اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے رسوا نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا تاکہ اس کا گھر دیکھ سکے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس سے شادی کرنے کے لیے بات آگے بڑھائے گا۔

وہ چلتا رہا یہاں تک کہ اس لڑکی کا گھر آگیا۔ راسپوٹین گھر دیکھ کر واپس آگیا۔

عشق تو وہ خود کر سکتا تھا لیکن شادی کے لیے ماں سے بات کرنی تھی۔ اس نے بھی جی کڑا کر کے ماں سے بات کی۔ لڑکی کا اتا پتا بتایا اور ماں کو مجبور کیا کہ وہ اس لڑکی کے گھر جائے۔

"تمہاری آوارگی سے پورا گاؤں واقف ہے۔ کون ہے جو تمہیں اپنی بیٹی دے۔"

"آپ جائیں تو سہی، زیادہ سے زیادہ وہ منع کر دیں گے۔"

"اسے میں اپنی توہین سمجھوں گی۔"

"یہ آپ کی نہیں ان کی توہین ہو گی۔ آپ جا کر تو دیکھیں وہ کبھی انکار نہیں کریں گے۔"

اس کی ماں ہرگز تیار نہیں ہو رہی تھی کہ اس کا رشتہ لے کر جائے لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنی ہے پھر یہاں ہی سہی۔ اسے یہ بھی امید ہوئی کہ شاید شادی کے بعد راہِ راست پر آجائے۔ وہ اس کا رشتہ لے کر اس لڑکی کے گھر چلی گئی لیکن اس کی توقع کے عین مطابق ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ اس کی ماں صرف یہ معلومات لے کر آسکی کہ لڑکی کا نام اسکودیا فیڈرونا ہے۔

لڑکی والوں کو راسپوٹین کی آوارگی پر اعتراض تھا۔

راسپوٹین اس اعتراض کو سن کر خود اپنی سسرال پہنچ گیا۔ ان لوگوں سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو سدھار لے گا اور شادی کے بعد ان تمام بری عادتوں سے توبہ کر لے گا جو اس میں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان لوگوں نے بھی سوچا شادی سے پہلے سب لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی ہو جائے گی تو راسپوٹین بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد اسکودیا فیڈرونا سے اس کی شادی ہو گئی۔

شادی کی پہلی رات ہی اسکودیا فیڈرونا کو اندازہ ہو گیا کہ راسپوٹین کے اندر ایک شیطان چھپا ہوا ہے۔ یہ اگر پوری شدت سے کسی وقت ظاہر ہو گیا تو مذہبی پاکیزگی کو بہا کر لے جائے گا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بے ربط باتیں کرتا ہے جو اس دنیا کی معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

"میں ایک ایسی زندگی کا تصور کر رہا ہوں جو نہایت

حسین و جمیل ہے اور ان مخفی طاقتوں کو منظر عام پر لا سکتی ہے جن کے دھندلے نشانات میری باتوں اور میرے کاموں میں نظر آتے ہیں۔"

فیڈرونا کو اب بھی اُمید تھی کہ وہ پیار محبت سے اسے راہ راست پر لے آئے گی لیکن اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ راسپوٹین کچھ دن تو اپنی حرکتوں سے رکا رہا لیکن پھر آوارہ مزاجی اور عیاشی کی طرف راغب ہو گیا۔ ہر وقت نشے میں مدہوش رہتا اور لڑکیوں کا پیچھا کرتا رہتا۔ ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں تھی جو اس کی طرح عیاش طبع تھیں۔ راسپوٹین اب اتنا بے باک ہو گیا کہ بیوی کی موجودگی میں ان لڑکیوں کو گھر لے آتا۔ بیوی کے سامنے ہی بے حیائی کے وہ کھیل کھیلتا کہ وہ آنکھیں بند کر لیتی۔ اب فیڈرونا کو یقین ہونے لگا تھا کہ راسپوٹین پر شیطانی قوتوں کا پوری طرح غلبہ ہو چکا ہے۔ اب اسے کوئی سیدھا راستہ نہیں دکھا سکتا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ راسپوٹین کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلی جائے گی لیکن جلد ہی اس کے پیروں میں زنجیر پڑ گئی۔ اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا وہ اس بچی کو لے کر کہاں جاتی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نصیحت کا راستہ اپنایا۔

"دیکھو راسپوٹین اب تم ایک لڑکی کے باپ بن گئے ہو۔"

"میں کیا سب ہی بن جاتے ہیں۔"

"میری بات پوری توجہ سے سنو۔ میں یہ کہنے والی ہوں کہ اب تمہیں زیادہ ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اب مجھے زیادہ کمانا چاہیے۔"

"یہ بھی ہے اور یہ بھی کہ اب تم آوارگی کے راستے سے لوٹ آؤ۔ بیٹی گھر میں ہے اس پر کیا اثر پڑے گا۔"

"اچھا ہے یہ بہت جلد زندگی کی حقیقت کو سمجھ جائے گی۔ اسے میں خود بتا دوں گا کہ گناہ کے بغیر نیکی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گناہ نہیں کرو گے تو نیکی کی اہمیت کیسے معلوم ہوگی۔"

اس کا یہ عجیب و غریب فلسفہ سن کر فیڈرونا دنگ رہ گئی تھی۔ کیا یہ شخص میری بیٹی کو بھی گناہ کے راستے پر چلائے گا؟ اس نے ایک مرتبہ پھر فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔

اب لوگ اسے بتا رہے تھے کہ راسپوٹین گاؤں کے ویران علاقوں میں اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی دریائے تورا کے کنارے ساکت بیٹھا خلا میں گھورتا رہتا ہے۔ فیڈرونا خود بھی دیکھ رہی تھی کہ اب وہ گھر پر بہت کم رہتا ہے۔

ایک دن وہ باہر سے گھوم پھر کر آیا تو اس نے فیڈرونا کو بتایا۔

"میں نے دریا کے کنارے ہزاروں فرشتوں اور حوروں کو نہایت سریلی اور میٹھی آواز میں وہی گانا گاتے ہوئے سنا ہے جو گاؤں کی لڑکیاں مل کر گاتی ہیں۔"

"بعض لوگ جاگتے میں بھی خواب دیکھتے ہیں۔" فیڈرونا نے کہا۔ "تم نے بھی ایسا ہی کوئی خواب دیکھا ہو گا۔" میڈرونا نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

ایک روز راسپوٹین نے عجیب بات کہی۔

"مجھے ہدایت ملی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر صحراؤں اور جنگلوں میں نکل جاؤں اور سچائی کی تلاش کروں۔"

"تم نے ہدایت دینے والے سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہاری بیوی اور بیٹی کا کیا ہوگا۔"

"میری کیا مجال کہ میں اس سے کچھ پوچھتا لیکن میں نے اس سیاحت کے لیے ایک اور راستہ ڈھونڈا ہے۔ اس سے میری آمدنی میں بھی اضافہ ہو جائے گا اور سچائی تلاش کرنے میں بھی مدد ملے گی۔"

"ایسا کون سا راستہ ہے۔"

"میں وہی پیشہ اختیار کروں گا جو میرے باپ نے اختیار کیا تھا۔ گھوڑا گاڑی پر مسافروں کو دور دراز کے علاقوں میں لے جانے کا کام۔"

فیڈرونا خوش ہو گئی کہ اس طرح آمدنی بھی بڑھے گی اور راسپوٹین کو گاؤں کے آوارہ دوستوں سے بھی نجات مل جائے گی۔

فیڈرونا نے ایک مرتبہ پھر راسپوٹین کو چھوڑ کر اپنے گھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

راسپوٹین نے گھوڑا گاڑی پر مسافروں کو دور دراز کے علاقوں میں لے جانے کا کام شروع کر دیا۔ اس کی گھوڑا گاڑی پر اکثر سیاح اور مذہبی مبلغ بھی سفر کرتے تھے جن سے وہ خدا اور کلیسا کے موضوع پر ایسے دلائل کے ساتھ بحث کرتا کہ بڑے بڑے مبلغ دم بخود رہ جاتے۔

ایک روز وہ ایسی ہی کسی بحث میں مصروف تھا کہ ایک مسافر اس کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا اور اس کی باتوں کو

غور سے سننے لگا۔ وہ مسافر اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اتنے لوگوں کی موجودگی میں کچھ کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ اس سے صرف اتنا کہہ سکا کہ جب وہ اپنے گھوڑوں کو آرام دینے کے لیے کسی سرائے میں اترے یا راستے میں کسی جگہ رکے تو وہ اس سے ضرور ملے۔ اتفاق سے یہ سفر دور دراز کا تھا۔ راسپوٹین کو کئی جگہ رکنا تھا۔ وہ ایک جگہ رکا تو اس نے اس مسافر سے ملاقات کی۔

''آپ کے مذہبی شعور کو دیکھتے ہوئے میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔'' مسافر نے کہا۔

''فرمائیے۔''

''آپ کا رجحان مذہب کی طرف ہے۔ علوم الٰہیہ سے متعلق حیرت انگیز واقفیت بھی رکھتے ہیں۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ کسی مذہبی درس گاہ میں داخلہ لے لیں۔''

''میں تو ایک بے پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ درسگاہ کیا ہوتی ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ کس درسگاہ میں داخلہ لوں اور مجھے اس کا فائدہ کیا ہوگا؟''

''میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ''درخوتور کی درسگاہ'' میں داخلہ لیں۔ یہ درس گاہ آپ کے خیالات سے بہت قریب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں آپ کی بہت پذیرائی ہوگی اور آپ روحانی طور پر بہت ترقی کریں گے۔''

''مجھے اس درس گاہ کے بارے میں کچھ بتائیے تو سہی۔ میں دیکھوں تو سہی کہ یہ درس گاہ میرے معیار کی ہے بھی یا نہیں۔''

''ارے آپ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟ یہ سائبیریا کی سب سے مشہور درسگاہ ہے۔ یہ خانقاہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ عبادت گاہ بھی ہے اور اس کے طول و عرض میں کھیت بھی پھیلے ہوئے ہیں جن میں روحانی فیض حاصل کرنے والے خود کاشت کر کے گزر اوقات کرتے ہیں۔ اس خانقاہ کے پیروکاروں کو فلسطی یا خلاکستی کہا جاتا ہے۔ اس درس گاہ میں الوہیت کی تعلیم کے علاوہ عیسائیت کے عام تصور سے مختلف فلسفے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کوئی شخص جتنا بھی گناہ گار کیوں نہ ہو خلاکستی فرقے کے مخصوص ضابطوں کو اپنانے کے بعد دنیا میں جنت پالیتا ہے۔''

''یہ مخصوص ضابطے کیا ہیں؟''

''یہ تو تمہیں وہاں داخل ہونے کے بعد ہی معلوم ہوگا کیونکہ ان ضابطوں کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ حکم ہے کہ ان

قوانین کو کسی پر ظاہر نہ کیا جائے نہ اپنے والدین پر نہ اولاد پر۔"

راسپوٹین کو مسافر کی باتیں کسی دلچسپ داستان کی طرح معلوم ہوئیں اور وہ اس خانقاہ میں جانے کے لیے بے چین ہو گیا تاکہ خفیہ رازوں سے آشنا ہو سکے۔

اس نے اس سفر سے واپس آتے ہی اس خانقاہ میں داخلہ لے لیا۔

اس درسگاہ میں جو "فرقہ" پرورش پا رہا تھا اس کا بانی ڈینسلا فلیچ تھا جس نے عیسائیت کا پیروکار ہونے کے باوجود بائبل اور دوسری تمام مذہبی کتابوں کو بے کار قرار دیتے ہوئے دریائے وولگا میں بہا دیا تھا۔ اس فرقے کے لوگوں کا ایک مقبول عقیدہ تھا کہ خدا سے جسمانی رابطہ رکھنے اور جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے انسان کا پُراسرار موت سے ہم کنار ہونا لازمی ہے۔ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے اور جب وہ گناہ میں ڈوب جاتا ہے تو وہ پُراسرار موت سے ہم کنار ہو کر حیاتِ نو حاصل کرتا ہے۔ اس حیات نو کے بعد اسے کرامات دکھانے، بیماروں کو شفا دینے، مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے، مُردوں کو زندہ کرنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ گناہ گاروں کو جنت میں داخل کر سکتا ہے اور یومِ حشر میں جزا و سزا اس کے مشورے سے ملتی ہے۔

ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد خدا لاتعداد مرتبہ روس کی مقدس سرزمین پر آیا اور دیہاتیوں کے روپ میں پھرتا رہا۔ ڈینسلا فلیچ (فرقے کا بانی) کے جسم میں داخل ہو کر لوگوں میں پھرتا رہا اور لوگوں کو نجات دلائی۔ اس کے بعد ایک گونگے کسان کے جسم میں داخل ہوا۔ پھر فوج کے ایک معمولی سپاہی کے جسم میں داخل ہوا۔ اس کے بعد راڈیوف کے جسم میں خدا کا ظہور ہوا اور وہ عظیم پیغمبر بنا (نعوذ باللہ)۔ کلیسا کی دنیا اسے گناہ کا عادی اور عورتوں کا رسیا قرار دیتی تھی لیکن اس کے پیروکار دیہاتیوں کے نزدیک وہ انسان کے بھیس میں خدا تھا۔ زار روس کے مصاحبوں نے جب اسے تائب ہونے کو کہا تو اس نے جواب دیا۔ میرے جسم میں مقدس روح کام کر رہی ہے۔ اس نے مجھے یہ کام کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ میرے اعمال خدا کی مرضی کے تابع ہیں لہٰذا تائب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"میں نے ان عورتوں کو جنہوں نے اپنی آبرو مجھ پر قربان کردی، گناہ کے ذریعے حقیر و خوار کر دیا ہے تاکہ وہ اپنی پاک دامنی پر گھمنڈ کر کے خدا کی رحمت سے محروم نہ رہیں۔"

دنیا میں بہت سے لوگوں نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ شخص بھی انہی میں سے ایک تھا۔ اب راسپوٹین بھی اسی راستے پر چلنے کے لیے تیار تھا۔ وہ اس خانقاہ میں داخل ہوا تو گویا آدھا سفر پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ یہاں کی تعلیمات سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ بس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کی ایک بیوی اور ایک بیٹی بھی تھی۔

جب وہ یہاں کی زبانی تعلیمات سے واقف ہو چکا اور ان پر ایمان لے آیا تو اسے دوسرے پیروکاروں کے ساتھ حکم ہوا کہ اسے "خفیہ مسکن" کی طرف جانا ہے۔ ان خفیہ مسکنوں کے متعلق مشہور تھا کہ یہاں کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ مسکن عام جھونپڑیوں کی شکل کے ہوتے تھے۔ ہر ہفتہ کی شام کو قابل اعتبار مرد و زن خاموشی سے ان عبادت خانوں میں جمع ہوتے تھے۔

راسپوٹین ایسی ہی ایک جھونپڑی میں داخل ہوا تو وہاں ایک سادہ سی میز اور دو پرانی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ مرد دائیں جانب اور عورتیں بائیں جانب بینچوں پر بیٹھ گئے۔ صدر مجلس کی اجازت سے پہلے گانا گایا گیا جس میں عقیدت کی خاطر موت کو گلے لگانے کا عہد کیا گیا تھا۔ پھر تمام مرد و زن نے اپنے اپنے کپڑے اتارے اور لٹھے کی ایک ایک قمیص سب نے پہن لی۔ میز پر رکھی بارہ موم بتیوں کو جلا دیا گیا اور ان موم بتیوں کے گرد رقص کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس دائرہ نما رقص میں اتنی تیزی آ گئی کہ ہر شے گھومتی نظر آ رہی تھی۔ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق یہی وہ وقت ہوتا تھا جب خداوند ان کے درمیان آ کر گناہوں کی بخشش کا اعلان کرتا تھا۔ یہ رقص جب اپنے عروج کو پہنچا تو سب اپنے کپڑوں سے بے نیاز ہو گئے۔ رقص اب بھی جاری تھا۔ اس کے بعد روشنی گل کر دی گئی۔ رقص تھم گیا "گناہ" کا رقص شروع ہو گیا۔

راسپوٹین گناہ کے اس کھیل میں ایسا مدہوش ہوا کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد اگلے ہفتے کا انتظار کرنے لگا وہ جیسی زندگی گزارتا رہا تھا یہ چند لمحے اس زندگی کی عملی تفسیر تھے۔

''خفیہ مسکن'' میں چند ہفتوں کے جانے کے بعد وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس کی دلچسپی یقین میں بدل گئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ گناہ کے ذریعے انسان ازسرنو زندگی حاصل کرتا ہے۔ دنیاوی رسوم کے تمام بندھنوں سے آزاد ہونا ہی عبادت کا صحیح مفہوم ہے۔ وہ عیسائی تھا لیکن اس درس گاہ کی تعلیمات نے اسے عیسائیت کی تعلیم سے باغی کردیا۔ کلیسا اور اس کے مقلد پادری اسے بھٹکے ہوئے لوگ نظر آنے لگے۔ اس کے ذہن و دل نے قبول کرلیا کہ اس فرقے کا بانی پیغمبر تھا اور اس پر وحی نازل ہوتی تھی۔

اس نے درخوتور کی خانقاہ کے تہہ خانوں میں کئی سال گزارنے کے بعد بے انتہا قوت ارادی پیدا کرلی۔ اب وہ بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کے لیے تیار تھا۔

کئی سال بعد جب وہ اس درس گاہ کی تعلیم مکمل کرچکا تو وہ عجیب موڑ پر کھڑا تھا۔ سوچ رہا تھا بیوی بچوں کے پاس چلا جائے یا دنیا کو ترک کرکے جنگلوں میں نکل جائے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا پھر اس کے دل میں ایک روشنی سی چمکی۔ مجھے ''ماکاری'' کے پاس جانا چاہیے۔ ماکاری ایک بوڑھا راہب تھا جس نے دنیا ترک کردی تھی اور درخوتور کی خانقاہ سے دور جنگل کے ایک تاریک کونے میں ایک جھونپڑی بنا کر رہتا تھا۔ اس کے جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ قبر نما جھونپڑی میں بھوکا پیاسا رہتا تھا۔ مصیبت زدہ لوگ دل کی مرادیں پانے کے لیے اس کی کٹیا کا رخ کرتے تھے۔ راسپوٹین بھی اس کی شہرت سن چکا تھا لہٰذا وہ عقیدت کے نذرانے لے کر اس کے حضور پہنچ گیا۔

راسپوٹین اسے دیکھتے ہی اس کے قدموں میں گر پڑا۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور آیندہ زندگی کے لیے ہدایت طلب کی۔ اس بوڑھے نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

''خوشی مناؤ میرے بیٹے، ہزارہا انسانوں میں سے خدا نے تم کو منتخب کیا ہے۔ بڑے بڑے کام تمہارا انتظار کررہے ہیں۔ چھوڑ دو اپنی بیوی کو۔ چھوڑ دو اپنے گھوڑوں کو۔ اپنے آپ کو روپوش کرلو۔ جاؤ سیلانی بن جاؤ۔ سرزمین روس تم سے ہم کلام ہوگی۔ اس کے الفاظ کے معنی سمجھنا سیکھو پھر دنیا کی طرف لوٹ آؤ۔''

ماکاری نے کھلے لفظوں میں راسپوٹین کو ترک دنیا کی تلقین کر دی تھی۔ اس نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ سیلانی بنے گا گھر لوٹ کر نہیں جائے گا۔

روس میں ''سیلانی'' کی اصطلاح ان خدا رسیدہ لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی جو دنیا کے تمام رشتوں سے منہ موڑ کر گمنامی کی زندگی گزارتے تھے۔ ان سیلانیوں کا کلیسا کے پادریوں سے بڑھ کر احترام کیا جاتا تھا۔ انہیں نذر و نیاز پیش کی جاتی تھی اور دعائیں منگوائی جاتی تھیں۔ یہ سیلانی کسی بھی گھر میں کچھ دنوں کے لیے قیام کر لیتے تھے اور پھر آگے بڑھ جاتے تھے۔

راسپوٹین کئی سال تک کشکول ہاتھ میں پکڑے اور روٹیوں کا تھیلا گلے میں لٹکائے گاؤں گاؤں پھرتا رہا۔

اس کی ماں اس کی جدائی میں نیم پاگل ہو گئی اور بالآخر بیٹے کی جدائی کی تاب نہ لاتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کی بیوی پر بھی اس کی جدائی کا بہت برا اثر پڑا تھا۔ ہر آنے جانے والے سے اس کا پتا پوچھتی تھی۔ لوگ اس کے مجازی خدا کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سناتے تھے۔ کچھ لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے اسے فلاں مقام پر دیکھا ہے۔ فیڈرونا کچھ دیر کے لیے خوش ہو جاتی تھی کہ اس کا شوہر اس کے پاس نہیں لیکن زندہ تو ہے۔ یہ اُمید تو تھی کہ کسی دن لوٹ کر آجائے گا۔

کئی سال اور گزر گئے۔ لوگوں کی زبانوں پر ایک ولی کی کرامات کا چرچا تھا۔ سیلانیوں کا کوئی نام تو ہوتا نہیں تھا۔ بس وہ اسے ولی اللہ کہتے تھے۔ اس کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے ایسے ولی کو دیکھنا بھی عبادت سمجھا جاتا تھا لہٰذا بیشتر لوگ ایسی کہانیاں سناتے تھے جس سے ظاہر ہو کہ وہ اس سے مل چکے ہیں یا اسے دیکھا ہے۔ اس علاقے میں بھی ایسی کہانیاں مشہور ہو رہی تھیں۔

''بھائی وہ سیلانی اچانک کسانوں پر ظاہر ہو گیا۔ دن بھر ان کے ساتھ کام کیا اور شام کو ان کے سامنے گناہ کے ذریعے نجات کے عقیدے کی شرح بیان کرتا رہا۔ دن بھر کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون ہے لیکن جب شام ہوئی اور اس نے زبان کھولی تو معلوم ہوا کہ وہ کون ہے۔''

''اسے عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ جنگل میں درختوں کی شاخوں کو صلیبیں بنا کر ان کے سامنے دعائیں مانگتے دیکھا گیا ہے۔''

''وہ آگ کا الاؤ تیار کر کے اس کے گرد لڑکیوں کے ساتھ رقص کرتا اور عجیب عجیب آوازوں کے ساتھ چلاتا ہے کہ اپنے غرور کو گناہ سے نیست و نابود کر دو۔ اپنے جسم کا امتحان لو۔''

''وہ اپنی مداح عورتوں کے ساتھ جوہڑوں اور تالابوں میں مادر زاد برہنہ کھڑا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس کے غلیظ بدن سے میل اتارتی ہیں۔''

کوئی اور جانے نہ جانے لیکن فیڈرونا جانتی تھی کہ وہ کوئی اور نہیں اس کا شوہر راسپوٹین ہے۔ وہ سمجھ ضرور گئی تھی لیکن ابھی تک اسے دیکھنے سے محروم تھی۔ وہ اس کی شہرت سن کر اسے دیکھنے کے لیے پہنچتی لیکن اسے معلوم ہوتا کہ وہ آج ہی کہیں چلا گیا ہے۔ کہاں گیا معلوم نہیں۔

اسی دوران راسپوٹین کی پیش گوئیوں کے سچ ہونے اور اس کی بددعاؤں کا چرچا ہوا۔ مشہور ہوا کہ اس نے ایک شخص کے جسم سے بدروح کو مار بھگایا ہے۔ پھر اس کی اس بددعا کا بڑا چرچا ہوا جو اس نے لوگوں کی بدتمیزی پر تین ماہ تک بارش نہ ہونے سے متعلق کی تھی جو پوری ہوئی۔ واقعی تین ماہ تک بادل کا ایک ٹکڑا بھی آسمان پر نظر نہ آیا۔

فیڈرونا ان کہانیوں کو بھی سن رہی تھی اور دل ہی دل میں فخر آمیز خوشی محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک ایسی قابلِ احترام ہستی کی بیوی ہے۔ اسے یہ دکھ ضرور تھا کہ سنانے والے کہانیاں ضرور سناتے ہیں لیکن کوئی اس کے ٹھکانے سے واقف نہیں جس کے ساتھ جا کر وہ اس سے مل آئے۔ اسے یہ بھی غصہ تھا کہ راسپوٹین خود اس سے ملنے کیوں نہیں آتا۔

وہ اس رات اپنے شوہر کو یاد کر کے بہت روئی تھی۔ بستر پر لیٹ کر بھی بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ اس نے اس دستک کو غور سے سنا۔ اس دستک کی آواز اسے جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ دستک پھر ہوئی۔ کئی برس پہلے بھی دروازے پر یہی دستک ہوا کرتی تھی۔ ''راسپوٹین!'' وہ زور سے چلائی اور دروازے پر پہنچ گئی۔ سامنے ایک شخص کھڑا تھا۔ شاید راسپوٹین، شاید کوئی اجنبی۔ وہ اسے پہلی نظر میں پہچان نہیں سکی تھی۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال چکناہٹ سے جڑ چکے تھے۔ اس کا چہرہ زرد اور اندر کو دھنسا ہوا تھا۔

اتنی دیر میں اس کا بوڑھا باپ بھی دروازے پر آ گیا تھا۔ وہ اسے پہچان ضرور گیا تھا لیکن اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس چہرے میں اپنے بیٹے کا چہرہ تلاش کر رہی تھیں۔ راسپوٹین کا سپاٹ چہرہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ کسی کو نہیں جانتا۔ جیسے وہ کسی رشتے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔

''راسپوٹین!'' فیڈرونا چلائی۔ ''یہ تم ہی ہو راسپوٹین اگر تم ہی ہو تو اندر کیوں نہیں آتے۔ میں کب سے تمہاری راہ تک رہی تھی۔ تمہارے دونوں بچے اب بڑے ہو گئے ہیں۔ کیا انہیں نہیں دیکھو گے۔ کیا باہر ہی سے چلے جاؤ گے۔ اندر کیوں نہیں آتے۔''

راسپوٹین کے چہرے پر اب بھی شناسائی کی کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے پادریوں کے انداز میں دعا دی اور تہہ خانے کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ یہ سیلانی لوگ جب بھی کسی گھر میں جاتے تھے لوگ ان کے لیے تہہ خانے کا دروازہ کھول دیتے تھے پھر وہ جب تک چاہتے وہاں قیام کرتے تھے۔

فیڈرونا نے تہہ خانے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ تہہ خانے میں اترا اور اس نیم تاریک کمرے میں ننگے بدن عبادت میں مشغول ہو گیا۔

فیڈرونا کا شوہر گھر آیا تھا۔ برسوں بعد اس نے خود کو سنوارا اور اپنا جائزہ لینے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آج وہی چمک تھی جسے دیکھ کر راسپوٹین اس پر مر مٹا تھا۔

دن گزر گیا مگر تہہ خانے کا دروازہ نہیں کھلا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ رات ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ راسپوٹین رات میں اس کے پاس ضرور آئے گا۔ کبھی چارپائی پر لیٹتی تھی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ جب وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو حال معلوم کرنے کے لیے تہہ خانے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ راسپوٹین بڑی تکلیف دہ حالت میں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہے اور اس کا چہرہ زمین کو چھو رہا ہے۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا اور پورے کمرے میں دہشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اسے آواز دیتی۔ الٹے قدموں لوٹ آئی۔

صبح ہوتے ہی لوگ اس کے گھر جمع ہونے لگے۔ اس کی عبادت و ریاضت کی دھوم مچ گئی تھی۔ سب سے پہلے مقامی گرجا گھر کا ایک رکن اندر گیا اور واپس آ کر لوگوں کو یقین دلایا کہ راسپوٹین نے واقعی نیا جنم لیا ہے اور وہ اپنا ماضی بالکل بھول چکا ہے۔ پھر کئی اور لوگ اندر گئے اور انہوں نے بھی تصدیق کی۔ اس کے بعد تو اس کے گھر لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

اس کی شہرت کلیسا تک پہنچی تو پادری نے گناہ کے راستے نجات ڈھونڈنے کی سخت مخالفت کی اور راسپوٹین کو جادوگر اور ابلیس کا نمائندہ کہنا شروع کر دیا۔ اس مخالفت کے باوجود کوئی کلیسا آنے کو تیار نہیں تھا۔ مریم کے مجسمے کے آگے ہر روز گڑگڑا کر دعا مانگنے والے یہ لوگ ایک بدطینت اور گمراہ شخص کے دیدار کے لیے اس کے گھر پہنچے ہوئے تھے۔ جب گرجا کی گھنٹیاں بار بار بجانے کے باوجود کوئی کلیسا میں نہیں پہنچا تو پادری غضب میں بھرا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا اور وہاں جمع ہونے والوں سے خطاب کیا۔

''اے لاعلم لوگو! اس شخص کے قریب بھی مت آؤ۔ یہ شعبدہ باز ہے۔ جو لوگ خود ہی ریاضت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں شیطان ان کا رہنما بن جاتا ہے۔ وہ انہیں نورانی شکلوں میں انواع و اقسام کے سبز باغ دکھاتا ہے اور انہیں مسیح دوراں قرار دیتے ہوئے حلال و حرام کی پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ ایسے لوگ شیطان کے قرب کو خدا کا جمال سمجھتے ہیں اور ہم کلامی پر فخر کرتے ہیں۔ تم جیسے بے وقوف لوگ اسے مقدس سمجھ کر اس پر دیوانہ وار گرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں۔ تمہارے سامنے میں ابھی اس کا پردہ چاک کرتا ہوں۔''

پادری یہ کہتے ہوئے تہہ خانے میں اتر گیا۔ لوگ دم بخود تہہ خانے کے باہر کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ دیکھئے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اچانک انہوں نے پادری کی زوردار چیخیں سنیں اور اسے نیم جان قدموں سے تہہ خانے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے تہہ خانے میں یقیناً کوئی ایسا خوف ناک منظر دیکھا تھا کہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے کیا دیکھا کسی کو کچھ بتانے سے قاصر تھا۔

اپنی اس شکست کے بعد پادری نے گورنمنٹ کو لکھا کہ راسپوٹین نہ صرف ''خلاکسٹی'' فرقے سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس کا جرم یہ بھی ہے کہ وہ اس فرقے کے گمراہ کن نظریات کا کھلے بندوں پرچار کر کے عیسائیت کی نفی کر رہا ہے اور لوگوں کو عیسائیت کے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ لوگوں

نے کلیسا میں آنا بند کر دیا ہے لہٰذا اس کے خلاف فوری کارروائی کی جائے۔

حکومت نے فوری ایکشن لیا اور ایک کمیشن راسپوٹین کے گاؤں بھیجا کہ وہ تحقیق کر کے رپورٹ مرتب کرے۔ یہ کمیشن آیا اور لوگوں کے بیانات قلم بند کیے۔ ہر شخص نے راسپوٹین کی پاکیزگی کی گواہی دی۔ آخر میں کمیشن کے سربراہ نے راسپوٹین کو طلب کیا۔ سربراہ کی درخواست پر پولیس کا ایک سپاہی تہہ خانے کے اندر گیا تاکہ راسپوٹین کو بلا کر لائے۔ اس وقت راسپوٹین عبادت میں مشغول تھا۔ سپاہی پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ بھی اس کی دعاؤں میں شامل ہو گیا اور فرطِ عقیدت سے راسپوٹین کے ہاتھ چومنے لگا۔ وہ سپاہی باہر آیا تو بالکل بدل چکا تھا۔

''راسپوٹین پر لگائے گئے تمام الزامات بے بنیاد ہیں۔ میں اس خدا رسیدہ بزرگ کو یہاں لانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

یہ کمیشن ناکام واپس ہو گیا۔

راسپوٹین تین دن کی چلہ کشی کے بعد باہر آیا اور لوگوں سے خطاب کیا۔ ''میں تمہیں مسرت بخش پیغام دینا چاہتا ہوں اور وہ ہے گناہ کے ذریعے نجات کا راستہ۔ گناہوں میں سرتاپا غرق ہو جاؤ یہاں تک کہ گناہ خود ہار مان جائے۔ اس کے بعد جنت تمہارے قدموں میں ہو گی۔''

اس خطاب کے بعد وہ دریائے تورا کی جانب نکل گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ کہاں چلا گیا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اسے لوگوں نے اس وقت دریافت کیا جب وہ علوم الٰہیہ کی اکیڈمی میں طلبہ کے دقیق اور پےچیدہ سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ یہ لیکچر ''تثلیث'' کے پےچیدہ مسئلے پر تھا۔ اس کے سیدھے سادے استدلال نے طلبہ کو حیرت میں ڈال دیا۔ جب وہ لیکچر دے چکا تو اکیڈمی کے ڈائریکٹر فیوفان نے گناہ کے بارے میں راسپوٹین کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے پوچھا۔

''تم گناہ کو ناگزیر سمجھتے ہو جب کہ مسیح (علیہ السلام) اور قدیم کلیسا کے تمام مقلدین اسے ابلیس کا مشغلہ قرار دیتے ہیں۔ یہ تضاد کیوں ہے۔''

سوال سخت تھا لیکن راسپوٹین نے نرمی سے جواب دیا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ انسانیت کے محسن اور ہمارے مقدس بزرگوں نے گناہ کی تکذیب کی ہے کیونکہ یہ شیطانی فعل ہے لیکن مکمل تائب ہوئے بغیر گناہ کے تصور کو ذہن سے نہیں نکالا جا سکتا اور تائب ہونے کے لیے گناہ کا ارتکاب ضروری ہے۔ تم اتنے گناہ کرو کہ تمہیں اس پر پچھتانا پڑے۔ یہ پشیمانی اور توبہ ہی تمہیں گناہوں سے پاک کر سکتی ہے۔''

فیوفان اس کے خیالات سے متفق نہیں ہو سکا تھا لیکن اس نے راسپوٹین کی ذات میں ایک اور شعلہ چمکتا ہوا دیکھ لیا اور اسے راضی کر لیا کہ وہ لارڈ بشپ ہرموگن سے ملاقات کرے۔

لارڈ بشپ ہرموگن ایک جہاندیدہ انسان تھا۔ اس نے راسپوٹین سے ملاقات کے دوران محسوس کیا کہ وہ کوئی معمولی شخص نہیں۔ اس میں بلا کی قوت تسخیر ہے۔ اس کی مدد سے روسی سیاست میں مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف کلیسا کی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ اس نے راسپوٹین کی خوب تعریف کی اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس سے زارسٹن کے سیاسی پادری ایلورڈ سے ملاقات کا وعدہ لے لیا۔

ہرموگن نے تجویز پیش کی تھی کہ راسپوٹین کو اپنے حق میں سیاسی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ ایلیوورڈ نے راسپوٹین سے ملاقات کے بعد اس تجویز کو قبول کر لیا اور یہ تجویز ٹرورشین پیوپل پارٹی کی مرکزی قیادت کے سامنے رکھ دی جہاں اسے منظور کر لیا گیا۔ روس کی زار حکومت اس وقت بڑی مشکل میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف انقلابی طاقتیں روس میں حکومت کو ہر طرح سے پریشان کرنے کی کوشش کر رہی تھیں تو دوسری طرف عالمی انقلابی تحریک کے پیچھے کام کرنے والی خفیہ طاقتیں برطانیہ، سوئٹزرلینڈ اور امریکا میں اس بات کی کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح برطانیہ کو روس کے ساتھ جنگ میں ملوث کر دیا جائے۔ ان انقلابیوں سے نمٹنے کے لیے ٹرورشین پیوپل پارٹی سامنے آئی تھی اور چاہتی تھی کہ راسپوٹین اس میں شامل ہو جائے۔ اس وقت ملک کے دیہاتوں میں بسنے والے کروڑوں افراد کی حمایت کی ضرورت تھی اور یہ کام راسپوٹین کر سکتا تھا کیونکہ یہ دیہاتی اس کی ہر بات وحی خداوندی سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ جو کہے گا وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔

راسپوٹین کو ایک خاص مقصد کے تحت قادر جان گرجا میں پیش کیا گیا۔ پادری نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس

وقت ڈھیلے ڈھالے پھٹے ہوئے دیہاتی کپڑوں میں ملبوس تھا۔شکل بھی نادار مفلسوں ہی کی طرح تھی۔

''اے لوگو! میری بات غور سے سنو، آج ہمارے درمیان خوش قسمتی سے ایک ایسی بزرگ ہستی موجود ہے جو مسیحا، خدا کا پیغمبر، مجسم نور اور تقدس کا پیکر ہے۔آگے بڑھو، تعظیماً اس کے آگے جھکو اور اس کے قدموں پر نچھاور ہوجاؤ۔''

یہ سنتے ہی لوگوں کا جم غفیر راسپوٹین کی طرف دوڑ پڑا اور اس کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔راسپوٹین نے پادریوں کے انداز میں اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور لوگوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیتا رہا۔

☆......☆

روس پر زار نکولاس دوم کی حکومت تھی۔جرمن نژاد بلیس کی شہزادی اور انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کی نواسی الیکس اس کی ملکہ تھی۔اس نے یہ شادی اپنی والدہ کی بے پناہ مخالفت کے باوجود سیاسی حکمتِ عملی کے تحت کی تھی تاکہ ملکی مفادات میں اشتراک پیدا ہوسکے۔انگلستان کے ساتھ تعلقات بڑھانا بھی مقصود تھا کیونکہ وہ ملکہ وکٹوریہ کی نواسی تھی۔شہزادی نے شاہ روس کو ایسی محبت دی کہ وہ شہزادی کا گرویدہ ہوگیا اور وہ اس سے مفاد کی نہیں حقیقی محبت کرنے لگا۔دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن کر رہ گئے تھے لیکن افسوس کہ یہ شہزادی اولادِ نرینہ سے محروم رہی۔یکے بعد دیگرے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں لیکن بیٹا کوئی نہیں تھا۔مادر ملکہ جرمنوں سے شدید نفرت کرتی تھی۔اس نے جرمن نژاد الیکس کو بہو تو بنا لیا تھا لیکن دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔جب الیکس تخت کا وارث نہ دے سکی تو اسے کھل کر مخالفت کرنے کا موقع مل گیا۔زار نکولاس کو بھی فکر ہوئی کہ یہ رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہوجائے کیونکہ مادر ملکہ کی مخالفت دیکھ کر وزرا، امرا اور ان کی بیگمات نے بھی شہزادی کے خلاف محاذ بنا لیا تھا۔اس پر آوارگی تک کے الزامات لگا دیئے گئے۔قریب تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے گھبرا کر شاہ سے علیحدگی اختیار کرلے کہ خدا نے اس کی سن لی۔وہ حاملہ ہوئی اور اس مرتبہ اس نے تخت کے وارث یعنی ایک بیٹے کو جنم دیا۔

بیٹے کو جنم دیتے ہی رشتے داروں کے طعنے تو ختم ہو گئے لیکن ملکہ اور زار روس ایک اور مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔

انہیں خوشی ہوئی لیکن ایک لامتناہی دکھ ان پر حاوی ہوگیا۔یہ بچہ پیدائشی طور پر ''ہیموفیلیا'' کے مرض میں مبتلا تھا۔اس کو کھیلتے ہوئے اگر چوٹ لگ جاتی تو اس کا سارا جسم سوج جاتا۔اس مرض کی وجہ سے اس کی ہڈیاں نہایت کمزور ہوگئی تھیں۔وارث پیدا ہوگیا تھا لیکن تخت تک پہنچنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔زار روس جو دنیا کی سب سے بڑی مملکت کا مالک تھا اس بیماری کے سامنے بے بس نظر آتا تھا۔وہ بچہ مستقل ڈاکٹروں کی نگرانی میں تھا۔روحانی علاج بھی جاری تھا۔محل میں آئے دن سنیاسی مجذوب اور صاحب کرامات پیر فقیر آتے جاتے رہتے تھے اور بادشاہ کو خوب جی بھر کے لوٹ رہے تھے۔

یہ باتیں بہت پہلے کی ہیں۔اب وہ بچہ نہیں لڑکا تھا۔نوجوانی کی منزلوں کے قریب لیکن ہیموفیلیا کا مریض۔لڑکا ہی تو تھا۔کھیل کود سے باز نہیں آتا تھا۔ایک مرتبہ نوکر کے لڑکے کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ ایک اونچی جگہ سے گر گیا۔اسے گہری چوٹیں آئیں اور جسم کی بیشتر ہڈیاں ٹوٹ گئیں جس کے باعث وہ سخت اذیت کا شکار ہوا۔محل میں اس کی چیخیں گونجتی رہتی تھیں۔

☆......☆

اسٹانا اور ملٹیا دو سگی بہنیں تھیں اور ٹرور شین پیوپل پارٹی کی بنیادی رکن تھیں۔ان دونوں بہنوں کا یہ کام تھا کہ وہ روسی کلیساؤں کی مقتدر شخصیات سے رابطہ رکھتیں اور ان سے رپورٹیں حاصل کر کے ملکہ تک پہنچاتی تھیں۔جب راسپوٹین ٹرور شین پیوپل پارٹی میں شامل ہوا تو علوم الٰہیہ کی اکیڈمی کے ڈائریکٹر فادر فیوخان نے ان دونوں بہنوں سے راسپوٹین کا تعارف کرایا۔''یہ نیا ممبر نہایت فصیح و بلیغ اور بلند حوصلہ ہے۔سچا روسی۔غیر معمولی طاقت اور پُراسرار قوتوں کا مالک ہے۔سائبیریا کے لوگ اس کی کرامات کے معترف ہیں۔وہ شہنشاہیت کا محافظ اور کلیسا کا وفادار ہے۔''

فادر نے یہ تعریف اس لیے کی تھی کہ یہ دونوں بہنیں اپنی رپورٹ میں یہ باتیں درج کرلیں اور ملکہ تک پہنچا دیں لیکن اسٹانا کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔اس نے راسپوٹین سے تنہائی میں ملاقات کی اور اسے شہزادہ الیکس کی بیماری کا بتایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کی شفایابی کے لیے دعا کرے۔راسپوٹین تمام حالات سن کر بے حد متاثر ہوا اور اسٹانا کو تسلی دی۔''ملکہ سے کہنا اب رونے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ اب میں آگیا ہوں۔ اس کا بیٹا بالکل تندرست ہوجائے گا۔"

"کیا آپ الیکس کے لیے دعا کریں گے۔"

"اگر ملکہ چاہے گی۔"

دونوں بہنوں کے تو فرائض میں شامل تھا کہ وہ گرجا کے معاملات کی رپورٹیں ملکہ کے حضور پیش کریں۔ انہوں نے ملکہ کے سامنے راسپوٹین کی تعریف میں کلمات ادا کیے۔

"اس شخص کو غیر معمولی روحانی قوت حاصل ہے۔ وہ تن مردہ میں روح پھونک سکتا ہے۔ ناامید بیماروں کو اچھا کر سکتا ہے لوگ اس کی کرامات کے معترف ہیں۔ لاعلاج مریض اس کے ہاتھ لگاتے ہی ہنستے کھیلتے گھروں کو جاتے ہیں۔"

"تو نے ایسے شخص سے الیکسی کی بیماری کا ذکر کیا؟"

"کیسے نہ کرتی۔ میں اسی غرض سے تو اس کے پاس گئی تھی۔"

"اس نے کیا کہا۔"

"اس نے پیغام بھیجا ہے، ملکہ سے کہہ دو کہ اب وہ بالکل نہ روئے میں اس بچے کو بالکل تندرست کردوں گا۔ وہ پہلے سے زیادہ صحت منداور توانا ہوجائے گا۔"

ملکہ یہ سنتے ہی راسپوٹین سے ملاقات کے لیے تڑپنے لگی لیکن اس سے پہلے ضروری تھا کہ بادشاہ سے اجازت حاصل کرلی جائے۔

بادشاہ نے سنا تو سوچ میں پڑگیا۔ وہ پہلی فرصت میں راسپوٹین کو محل میں لانا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی محل میں آمد خفیہ رکھی جائے۔ اس کی کچھ سیاسی وجوہات تھیں لہٰذا اسے لانے کے لیے ایک خفیہ عقبی دروازہ استعمال کیا گیا جس کا چند مخصوص لوگوں کے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ استانا کو بھی اسی وقت پتا چلا جب اس سے کہا گیا کہ وہ راسپوٹین کو اس خفیہ دروازے سے اندر لے کر آئے۔

ان دنوں روس میں بے چینی، افراتفری، قتل وغارت اور بغاوت کی افواہیں عام تھیں۔ بادشاہ نہیں چاہتا تھا کہ ٹرورشین پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے راسپوٹین محل میں آئے اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے۔ اس لیے مکمل رازداری برتنا ضروری تھی۔

راسپوٹین اس عقبی دروازے سے داخل ہوا اور ایک زینہ چڑھ کر بادشاہ کے حضور پہنچ گیا۔ وہ اس وقت بھی معمولی لباس میں تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور بال شانوں تک لٹک رہے تھے۔ اس نے تمام شاہی آداب کو بالائے طاق رکھا اور شاہی جوڑے کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ شاہی جوڑا اس کی بے تکلفی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے الیکسی کے کمرے میں لے گیا۔ الیکسی اس وقت بھی درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ راسپوٹین نے کمرے کے ایک کونے میں دو زانو ہو کر کچھ دعائیں مانگیں اور پھر اپنی انگشت سے شہزادے کے سینے پر صلیب کا نشان بنایا صلیب کا نشان مکمل ہوتے ہی بچے نے آنکھیں کھول دیں۔ الیکسی کی آنکھوں میں اب درد کی بجائے سکون تھا۔ اس کے سفید ہونٹ گلابی ہوگئے۔

"میں نے تمہارا درد بھگا دیا ہے۔ اب تمہیں کوئی چیز تکلیف نہیں دے گی۔ کل تک تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے۔" راسپوٹین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان الفاظ میں کوئی ایسی طاقت تھی کہ الیکسی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بدن میں کبھی درد ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ فوراً بستر سے اٹھا اور راسپوٹین سے لپٹ گیا۔ ملکہ نے بھی فرطِ جذبات سے راسپوٹین کا ہاتھ چوم لیا۔

"میری دعاؤں پر یقین رکھ۔ تمہارا بیٹا بچ جائے گا۔"

لوگ کہتے ہیں راسپوٹین ہپناٹزم کا ماہر تھا۔ شاید اس نے الیکسی کو ہپناٹائز کردیا ہو اور وہ محسوس کررہا ہو کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ شیطانی طاقتیں راسپوٹین کے تابع تھیں۔ وہ ان سے کام لیتا تھا۔ یہ کہنے والے بھی کم نہیں تھے کہ کثرت عبادت سے اس کی زبان میں اثر پیدا ہوگیا ہے۔ وہ جو دعا مانگتا ہے وہ پوری ہوتی ہے۔ حقیقت کچھ بھی ہو یہ حقیقت تھی کہ الیکسی بھلا چنگا ہوگیا تھا۔

اس واقعے کے بعد راسپوٹین پر شاہی محل کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھل گئے۔ وہ بلا جھجک بلا اجازت جب چاہتا شاہی محل میں چلا آتا اور شاہی خاندان کے ساتھ مذہبی رسومات ادا کرتا۔ اس کے کپڑے میلے اور معمولی ہوتے۔ بے ترتیب بال الجھے ہوتے۔ بدن سے بدبو آرہی ہوتی لیکن شاہی محل میں کسی کی ہمت نہیں تھی جو اسے ٹوکتا یا گھن کھاتا۔ اس کی دل جوئی کے لیے سب اس کے آگے پیچھے ہوتے تھے۔ شہزادیاں اس سے اتنی مانوس

ہوگئیں کہ ذاتی مسئلے بھی اس کے سامنے کھل کر بیان کرتیں۔ اس کی اتنی ہمت ہوگئی تھی کہ آدھی رات کو بھی ان کی خواب گاہوں میں چلا جاتا تھا۔

راسپوٹین اب تک خفیہ راستے سے محل کے اندر آجا رہا تھا لیکن جلد ہی یہ راز کھل گیا۔ بات دربار تک پہنچی تو راسپوٹین کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدم اکھاڑنے کے لیے نئی نئی سازشیں تیار کی جانے لگیں۔ شاہ کا اے ڈی سی سب سے پیش پیش تھا۔ اس نے محل کے اندر کے حالات جاننے کے لیے کئی ملازموں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ شاہ کی بیٹیوں کی خدمت گار نے انکشاف کیا کہ راسپوٹین جب شام کی دعائیں دینے کے لیے کمرے میں جاتا ہے تو بچیوں سے ناشائستہ حرکتیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی آدھی رات کو بھی ان کے کمروں میں گھس آتا ہے۔ یہ بھی الزام لگایا گیا کہ راسپوٹین نے ایک ملازمہ کو ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ نہایت شدید نوعیت کے الزامات تھے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ اس نے ایلکسی کو ٹھیک کر دیا تھا۔ ایلکسی کے اتالیق نے اس کی بھی تردید کردی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ راسپوٹین کی دعاؤں سے نہیں ایک نیپالی ڈاکٹر کے علاج سے ٹھیک ہوا۔ راسپوٹین شعبدہ باز ہے۔ وہ چپکے چپکے نیپالی ڈاکٹر کی دوائیں پلاتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ ایلکسی اس کی دعاؤں سے ٹھیک ہوا ہے۔

جب ان الزامات کے چرچے محل سے باہر نکلے اور راسپوٹین کو ان الزامات کا سامنا کرنے میں دقت پیش آئی۔ عام لوگوں میں اس کی پاکیزگی شک کی نظروں سے دیکھی جانے لگی تو اس نے اعلان کردیا۔

”بدقماش اور بدکردار لوگوں نے میرے تقدس اور زہد کو میلا کردیا ہے لہٰذا وہ اپنے دامن کو ایک مرتبہ پھر رہبانیت کے پانی سے دھونے یہاں سے دور چلا جائے گا۔“

اس نے محل میں آنا جانا بند کردیا۔ سیلانیوں والی لاٹھی اٹھائی روٹیوں کا تھیلا ساتھ لیا اور گھر سے نکل گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شہنشاہ اور ملکہ کو خبردار کردیا۔

”لوگ میرے بارے میں جو کہتے ہیں وہ مت سنو۔ یہ سب ابلیس کے گماشتے ہیں۔ اگر میں تم سے جدا ہوگیا تو چھ ماہ کے اندر اندر نہ صرف تم اپنا آپ کھو بیٹھو گے بلکہ تخت بھی تم سے چھن جائے گا۔“

وہ اس دفعہ مشرقی ممالک کی طرف نکلا۔ بیت المقدس گیا اور ہیکل سلیمانی میں مجاہدات اور چلہ کشی کرتا رہا۔ یہاں سے اطالیہ گیا اور عیسائی مقامات مقدسہ کی زیارتیں کرتا رہا۔

ان ریاضتوں اور زیارتوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے گاؤں پوکردوسکی چلا گیا اور عبادت میں مشغول ہوگیا۔

☆......☆

زار روس اپنے اہل خانہ کے ساتھ شکار پر نکلا ہوا تھا۔ وہ اس وقت پولینڈ کے ایک قصبے میں تھا کہ اس کا بیٹا ایلکسی ایک مرتبہ پھر ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ اس کا پاؤں پھسلا اور کسی ایسے ڈھب سے گرا کہ گھٹنے کا جوڑ کھل گیا۔ درد کی شدت سے تیز بخار بھی رہنے لگا۔ شاہی ڈاکٹر ساتھ تھا لیکن اس کا کوئی نسخہ کارگر نہ ہوا۔ اس وقت راسپوٹین کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ راسپوٹین اس وقت اپنے آبائی گاؤں میں مقیم ہے۔ اسے جلد سے جلد مطلع کرنے کی کوئی اور صورت تو تھی نہیں یہی ایک طریقہ تھا کہ ٹیلی گرام کے ذریعے اسے خبر کردی جائے۔ ٹیلی گرام کے ذریعے اسے ایلکسی کی بیماری کی اطلاع کردی گئی۔

راسپوٹین کی طرف سے جوابی ٹیلی گرام آیا۔

”ناامید نہ ہو تمہارا بچہ زندہ رہے گا۔ ڈاکٹروں سے کہہ دو اسے پریشان نہ کریں۔“

اسی ٹیلی گرام میں اس نے ہدایت کی تھی کہ اس عبارت کو ایلکسی خود پڑھے۔ عبارت یہ تھی۔

”تم ابھی بستر سے اٹھ جاؤ گے۔ دیکھو اٹھ بھی گئے۔ اب تم تیزی سے صحت یاب ہو گے۔“

ایلکسی کا ہر عمل چونکہ راسپوٹین کی ہدایت کے تابع تھا اس لیے وہ ٹیلی گرام پڑھتے ہی تیزی سے صحت یاب ہونے لگا۔

بادشاہ نے راسپوٹین کو دوبارہ محل میں آنے کے لیے اصرار کیا لہٰذا وہ گاؤں سے سینٹ پیٹرز برگ منتقل ہوگیا۔ وہ اب شاہی خاندان کی مجبوری بن گیا تھا۔ سینٹ پیٹرز برگ میں اسے ملک کی اہم ترین شخصیت کا درجہ حاصل تھا۔ اس کی اقامت گاہ پر اس کی حفاظت کے لیے سیکیورٹی موجود رہتی تھی۔ ملکہ تو جیسے اس کی بے دام غلام بن گئی تھی۔ وہ بادشاہ کو مجبور کرتی رہتی تھی کہ ملکی معاملات میں راسپوٹین سے مشورہ

ضرور کرلیا کرے۔ یہ ملکی معاملات تھے، سیاست کی گتھیاں تھیں لیکن ملکہ کا اصرار رہتا تھا کہ راسپوٹین جو مشورہ دے اسی پر عمل کیا جائے۔

''جنرل ٹریپوپ لاکھ تجربہ کار جرنیل سہی لیکن اس کے کہنے پر چلنے کی بجائے راسپوٹین کی ہدایت کو مشعل راہ بنایا جائے کیونکہ اس کی پشت پر خداوند کریم موجود ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ اس کی دعاؤں کی برکت سے تخت وتاج اور ملک کے لیے سنہرے دن آنے والے ہیں۔''

قصر شاہی میں رسائی حاصل کرنے کے بعد راسپوٹین مستقل طور پر سینٹ پیٹرز برگ میں رہنے لگا تھا۔ اب وہ سیلانی نہیں شاہی خاندان کا ایک رکن تھا۔ اس نے گاؤں سے اپنی بیوی، دونوں بیٹیوں اور خبط الحواس بیٹے کو اپنے پاس بلالیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے خیالات کے تابع نہ کرسکا۔ وہ اپنے باپ دادا کی طرح کٹر مسیحی اور کلیسا پرست رہی۔ وہ راسپوٹین کے فلسفے ''گناہ کے ذریعے نجات'' کی قائل کبھی نہ ہوسکی۔ راسپوٹین خلائی فرقے کا معتبر رہنما ہونے کے باوجود اس راسخ العقیدہ عورت کے ایمان کو متزلزل نہ کرسکا۔ اس کی اولاد بھی اس کے فلسفے سے متفق نہ ہوسکی۔ چراغ تلے اندھیرا والا معاملہ تھا۔ سارے روس کو بہکانے والا اپنے گھر میں بے بس تھا۔ اس کے عقیدت مند یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ سب کو شفا دینے والا اپنے بیٹے کا علاج نہیں کرسکا تھا۔ اس کے بیٹے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ ہر وقت ہنستا رہتا تھا اور جانوروں کی طرح آوازیں نکالتا تھا۔

سینٹ پیٹرز برگ آنے کے بعد اس کا گھر مرجع خلائق بن گیا۔ ہر وقت حاجت مندوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ دور دراز کے علاقوں سے لوگ آتے تھے۔ ان کے رہنے سہنے اور خوراک کا بندوبست وہ خود کرتا تھا۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ وہ نذرانے تھے جو امیر مسیحی اپنی مرادیں پوری ہونے کے صلے میں اسے پیش کرتے تھے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ بیمار اس کی نگاہ کے ایک اشارے سے شفایاب ہوجاتے ہیں۔ بڑے بڑے امراء و وزراء یہ جانتے ہوئے کہ شاہی خاندان مکمل طور پر اس کے زیر اثر ہے اور وہ ان سے ہر بات منوانے پر قادر ہے اپنی دنیاوی مرادیں لے کر اس کے پاس آتے تھے۔

اب وہ ایک پر تعیش زندگی گزار رہا تھا۔ ایک خادمہ رکھ لی تھی۔ ایک سیکریٹری بھی تھی۔ یہ دونوں اس کی تشہیر کے فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔ لوگوں کو اس کی کرامات کے قصے بڑھا چڑھا کر سناتی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اپنے علاج معالجے کے لیے راسپوٹین کے پاس آتے رہیں اور دکانداری چلتی رہے۔

اس نے ایک زنانہ حلقہ ''حلقہ پاک بازاں'' قائم کیا تھا۔ اس میں ظاہر ہے صرف عورتیں شریک ہوسکتی تھیں۔ عورتیں اس حلقے میں شمولیت کی زبردست خواہش رکھتی تھیں۔ جس دن ان کی یہ خواہش پوری ہوجاتی وہ دن ان کی زندگی کا مبارک دن ہوتا تھا۔ وہ اعلانیہ کہتی پھرتی تھیں کہ راسپوٹین نے چھولیا ہے، انہیں خلوت میسر آگئی ہے۔ اب وہ بھی اس کی طرح مقدس ہیں۔ عورتوں میں عام خیال تھا اگر راسپوٹین کی مقدس نظریں کسی عورت کا انتخاب کرلیں تو ہمارے اور ہمارے شوہروں کے لیے اس سے بڑھ کر خوش نصیب انسان کوئی نہیں۔ حلقے میں شامل نہ ہونے والی عورتیں رو رو کر آسمان سر پر اٹھالیتیں یا بڑی بڑی سفارشوں کا سہارا لیتیں۔

راسپوٹین کی عدم موجودگی میں یہ عورتیں ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہتیں۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوتا اس سے لپٹ جاتیں وہ بھی ان کے ساتھ یہی سلوک کرتا اور انہیں اپنی اپنی جگہ بیٹھ جانے کی ہدایت کرتا۔ باتوں کے دوران اچانک وہ کسی عورت کو اپنے قریب بلاتا۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھتا اور بالوں میں کنگھی کرتا اور وعظ شروع کردیتا۔ اس کی زبان باتوں میں مصروف رہتی اور آنکھیں اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتی رہتیں۔ رفتہ رفتہ یہ معلوم ہونے لگتا جیسے سب اس کے تابع ہوگئی ہیں۔ وہ میز کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو سب بڑھاتیں۔ وہ منہ سے شراب کا گلاس لگاتا تو وہ بھی اپنے اپنے گلاس اٹھاتیں۔ وہ باتیں کرتے کرتے فرش پر گر جاتا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب اسے خواب گاہ میں لے جایا جائے۔ چند خواتین اسے خواب گاہ میں لے جاتیں۔ خواب گاہ کی داستانیں بھی بہت جلد منظر عام پر آجاتیں لیکن راسپوٹین کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ برابر اپنی روش پر قائم رہا۔

اس کے پاس بہت سے وزراء اور فوجیوں کی بیویاں بھی آنے لگی تھیں جو اس کے فلسفے ''گناہ کے ذریعے نجات'' کی قائل تھیں۔ ان کے شوہروں کو اس کے پاس آنا قطعی پسند

نہیں تھا خصوصاً اس حالت میں کہ بہت سی عورتوں کے ساتھ اس کے اسکینڈل مشہور ہونے لگے تھے۔ انہوں نے اپنی بیویوں کو روکنا چاہا تھا لیکن وہ جنت کی تلاش میں اس کے ساتھ ملوث ہو رہی تھیں۔ ان بااثر لوگوں نے چاہا کہ کسی طرح راسپوٹین کو گناہ گار قرار دے کر راستے سے ہٹا دیا جائے لیکن وہ اتنا طاقت ور ہو چکا تھا کہ اس پر آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اس کے خلاف قدم اٹھانے سے پہلے ٹھوس ثبوتوں کی ضرورت تھی۔ یہ کام پولیس سے لیا گیا۔ پولیس کو تحقیقات کا حکم دیا گیا کہ راسپوٹین کے گناہوں کی تحقیق کی جائے۔ جو عورتیں اس کا شکار بنی ہیں ان سے انٹرویو کیے جائیں اور انہیں عام کیا جائے تاکہ اس کے ہزاروں عقیدت مندوں کو اس کے خلاف بھڑکایا جائے تاکہ اس کے خلاف جب کوئی کارروائی کی جائے تو لوگ اس کے حق میں نہ اٹھ سکیں۔

پولیس نے خاموشی سے تحقیق شروع کر دی۔ ان رپورٹوں میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ ایسا تھا جسے پڑھ کر آدمی آنکھیں بند کر لے۔ گھر کی ملازماؤں سمیت شرفا کی بیویوں تک سے اس کے تعلقات سامنے آئے۔ خود کو مسیح دوراں اور پیغمبر کہلانے والے کی خلوتیں اتنی رنگین ہوں گی کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جب یہ رپورٹیں مرتب ہوئیں تو اس کے مخالفین نے ان سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن وہ ان مخالفتوں کی آندھی کے سامنے کسی مضبوط چٹان کی طرح ڈٹا ہوا تھا اور لگتا تھا دنیا کی کوئی طاقت راسپوٹین کو تباہ نہیں کر سکتی۔ مجبور ہو کر وزیر داخلہ خود اس کے گھر آیا اور ان رپورٹوں کی روشنی میں اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ وہ محتاط تو کیا ہوتا، نامکمل رپورٹوں کو مکمل کرتا رہا اور پولیس کی غلطیوں کی تصحیح کراتا رہا۔ ایک رپورٹ کو دیکھ کر کہا۔

''اداکارہ دوار دور دو رات بھر میرے پاس نہیں رہی تھی نصف شب ہی کو چلی گئی تھی۔'' ایک رپورٹ میں پولیس نے لکھا تھا کہ ایک غیر معروف عورت اس کے ہاں رہی تو راسپوٹین نے وضاحت کی۔ ''پولیس والوں نے اس کا نام اس لیے درج نہیں کیا کہ وہ ایک وزیر کی بیوی تھی۔''

ایک مشہور کرنل کی بہن کا نام بھی پولیس نے چھپایا تھا۔ راسپوٹین نے اس کا نام لے کر بتایا کہ وہ اس کی خواب گاہ میں گھنٹوں مقیم رہی تھی۔

راسپوٹین نے ان رپورٹوں کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی جب کہ وزیر داخلہ یہاں سے اٹھ کر ملکہ کے پاس پہنچا اور اسے یہ رپورٹیں دکھائیں۔ اس نے یہ رپورٹیں پڑھیں اور انہیں مسترد کر دیا۔

''یہ سب بدخواہوں کی اختراع ہیں۔''

وزیر داخلہ نے اسے بھڑکانے کے لیے کہا ''آپ نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے قمیص تیار کی تھی اور اس پر گل بوٹے کاڑھے تھے۔ آپ کو معلوم ہے اس نے اس قمیص کا کیا حشر کیا۔ چند لڑکیوں کی فرمائش پر اس نے یہ قمیص پھاڑ کر اسے پیروں تلے روند دیا۔''

ملکہ نے ناراض ہونے کی بجائے راسپوٹین کا دفاع کیا۔ ''اللہ والے لوگ دنیاوی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ دنیاوی نعمتوں کی پروا نہیں کرتے۔''

ملکہ کسی الزام کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کپڑے سینے پر فخر محسوس کرتی تھی اور اس کے فلسفہ گناہ کا دفاع کرتے ہوئے اسے ابلیس کی ترغیب کے خلاف جدوجہد کہتی تھی۔

ان رپورٹوں کی موجودگی کے باوجود حیران کن بات یہ تھی کہ کبھی کسی انتظامی ادارے نے راسپوٹین کے خلاف کوئی راست قدم نہ اٹھایا اور نہ ہی کسی جرم میں اس پر ساری عمر کوئی مقدمہ چلا۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کے اقتدار کا سورج کس تابنا کی سے چمک رہا تھا اور شاہی خاندان پر اس کی انگلیوں کی گرفت کتنی مضبوط ہو گئی تھی۔

☆......☆

راسپوٹین کے خلاف سازشوں کا جال تیار ہو رہا تھا۔ وہ لوگ جو اس کے خلاف تھے جن میں شاہ کا ایڈی بھی شامل تھا، ایک سازش کے تحت اس کے خلاف اسکینڈل تیار کرتے رہے اور اخباروں میں چھاپتے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ عورتوں کو ہراساں کرنے کا الزام تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ شاہی خاندان اس کے علاوہ کوئی کارروائی نہیں کر رہا ہے تو حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے اس کے گن گانے لگے لیکن در پردہ اس کے خلاف کام کر رہے تھے۔

صرف حکومتی کارندے ہی راسپوٹین کے خلاف نہیں تھے بلکہ ٹروڈشین پیوپل پارٹی کے سرکردہ افراد بھی اس کے خلاف ہو گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ راسپوٹین ان کے زبانی

نعروں کا پول سرعام کھول رہا تھا۔ وہ کھلے عام کہہ رہا تھا کہ غریبوں کا استحصال دراصل یہی پارٹی کرتی ہے۔

اس پارٹی نے راسپوٹین کے خلاف وزیراعظم کو استعمال کیا جس نے شہنشاہ کو بھڑکانے کی بھرپور کوشش کی لیکن شہنشاہ، راسپوٹین سے اتنا خوش تھا کہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی بجائے وزیراعظم کو برطرف کردیا اور اس کی جگہ ایک نئے وزیراعظم کوٹسوف کا تقرر کردیا۔ یہ شخص نہایت گھاگ سیاست داں تھا۔ وہ بھی راسپوٹین کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خائف تھا لیکن کھل کر سامنے نہیں آتا تھا۔ اس نے شہنشاہ کے کان بھرنے کی بجائے راسپوٹین کو خریدنے کی کوشش کی اور دو لاکھ روبل پیش کرتے ہوئے واپس آبائی گاؤں لوٹ جانے کو کہا۔

راسپوٹین نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ ”میں صرف شہنشاہ کے حکم کا پابند ہوں اگر وہ مجھ سے کہیں گے تو میں ایک روبل لیے بغیر گاؤں لوٹ جاؤں گا۔“ کوٹسوف نے بظاہر بات یہیں ختم کردی لیکن اب اس نے ایک اور چال چلی۔ اس نے راسپوٹین کے خلاف گم نام تبصرے شائع کرانے شروع کردیے اور یہ تبصرے لے کر شہنشاہ کے پاس پہنچ گیا۔

”ان تبصروں کی وجہ سے شاہی خاندان بھی بدنام ہورہا ہے اور حکومت روس بھی۔ اگر اب بھی آپ نے راسپوٹین کی حرکتوں پر اس کی سرزنش نہیں کی تو پانی سر سے اونچا ہو جائے گا۔ آپ کی عقیدت اپنی جگہ۔ میں بھی اس سے عقیدت رکھتا ہوں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کے خلاف نفرت بڑھتی جارہی ہے۔“

شہنشاہ تمام باتیں سنتا رہا اور پھر دو لفظوں میں ان الزامات کو جھٹلا دیا۔ ”یہ داستانیں فرضی ہیں۔ نقاد کسی تحقیق کے بغیر شائع کررہے ہیں۔ آپ میرے خاندان کی بدنامی کی فکر نہ کریں۔ میں خود نمٹ لوں گا۔“

کوٹسوف کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے آیندہ راسپوٹین کی مخالفت کی جرأت نہیں کی لیکن لگتا یہ ہے کہ وہ سازشوں میں مصروف رہا اور اب منصوبہ یہ تھا کہ راسپوٹین کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہ شک اس وقت تقویت پکڑ جاتا ہے جب راسپوٹین پر قاتلانہ حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک رات دو اشخاص ریوالور لے کر اس کے گھر میں گھس آئے لیکن شہنشاہ کی طرف سے اسے سیکورٹی دی گئی تھی۔ پولیس نے ان دونوں کو پکڑ لیا۔ ان دونوں نے الزام لگایا کہ ان کی بیویاں راسپوٹین کی خواب گاہ میں ہیں۔ پولیس نے پورا گھر چھان مارا لیکن کوئی عورت برآمد نہ ہوئی لہٰذا ان دونوں کو قاتلانہ حملے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

اس واقعے کے کچھ دنوں بعد راسپوٹین ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ موسیقی اور رقص کے شور میں راسپوٹین نے جی بھر کر شراب پی۔ رقص جاری تھا کہ ایک باریش شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور چلانے لگا۔ ”کیا یہی پیغمبر دوراں ہے جو کہتا ہے اس کے الفاظ میں اللہ بولتا ہے۔ کیا یہ ذلیل اور کمینہ شخص انسان کہلانے کا حق رکھتا ہے۔“

ابھی اس کے الفاظ ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ گولیاں چلنی شروع ہوگئیں۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ پولیس نے راسپوٹین کو وہاں سے نکال لیا۔ تھوڑی دیر میں گولیاں چلانے والے افراد گرفتار ہوگئے۔ ان میں وہ باریش شخص بھی شامل تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ باریش شخص دراصل پولیس آفیسر تھا۔ سادہ کپڑوں میں تھا جسے پولیس کے سربراہ نے مامور کیا تھا۔ عام پولیس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ پولیس آفیسر ہے۔

اس پر کئی قاتلانہ حملے ہوئے لیکن وہ ہر بار بچتا رہا۔ وہ بڑی بے باکی سے کہا کرتا تھا۔ ”میری مخالفت کرکے کوئی شخص روس میں نہیں رہ سکتا۔“

اس کا یہ کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ پادری ایلوڑ جو شاہی پادری تھا اور شہنشاہ کا بہت سرچڑھا تھا۔ راسپوٹین کی مخالفت اور قتل کی سازش کرنے کے الزام میں جلاوطن کردیا گیا تھا اور ناروے میں مالی تنگ دستی کے دن گزار رہا تھا۔ وزیراعظم اسٹبولین اس جرم میں برطرف کردیا گیا تھا کہ اس نے راسپوٹین کی شکایت شہنشاہ سے کی تھی۔ وزیر داخلہ تک برطرف کردیا گیا تھا۔ وزارت تک پہنچنے کے لیے راسپوٹین کی سفارش لازمی تھی۔

اس صورت حال میں تمام حکومتی کارندے اس کے خلاف ہوگئے۔ یہ لوگ اس کے بدترین دشمن مگر بہترین دوست تھے۔ کچھ لوگ اپنے حق میں سفارشیں کرانے کے لیے اسے خوش رکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کا تختہ الٹنے کے لیے اس سے ملاقاتیں کرتے تھے۔ یہ وزرا آپس ہی میں پھوٹ کا شکار تھے۔ ایک اگر راسپوٹین کو راستے سے ہٹانے کے لیے کوئی منصوبہ بناتا تو دوسرا راسپوٹین کو اس

منصوبے سے آگاہ کر دیتا۔ اس دھما کا چوکڑی سے انقلابیوں کو سخت مدد مل رہی تھی اور حکومت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ تمام وزراء کی صلاحیتیں صرف راسپوٹین پر مرکوز تھیں کہ کسی طرح وہ راستے سے ہٹ جائے۔ وطن کے لیے کام کرنے کی کسی کو فرصت نہیں تھی جب کہ بیرونی حالات روس کے خلاف جا رہے تھے۔

وزیر داخلہ اور پولیس چیف آپس میں دوست تھے لیکن ایک دوسرے کو پھنسانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ وزیر داخلہ نے راسپوٹین کے قتل کی منصوبہ بندی کی۔ اس میں پولیس کا سربراہ بلٹسکی بھی شامل تھا لیکن وزیر داخلہ یہ بھی کہتا سنا گیا کہ راسپوٹین کی تمام ذمہ داری بلٹسکی کے ذمہ ہے لہٰذا اگر اسے کوئی زک پہنچے گی تو ذمہ دار وہ ہوگا میں نہیں۔

"راسپوٹین کے قتل کے بعد بلٹسکی کو اس جرم میں آسانی سے پھنسایا جاسکتا ہے۔"

بلٹسکی کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ وہ اس انداز سے منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ پھانسی کا پھندا وزیر داخلہ کے گلے میں فٹ ہوجائے۔

کرنل کومیسارف بھی ان لوگوں میں تھا جو راسپوٹین کے وجود سے سرزمین روس کو پاک کرنا چاہتے تھے لیکن جب انہیں اس منصوبے میں شامل کیا گیا تو انہوں نے اسے طفلانہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے بلٹسکی کو وزیر داخلہ کے خفیہ عزائم سے آگاہ کر دیا جس پر بلٹسکی نے تہیہ کر لیا کہ وہ آیندہ وزیر داخلہ کا ساتھ نہیں دے گا۔ یوں یہ منصوبہ عمل سے پہلے ہی ناکام ہو گیا۔

وزیر داخلہ نے اپنے طور پر راسپوٹین کو زہر دینے کا پروگرام بنایا۔ اسے پادری ایلوڑڈ کا خیال آیا جو جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ اس نے ایک جاسوس کے ذریعے ایلوڑڈ سے رابطہ کیا اور منہ مانگی رقم کے بدلے میں اس کے کسی پیروکار کے ذریعے راسپوٹین کو زہر دینے پر اسے تیار کر لیا۔

بلٹسکی اور کرنل کومیسار کے جاسوس نے یہ راز فاش کر دیا تھا۔ وزیر داخلہ کا جاسوس مطلوبہ رقم اور وزیر داخلہ کے ہاتھ سے لکھا ہوا خط لے کر روانہ ہوا لیکن سویڈن کی سرحد پر اسے گرفتار کر لیا گیا اور سینٹ پیٹرز برگ لایا گیا۔ یہ کارنامہ بلٹسکی کا تھا۔

اس جرم کی پاداش میں وزیر داخلہ فوری طور پر

برطرف کردیا گیا۔ اس طرح آپس کے اختلافات راسپوٹین کی عمر دراز کرتے رہے۔

راسپوٹین ان حملوں سے خود بھی بوکھلا گیا تھا۔ لیکن خوف زدہ نہیں تھا۔ وہ ایک لمحے کو بھی کہیں روپوش ہوکر نہیں بیٹھا صرف اتنا کیا کہ کچھ دنوں کے لیے اپنی ایک عقیدت مند مادام گولووینا کے گھر منتقل ہوگیا۔ یہ عورت زار روس کے سابق مشیر گولوون کی بیوہ اور ملکہ کی ایک قریبی سہیلی کی رشتہ دار تھی۔ اس کی خوب صورت بیٹی مونیا اپنے منگیتر کی موت کے بعد سوگواری کی زندگی گزار رہی تھی اور ماں کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ یہ دونوں راسپوٹین کی زبردست عقیدت مند تھیں اور دوسرے تیسرے دن راسپوٹین کے گھر آتی جاتی رہتی تھیں اور جب راسپوٹین پر حملوں کا سلسلہ جاری ہوا تو وہ اسے اپنے گھر لے آئی۔ یہاں مادام گولووینا بھی تھی اور اس کی حسین بیٹی مونیا بھی لہٰذا راسپوٹین کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ مادام اعلیٰ طبقے کی عورت تھی لہٰذا اس کے گھر جو بیگمات اور حضرات آتے تھے وہ طبقہ اشرافیہ کے لوگ ہوا کرتے تھے جن کا تعلق یا تو شاہی خاندان سے ہوا کرتا تھا یا حکومت کے اعلیٰ عہدے دار تھے۔

اس گھر میں پرنس فیلکس یوسوسوف کا آنا جانا بھی تھا کیونکہ مادام گولووینا کی بیٹی مونیا اس کے بھائی کی منگیتر تھی جس کی بے وقت موت نے مونیا کو سوگوار کردیا تھا۔

پرنس یوسوسوف ملکہ کا دور کا رشتہ دار تھا اور گنے چنے قابلِ اعتماد لوگوں میں سے تھا۔ اس نے جرمن اور لندن میں تعلیم حاصل کی تھی اور ان ملکوں میں جہاں زار روس کے دشمنوں کی آماجگاہ تھی۔ وہاں ہو رہی متعدد سازشوں کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کی شادی زار روس کی ایک قریبی عزیزہ سے ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کا نام آئرنیہ تھا لیکن اس جوڑے کے کوئی اولاد نہ تھی۔

مادام لوگوونیا چونکہ راسپوٹین کی عقیدت مند تھی لہٰذا اس نے پرنس کے سامنے اس کا ذکر کیا۔ ''تمہیں راسپوٹین سے ملاقات کرنی چاہیے۔''

''وہ کیوں۔''

''میں چاہتی ہوں آئرنیا کے اولاد ہو لیکن اس کے لیے روحانی علاج کی ضرورت ہے۔ تم میرے گھر آؤ اور راسپوٹین سے ملاقات کرو آج کل تو وہ میرے گھر پر ہی مقیم ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔''

''آپ کو معلوم ہے میں کشف و کرامات کی داستانوں پر یقین نہیں رکھتا۔''

''آپ راسپوٹین سے ملاقات تو کر کے دیکھیں آپ کو ان داستانوں پر یقین آنے لگے گا۔''

''اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔''

''یہ سب اس کے مخالفین کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں آپ اس سے مل کر تو دیکھیں۔''

پرنس تیار ہوگیا۔ وہ مادام گولونیا کے گھر اس وقت پہنچا جب راسپوٹین اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کے بارے میں لوگوں کو بتا رہا تھا۔ انہیں باخبر کر رہا تھا کہ دشمن اسے مارنے کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہے ہیں لیکن دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑے گی۔

وہ بڑی دیر تک اپنی تعریفیں کرتا رہا اور پھر بڑے تکبرانہ لہجے میں بولے۔ ''مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کے حصول کے لیے میز پر مکا مار دینا کافی ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے میں روسی امرا سے نمٹ سکتا ہوں۔''

پرنس کو اس کی یہ باتیں سخت ناگوار گزریں۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے نزدیک شاہی خاندان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

یہ پہلا تاثر ہی پرنس کے لیے اچھا نہیں تھا کہ راسپوٹین کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے ایک اور غلطی دکھادی۔ وہ مادام گولوونیا کے گھر تھا کہ پرنس بھی آگیا۔ راسپوٹین اس سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ مونیا آگئی۔ راسپوٹین نے پرنس کا ہاتھ چھوڑا اور مونیا کے ساتھ سب کے سامنے ایسی بے ہودہ حرکت کی کہ پرنس نے اس کے اس قبیح فعل کے باعث راسپوٹین کے ناپاک وجود کو ختم کرنے کا تہیہ کرلیا۔ جو کچھ اس کے بارے میں سنا تھا سچ نظر آنے لگا۔ وہ اسی وقت اٹھا اور مادام کے گھر سے باہر نکل آیا۔

پرنس نے وہ رات انگاروں پر گزاری۔ کروٹیں بدلتا رہا اور راسپوٹین کو راستے سے ہٹانے کے منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ راسپوٹین نہایت طاقت ور دشمن تھا۔ اسے راستے سے ہٹانا آسان نہیں تھا۔ شہنشاہ اس کا وفادار تھا۔ اس کے کہنے پر راسپوٹین کی مکمل

حفاظت کی جارہی تھی۔ اس نے ہر محکمے میں اپنے آدمی بٹھا رکھے تھے جو اس کے لیے مخبری کیا کرتے تھے۔ ہر منصوبے کا علم اسے وقت سے پہلے ہو جاتا تھا۔ لوگ اسے اس کی کرامت سمجھ کر اس کے اور زیادہ عقیدت مند ہوتے جارہے تھے۔ اس کے قتل کا منصوبہ بناتے ہوئے ہر پہلو سے غور کرنے کی ضرورت تھی۔

رات گزرتی جارہی تھی اور پرنس کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ اسے اپنے ایک دوست کا خیال آیا جس پر وہ یہ راز ظاہر کرسکتا تھا اور وہ اسے کوئی مشورہ دے سکتا تھا۔ دو پہلو پھر بھی اس کے سامنے تھے۔ اگر اس نے انکار کردیا تو؟ اگر اس نے بے وفائی کی، شہنشاہ تک بات پہنچادی تو؟ بہت غور کرنے کے بعد اس نے یہ خطرہ مول لے لیا اور اپنے دوست ڈمڑی کو اسی وقت اپنے پاس بلالیا۔

''میرے دوست میرے ساتھ جینے مرنے کا عہد کر کے وعدہ کرو کہ جو میں کہوں گا اسے پورا کرو گے اور میرا ساتھ دو گے۔''

''مجھے اگر دوست کہتے ہو تو یہ سوچنا بھی مت کہ میں تمہارا ساتھ چھوڑ جاؤں گا۔''

''تم راسپوٹین کو تو جانتے ہی ہو گے۔''

''اس وقت حکومت وہی چلا رہا ہے۔ تمام فیصلے اس کی مرضی سے ہو رہے ہیں۔ میں اسے کیسے نہیں جانوں گا لیکن اگر تمہارا مطلب اس سے زیادہ کا ہے تو میں اس سے کبھی نہیں ملا۔''

''شاید تم یہ نہیں جانتے ہو گے کہ وہ ایک بدکار اور بداعمال شخص ہے۔ خود کو ولی اللہ اور پیغمبر بھی کہتا ہے اور ہر وقت نشے میں بھی رہتا ہے۔ گناہ کا پرچار ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی ناپاک خواہش کی تکمیل بھی کرتا ہے۔ کسی کی عصمت و آبرو اس سے محفوظ نہیں۔ بڑے بڑے عہدے داروں کی بیگمات اس کی خواب گاہ کی سیر کر آئی ہیں۔ وہ حکومت کی جڑیں کاٹ رہا ہے اور عوام کو بے راہ روی پر مائل کر رہا ہے۔ شہنشاہ ہے کہ اس کے بے حیائی کے قصوں کو ورد کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ ملکہ بھی اس کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ ایک ایسے وقت میں کہ جب انقلابیوں کی چیرہ دستیاں زوروں پر ہیں۔ بادشاہ کی بے حسی ملک کو تباہ کردے گی۔ جب تک راسپوٹین ہے ملک کا کوئی کام سیدھا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے میرا منصوبہ یہ ہے کہ راسپوٹین کو قتل کردیا جائے۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو یہ اتنا آسان ہوگا۔ اس وقت شہنشاہ سے زیادہ قوت راسپوٹین کی ہے۔''

''یہ کام مشکل ہے اسی لیے تو اس سرد رات میں تمہیں میں نے بلایا ہے تاکہ دو ذہن مل کر مضبوط منصوبہ بنائیں۔ وطن پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ اس منصوبے پر عمل کرلیا جائے خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن میرا کہنا پھر بھی یہ ہے کہ یہ کام خطرے کا ہے۔''

''وطن کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو بچانا ضروری نہیں۔''

دونوں نے مل کر یہ طے کیا کہ راسپوٹین کو ایک خوب صورت لڑکی کا جھانسا دے کر پرنس کے محل میں بلایا جائے اور شراب میں زہر ملا کر اسے دیا جائے اور پھر خاموشی سے لاش ٹھکانے لگادی جائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

''کیا راسپوٹین تمہاری دعوت اتنی آسانی سے قبول کرلے گا جب کہ وہ جانتا ہے کہ تم اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ مادام گولودنیا تمہارے خیالات کے بارے میں اسے سب کچھ بتا چکی ہوگی۔''

''مجھے معلوم ہے۔ یہ ایک طویل المدتی منصوبہ ہوگا۔ اسے دعوت پر بلانے سے پہلے راسپوٹین کو دوستی کا فریب دینا ہوگا۔ یہ کام مشکل نہیں۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

صبح کی سپیدی نمودار ہوئی تو تمام باتیں طے ہو چکی تھیں۔

پرنس نے اسی دن مونیا کو اپنے پاس بلایا اور اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔ ''مونیا، میں اب بے اولادی کے طعنے سنتے سنتے تھک گیا ہوں تم کسی طرح راسپوٹین سے میرے لیے دعا کراؤ۔''

''یہ کام اب بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس دن اچھا خاصا موقع تھا لیکن تم نے راسپوٹین کو ناراض کردیا اور اٹھ کر چلے آئے۔ وہ جس سے نفرت کرنے لگتا ہے پھر بڑی مشکل سے اس کا دل صاف ہوتا ہے۔''

''اچھی مونیا، تم میرا یہ کام کردو۔ کچھ ایسا کرو کہ اس کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے اور وہ مجھے ملاقات کا شرف بخش دے۔''

''میں وعدہ نہیں کرتی کیونکہ وہ میرے اختیار میں

نہیں لیکن کوشش ضرور کروں گی۔''

''تم اس کے سامنے میری اتنی تعریفیں کرو کہ وہ مجھ سے ملنے پر مجبور ہو جائے۔''

''میں تو دل سے چاہوں گی کہ وہ تم سے ملاقات کرے۔''

یہی باتیں اس نے مادام گولوونیا سے بھی کیں۔ دونوں ماں بیٹیوں کو اس نے اس کام پر لگا دیا کہ وہ راسپوٹین سے اس کی ملاقات کا بندوبست کریں۔ مونیا نے بڑی ترکیب سے کام لیا۔ اس نے راسپوٹین کی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے پرنس کی بیوی آئرینہ کے حسن کے قصیدے پڑھنے شروع کیے۔ وہ نہایت حسین ہے۔ لڑکی کیا ہے پری زاد ہے۔ اس کے دونوں رخساروں میں ننھے ننھے گڑھے پڑتے ہیں۔ اس کے بال کمر تک پھیلے ہوئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جب جرعہ جرعہ کر کے یہ شراب خوب انڈیل چکی تو اس کی بے اولادی کا قصہ چھیڑا۔

''وہ بہت حسین ہے لیکن اولاد نہ ہونے کے غم نے اسے اداس کر دیا ہے۔ ہر وقت اداسی اس کے چہرے سے جھلکتی رہتی ہے جو اس کے حسن کو ماند کر دیتی ہے۔ اس دکھ سے پرنس کی زندگی بھی اجیرن ہو گئی ہے۔''

راسپوٹین نے پہلے تو کوئی توجہ نہیں دی لیکن ایک دن وہ ترنگ میں تھا۔ مونیا کی باتوں کو غور سے سنا اور کہہ اٹھا۔

''پرنس اگر آئرینہ کی مجھ سے ملاقات کرا دیتا۔ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا تو میں اس کے لیے دعا کرتا لیکن اس میں تکبر بہت ہے اور ایسے لوگ مجھے پسند نہیں۔''

''اب پرنس اپنے کیے پر پچھتا رہے ہیں۔'' مونیا نے کہا۔ ''آپ سے بے رخی دکھانے کے بعد بہت افسردہ رہنے لگے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن خوف زدہ ہیں کہ کہیں آپ کی نفرت کے شکار نہ بن جائیں۔''

''راسپوٹین کا فلسفہ محبت ہے، وہ کسی سے نفرت نہیں کرتا اور پھر اس کی تو بیوی بہت خوب صورت ہے۔''

''آپ کہیں تو میں پرنس کو لے کر آ جاؤں۔''

''اگر وہ چاہے۔''

مونیا نے اپنا کام کر دکھا دیا تھا۔ اس نے یہ خوش خبری پرنس تک پہنچا دی۔ پرنس تو تیار بیٹھا تھا۔ راسپوٹین سے ملنے پہنچ گیا اور ایسی عقیدت سے ملا کہ راسپوٹین اپنی فتح پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ شاہی خاندان کا ایک ہی فرد تھا جو اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اب وہ بھی اس کی مٹھی میں تھا۔

پرنس ہر فن مولا بھی تھا اور نہایت باتونی بھی۔ اس نے باتوں کے ایسے چراغ جلائے کہ راسپوٹین روشنی میں نہا گیا۔ ایک روز تو اس نے حد ہی کر دی۔ اسے کہیں سے معلوم ہو گیا تھا کہ راسپوٹین خانہ بدوشوں کے گیت بہت پسند کرتا ہے۔ اس نے بربط اٹھایا اور راسپوٹین کے گھر پہنچ گیا اور بربط پر وہی گیت چھیڑ دیے۔ راسپوٹین جھوم جھوم گیا۔

اب وہ راسپوٹین کے دل میں اپنا مقام بنا چکا تھا۔

اب اسے دوسرے مرحلے میں داخل ہونا تھا۔ اس نے ایک دن موقع دیکھ کر اپنی بے اولادی کا ذکر کیا اور اس سے دعا کرنے کی التجا کی اور ساتھ ہی آئرینا کی خوب صورتی کا ذکر بھی چھیڑ دیا۔ اس کے حسن و جمال اور عادات و خصائل کی جی کھول کر تعریف کی۔ راسپوٹین نے آئرینا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ وہ اسے سامنے بٹھا کر اس کے لیے دعا کرے۔ پرنس نے اس وقت اس کی خواہش کو بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا۔

راسپوٹین آئرینا کے نادیدہ حسن سے اتنا متاثر ہو گیا کہ ہر ملاقات میں وہ خود آئرینا کا ذکر چھیڑ دیتا تھا اور پرنس اس کا اشتیاق بڑھانے کے لیے کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیتا تھا۔

اس دوران اس نے اپنے محل کے نیم تاریک تہہ خانے کو صاف کروا کر اس کی مرمت کروائی اور اسے ہر آسائش سے مزین کر دیا۔ ان کاموں کی تکمیل کے بعد اس نے 16 ستمبر 1916ء کو اپنے محل میں آنے کی دعوت دے دی۔

اس کا اشتیاق اتنا بڑھ گیا تھا کہ 16 ستمبر آتے ہی وہ رات آنے کے انتظار میں بے چین ہو گیا۔ شام ہوتے ہی اس نے اپنی سیکریٹری کو بتایا کہ وہ رات کا کھانا کہیں باہر کھائے گا اور بے چینی سے اس شخص کا انتظار کرنے لگا جو اسے لے کر پرنس کے گھر جانے والا تھا۔ اس نے اپنے پروگرام کو مکمل راز میں رکھا تھا۔ اس کی سیکریٹری کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کھانا باہر کھائے گا اور یہ تو سیکریٹری کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جانے والا ہے۔ وہ ایک ایک پل کو گن گن کر گزار رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ دوسری طرف وزیر داخلہ تھا جو اسے باخبر کر رہا تھا کہ

کچھ لوگ اس کی جان لینے کی کوشش کررہے ہیں لیکن راسپوٹین بالکل سنجیدہ نہ ہوسکا اور یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

''مجھے مارنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ان کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں کہ میری گردن تک پہنچ سکیں۔''

کوئی طاقت تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور یہ طاقت یقیناً آئرینا تھی۔ مقررہ وقت پر اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ایک طویل القامت شخص لمبے سیاہ کوٹ اور سیاہ ٹوپی میں ملبوس راسپوٹین کی خواب گاہ کے پچھلے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ کوٹ کے لمبے کالروں میں چھپا ہوا تھا۔ راسپوٹین خاموشی سے خواب گاہ سے نکلا۔ کار تیار کھڑی تھی۔ کار کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ راسپوٹین سوار ہوا اور پرنس کے محل میں پہنچ گیا۔

وہی شخص جو اسے یہاں تک لایا تھا۔ اسے تہہ خانے کے دروازے تک چھوڑ کر چلا گیا۔ یہاں پرنس اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ تہہ خانہ مچھلی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ شراب کی درجنوں بوتلیں موجود تھیں۔

''یہ مچھلی خاص طور پر ڈنمارک سے منگوائی گئی ہے اور یہ شراب میری ذاتی نگرانی میں کشید کی گئی ہے۔'' پرنس نے اسے بتایا۔

''میں تمہارے اعلیٰ ذوق کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' راسپوٹین نے اس کی تعریف کی۔

شراب اور مچھلی اس کے پیٹ میں اترنے لگی۔ جب کچھ نشہ بڑھا تو اس نے ڈوبتی آواز میں پرنس کو مخاطب کیا۔

''لوگ مجھے جادوگر کہتے ہیں مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ میں ایک بہترین تعبیر گو اور مسیح دوراں ہوں۔ پُراسرار روحانی طاقتوں کا مالک ہوں۔ خدا نے امن و نجات کی کلید میرے ہاتھ میں دی ہے۔ دنیا و آخرت میں میرا مقام بہت بلند ہے۔ میں خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔''

اس کی باتیں سن کر پرنس اپنے دانت بھینچ رہا تھا اور سوچ رہا تھا یہ کیسا پیغمبر ہے جو شراب کی کئی بوتلیں خالی کرچکا ہے۔ یہ سب باتیں اس وقت سوچنے کی نہیں تھیں۔ وہ راسپوٹین کے جام میں شراب انڈیلنے لگا۔ اسے یہ بھی حیرت ہورہی تھی کہ یہ شخص اس قدر شراب پینے کے باوجود اب بھی حواس قائم رکھے ہوئے۔

شراب تو شراب ہوتی ہے۔ راسپوٹین پر بھی شراب کا اثر ہونے لگا تھا۔ اس نے نشے کی حالت میں پرنس کو جھنجوڑ ڈالا۔

مجھے اس آسمانی ہستی اور آفرنیش کے تاج کے پاس لے چلو جو میرے لیے آسمان سے اتاری گئی ہے۔ میں اس تصور کو دیکھنا چاہتا ہوں جس میں ساری دنیا کو دیکھا جاسکتا ہے۔ میری مراد آئرینا سے ہے۔ میں اس کی جھولی کو خوشیوں سے بھر دوں گا اور ایسا نور عطا کروں گا جس کی مثال زمین و آسمان میں نہیں ہوگی۔

راسپوٹین آئرینا کی تعریف کرتے کرتے فحش کلامی پر اتر آیا اور آئرینا کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے لگا جو کسی بھی شوہر کے لیے ناقابل برداشت ہوسکتے ہیں لیکن پرنس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اتنی دیر میں دو آدمی وہ خاص شراب کی بوتل لے کر آگئے جس میں زہر ملا ہوا تھا۔ پرنس نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں راسپوٹین کو مخاطب کیا اور شراب کی یہ بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔

''آئرینا خواب گاہ میں آپ کی راہ دیکھ رہی ہے۔ اس کے نام کا یہ آخری جام نوش فرمائیں اور پھر اسے دعاؤں سے مستفید کرنے کے لیے اندر تشریف لے جائیں۔''

راسپوٹین اتنی جلدی میں تھا کہ بیٹھنے اور جام بنانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بوتل کو منہ سے لگایا اور کھڑے کھڑے پوری بوتل خالی کردی۔

اسی وقت پرنس کا دوست ڈمٹری بھی اندر آگیا۔ شاید وہ راسپوٹین کی موت کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اتنا زہر پینے کے باوجود وہ زندہ ہے۔ اس نے ریوالور نکالا اور تمام گولیاں راسپوٹین کے بدن میں اتار دیں۔ اس کی تقلید میں پرنس نے بھی اپنا ریوالور خالی کردیا۔ راسپوٹین لڑکھڑایا ضرور لیکن گرا نہیں۔ ڈمٹری نے اپنا خنجر نکالا اور دستے تک اس کی پیٹھ میں اتار دیا۔ راسپوٹین زمین پر گر پڑا۔ پرنس نے ڈنڈا اٹھایا اور اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کردیا۔ پرنس نے اپنے ملازموں کو بلایا اور اس کی لاش کو اٹھا کر دریائے نیوا کے کنارے پر لے گئے۔ اس وقت بھی وہ پوری طرح مرا نہیں تھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا اور سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ پرنس نے اسے رسیوں سے باندھا اور دریا میں پھینک دیا۔

صبح ہوئی تو حسب معمول راسپوٹین کے گھر کے سامنے ملاقاتی جمع ہونا شروع ہوگئے۔ راسپوٹین کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اس نے اپنی سیکریٹری سے یہ کہا ضرور تھا کہ وہ

کھانا کہیں باہر کھائے گا لیکن رات کو گھر نہیں آئے گا یہ نہیں بتایا تھا۔ اس نے ہر اس جگہ فون کر کے دیکھ لیا جہاں وہ جا سکتا تھا لیکن کہیں سے کوئی خبر نہ ملی۔ مجبور ہو کر اس کی گم شدگی کی اطلاع کردی گئی۔ اطلاع ملتے ہی خفیہ پولیس اور جاسوس حرکت میں آگئے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ رات کے وقت گشت پر موجود پولیس نے بتایا کہ انہوں نے رات کے وقت پرنس فلکیس یوسوسوف کے محل سے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔

بس یہ اشارہ کافی تھا۔ اس رپورٹ پر شہزادے کے محل کی تلاشی لی گئی۔ تہہ خانے سے صحن تک خون کے دھبے پائے گئے۔ دوپہر کے وقت راسپوٹین کے دستانے دریائے نیوا کے قریب سے مل گئے۔ یقین ہو گیا کہ اس کی لاش دریا میں بہادی گئی ہے۔ غوطہ خوروں کو طلب کیا گیا۔ دو دن کی مسلسل تلاش کے بعد اس کی لاش نکالی گئی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ڈاکٹروں نے اس کی موت کا سبب دریا میں ڈوبنا قرار دیا۔ زہر، پستول کی گولیوں، خنجر کے وار اور کھوپڑی پاش پاش ہونے کے باوجود وہ زندہ رہا تھا۔ اگر دریا میں نہ پھینکا جاتا تو شاید زندہ رہ جاتا۔ یہ بات ڈاکٹروں کے لیے بھی حیران کن تھی۔

وہ کتنا سخت جان تھا۔ یہ طاقت اس میں کہاں سے آئی تھی؟

شہنشاہ اس وقت محاذ جنگ پر تھا۔ خبر ملتے ہی وہ دارالحکومت پہنچ گیا۔

20 ستمبر 1916ء کو راسپوٹین کو پورے شاہی اعزاز کے ساتھ ایک باغ میں دفن کیا گیا۔

اس کے قاتلوں کو شاہی خاندان کے افراد ہونے اور اقربا کی رحم بھری اپیلوں کے باعث دور دراز کے علاقوں میں جلاوطن کردیا گیا۔

☆......☆

انقلابی تخریبی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ ان کا پہلا مقصد زار کا تختہ الٹنا تھا۔ ریلوے لائنیں اڑائی جارہی تھیں۔ مارچ 17ء تک مظاہروں اور تخریب کاری نے ایسا زور باندھا کہ حکومت بے بس نظر آنے لگی۔ انقلابیوں نے شہر کے خفیہ مقامات پر مشین گنیں نصب کردیں۔ پولیس اور عوام میں جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ جیلوں کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کرا لیا گیا۔ زار روس اس وقت بھی محاذ جنگ پر فوجوں کے معائنے میں مشغول تھا۔

حالات اتنے بگڑ گئے تھے کہ پولیس کے لیے سنبھالنا مشکل تھا۔ پارٹی کے یہودی لیڈروں نے عورتوں کو سڑک پر لا کر حالات بالکل ہی بے قابو کردیے۔ ان کارروائیوں کے پیچھے یقین تھا جو برسوں کی کارروائیوں کے بعد اب منزل کے نزدیک تھا۔ زار روس کو پیغام پہنچایا گیا کہ حالات سنگین ہیں۔ زار بھی اب سمجھ گیا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا اس نے محاذ جنگ ہی سے حکومت ختم کرنے کے احکامات جاری کردیے۔

معزول شدہ حکومت کے صدر نے شہنشاہ زار روس کو ایک اور تار دیا۔ ”آخری وقت آن پہنچا ہے ہمارے عزیز وطن اور شاہی خاندان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔“

بغاوت کے یہ شعلے فوجی چھاؤنی تک پہنچ گئے۔ کئی رجمنٹوں نے بغاوت کردی اور سپاہ کی اکثریت انقلابیوں کے ساتھ مل گئی۔ جب فوج ہی نے ہتھیار ڈال دیے تو کیا رہ گیا۔ دارالحکومت کا کنٹرول فوج نے سنبھال لیا اور انقلابیوں کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔

اس خونی انقلاب کے بعد 15 مارچ 1917ء کو شہنشاہ زار روس کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس وقت راسپوٹین کو مرے ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے۔ ملکہ نے زار کو راسپوٹین کی پیش گوئی پڑھ کر سنائی۔

”مجھے معلوم ہے کہ ابلیس کے گماشتے مجھے تم سے جدا کررہے ہیں لیکن ان کی ایک نہ سنو۔ اگر میں تم سے دور ہو گیا تو چھ ماہ کے اندر اندر نہ صرف تم اپنا آپ کھو بیٹھو گے بلکہ تخت وتاج بھی تم سے چھن جائے گا۔“

یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔

زار روس کی تخت سے دست برداری کے صرف ایک ہفتے بعد یعنی 21 مارچ 1917ء کو انقلابیوں نے راسپوٹین کی قبر کھودی اور تابوت کو جنگل میں لے جا کر آگ کے ایک بڑے الاؤ میں ڈال دیا۔

روس کی سب سے طاقت ور شخصیت کا انجام اتنا بھیانک ہوگا یہ کس نے سوچا تھا۔ 1871ء میں پیدا ہونے والا یہ شخص 1916ء میں صرف 45 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوا۔

ماخذ:

راسپوٹین، ڈاکٹر شاہد مختار

لینن (سوانح عمری) مترجم: ظ انصاری

پردۂ اسرار

کاشف زبیر

بے قراری کے موسم کی پاسداری اس کا مقدر تھی۔ وہ کسی کل چین نہ پاتا تھا۔ دردِ زندگانی قدم بہ قدم ہمرکاب تھی اور وہ سکندر بن کر نئی دنیا کا متلاشی تھا۔ اس نے تصوف کے چہار فرقہ کو آزمایا بالآخر اسے اپنے نانا کا فرقہ ملامتیہ زیادہ بھایا، بس اس نے راہِ سلوک کی اس راہِ دشوار کو اپنا لیا اور ایک جہان کے اذہان میں تبدیلی کی نئی لہر دوڑا دی، ایک بڑا طبقہ اس کے نام کی مالا جپنے لگا۔

کراچی کی ایک اسرار بھری شخصیت کا ذکرِ خاص

صبح کا اوّل پہر تھا تاریکی غالب تھی مگر اس کا غلبہ زیادہ دیر رہنے والا نہیں تھا۔ ہوا میں نباتات کی خوشبو تھی۔ سامنے دور تک کھیت تھے اور ان کے درمیان کہیں کہیں باغات تھے۔ آسمان پر تیزی سے غائب ہوتے تارے چمک رہے تھے۔ آبادی ذرا دور تھی اور اس ویرانے میں صرف دو انسان موجود تھے۔ ان دو حضرات میں ایک نوجوان تھا۔ خوش رو اور چمکتی آنکھوں والا نوجوان جس کی آنکھوں اور ذہانت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی کیفیت نمایاں

تھی۔ یہ کیفیت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے اور انہیں ملتی ہے جن سے اللہ کوئی کام لینا چاہتا ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی ریش تھی جو بھلی لگ رہی تھی۔ دوسرے ایک بزرگ تھے، سفید ریش اور اوپر سے صاف سر والے۔ داڑھی گھنی اور کسی قدر چڑھی ہوئی تھی۔ سادہ کرتہ اور لنگی میں وہ عام سے فرد لگ رہے تھے۔

لیکن ان کی آنکھوں میں وہی کیفیت کہیں زیادہ شدید تاثر کے ساتھ تھی۔ شاید جو کچھ نوجوان حاصل کرنا چاہ رہا تھا وہ پہلے ہی پا چکے تھے۔ نوجوان نے کئی بار ان بزرگ آنکھوں میں دیکھنا چاہا مگر ہمت نہ ہو سکی۔ حالانکہ ان میں بہت قریبی رشتہ تھا۔

فجر کی نماز کے بعد صبح کا وقت تھا۔ مسجد سے ذرا دور اس جگہ سبزہ و گل پر روشنی یوں آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھی کہ جیسے انکشاف کے دروازے کھلتے ہیں۔ جیسے انسان وہ دیکھتا ہے جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ جب وہ اس طرح سے دیکھتا ہے تو اس کی دیکھنے کی خواہش شدت اختیار کر جاتی ہے۔ بہ ظاہر عام سا منظر تھا جو ہر روز ہی دکھائی دیتا تھا لیکن اس وقت اس منظر کا تاثر ہی کچھ اور تھا۔ بزرگ نے نوجوان کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ دونوں خاموش تھے مگر محو کلام بھی تھے۔ نوجوان جو دیکھ رہا تھا وہ اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا اور سینے کے پنجر میں اس کا دل ہمک ہمک کر دھڑک رہا تھا۔ بزرگ نے نوجوان کی طرف دیکھا اور خاموش لفظوں میں سوال کیا۔ ''دیکھ رہے ہو؟''

''جی دیکھ رہا ہوں۔'' نوجوان نے خاموش لفظوں میں ہی جواب دیا۔

''اس سے آگے دیکھنا چاہتے ہو؟''

''اب اس خواہش کے سوا دل میں اور کچھ نہیں ہے۔''

''قیمت جانتے ہو؟''

''نہیں، مگر میں اپنا سب دینے کو تیار ہوں۔''

''تمہارے پاس کیا ہے؟ کیا لے کر آئے تھے؟''

جب نوجوان نے سوچا تو اندر ہی اندر شرمندہ ہونے لگا۔ اس نے سوچا تو تعجب بھی ہوا۔ واقعی وہ کیا لے کر آیا تھا۔ اس کے پاس اس کا کچھ نہیں تھا پھر وہ کیا دینے کی بات کر رہا تھا۔ اس بار اس نے ندامت سے اعتراف کیا۔

''کچھ بھی نہیں، میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ میں کسی بھکاری کی طرح خالی ہاتھ ہوں۔''

بزرگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔ ''اب تم نے ٹھیک کہا ہے۔ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے مگر ایک چیز ہے۔ یہ خالی ہاتھ اور اسے یہی چاہیے۔''

''کیا وہ قبول کرلے گا؟''

''کیوں نہیں کرے گا۔ وہ تو اپنے بندوں کا منتظر ہوتا ہے کہ اس کی طرف آئیں۔ بندہ خالی ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اسے بھرے خزانوں سے تھام لیتا ہے۔ اس کے بندے ایک قدم آتے ہیں تو وہ دس قدم آتا ہے۔ بندے چل کر آتے ہیں تو وہ دوڑ کر آتا ہے۔ اس کی بس ایک ہی شرط ہے۔''

''کیسی شرط؟''

''اس کے ہو جاؤ۔ پورے کے پورے اور کسی کے ذرا سے بھی نہ رہو۔'' بزرگ نے سلسلہ تکلم بزبان خاموشی جاری رکھا۔ ''وہ شرک برداشت نہیں کرتا ہے۔''

''اس کا کیسے ہو جاؤں؟''

''بہت آسان ہے، لیکن بہت ہی مشکل ہے۔'' بزرگ نے بہت بڑی حقیقت بہت سادہ لفظوں میں بیان کی۔ لفظ بھی وہ جو خاموش تھے۔ ''اپنا سب اس پر چھوڑ دو اور اس کے ہر فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دو۔ اپنی مرضی سے کچھ نہ چاہو اور اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ چاہو۔ بولو ایسا کر سکو گے۔ یہ سوچ کر عہد کرنا کہ اسے نبھانا آسان نہیں ہے۔ اگر آسان ہوتا تو آج زمین اللہ کے ولیوں سے بھری ہوتی۔''

روشنی رفتہ رفتہ پوری طرح پھیل چکی تھی۔ دنیا میں روشنی ہر روز ہوتی ہے۔ ہر تاریک رات کے بعد اجلا دن نمودار ہوتا ہے لیکن نوجوان کے اندر روشنی پہلی بار آئی تھی اور یہ کبھی نہ ختم ہونے والی روشنی تھی۔ یہ روشنی اسے سکون دے رہی تھی اس کی بے چینی کو ختم کر رہی تھی جو بہت دنوں سے اسے بے قرار کیے ہوئے تھی۔ اس نے احترام سے بزرگ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں عہد کرتا ہوں کہ میں اسے نبھاؤں گا انشااللہ۔''

نوجوان کا نام سید محمد عظیم تھا۔ اس نے یہ عہد دل سے کیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی مراد بر آئے گی۔

☆☆☆

یوپی کے ضلع بلند شہر کے اس چھوٹے سے قصبے خورجہ میں مسلمان اکثریت میں تھے اور زیادہ وسط ایشیا سے

ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ان میں ایک سید خاندان بھی تھا جو کئی نسلوں سے یہاں آباد چلا آرہا تھا۔مگر یہ خاندان وسط ایشیا سے نہیں بلکہ سرزمین عرب سے آکر سرزمین ہند پر آباد ہوا تھا۔مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ لیکن اپنی نیک نامی اور دینی خدمات کے حوالے سے یہ خاندان اس سارے علاقے میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ حسین مہدی بدیع الدین شیر دل اس خاندان کے ایک ممتاز چشم و چراغ تھے۔بچپن میں مکتب کی تعلیم حاصل کی اور جوان ہونے پر انگریزوں کی نوکری کر لی۔ان کی شادی اپنے ہی خاندان کے ایک بزرگ کی صاحب زادی سعیدہ بی بی سے ہوئی اور 1898ء میں اس خاندان میں دوسرے بچے اور پہلے بیٹے نے جنم لیا۔اس خاندان کو اللہ نے پہلے رحمت سے اور پھر اپنی نعمت سے نوازہ تھا۔ماں باپ نے اس کا نام محمد عظیم رکھا۔اسکول میں داخلے کے وقت پورا نام سید محمد عظیم لکھوایا گیا۔

ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شجرہ نسب سیدنا حسینؓ اور سیدنا حسنؓ سے جا ملتا ہے۔جد امجد فضیل مہدی عبداللہ عرب مکہ سے ہجرت کر کے برصغیر کے علاقہ مدراس میں آباد ہوئے۔ان کے دو بیٹوں حسین مہدی رکن الدین اور حسن مہدی جلال الدین سے ان کی نسل آگے چلی اور چوتھی پیڑھی میں محمد عظیم پر آکر دوبارہ جمع ہوگئی۔جناب فضیل مہدی ان کے دادا کے دادا تھے۔چار نسلوں سے علم اور زہد اس خاندان کا طرۂ امتیاز چلا آرہا تھا۔اسی مناسبت سے پورے برصغیر میں اس خاندان کی عزت و شہرت تھی۔مگر اس شہرت اور عزت کو دنیاوی مال و متاع میں تبدیل کرنا ان کا شیوہ نہیں تھا۔سب ہی ملازمت پیشہ یا اپنا کام کر کے روزی کمانے والے تھے۔دین کو کبھی روزی کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا۔اپنے ہاتھ کی کمائی کو ہی کسب حلال سمجھتے تھے۔محمد عظیم کے والد حسین مہدی ملازمت پیشہ تھے اور انگریز فوج میں تھے۔

انہوں نے انگریزوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ ان کے نظم و ضبط اور ترقی سے متاثر تھے۔ان کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد بھی جدید تعلیم حاصل کرے اور اسی لیے محمد عظیم کو اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ ہوا۔مگر اسکول سے پہلے محمد عظیم کو مقامی مدرسے میں داخل کرایا گیا تاکہ وہ قرآن مجید اور دین کی ابتدائی تعلیم حاصل کر سکے۔والد کی خواہش تھی کہ بیٹا دور جدید کی تعلیم حاصل کرے جب کہ والدہ سعیدہ بی بی کی خواہش تھی کہ بیٹا دین کی تعلیم حاصل کرے اور راہ سلوک پر چلے۔یہ خواہش انوکھی نہیں تھی کیونکہ سعیدہ بی بی بابا تاج الدین ناگپوری کی صاحبزادی تھیں اور ان سے دین کی تعلیم حاصل کی تھی۔بھلا وہ کیوں بیٹے کے لیے دنیاوی تعلیم کی خواہش ظاہر کرتیں۔مگر شوہر کی اطاعت شعار خاتون نے ان کے حکم کے آگے سر جھکایا اور محمد عظیم کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے تیار ہوگئیں۔

لیکن ساتھ ہی انہوں نے شوہر سے منوالیا کہ پہلے محمد عظیم مدرسے میں پڑھے گا اور جب یہاں سے ناظرہ قرآن مکمل کرلے گا تو اسے اسکول میں داخل کرایا جائے گا۔اسی بنا پر جب اسے اسکول میں داخل کرانے کا وقت آیا تو اس کی عمر نویں سال میں لگ چکی تھی۔اس زمانے میں تاریخ پیدائش سے زیادہ سن پیدائش یاد رکھنے کا رواج تھا اس لیے جب محمد عظیم کو اسکول میں داخل کرانے کا وقت آیا تب بھی رجسٹر میں اس کا سن پیدائش ہی لکھا گیا اور تاریخ پیدائش آج بھی نامعلوم ہے۔محمد عظیم نے محلے کے مدرسے سے قرآن کریم کا ناظرہ مکمل کیا اور دین کے بارے میں ابتدائی تعلیم والدہ نے دی۔ان کی خواہش تھی کہ محمد عظیم کچھ عرصہ اپنے نانا تاج الدین کے ساتھ گزارے۔مگر مدرسے کے فوراً بعد اسکول کا سلسلہ شروع ہوگیا۔پہلا اسکول ایک پرائمری اسکول تھا۔مدرسے اور گھر سے محمد عظیم نے بہت کچھ سیکھا تھا مگر اسے یہاں پہلی کلاس میں داخلہ ملا اور محمد عظیم نے پرائمری تعلیم یہیں سے حاصل کی۔

حسین مہدی زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن گھر کا ماحول انہوں نے دینی اور ادبی رکھا تھا۔خاص طور سے انہیں شعر و شاعری سے شغف تھا اور اکثر گھر میں ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔محمد عظیم کا ان سے متاثر ہونا لازمی تھا۔اس کا ادبی شعری ذوق پروان چڑھ رہا تھا۔اس زمانے میں یوپی کے شرفا میں شعر و شاعری اتنی ہی لازم سمجھی جاتی تھی جتنا کہ آج کے دور میں تعلیم حاصل کرنا۔کسی اَن پڑھ کا شعر کہنا اتنا تعجب انگیز نہیں ہوتا تھا جتنا کہ کسی پڑھے لکھے کا شاعر نہ ہونا۔لوگ نہ صرف شعر و شاعری کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے بلکہ اپنے بچوں خاص طور سے بیٹوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے کہ کم عمری سے ان کا شعری ذوق پروان چڑھے۔محمد عظیم بھی والد کے ہمراہ ایسی محفلوں میں شریک

ہوتا تھا۔ اگرچہ روایتوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا مگر یہ ایسی بات تھی جیسے لوگوں کا شادی بیاہ میں شریک ہونا اور اس کا ذکر لازمی نہیں سمجھا جاتا ہے۔

1857ء کے زوال کی انتہا کے بعد مسلمان سنبھلنا شروع ہوگئے تھے اور انہوں نے بہ حیثیت قوم اپنی قوت کو جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ اقتدار اور طاقت سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں نے سرسید کی قیادت میں درست ترین فیصلہ کیا کہ تعلیم اور جدید تعلیم ہی مسلمانوں کو اس پستی سے نکال سکتی ہے۔ علی گڑھ اسکول جو بعد میں کالج بنانے اور سرسید کی وفات کے خاصے عرصے بعد جاکر اسے یونیورسٹی کا درجہ ملا تھا۔ اس وقت ہر مسلم نوجوان کی دل کی دھڑکن تھا۔ اسکول کے آخری سالوں میں پڑھنے والے نوجوان علی گڑھ جاکر پڑھنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ علی گڑھ صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ سیاسی تربیت کا ایک ایسا ادارہ بن گیا جس نے بجا طور پر تحریکِ پاکستان میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ یہ علی گڑھ سے پڑھے لکھے نوجوان تھے جنہوں نے پاکستان کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔

لازماً محمد عظیم بھی علی گڑھ کے نام سے متاثر تھا۔ پرائمری تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لیے اسے بلند شہر کے ہائی اسکول بھیجا گیا۔ یہ ایک مسلم اسکول تھا اور یہاں بیشتر مسلمان بچے ہی پڑھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علی گڑھ جانا چاہتے تھے۔ اگرچہ اس وقت مسلمان الگ وطن کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے لیکن ان میں سیاسی شعور اور ملک کی سیاست میں اپنا حصہ شامل کرنے کا رجحان تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ مسلم لیگ غیر فعال تھی اور تحریکِ خلافت کا آغاز تھا۔ یہ براہ راست انگریزوں سے تصادم والی بات تھی اس لیے مسلم لیگ نے اس کی حمایت سے انکار کیا اور نتیجے میں عوام نے مسلم لیگ کی حمایت سے انکار کردیا۔ مسلمان جذباتی طور پر خود کو خلافت سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس معاملے میں دماغ کے بجائے دل سے سوچا۔ کانگریس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کو مزید اکسایا۔ خلافت کے ساتھ تحریکِ ہجرت اور ترک موالات کی تحریک بھی شروع ہوئی اور اس نے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ جذباتی مسلمانوں نے انگریزوں کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور انگریزی چیزوں کے ساتھ اس کی تعلیم کا بائیکاٹ کرنے لگے۔ لوگوں نے اپنے بچوں کو اسکول سے اٹھالیا۔

حسین مہدی اور ان کے خاندان والے اگرچہ تحریکِ خلافت کے حق میں تھے لیکن انہوں نے ہجرت اور ترک موالات میں حصہ نہیں لیا۔ محمد عظیم اس وقت اسکول میں تھا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ملک کے حالات اور سیاست میں ہونے والی تبدیلیاں بھی دیکھ رہا تھا۔ فطری طور پر وہ بھی خلافت کا حامی تھا مگر ابھی وہ زیرِ تعلیم تھا اور کھل کر اپنی حمایت کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ اسی دور میں اس نے محسوس کیا کہ صرف جدید تعلیم مسلمانوں کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ جیسے صرف دینی تعلیم کے بل بوتے پر آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح جدید سائنسی نظریات جو مسلم نوجوانوں کو متاثر کررہے تھے۔ دین کے حوالے سے مسائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دوسری طرف علمائے کرام پڑھے لکھے نوجوانوں کی اضطرابی کیفیت کی تسلی کرنے سے قاصر تھے۔ خود محمد عظیم بعض سوالوں کے جواب علمائے دین سے چاہتا تو اسے غیر تسلی بخش جواب ملتا تھا۔ قصور علما کا نہیں تھا بلکہ دورِ حاضر سے لاعلمی کا تھا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ جا بہ جا مسلمانوں سے زمین و آسمان پر غور کرنے کو کہتا ہے۔ مگر مسلمان نصاب رٹ کر سمجھتے تھے کہ انہوں نے اللہ کے فرمان پر عمل کرلیا ہے۔

اسی طرح بہت سے سوالات تھے جو محمد عظیم کے اندر اٹھتے تھے مگر اسکول کی تعلیم ان کا جواب دینے سے قاصر تھی۔ گھر میں بھی کچھ سوالوں کے جواب والد صاحب نہیں دیتے تھے اور کچھ کے جوابات دینے سے والدہ قاصر تھیں۔ دین دار اور پرہیزگار ہونے کے باوجود ان کی دینی تعلیم اتنی نہیں تھی کہ وہ محمد عظیم کے ذہن میں آنے والے دین و دنیا کے حوالے سے سوالوں کے جواب دے سکیں۔ مگر وہ اس کے سوالات سن کر خوش ہوتی تھیں اور اسے ترغیب دیتیں کہ وہ اپنے نانا سے ملے شاید ان کے پاس ان سوالوں کے جواب ہوں۔ محمد عظیم کی مجبوری تھی کہ وہ والد کے حکم کے مطابق اسکول کی تعلیم حاصل کررہا تھا اور جب تک یہ تعلیم جاری تھی وہ از خود کہیں جانے اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ اسے انتظار تھا کہ وہ اپنا تعلیمی سلسلہ مکمل کرلے اس کے بعد وہ اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرے گا۔

بلند شہر کے اسکول سے محمد عظیم نے میٹرک مکمل کیا اور اس سے پہلے ہی اس نے علی گڑھ جا کر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ والد صاحب اس کے فیصلے سے خوش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ علی گڑھ یونیورسٹی سے وہ اعلیٰ ڈگری حاصل کرے۔ ویسے بھی علی گڑھ کا نام اور معیار پورے ہندوستان میں مشہور ہو چکا تھا۔ اس وقت وہاں ہزاروں کی تعداد میں مسلم نوجوان پڑھ رہے تھے اور کہتے ہیں کہ داخلے کے خواہش مند کسی نوجوان کو انکار نہیں کیا جاتا تھا اگر وہ داخلے کا اہل ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ علی گڑھ سے فارغ ہونے والے نوجوان اتنی کثرت سے ہر شعبے اور خاص طور سے بیوروکریسی میں آئے کہ لگتا ہے اس وقت مسلمانوں کی واحد درسگاہ علی گڑھ ہی تھی۔ محمد عظیم نے علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ وہ انٹر میں آیا تھا۔ یہاں اس جیسے ہزاروں طلبا تھے اور وہ ان میں نمایاں نہیں تھا۔ مگر اس کے اندر کا انسان ان سب سے الگ تھا اور وہ جلد ان سے الگ ہونے والا تھا۔

سر سید نے مسلمانوں کو عصری تعلیم کی طرف متوجہ کیا مگر وہ عصری تعلیم کو خالصتاً سائنسی نقطۂ نظر سے لینے لگے اور دین کو اس معاملے سے بالکل خارج کر دیا۔ یہ تقریباً وہی غلطی تھی جو مدرسوں میں روا رکھی گئی تھی کہ وہاں صرف دین پڑھایا جاتا تھا اور دنیا کو اس سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس لیے وہاں سے صرف عالم نکلے۔ اسی طرح علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آشنا کیا مگر غیر شعوری طور پر وہ نوجوانوں کو دین سے دور کرتے چلے گئے۔ دونوں طبقات میں دوری پیدا ہوئی اور یہ اس حد تک بڑھی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے روادار بھی نہیں رہے تھے۔ دین دار طبقہ حقارت سے اور بعد میں خود علی گڑھ تحریک سے تعلق رکھنے والے افراد بھی خود کو فخر سے نیچری یعنی فطرت پرست کہنے لگے۔ عام فہم لفظوں میں وہ مادہ پرست کہلانے لگے تھے۔

حالانکہ ان میں سے اکثریت سلجھے ہوئے مذہبی رجحانات رکھنے والے افراد کی تھی۔ مگر تحریک پر غلبہ ان حضرات کا رہا جنھوں نے دین سے بیر اپنا لیا تھا اور اس پلیٹ فارم سے کھلے بندوں اس کا پرچار کرتے تھے۔ وہ دین اور اس سے وابستہ شخصیات کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ محمد عظیم یہ سب دیکھتا اور اسے لگتا کہ یہ اس کا میدان نہیں ہے اسے یہاں نہیں بلکہ کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔ مذہب اور اس سے وابستہ شخصیات سے محبت اس کے خون میں شامل تھی۔ اس لیے جب وہ لوگوں کو ان سے بیزاری کا اظہار کرتے دیکھتا تو اسے اندر سے دکھ ہوتا تھا۔ وہ سوچتا کہ تعلیم تو انسان کو مہذب اور متحمل بناتی ہے یہ کیسی تعلیم تھی جسے حاصل کر کے انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کی دل آزاری پر اتر آیا تھا۔ بہت جلد اس کا دل علی گڑھ سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ سوچتا کہ یہ جگہ چھوڑ دے۔ مگر والد صاحب چاہتے تھے کہ وہ علی گڑھ میں پڑھے اور یہاں سے ڈگری حاصل کرے۔ جب کہ وہ بیزار ہوتا جا رہا تھا۔

اس کشمکش کا اثر اس کی تعلیم پر بھی پڑا تھا۔ محمد عظیم بہت ذہن نوجوان تھا اور اس نے اسکول کی تعلیم بہت اچھے نمبروں سے پاس کی تھی۔ کالج کا نصاب اگرچہ اسکول کے مقابلے میں مشکل تھا مگر اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ اب دنیا کی تعلیم میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ خالص دینی تعلیم کی طرف اس کا رجحان نہیں تھا۔ اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کس راستے پر چلے؟ جہاں اسے سکون ملے اور ان سوالوں کے جوابات بھی جو اس کے ذہن میں چکراتے رہتے تھے۔ پھر کسی نے اسے صوفی مولانا کابلی کے مزار کے بارے میں بتایا۔ سلسلہ سہروردیہ کے یہ بزرگ مولانا کابلی صوفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کابل کی مناسبت سے کابلی کہلاتے تھے اور انتقال کے بعد ان کا مزار علی گڑھ میں بنا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی مولانا کابلی سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کے مزار پر حاضری دیتے تھے۔

محمد عظیم مزار پر گیا تو اسے اپنی اندرونی بے چینی میں خاصا فرق محسوس ہوا اور اسے یوں لگا جیسے وہ اسی جگہ آگیا ہے جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب اکثر یہاں آیا کرے گا۔ درسگاہ میں ان دنوں چھٹیاں تھیں اس لیے وہ صبح سویرے یہاں آجاتا اور رات گئے واپس ہاسٹل جاتا تھا۔ وہ زیادہ تر مزار کے اندر والے حصے میں قبر کے پاس بیٹھا کرتا اور کبھی کبھی وہاں کی صفائی بھی کرتا تھا۔ وہاں رہنے اور مزار کی صفائی کرنے سے اسے روحانی خوشی ملتی تھی۔ مگر اسے تو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس کی رہنمائی کر سکے اور اسے نہ صرف راستہ دکھائے بلکہ منزل تک بھی لے جائے۔ بچپن سے وہ اپنے نانا تاج الدین بابا ناگپوری کے بارے میں سنتا آیا تھا مگر اسے چند ایک بار ہی

ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا تھا۔ جب بھی جاتا ہوا مختصر مدت کے لیے ہوا۔ ایک دن وہ مزار میں بیٹھا تھا کہ اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ ناگپور جا کر نانا کی خدمت میں حاضری دے۔ علی گڑھ سے زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا۔ وہ نانا سے مل بھی لیتا اور شاید وہ اس کی رہنمائی کریں۔ یہ خیال آتے ہی محمد عظیم نے سامان باندھا اور ناگپور پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی بابا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ دونوں بازو پھیلا دیے۔ نواسہ نانا کے سینے سے لگ گیا۔

''مجھے خبر مل گئی کہ تم چل پڑے ہو نانا نے پیٹھ تھپک کر کہا۔ اب میرا بھی وقت چل چلاؤ کا ہے۔ کوئی تو ہو جو چراغ روشن رکھے۔''

محمد عظیم نے چونک کر نانا کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ نانا نے اس کے دل کا حال جان لیا ہے کہ ان کا نواسا کس راہ کا مسافر ہے اور اندر سے بے چین ہے۔ انہوں نے چند دن اسے اپنے ساتھ رکھا اور اپنی نگرانی اور توجہ کے ساتھ سلوک کی منزلیں طے کرائیں۔ اس سے پہلے انہوں نے نوجوان محمد عظیم کو باطنی دنیا کی کچھ جھلکیاں دکھائیں تاکہ وہ جان سکے کہ آگے اسے کن حالات سے واسطہ پڑے گا اور وہ پوری رضامندی اور ذہنی تیاری کے ساتھ اس راہ پر قدم رکھے جس پر چلنا آسان نہیں ہے۔ یہاں قدم قدم پر دھوکے ہیں اور بھٹک جانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔ شاید اسی لیے رہنما کی ضرورت کو اشد بیان کیا گیا ہے۔ محمد عظیم کی خوش قسمتی کہ اسے اپنے خاندان کے بزرگ رہنما کے طور پر ملے۔ جو استاد بھی تھے اور مشفق بھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ بابا تاج الدین نے اولیا اللہ کی اس راہ کو چنا تھا جو سب سے کٹھن ہے، جسے فرقہ ملامتیہ کہا جاتا ہے۔ جس کا اصول ہے کہ خود کو چھپا کر رکھو دنیا والوں کے سامنے خود کو اس طرح پیش کرو کہ دنیا والے کراہیت محسوس کریں اور چھپ کر عبادت کرو۔

محمد عظیم نے ان کے ساتھ رہ کر وہ سب کچھ سیکھا اور جانا جو روحانی راستے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس راستے پر لے جانے سے پہلے بابا تاج الدین نے محمد عظیم کو تو راضی کر لیا تھا مگر اس کے والد صاحب کو راضی کرنا ابھی باقی تھا۔ جب تک ماں باپ اجازت نہ دیں جہاد جیسا اہم فرض بھی جائز نہیں ہوتا ہے۔ اللہ والوں سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ کسی سالک کے لیے راہ سلوک پر چلنا اور منزل پر پہنچنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے ماں باپ کی رضامندی اور دعائیں اس کے ساتھ شامل نہ ہوں۔ بابا صاحب نے خود اطلاع بھیجی یا کسی ذریعے سے والد صاحب تک اطلاع پہنچی کہ ان کا بیٹا اب کچھ اور ہی پڑھنا چاہتا ہے۔ دنیاوی تعلیم سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ یہ ان کے لیے بڑی خبر تھی، وہ فوری ناگپور پہنچے۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح محمد عظیم علی گڑھ واپس جانے اور وہاں اپنی باقی رہ جانے والی تعلیم مکمل کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ مگر وہ پوری طرح فقر کی طرف مائل ہو چکا تھا اس نے والد صاحب سے کہہ دیا۔ ''مجھے اسی راہ پر چلنے دیں۔''

بیٹے سے مایوس ہو کر داماد نے سسر سے فریاد کی اور کہا۔ ''اسے کم سے کم تو ڈگری حاصل کرنے دیں۔''

مگر بابا تاج الدین خود نواسے کو اب اپنے پاس دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے داماد سے کہا۔ ''تم اس کے باپ اور مختار ہو لیکن اگر یہ مزید پڑھ گیا تو پھر میرے کام کا نہیں رہے گا۔''

والد صاحب مایوس ہوئے تھے کہ بیٹا اور سسر ایک ہی زبان بول رہے تھے۔ وہ دونوں سے ہی محبت کرتے تھے۔ پھر انہوں نے محسوس کیا کہ رضائے الٰہی بھی یہی ہے۔ اس لیے انہوں نے بیٹے کو اجازت دی اور کہا۔ ''میرے بیٹے اب تم سمجھ دار ہو۔ اس لیے جس طرح چاہے اپنا مستقبل بناؤ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

محمد عظیم خوش ہو گیا تھا۔ وہ بھی ماں باپ کی رضامندی سے روحانیت کی منزل کی طرف جانا چاہتا تھا۔ ماں کی طرف سے اسے پہلے ہی اطمینان تھا بلکہ شاید یہ ان ہی کی خواہش تھی جو وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اب والد بھی راضی ہو گئے تھے۔ وہ باقاعدہ بیعت کر کے بابا تاج الدین ناگپوری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوا اور مسلسل نو برس تک ان سے طریقت کے اسرار و رموز سیکھتا رہا۔

بابا تاج الدین ناگپوری نہ صرف صاحبِ طریقت بلکہ صاحبِ منصب بھی تھے۔ فقر ان کی شخصیت سے ٹپکتا تھا۔ بیسویں صدی کی جن شخصیات نے اس میدان میں شہرت حاصل کی ان میں بابا تاج الدین ناگپوری کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ زہد و تقویٰ، علم و حلیم اور عاجزی اور انکساری ان کی شخصیت کا جزو تھیں۔ معمولی غذا، معمولی لباس اور دنیا کے معمولی ترین لوازمات بھی ان کا اثاثہ نہیں تھے۔

وہ اسے فقیر پراو پرداے کی عنایات قرار دیتے تھے۔ایسے شخص کی صحبت میں نو سال گزارنے والا کیا کچھ حاصل کر کے وہاں سے اٹھے گا ہم اس کا اندازہ ہی لگا سکتے ہیں۔

☆☆☆

سعیدہ بی بی (والدہ محمد عظیم) بہت کم عمری میں بیاہ دی گئی تھیں۔شاید وہ تیرہ برس کی تھیں جب حسین مہدی کی زوجیت میں آئیں اور بہت کم عمری میں ہی وہ دنیا سے رخصت بھی ہو گئیں۔اس وقت ان کی عمر چھتیس سینتیس برس سے زیادہ نہیں ہوگی۔چھ بچوں میں سب سے بڑی بیٹی تھی جو بیاہی جا چکی تھیں اور ان کے بعد محمد عظیم تھے۔وہ جوان تھے مگر باقی بہن بھائی جن میں دو بھائی اور دو ہی بہنیں تھیں ابھی کمسن اور پرورش کے محتاج تھے۔والد صاحب کو غم روزگار سے فرصت نہیں تھی اور دوسری شادی کی طرف میلان نہیں تھا۔شاید وہ مرحومہ کی جگہ کسی اور کو دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔اس لیے یہ بار عظیم، محمد عظیم کے شانوں پر آن پڑا۔بھائیوں کا مسئلہ نہیں تھا مگر بہنوں کی پرورش میں انہیں بہت دشواری پیش آرہی تھی۔بہت سے امور ایسے تھے جو ایک بھائی اپنی بہن کو بتا اور سمجھا نہیں سکتا ہے۔کوئی عورت ہی ان بچیوں کی اس حوالے سے پرورش کر سکتی تھی۔وہ پریشان ہو گئے اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو مرشد بابا تاج الدین ناگپوری سے مشورہ اور مسئلے کا حل چاہا۔انہوں نے حسب توقع اس مشکل کا حل نکالا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ان کے ارادت مند کی صاحبزادی سے شادی کرلیں۔انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔

گھر میں خاتون خانہ آگئیں تو سب معاملات درست ہوتے چلے گئے اور محمد عظیم گھر کی فکروں سے بے نیاز ہو کر روزگار اور اس کے ساتھ ساتھ روحانی تعلیم میں مگن ہو گئے۔بلکہ تعلیم مقدم تھی اور دنیاوی معاملات کی ان کی نظر میں اتنی اہمیت نہیں تھی۔مگر ان ہی دنوں رب حقیقی کی طرف سے بابا تاج الدین کا بلاوا آگیا۔لیکن اپنے بلاوے سے پہلے وہ محمد عظیم کو وہ کچھ سکھا چکے تھے جو ان کے لیے قلندر بننے کو کافی تھا۔اس کے باوجود مرشد اور شفیق نانا کی جدائی برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔جب ناگپور میں ان کے حجرے اور مسجد کو ان کے وجود سے خالی پایا تو ایسی وحشت ہوئی کہ انہوں نے وہاں سے ترک مکانی کا فیصلہ کرلیا۔مگر ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ناگپور سے کہاں جائیں؟ خورجہ اور بلند شہر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔علی گڑھ میں مولانا کابلی کا مزار تھا مگر انہوں نے وہاں بھی سکونت اختیار کرنے کا نہیں سوچا۔

بہن بھائی اور والد صاحب اب ان کے ساتھ تھے اور کفالت کے لحاظ سے وہی گھر کے بڑے بن گئے تھے اس لیے فیصلہ بھی انہی کو کرنا تھا کہ وہ کہاں جائیں اور سکونت اختیار کریں۔محمد عظیم کا ذریعہ معاش زیادہ تر تحریر سے وابستہ تھا۔شاعری ان کا شوق تھا۔ایسے میں انہیں تحریر و ادیب اور شعر و شاعری کے لحاظ سے متحدہ ہندوستان کا دارالحکومت دہلی ہی سب سے مناسب جگہ لگی۔وہ معہ اہل و عیال دہلی اٹھ آئے اور پھر قیام پاکستان تک یہیں قیام کیا۔والد صاحب عمر کی اس منزل پر تھے جہاں انسان کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں اور وہ پورے خاندان کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ناگپور میں قیام کے دوران جب محمد عظیم نے یہ بات محسوس کی تو انہوں نے ایک سعادت مند بیٹے کی طرح آگے بڑھ کر یہ ذمے داری اپنے شانوں پر لے لی۔

رجحان شروع سے شعروادب کی طرف تھا اس لیے قلم کو ذریعہ روزگار بنایا اور مختلف رسائل میں لکھنا شروع کر دیا۔دن بھر ادبی کام کرتے، شام اور رات کے ابتدائی پہر میں ادبی محفلیں ہوتیں جن میں شہر کے منتخب ادیب اور شعرا شرکت کرتے تھے اس کے بعد رات کا آخری پہر رب اور بندے کے لیے مخصوص ہو جاتا تھا۔عبادت اور ریاضت کے ساتھ ساتھ رب کائنات سے رازو نیاز ہوتے تھے۔کوئی نہیں جانتا کہ رات کے اس پہر میں محمد عظیم اپنے رب سے کیا بات کرتے تھے اور ان کا طریقہ کیا تھا۔مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔اس وقت کے دورانیے میں اضافہ ہوتا گیا اور لب پر خاموشی کے تالے گہرے ہوتے چلے گئے۔شاید وہ جو دیکھتے اور سنتے تھے وہ زبان پر آنہیں سکتا تھا۔اللہ نے انہیں علم کے ساتھ اسے برداشت کرنے کا حوصلہ بھی دیا تھا ورنہ بہت سے منصور بن حلاج کی طرح برداشت کی سکت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ کہہ جاتے جو نہیں کہنا چاہیے اور دار ورسن ان کا مقدر بن جاتا تھا۔

ذاتی طور پر محمد عظیم کی پریشانیاں کم نہیں تھیں۔فقیر کے گھر میں فقر و فاقہ ہی ہوتا ہے۔دوسری تکالیف بھی کم نہیں تھیں۔معمولی سی رہائش تھی اور بہت بڑا عیال تھا۔مگر صبر شکر

کر کے اسی میں رہتے رہے۔ اپنی ذات کے لیے نہ مخلوق سے کچھ مانگا اور نہ خالق سے شکوہ کیا۔ خالق کے لیے تو وہ پہلے ہی معاہدہ کر چکے تھے کہ سرِتسلیم خم رہے گا۔ ہمیشہ راضی برضا رہیں گے۔ رب سے اس معاہدے کے بعد مخلوق کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جاتی تھی۔ ان کے ساتھ گھنٹوں گزارنے والے بھی واقف نہیں تھے کہ محمد عظیم کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ اہلِ خانہ وعیال کا کیا حال ہے۔ کیونکہ کبھی کوئی شکوہ، شکایت اور پریشانی زبان پر آئی ہی نہیں تھی۔ حد یہ کہ اپنے بارے میں بھی بات نہیں کرتے تھے۔ باطنی طور پر جو حاصل کر چکے تھے اسے خدا کی عطا سمجھ... رکھا تھا۔ نہ کمال نہ کرامات اور نہ ہی اپنی بڑائی کا کوئی اظہار۔ اگر اظہار کیا بھی تو دوسروں کے لیے اپنے فائدے کے لیے کبھی کچھ نہیں کیا۔

محفلوں میں یار دوستوں کے ساتھ یوں خوش گپیاں کرتے جیسے عام سے فرد ہوں۔ مسئلے مسائل اور بحث و مباحثے میں کبھی اپنی معلومات کا اظہار بڑائی کے لیے نہیں کیا۔ عبادات میں سب کے سامنے نارمل رہتے اور اکیلے میں کیفیت دوسری ہو جاتی تھی۔ بہت سے ادیب و شعرا تو ان کی دوسری حیثیت سے واقف ہی نہیں تھے۔ وہ صرف انہیں ادیب و شاعر کے طور پر جانتے تھے۔ اس کے باوجود رفتہ رفتہ دہلی میں ان کی شہرت یوں پھیلنے لگی جیسے دیر سے کھلنے والے پھول کی خوشبو ذرا دیر سے پھیلتی ہے مگر بہت دیر تک پھیلی بھی رہتی ہے۔ لوگ آتے ان سے بیعت کی درخواست کرتے۔ طریقت سیکھنے کے خواہش مند ہوتے۔ بابا صاحب (اب مضمون میں ان کا ذکر اسی اسم سے ہوگا) آدمی کے لحاظ سے اس سے پیش آتے تھے۔ مگر کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ ان کی ذات سے دوسروں کو کچھ نہ کچھ ملتا تھا۔ مریدی کے خواہش مندوں سے انکساری سے کہتے کہ وہ خود مرید ہیں کسی اور کو مرید کہاں سے کریں؟

مگر بھی ملنے والے خود کو مرید سمجھنے لگتے۔ وقتاً فوقتاً خدمت میں حاضری دیتے۔ ہدیے لاتے اور دعاؤں کے طلب گار ہوتے۔ بابا صاحب ان دونوں چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے مگر کہاں تک۔ لوگوں کی عقیدت اور محبت انہیں بھی مجبور کر دیتی۔ محبت کا جواب محبت سے دینا تو انسانوں کا طریقہ ہے ہی۔ صوفیائے کرام تو نفرت کا جواب بھی محبت سے دینے کے قائل ہوتے ہیں۔ بابا صاحب اپنی طرف آنے والوں کو پیچھے نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آ کر بڑے بڑے اولیا اللہ بے بس ہو جاتے ہیں۔ بہت سے تو بچنے کے لیے ویرانوں کا رخ کرتے ہیں یا خود پر گناہ گار کا لیبل لگوا لیتے ہیں۔ بابا صاحب خود کو عام آدمی ہی سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے ویرانوں کا رخ نہیں کیا اور اللہ کے حضور وہ خود کو خطا کار ہی تصور کرتے تھے۔

اجتناب کی پوری کوشش کے باوجود ان کی محفلیں دہلی میں مقبول ہوتی چلی گئیں اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم اور خاص طور سے انگریز بھی بابا صاحب کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے تھے۔ بہت سے صاحبانِ اقتدار اور دولت مند باقاعدگی سے ان کی محفلوں میں شامل ہوتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ بابا صاحب کبھی ان سے کچھ چاہیں یا کوئی فرمائش کریں اور وہ سر آنکھوں پر اسے پورا کریں۔ مگر ان کی یہ حسرت ہمیشہ حسرت ہی رہی۔ بابا صاحب نے کبھی اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ ہاں دوسرے پریشان حالوں اور مصیبت زدگان کے لیے سفارش کی جو ہمیشہ پوری ہوتی رہی۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ بابا صاحب ہمیشہ دہلی میں رہیں اور کبھی یہاں سے نہ جائیں۔

دہلی کے عام مسلمان بھی جو آنے والے وقت سے پریشان تھے اور ان کے لیے بابا صاحب کی ذات سہارا تھی وہ بھی ان کو یہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر بابا صاحب کوئی اور فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ نجیب الطرفین سید تھے اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ اپنے جدِ امجد کی ایک سنت پر عمل کرنے کا موقع مل رہا ہو اور وہ ان خوش نصیب مسلمانوں میں شامل ہو سکتے تھے جن کو یہ موقع مل رہا تھا۔ تیرہ سو سال پہلے مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کی کہ کفار سے اپنا دین بچا سکیں۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے مسلمان اس سنت کو زندہ کرتے رہے۔ تقسیم ہند ایک اور موقع تھا جب مسلمان صرف رضائے الٰہی کی خاطر ہجرت کرنے والے تھے۔ بابا صاحب اس موقع کو کیسے ہاتھ سے جانے دیتے وہ تو اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔

وہ پاکستان بننے سے پہلے تقریباً اکیس برس دہلی میں رہے۔ دہلی متحدہ ہندوستان کا دارالحکومت اور سیاست کا مرکز تھا۔ تحریک پاکستان محمد عظیم کی نظروں کے سامنے شروع ہوئی اور وہ آغاز سے اس کے حامی رہے تھے۔ ان کے

خیال میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن نہایت ضروری تھا جہاں وہ سیاست، معیشت اور مذہب میں خود مختار ہوں۔ متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کے ہوتے ہوئے وہ ہندوؤں کے تیور دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے جو ابھی سے مسلمانوں سے ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے کی بات کر رہے تھے جب کہ وہ ابھی اقتدار میں بھی نہیں تھے اگر وہ ہندوستان کے اقتدار پر مکمل غلبہ حاصل کر لیتے تو کیا کرتے اس کی ایک جھلک مسلمانانِ برصغیر نے کانگریس کے ڈھائی سالہ اقتدار کے دوران دیکھ لی تھی۔ ان ڈھائی سالوں میں مسلمانوں کا نہ صرف وحشیانہ قتل عام ہوا بلکہ ان کو معاشی اور معاشرتی طور پر مفلوج کرنے میں بھی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ اس لیے جو مسلمان پہلے الگ وطن کے لیے ڈانواڈول تھے اب وہ بھی دل وجان سے پاکستان کے حامی بن گئے۔

بابا صاحب دل وجان سے پاکستان کے حامی تھے اور نہ صرف اس کا پرچار کرتے تھے بلکہ پاکستان بننے کی صورت میں وہاں ہجرت کے لیے بھی پُرعزم تھے۔ وہ جس دنیا کے باسی تھے وہاں بہت پہلے خوش خبریاں ملنے لگتی ہیں انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ایک الگ وطن مسلمانوں کا مقدر ہے۔ مختلف سلسلوں اور مسالک کے مسلمان اپنے تضاد سے قطع نظر ایک الگ وطن کے قیام پر متفق تھے۔ اس کی ایک مثال بریلوی، دیوبندی اور شیعہ سنی کا تضاد ہے لیکن جہاں تک تحریک پاکستان کا تعلق ہے تو ہمیں اس میں سب ایک نظر آتے ہیں۔ اِکّا دُکّا افراد جو مخالف تھے۔ ان کو مسلمانوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور بہ حیثیت مجموعی اپنا سارا زور مسلم لیگ کے پلڑے میں ڈال کر اسے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنا دیا تھا۔ 1946ء کے عام انتخابات ریفرنڈم ثابت ہوئے۔ جس میں مسلمانوں نے اتنی بڑی تعداد میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ جسے نظرانداز کرنا انگریزوں اور ہندوؤں کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

بابا صاحب کا قلم اور زبان اس تحریک کا ایک حصہ رہی ہے۔ وہ ان چند معروف افراد میں سے ایک تھے جنہوں نے صرف رضائے الٰہی کے لیے پاکستان کی طرف ہجرت کی۔

اِدھر پاکستان بننے کا اعلان ہوا اور اُدھر بابا صاحب نے پاکستان جانے کے لیے سامان باندھا اور اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو لے کر وہ ہمیشہ کے لیے یہاں چلے آئے۔ وہاں سے علی الاعلان چلے مگر کراچی اتنی خاموشی سے آئے کہ قریبی لوگوں کے سوا کسی کو پتا نہیں چلا کہ وہ ہجرت کر کے یہاں آ چکے ہیں۔ یہاں ان کے جاننے والے بہت کم تھے۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ وہ دلی کی راجدھانی چھوڑ آئے ہیں تو انہیں حیرت ہوئی کہ کوئی اتنا بے نیاز بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دلی میں ایک دنیا انہیں جانتی اور عقیدت مند تھی۔

خاموشی سے آنے میں یہ رمز تھا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ دنیا کے لیے یہاں آئے ہیں اور اس لیے بھی کہ کوئی ان کی حیثیت اور مقام دیکھ کر انہیں نوازنے کی کوشش نہ کرے۔ ایک طرف بابا صاحب کا یہ طرز عمل تھا اور دوسری طرف متروک املاک کی لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ جو خالی ہاتھ تھے انہوں نے تجوریاں کلیم کر دیں اور جن کے پاس جھونپڑیاں بھی نہیں تھیں وہ کوٹھیوں کے دعوے دار ہو گئے۔ جنہیں دو گز زمین کا آسرا بھی نہیں تھا وہ مربعوں کے کلیم داخل کرا رہے تھے۔ اس لوٹ مار اور ہاہاکار سے بچ کر بابا صاحب لی مارکیٹ کے ایک کوٹھری نما کرائے کے مکان میں بیٹھ گئے تھے۔ دنیا سے بے رغبتی سہی مگر گزارے کے لیے کچھ کمانا بھی ضروری تھا۔ والد صاحب حیات تھے مگر کام چھوڑ چکے تھے اس لیے خاندان کی کفالت کُلی طور پر بابا صاحب اور ان کے بھائیوں پر تھی۔

بابا صاحب نے روزگار کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ لارنس روڈ چلے جاتے اور وہاں بیٹھ کر بجلی کے فیوز باندھتے تھے۔ یعنی اڑ جانے والے فیوز کی مرمت کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بجلی کے کام میں بھی ادراک تھا اور شاید وہ اس سے کہیں زیادہ مختلف کاموں وفنون کے ماہر تھے۔ مگر ان کا اظہار یوں نہیں ہو پاتا تھا کہ انہوں نے کبھی ان کاموں یا فنون کو ذریعہ روزگار نہیں بنایا تھا۔ کچھ دن وہ یہ کام کرتے رہے مگر جیسے جیسے ان کی آمد کی خبر پھیلتی گئی۔ احباب اور عقیدت مند کھنچے چلے آنے لگے اور پھر ڈان اردو اخبار میں نائب مدیر کے طور کام کرنے لگے۔

اس وقت ڈان کا شمار ملک کے مقبول ترین اخبارات میں ہوتا تھا اور اس کا سب ایڈیٹر ہونا بھی بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ بابا صاحب کو یقیناً یہ سیٹ ان کی قابلیت کی وجہ سے ملی تھی نہ کہ کسی عقیدت کی وجہ سے۔

مگر بابا صاحب کے مزاج میں نوکری نہیں تھی۔ خاص طور سے ایسی نوکری جس میں ان سے کوئی جواب طلب کر سکے اس لیے کچھ عرصے بعد انہوں نے یہاں سے استعفا دے دیا۔ استعفے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں اخبارات پر پابندیاں اور سنسر شپ بہت سخت تھی۔ اخبارات ... حاکم وقت کے اشارہ ابرو پر کام کرتے تھے اور جو نہیں کرتے تھے ان پر اور ان کے اخبار پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے بہت سی خبریں کتر برید کا شکار ہوتی تھیں۔ جھوٹ سچ اور سچ جھوٹ بنا دیا جاتا تھا۔ جو چھپنا چاہیے تھا وہ نہیں چھپتا تھا اور جو نہیں چھپنا چاہیے تھا وہ دھڑلے سے چھپایا جا رہا ہوتا تھا۔ یہ مکروفریب بابا صاحب جیسے صاحب کردار کی طبیعت کے خلاف تھا اس لیے یہ نوکری زیادہ عرصے نہیں چل سکی۔ شاید وہ فوری چھوڑ دیتے مگر کچھ لوگوں کی محنت وعقیدت نے ان کا دامن تھامے رکھا تھا۔

مگر اس تجربے کے بعد انہوں نے مستقل طور پر لکھنے اور لکھانے کو روزگار کے طور پر اپنا لیا۔ ایک تو وہ فطری طور پر لکھنے والے تھے۔ لکھنے سے انہیں روحانی خوشی ملتی تھی۔ پھر اپنے تجربات اور نظریات دوسروں تک پہنچانے کا یہی سب سے مؤثر طریقہ تھا۔ تحریر پر بابا صاحب کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ یوپی میں پیدا ہوئے اور دہلی میں زندگی کا ایک تہائی حصہ گزارا۔ ان کی زبان میں کوئی سقم کہاں باقی رہ سکتا تھا۔ لکھتے بہت روانی سے تھے اور بہت کم اپنا لکھا ہوا کاٹتے تھے۔ یہ خوبی بہت کم لکھنے والوں میں ہوتی ہے۔ تحریر میں بہتی ندی کی روانی اور ایسی چاشنی تھی کہ پڑھنے والا اس مٹھاس کا اسیر ہو جاتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بابا صاحب نے بے تحاشا لکھا۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تحریر کردہ چیزیں بہت کم ہیں۔ سب سے مشہور تصنیف لوح وقلم ہے۔ جسے دور جدید میں صوفیا ازم اور روحانیت کا ایک شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کتاب بھی انہوں نے خود نہیں لکھی تھی بلکہ اپنے خلیفہ اور مرید خواجہ شمس الدین عظیمی سے لکھوائی۔ وہ بولتے جاتے اور خواجہ صاحب لکھتے جاتے۔

نوکری ہو یا اپنا کام اتنے بڑے خاندان کا پیٹ بھرنا اور ان کی ضروریات (اس لفظ کو آج کے معنوں میں نہ لیا جائے، اس وقت ضرورت سچ مچ ضرورت ہوتی تھی اور پھر بابا صاحب کا اہل عیال ہو تو یہ صرف اشد ضرورت ہی ہو سکتی تھی۔) پورا کرنا آسان نہیں تھی۔ کراچی میں بھی بابا صاحب کے عقیدت مندوں کی کمی نہیں تھی جوان کے لیے کچھ کرنے کو بے قرار تھے۔ ایک اشارے کی دیر تھی کہ ان کی مشکلات ختم ہو جاتیں۔ اس کے باوجود وہ بے نیاز رہے۔ اس وقت کے کمشنر بحالیات خان بہادر عبداللطیف تھے۔ وہ بابا صاحب کے پرانے عقیدت مندوں میں تھے جب انہیں پتا چلا کہ بابا صاحب کراچی آچکے ہیں تو خود حاضری دی اور جب دیکھا کہ وہ ایک معمولی سے مکان میں اہل وعیال کے ساتھ رہ رہے ہیں، تو انہوں نے مؤدبانہ درخواست کی کہ بابا صاحب ایک کلیم کر دیں اور شہر کی جس متروک املاک کی طرف اشارہ کریں گے وہ ان کی کر دی جائے گی۔

بابا صاحب نے اپنی حیثیت کے مطابق خان بہادر صاحب کی خاطر مدارات کر کے انہیں رخصت کر دیا مگر ان کی درخواست پر کوئی توجہ نہ دی اور نہ ہی بعد میں کبھی ذکر کیا۔ کمشنر صاحب نے خود کئی جگہ اس واقعے کو بیان کیا اور کف افسوس ملتے رہے کہ ان کے نصیب میں بابا صاحب کی خدمت نہیں تھی۔ خان بہادر نے یہ نہیں سوچا کہ بابا صاحب اگر ان کی خدمت قبول کر لیتے تو پھر ان میں اور دوسرے دنیا دار زاہدوں میں کیا فرق رہ جاتا۔ انہوں نے بعد میں بھی اپنی ہجرت کا کوئی صلہ اس دنیا میں نہیں چاہا۔ بلکہ آنے والے دنوں میں ان کی زندگی سادہ سے سادہ ہوتی چلی گئی۔ کھانے پینے اور دنیا کی چیزوں میں بہت احتیاط برتنے لگے تھے جو زہد کا تقاضہ بھی ہے اور طریقت کا سلیقہ بھی۔ اس کی ایک مثال صابن سے اجتناب ہے۔ انہوں نے کبھی صابن سے ہاتھ نہیں دھوئے۔ اگر کبھی چکنائی لگ جاتی تو اسے دیر تک دھوتے تھے حتیٰ کہ وہ صاف ہو جائے مگر صابن استعمال نہیں کرتے تھے۔ ذاتی اشیا بہت کم تھیں اور جو تھیں انہیں ایک مخصوص جگہ رکھتے تھے تاکہ ان کی تلاش اور استعمال میں زیادہ وقت نہ لگے۔ وہ دنیاداری کے جھمیلوں کو کم سے کم وقت دینا چاہتے تھے تاکہ زیادہ وقت اپنے اصل مقصد کو دے سکیں۔ جن برتنوں میں کھاتے پیتے وہ معمولی درجے کے ہوتے تھے اور اکثر تو بہت پرانے ہوتے تھے۔

بابا صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ غیر منقسم ہندوستان میں گزرا۔ یعنی انچاس برس وہ خورجہ، بلند شہر، ناگپور اور دہلی میں رہے تھے۔ زندگی کے آخری بتیس برس انہوں نے کراچی میں گزارے۔ مگر یہ آخری حصہ ہی ہمیں پوری

تفصیل کے ساتھ دستیاب ہے۔ ابتدائی انچاس برسوں کی خبر زیادہ نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ اس وقت کے بیشتر ساتھی اور جاننے والے بچھڑ گئے یا دنیا میں نہ رہے۔ بہت سے ہندوستان میں رہ گئے اور کچھ ہی پاکستان آئے تھے۔ کراچی میں بابا صاحب نے بھرپور عوامی زندگی گزاری۔ جب ان کا لوگوں سے رابطہ رہا۔ وہ لوگوں کے دکھ سکھ میں کام آتے رہے اور ایک عام فرد کی طرح دنیا جینے کی مشقتیں سہتے رہے۔ اخبار کے بعد انہوں نے رسالوں کی ادارت کی اور رسالہ نقاد کے طویل عرصے تک مدیر رہے۔ یہ نوکری یوں گوارہ کرلی کہ وہ کسی کو جواب دہ نہیں تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی رسالوں کی ادارت کی جن میں ڈائجسٹ بھی شامل تھے۔

بابا صاحب کہانی نویسی کے فن میں بھی مہارت رکھتے تھے اور انہوں نے کئی چھوٹی اور بڑی سلسلے وار کہانیاں لکھیں جو قلمی ناموں سے شائع ہوتی رہیں۔ وہ اس حوالے سے کسی ستائش یا صلے کے روادار نہیں تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ کہانیاں انہوں نے کسی کے کہنے پر لکھی ہوں اور پھر اسی فرد کے نام سے شائع ہوگئیں۔ بابا صاحب کی رحلت کے بعد ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا اور اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اس کے درجنوں ایڈیشن نکل گئے۔ بے شمار چھوٹی کہانیاں جو انہوں نے لکھ کر دیں وہ آج نامعلوم ہیں یا ان کے رسالے محفوظ بھی ہیں تب بھی یہ نہیں معلوم کہ یہ بابا صاحب کے قلم سے نکلے شاہ کار ہیں۔ عوام الناس کے شوق کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ڈائجسٹوں میں بھی لکھا اور ان کی ادارت بھی کرتے رہے۔

ان کے اس طرز عمل کا موازنہ ان ادیبوں سے کریں جو قلم کی دنیا میں تو بہت بڑے ہیں لیکن جب ان سے ادب کی تعریف پوچھی جائے تو وہ اسے چند کتابوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ ایک ایک لفظ اور جملے میں مغرب کی پیروی کرنے والے یہ ادیب اس سوال کا جواب دینے سے بھی قاصر ہوتے ہیں کہ مغرب میں تو ڈائجسٹ بھی ادب ہوتا ہے اور بہت سا ادب اصل میں ڈائجسٹوں یا ماہانہ رسائل میں لکھا گیا اور اس کے بعد کتابی شکل میں آیا۔ ان کے پاس اس کا جواب صرف ڈھٹائی ہے کہ ہم نہیں مانتے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ڈائجسٹوں کی سرکولیشن محدود ہے اور اسی لحاظ سے مالی وسائل بھی زیادہ نہیں ہیں اگر یہ مغرب کے رسائل کی طرح مالی وسائل رکھتے اور زیادہ معاوضہ دے سکتے تو یہی ادیب ڈائجسٹوں میں لکھنے کے لیے بھی دوڑے آتے اور اپنا لکھا ہوا ادب بھی مانتے۔

بابا صاحب لوح و قلم اور اس جیسے اعلیٰ روحانی ادب کے تخلیق کار رہے ہیں وہ اس کے علاوہ کچھ نہ بھی لکھتے تو ان کی شخصیت اور حیثیت میں کوئی کمی نہ آتی مگر انہوں نے یہاں بھی انکساری اور تواضع کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ رسالوں کی ادارت بھی کرتے رہے اور خود بھی کہانیاں لکھتے رہے۔ بے شک یہ ان کے نام سے نہیں چھپتی تھیں مگر ان کا مخصوص حلقہ جانتا تھا کہ کون سی کہانی بابا صاحب کے قلم پر اثر کا نتیجہ ہے۔ جس رسالے میں بابا صاحب کی کہانی ہوتی وہ ہاتھوں ہاتھ نکل جاتا تھا اور بعض اوقات تو دفتر کے لیے کاپی بھی نہیں بچتی تھی۔ کئی رسالوں کو اضافی پرنٹ کرانا پڑتا تھا۔ اسے بابا صاحب کے قلم کی برکت ہی کہا جاسکتا ہے کیونکہ عوام الناس نہیں جانتے تھے کہ وہ کہانی نویس بھی ہیں۔ اگر وہ اپنا نام دے دیتے تو پھر ان رسالوں کی سرکولیشن ہی کچھ اور ہوجاتی۔

☆☆☆

بابا تاج الدین ناگپوری کی تربیت اور روحانی فیض اپنی جگہ، انہوں نے طویل عرصے ہندوستان میں رہ کر بہت سے بزرگوں اور اولیا اللہ سے فیض حاصل کیا۔ وہ مسلسل سیکھتے رہے مگر مزید سیکھنے کی تڑپ بھی بڑھتی رہی۔ وہ کراچی آئے تو لوگ انہیں اپنے میدان کا استاد سمجھتے تھے لیکن وہ خود اپنے آپ کو شاگرد سے زیادہ اور کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ مسلسل مرشد کی تلاش میں تھے جس کے دامن سے وابستہ رہ کر وہ سلوک کی باقی ماندہ منزلیں طے کرسکیں۔ کراچی آنے کے بعد ان کی جستجو اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ایسے میں ان کی ملاقات سہروردی سلسلے کے بزرگ حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردی سے ہوئی اور اس ملاقات نے بابا صاحب کے سینے میں دبی ہوئی آگ کو شعلوں میں بدل دیا۔ انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ انہیں حلقہ بیعت میں شامل کرلیا جائے۔

1956ء میں ہونے والی یہ ملاقات بابا صاحب کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی لے آئی۔ حضرت نے انہیں رات تین بجے طلب کیا اور وہ سخت سردی کے عالم میں رات دو بجے ہی میکلوڈ روڈ کے اس ہوٹل کے باہر سیڑھیوں پر جا بیٹھے جہاں حضرت مقیم تھے۔ انتظار کی لذت عشاق ہی

جانتے ہیں اور تین ہزار چھ سو ساعت پر مشتمل یہ وقت بابا صاحب نے کیسے گزارا اس کا بھی ذکر نہیں کیا۔ ٹھیک تین بجے اندر سے حضرت نمودار ہوئے اور انہیں ساتھ لے گئے۔ اندر لے جا کر انہوں نے بابا صاحب کی پیشانی پر تین مرتبہ پھونک ماری اور ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس رات انہوں نے وہ دیکھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر پھونک پر وہ ایک نیا عالم دیکھتے تھے۔

وہ تین ہفتے حضرت کے ساتھ رہے اور ان تین ہفتوں کا ایک ایک لمحہ تعلیم اور تربیت میں گزرا۔ وہ لمحہ بابا صاحب کے لیے زندگی کا حاصل بن گیا جب حضرت نے انہیں اپنا خلیفہ بنایا۔

جو منصب دوسرے برسوں ساتھ رہ کر خدمت میں اپنا آپ مٹا کر بھی حاصل نہیں کر سکے تھے وہ منصب بابا صاحب کو صرف تین ہفتے کی ہم نشینی میں مل گیا۔ اس کی وجہ سیدھی سی ہے کہ جو اخلاق اور اندرونی صفائی مرشد کی صحبت میں رہ کر بھی دوسرے برسوں میں حاصل نہیں کر سکے تھے وہ اخلاق اور باطنی صفائی بابا صاحب نے از خود زہد و احتیاط سے حاصل کر لی تھی۔ راہ سلوک کے مسافروں کے لیے پرہیز اور تقویٰ ہی سب سے بڑا استاد ہے کیونکہ بعض اوقات برسوں کی ریاضت کسی ایک بے احتیاطی سے ضائع چلی جاتی ہے اور آدمی وہیں کا وہیں کھڑا رہ جاتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات درج ہیں جب نفس کی ذرا سی پیروی نے اولیا اللہ کو شدید مشکلات سے دوچار کیا اور انہیں ذلت اور رسوائی کی منزلوں سے گزرنا پڑا۔ اپنے کیے کا بہت بڑا کفارہ ادا کرنا پڑا کیونکہ وہ رب سے کیے عہد پر پورا نہیں اترے تھے۔

اس راستے میں سب سے زیادہ اہمیت اسی اوّلین عہد کی ہوتی ہے اور بابا صاحب نے اس عہد کی ہمیشہ پاسداری کی۔ جب اللہ کے ہوئے تو پھر کسی کے نہ ہو سکے۔ دنیا کی تو کوئی حیثیت نہیں تھی دین کے معاملے میں بھی بہت محتاط ہو گئے تھے۔ جب دنیا کا کوئی معاملہ آتا تو وہ اسے رب سے کیے ہوئے عہد کی عینک سے دیکھا کرتے تھے۔ اگر انہیں محسوس ہوتا کہ معاملہ انتخاب کا ہے تو وہ بلا جھجک آخرت کا انتخاب کر لیتے تھے اور دنیا چاہے کتنی ہی پرکشش کیوں نہ ہو اسے چھوڑ دیتے تھے۔

بابا صاحب بھی دامن بچاتے تھے۔ دنیا کی آسائشوں کو خاردار جھاڑیوں سے کم نہیں سمجھتے تھے جن میں ایک بار دامن الجھ جائے تو پھر چھڑانے کی کتنی ہی کوشش کی جائے الجھتا ہی جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ دامن کو الجھنے ہی نہ دیا جائے۔ حضرت ابوالفیضؒ کی خلافت ملنے کے بعد بابا صاحب کی روحانی تربیت کا آغاز ہوا۔ نیند اور بیداری کے عالم میں یہ تربیت جاری رہتی تھی۔ اس کے ساتھ لازمی عبادت جو مشقت کی حد تک پہنچی ہوئی تھی وہ بھی شروع ہو گئی۔ بعض اوقات ایک ہی نماز میں سینکڑوں بار سورۃ اخلاص پڑھ ڈالتے تھے۔ نماز کے دوران استغراق کی کیفیت طاری ہوتی اور جب اس سے چونکتے تو احتیاطاً پھر نماز پڑھتے تھے۔ مستقل باوضو رہتے تھے اور اگر شبہ بھی ہو جاتا کہ وضو نہیں رہا ہے تو دوبارہ وضو کر لیا کرتے تھے۔

جب بابا تاج الدین کی تربیت میں تھے تو اس کے بعد ہی دنیاوی لذتوں سے بے رغبتی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ چوبیس میں سے مشکل سے دو ڈھائی گھنٹے سوتے تھے اور چوبیس گھنٹے میں صرف ایک یا دو چپاتی سالن کے ساتھ لیتے تھے اور کبھی دودھ کے ساتھ کلام میں بھی بہت احتیاط برتنے لگے تھے۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ زبان سے نکلا ایک غلط لفظ پکڑ میں آجاتا ہے اور کسی کی دل آزاری سے بڑا گناہ ان کے نزدیک کوئی نہیں تھا اس لیے جو بولتے بہت سوچ سمجھ کر بولتے تھے۔ بحث سے گریز کرتے تھے اور اگر کوئی جاہل منہ کو آتا تو سنت کے مطابق سلام کر کے ایک طرف ہو جاتے۔ لڑائی جھگڑے جیسی چیزوں سے کوسوں دور تھے۔ دنیا کی کسی چیز سے مطلب ہی نہیں تھا کہ اس کی بنیاد پر لڑائی ہوتی۔ دلی میں اپنا گھر چھوڑ کر آئے تو کراچی میں گھر ہی نہیں لیا جو ان کا حق تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا ہے راہ سلوک میں اخلاق اور تقویٰ کی ہی اصل اہمیت ہوتی ہے۔ بابا صاحب کے اخلاق حسنہ کا بیان ان کے بچپن کے دوست اور نزدیکی ساتھی سید نثار علی بخاری یوں بیان کرتے ہیں۔ ”مجھے بابا صاحب کا بچپن اپنے بچپن سے زیادہ یاد ہے۔ ان یادوں میں کوئی ایک یاد بھی ایسی نہیں ہے جب بابا صاحب کی کسی بچے سے لڑائی ہوئی ہو۔ گالی اور برے الفاظ تو ان کی شان سے ہمیشہ ہی بعید رہے۔ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ اپنے سے چھوٹوں کو بھی ہمیشہ آپ جناب سے مخاطب کرتے تھے، کبھی کسی سے تم یا تو کہہ کر بات نہیں کی۔ آپ کے محلے اور اسکول

کے ساتھی بھی آپ کا احترام کرتے تھے اور کبھی بابا صاحب کے ساتھ سوئے ادب پیش نہیں آئے۔ آپ نے بچپن میں کوئی ایسا کھیل نہیں کھیلا جو اخلاق سے گرا ہوا ہو یا اس میں بد تمیزی کا ذرا بھی شائبہ ہو۔''

جب بچے تھے تو مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ مگر اسی کیفیت کے ساتھ جو نثار علی صاحب نے بیان کی ہیں۔ کھیل میں بھی کبھی لڑائی نہیں ہوئی حالانکہ بچوں کی لڑائی ہوتی ہی کھیل میں ہے۔ بڑے ہوئے تو کچھ عرصے فٹ بال اور کرکٹ بھی کھیلی۔ مگر پھر دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح کھیلوں سے بھی دل اچاٹ ہوگیا۔ گھر کے کھیلوں میں شطرنج کا شوق تھا اور ایک زمانے میں اتنی مہارت حاصل کرلی تھی کہ ایک سو چالیس چالیں یاد ہوگئی تھیں۔ مخالف مشکل سے ہی جیت کر اٹھتا تھا۔ ورنہ جیت ہمیشہ بابا صاحب کا مقدر ہوتی تھی بہت اچھے کھلاڑی بھی ڈرا کرانے میں عزت سمجھتے تھے۔ مگر جب روحانیت کی طرف آئے تو شطرنج بھی وقت کا ضیا سمجھتے ہوئے ترک کردیا اور ایسا ترک کیا کہ دوبارہ کبھی کھیلا ہی نہیں۔ بساط اور مہروں پر نظر پڑ جاتی تو اجنبی کی طرح دیکھتے تھے۔

علی گڑھ کے زمانے میں بلکہ اس سے بھی پہلے آپ رسول اللہ ﷺ کی ان اخلاقی سنتوں پر عمل کرنے لگے تھے جن کا خیال بہت سے دین دار لوگ نہیں کرتے ہیں۔ آپ بیماروں کی عیادت کو جاتے اور عیادت بھی سنت کے طریقے سے کرتے کہ وقت سے جاتے۔ تھوڑی دیر بیٹھتے، مریض کے لیے کچھ لے جاتے اور اس کے پاس حوصلہ افزا گفتگو فرماتے۔ پریشان حالوں کی پریشانی میں شریک ہوتے۔ عمل سے ممکن ہوتا تو عمل کرتے ورنہ اس کی پریشانی ختم ہونے کی دعا کرتے تھے۔ دکھ اور تکلیف میں مبتلا شخص سے یوں پیش آتے کہ وہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ میرا دکھ بابا صاحب محسوس کررہے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں سے خود سلام دعا کرتے۔ حالانکہ اس وقت انگریزوں کا یہ برا رواج ہندوستانیوں اور مسلمانوں میں بھی آگیا تھا کہ بغیر تعارف کے سلام کرنے کو برا سمجھنے لگے تھے۔ دلی کے روسا اور شرفا بھی اسے برا سمجھتے تھے اور اگر ایسا کوئی کرتا تو اسے گرا پڑا شخص سمجھا جاتا تھا مگر بابا صاحب نے بنا کسی خوف اور جھجک کے اس سنت کو اپنا لیا تھا۔ انہیں پروا نہیں تھی کہ کوئی انہیں کیا سمجھتا ہے؟

ان کی محفلوں میں عیب جوئی اور غیبت منع تھی۔ بابا صاحب اور ان کے ارادت مندوں کی طرف سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اگر کوئی اجنبی یا آداب محفل سے ناواقف شخص ایسا کر بیٹھتا تو اسے مناسب الفاظ میں ٹوک دیا جاتا تھا مگر اس طرح کہ وہ بھی شرم اور بے عزتی محسوس نہ کرے۔ بابا صاحب کی ان محفلوں میں جہاں ادب اور سیاست پر بات ہوتی تھی وہیں موقع بہ موقع بابا صاحب حاضرین کو اخلاقِ دین سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

یہ تمام صوفیا کرام کا طریقہ کار رہا ہے کہ وہ پہلے انسان کے اخلاق کی اصلاح کرتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں تبلیغ کے دوران کیا تھا اور اخلاق کی پختگی کے بعد رفتہ رفتہ مسلمانوں پر دین کے احکامات نافذ کیے تھے اور عبادات کو لازم کیا تھا۔ حرام حلال کا مرحلہ سب سے آخر میں آیا تھا اور ایسا ہی صوفیا کرام بھی کرتے رہے۔

بابا صاحب نے بھی اصلاح کا کام اخلاق سے شروع کیا۔ اگر کوئی عبادت میں کمی کرتا نظر آتا تو اسے شاید ہی ٹوکتے لیکن اگر کوئی اخلاق سے ہٹ کر عمل کرتا دکھائی دیتا تو اسے فوری ٹوکتے تھے اور اصلاح کرتے تھے۔ مگر اصلاح اس طرح کرتے کہ اگلا ان کی دردمندی محسوس کرتا اور اسے اپنی تذلیل نہیں سمجھتا تھا۔ بابا صاحب زبان سے زیادہ عمل سے تعلیم دینے پر یقین رکھتے تھے اس لیے جب عمل کا موقع آتا تو وہ بڑھ چڑھ کر عمل کرتے تھے۔ دو انسانوں کے تعلق میں اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ خاص طور سے جب تعلق بہت نزدیکی ہو۔۔۔ ایسا ہی ایک بار سید نثار علی کے ساتھ ہوا۔ کسی وجہ سے بابا صاحب ان سے ناراض ہوئے اور کئی مہینے تک ان سے نہ بات کی اور نہ ملاقات۔ نثار علی بے قرار تھے کہ کسی طرح بابا صاحب سے دوبارہ بات ہو مگر ان کے گھر جانے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔

ان ہی دنوں عید کا موقع آیا اور وہ اس بہانے ملنے کے لیے پہنچ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ بابا صاحب اگر ملے بھی تو پہلے کی طرح ملیں گے اور تعلق وہیں سے استوار ہوجائے گا۔ مگر بابا صاحب انہیں دیکھ کر کھل اٹھے اور پھر گلے لگے تو اتنا روئے کہ کرتہ بھیگ گیا۔ نثار علی بھی روتے رہے۔ بابا صاحب کو روتے دیکھ کر سید نثار علی کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ بابا صاحب کے لیے دوست تھے' جیسی تڑپ ان کے دل میں تھی ویسی ہی یا شاید اس سے بھی زیادہ تڑپ بابا صاحب

کے دل میں ان کے لیے تھی۔ مگر قصور ان کا تھا اس لیے بابا صاحب نے ملنے میں پہل نہیں کی مگر بے قراری سے ان کے منتظر رہے تھے۔ جب نثار علی آئے تو بابا صاحب سب بھول گئے۔ انہیں بس دوست اور اس کی دوستی یاد رہی۔ اس کے بعد دونوں دوستوں میں کبھی تکدر نہیں آیا۔

وضع داری کا یہ عالم تھا کہ دلی میں جب بابا صاحب نے ہفتے میں ایک دن نثار علی کے ہاں جانا شروع کیا تو یہ معمول ان کی زندگی کے آخری وقت تک جاری رہا جب وہ بیماری کی وجہ سے صاحب فراش ہو گئے اور انہوں نے نثار علی سے درخواست کی کہ بھائی اب تم آجایا کرو کہ بیماری نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے۔ نثار علی اس بارے میں کہتے ہیں۔ "حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، دلی کے فسادات ہوں، آندھی آئے، طوفان آئے، بارش ہو رہی ہو یا بابا صاحب کی طبیعت خراب ہو۔ وہ لازمی اس خاکسار کے گھر معینہ وقت پر تشریف لاتے اور اگرچہ طبیعت ناساز ہی کیوں نہ ہو کبھی نہیں لیٹے تھے ہمیشہ بیٹھ کر نشست کرتے تھے اور ایک مقررہ وقت تک بیٹھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ جب میں ان کے اس عمل کے بارے میں سوچتا ہوں تو نہ جانے کتنے سبق نظر آتے ہیں۔"

سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انسان اندر سے جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ظاہری اعمال جو اس کی شان سے بعید محسوس ہوتے ہیں وہ ان کی زیادہ پابندی کرنے لگتا ہے۔ اخلاق اور تعلقات کو زیادہ اہمیت دینے لگتا ہے۔ بابا صاحب نے باطنی دنیا میں جو درجہ حاصل کیا اس کے پس پشت ان کا یہی اخلاق اور تقویٰ کارفرما تھا۔ دین کو کبھی اپنی ذات کے لیے مخصوص نہیں سمجھا بلکہ دین کو دوسروں کی بھلائی کا ایک ذریعہ سمجھا اور ساری عمر اس پر عمل پیرا رہے۔ ان کا تعلق اور دوستی بلا مسلک اور فرقے سب سے تھی کیونکہ وہ اس بات پر کامل ایمان رکھتے تھے کہ اسلام کی بنیاد مسلمانوں کی باہمی اخوت ہے۔ جب تک ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے صرف اسلام کی بنیاد پر محبت نہیں کرے گا۔ اس کا ایمان ناقص رہے گا۔ مسلک اور فرقے کی بنیاد پر بغض مسلمان کی شان کے خلاف اور قرآن کریم کی نفی ہے جو مسلمانوں سے کہتا ہے کہ ایک ہو جاؤ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔

ذاتی زندگی میں وہ قرون اولیٰ کے ان عظیم مسلمانوں کی طرح تھے جو اپنی ذات کو اور اپنے اعمال کو سب سے حقیر سمجھتے تھے۔ بابا صاحب کے پاس ساری دنیا سے خطوط آتے تھے اور ان کا باقاعدگی سے جواب دیا جاتا تھا۔ جواب دینے کی خدمت بھی خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے سپرد تھی۔ ایک بار انہوں نے بابا صاحب سے عرض کیا کہ کیوں نہ لیٹر ہیڈ چھپوالیا جائے اور اسی پر خطوط لکھنے والوں کو جواب دیا جائے۔ بہت سے باقاعدگی سے خط لکھنے والے اصرار کرتے تھے کہ انہیں لیٹر ہیڈ پر جواب دیا جائے تاکہ وہ اسے تبرک کے طور اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر سکیں۔ بابا صاحب نے منظوری دے دی لیکن جب نام لکھنے کا مسئلہ سامنے آیا تو انہوں نے "سید محمد عظیم برخیا" میں سے سید پر دائرہ بنا دیا اور کہا کہ اسے لیٹر ہیڈ میں شامل نہ کیا جائے۔ سوال کیا گیا کہ کیوں؟ آپ تو نجیب الطرفین سید ہیں۔ تو جواب دیا کہ سید لکھنے کا حق اسے ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے کچھ تو اوصاف ہوں۔ یہ کہہ کر اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور روتے ہوئے کہا کہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اپنے نام کے ساتھ سید لکھوں۔ چنانچہ لیٹر پیڈ پر نام سید کے بغیر ہی لکھا گیا۔

☆☆☆

بابا صاحب نے زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو دیکھا اور بہت سے پہلوؤں کو برتا بھی۔ نوجوانی میں جب علی گڑھ کا جنون تھا تو انہوں نے ادب سے متعلق بہت کچھ پڑھا اور اس کا بڑا حصہ فکشن پر مشتمل تھا۔ ان دنوں وہ بے تحاشہ پڑھتے تھے۔ پڑھنے کے لائق کوئی چیز انہوں نے نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے ذاتی سامان میں کتابوں کی بہتات رہی تھی۔ رسائل میں لکھنے کا سلسلہ بھی ان ہی دنوں شروع کیا تھا۔ پھر وہ فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میدان میں بھی کسی کو نہیں چھوڑا۔ وہ فلسفہ بھی دیکھا جو سراسر مذہب کے خلاف تھا۔ درحقیقت بیشتر فلسفہ مذہب کے خلاف ہی رہا ہے اور یونان میں فلسفی ہی اس شخص کو کہا جاتا تھا جو دیوتاؤں سے بیزار ہو۔ یہی فلسفہ جب مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے اس میں مزید موشگافیاں کیں اور بیشتر فلسفیوں کی شہرت مذہب بیزاری ہی تھی۔ اگر وہ دین کی طرف متوجہ بھی ہوتے تھے تو بہ نیت فتنے فساد کے ہوتے تھے اور ان کے پھیلائے فتنوں نے عالم اسلام میں بہت خون بہایا۔

مگر بابا صاحب نے فلسفے کو کسی اور ہی نظر سے پڑھا۔

وہ دین و دنیا کے بارے میں مخالف لوگوں کی سوچ وفکر جاننا چاہتے تھے۔ وہ دنیا کے علوم بھی پڑھ رہے تھے اگرچہ ان کا دل عصری تعلیم کی طرف نہیں تھا۔ کیونکہ بیشتر نصاب انگریزوں کا مرتب کیا ہوا تھا اور انہوں نے اس سے مذہب کو خارج کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں میں ملحد سوچ پروان چڑھانا چاہتے تھے اس لیے نصاب بھی اسی لحاظ سے بنایا ہوا تھا۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جو بابا صاحب کے دل و دماغ کو چبھتی تھیں۔ مگر وہ ان کی مخالفت یا موافقت کے مسئلے میں نہیں پڑے تھے۔ ایک اچھے طالب علم کی طرح وہ معلومات جمع کر رہے تھے۔ جب وہ بہت کچھ پڑھ چکے اور جان چکے تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب چھان بین کی جائے۔ جیسے جیسے وہ چھانتے جا رہے تھے دنیا کے فلسفے ان کے دل و دماغ سے یوں اتر رہے تھے جیسے ریگ مال اصل دھات سے زنگ اتار دیتا ہے اور جب زنگ پوری طرح اترتا ہے تو خالص کھری چمکتی دمکتی دھات نکل آتی ہے۔

بابا صاحب نے محسوس کیا کہ فلسفہ تو ایک ہی ہے اور وہ ہے فلسفۂ قرآن۔ اس کے سوا سارے فلسفے محض الفاظ کی بھول بھلیاں ہیں جن میں کھو کر انسان اپنے اصل مقاصد بھول سکتا ہے۔ جدید تعلیم سے زیادہ اس کے پس پشت مقاصد نے بابا صاحب کو اس سے بیزار کر دیا تھا اور تب ان کا رجحان صوفیا ازم کی طرف ہوا۔ وہ اللہ والوں کی صحبت تلاش کرنے لگے اور یہ تلاش تا عمر جاری رہی۔ اس وقت بھی جب ساری دنیا سے لوگ اللہ والے کی تلاش میں ان تک آنے لگے تھے۔ مولانا کابلیؒ کے مزار پر ان پر کئی در کھلے تھے مگر تشنگی ختم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ یہ تشنگی کسی حد تک نانا تاج الدین ناگپوری کے پاس جا کر ختم ہوگئی مگر اس نے کچھ نئی تشنگیوں کو جنم بھی دیا تھا۔ وہ نت نئے سرچشموں کی تلاش میں رہے اور ان سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔

اللہ نے بھی اپنے بندے کی پیاس بجھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ صوفیائے کرام کا کوئی سلسلہ ایسا نہیں ہے جس کے کسی نہ کسی فرد سے بابا صاحب نے روحانی فیض حاصل نہ کیا ہو۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تمام سلسلوں کے بزرگ اپنی اپنی دینی نعمتیں بابا صاحب کی ذات میں جمع کر رہے ہیں۔ مختلف واسطوں سے یہ سلسلے جناب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتے تھے اور پھر رسول اللہ ﷺ تک جاتے تھے جو روحانیت کا اصل اور خالص منبع ہیں۔ تمام سلسلوں کا نچوڑ اور ان سے فیض حاصل کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ بابا صاحب ایک نیا سلسلہ روحانیت شروع کریں جو نئی نسل کو نئے زمانے کے مطابق دین کی طرف راغب کرے۔ انہیں دور حاضر کے فتنوں اور برائیوں سے محفوظ رکھے۔ بھٹکے ہوئے انسانوں کے ساتھ ساتھ دکھی اور پریشانیوں میں مبتلا انسانوں کی مدد کریں۔

صوفیا سلسلوں کے بارے میں کچھ وضاحت کر دی جائے۔ ابتدائے اسلام سے سلسلہ بیعت تو جاری تھا۔ شروع میں ہر مسلمان اعلیٰ درجے کی دینی معلومات اور فہم رکھتا تھا اور سربراہ مملکت لوگوں کا دینی پیشوا بھی ہوتا تھا۔ دورِ خلافت راشدہ تک یہی رواج رہا۔ مگر خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد حکمران صرف حکمران رہ گئے جو چنے نہیں جاتے تھے بلکہ مسلط کیے جاتے تھے۔ اس لیے دینی پیشوائی اور عوام الناس کو اس بارے میں درست معلومات اور رہنمائی کا بیڑا بزرگان دین نے اٹھالیا۔ کیونکہ وہ حکومت کے برعکس وسائل سے محروم تھے اور ایک فرد واحد چاہے وہ کتنا ہی عالی منصب کیوں نہ ہو اکیلا سب کچھ کرنے سے قاصر ہوتا ہے اس لیے محسوس ہوا کہ دین کی اشاعت کے لیے سلسلے شروع کیے جائیں۔ اسے آپ ایک طرح سے انسٹی ٹیوشن یا ادارہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ افراد آتے جاتے رہتے ہیں اور ادارے قائم رہتے ہیں۔

عصری تعلیم سے بیزاری کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہیں خالصتاً دنیاوی علوم سے بیزاری تھی۔ اس کے برعکس وہ باقاعدگی سے جدید علوم کا مطالعہ کرتے رہے اور خاص طور سے جدید سائنسی انکشافات پر ان کی ہمیشہ نظر رہی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک تو بن گیا تھا مگر یہاں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا وہی انگریزوں کا بنایا ہوا نظام برقرار تھا۔ اس نظام کے تحت پڑھنے والے طلبہ دین کے حوالے سے ایک مخصوص نقطۂ نظر بھی حاصل کر رہے تھے۔ مدارس جو دینی تعلیم تو دے رہے تھے لیکن ایک بہت بڑی آبادی ان کے اثر سے باہر تھی۔ بلکہ وہ خود ایک بالکل الگ طبقہ پیدا کر رہے تھے جس سے ان دونوں طبقات میں بُعد بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لیے بہت ضروری ہوگیا تھا کہ اسکول اور کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوان طبقے کو مذہب سے دوری سے بچانے کی کوشش کی جائے اور مذہب کو ان کے سامنے سائنٹیفک انداز میں پیش کیا جائے۔

یہ طبقہ تعلیم سے فارغ ہو کر نوکری اور عام معمولات زندگی میں مگن ہو جاتا ہے اور اسے ہی اپنی کل کائنات سمجھتا ہے۔ اسے دوسری دنیا کی فکر نہیں رہتی جسے آخرت کہتے ہیں اور ہر مسلمان کا منشا نظر اصل میں آخرت ہونی چاہیے۔ یہی وہ رزلٹ ہے جس پر ہماری کامیابی اور ناکامی کا دارو مدار ہوتا ہے۔ اس طبقے کو دین کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مذہب کے وہ پہلو بھی اس کے سامنے پیش کیے جائیں جو اب تک اس سے پوشیدہ تھے۔ کلمہ گو سب ہی ہیں۔ نماز اور روزہ جیسی عبادات سے تو ہر مسلمان واقف ہی ہوتا ہے۔ وہ مسلمان جو دین سے بہت دور ہوں، جمعہ بھی نہ سہی عید کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی روزہ بھی رکھ لیتے ہیں۔ حج اور زکوۃ مالیات سے مشروط ہوتے ہیں۔ عام مسلمان ان پر بھی مشکل سے عمل کرتا ہے۔

دین کا روحانی پہلو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے کسی طلسم ہوش ربا سے کم نہیں ہے۔ ایک ایسی دنیا جو عجائبات پر مشتمل ہے اور وہ اس پر مشکل سے ہی یقین رکھتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ وقت ضائع کرنے والی چیز ہے اور بہت سوں کے خیال میں ایمان ضائع کرنے والی ہے۔ لوگ اس سے دور رہنا پسند کرتے ہیں اور جو چند ایک تجسس اور نفس کے مارے نزدیک آتے ہیں وہ اسے عملی دنیا کے لحاظ سے لیتے ہیں جہاں دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اپنے مسائل کے حل اور دنیا کی آسائشیں حاصل کرنے کے ایک شارٹ کٹ تصور کرتے ہیں جہاں انہیں کچھ کیے بغیر اور ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر سب کچھ مل جائے گا۔ اکثر جعلی پیروں اور عاملوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو دین کی عملی تربیت اور مشق سے نہ گزرے ہوں ان کے لیے بھٹک جانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ بغیر کسی تیاری اور رہنما کے تاریک جنگل میں جانے والے کے لیے بھٹک جانا۔

بابا صاحب نے محسوس کیا کہ وہ طبقہ جو دین سے دور ہے اور تجسس کے تحت اس طرف آتا ہے اس کی رہنمائی کے لیے باقاعدہ نظام کی ضرورت ہے جیسے منگولوں کے حملے کے بعد جب اسلامی دنیا میں بے عملی اور مایوسی عام ہوئی تھی تو صوفیائے کرام نے خانقاہی نظام کی مدد سے مسلمانوں کو دین سے دوری سے بچایا تھا۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جو کیتھولک چرچ منظم ترین ادارہ ہوتے ہوئے بھی نہ کر سکا اور عیسائی جب مذہب سے بیزار ہوئے تو انہوں نے سیکولرازم اپنا لیا۔ اگر صوفیائے کرام اس وقت خانقاہوں کی مدد سے بھٹک جانے والوں کو پناہ نہ دیتے اور دین کی حفاظت نہ کرتے تو شاید مسلمان بھی بہ حیثیت مجموعی سیکولرازم کی طرف مائل ہو جاتے۔ صوفیائے کرام کی یہ اتنی بڑی خدمت ہے جسے کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

کیونکہ خانقاہی نظام مروجہ دینی تعلیم کے طریقہ کار سے ہٹ کر قائم کیا گیا تھا۔ اس لیے اسے دین میں تبدیلی قرار دیا گیا۔ اس کے دو نقصانات ہوئے اول وہ طبقہ جو اس کا مخالف تھا اس سے دور ہوتا اور متنفر ہوتا چلا گیا۔ دوسرا وہ طبقہ جو اس کا حامی تھا۔ اس میں مفاد پرست عناصر نے فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ تعظیم صوفیائے کرام کی وراثت تبلیغ دین تھی لیکن ان کے وارثوں نے اسے گدی نشینی (وہ بھی وراثتی) اور حلقہ پیری مریدی تک محدود کر دیا۔ سارے سال دین کی اشاعت کے بجائے بس سالانہ عرس منانے تک رکھ چھوڑا۔ اس سے مخالفین کو مزید موقع ملا کہ وہ اس سسٹم پر تنقید کر سکیں اور خاصی حد تک ان کی تنقید جائز بھی ہو گئی تھی کہ ایک بار آنے والی تبدیلی کی رفتار رک نہ سکی اور جب یہ مفاد پرستوں کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے اس میں اپنی مرضی سے آئے دن تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں۔ دین کے بجائے پیر پرستی کو رواج دیا جانے لگا۔

بابا صاحب یہ سب دیکھ اور محسوس کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف عالم اسلام اور خاص طور سے اس کا نوجوان طبقہ تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ وہ مغربی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مغربی فکر بھی حاصل کر رہا ہے۔ وہ عقل پرست ہو رہا ہے اور دین کو عقل کی بنیاد پر پرکھ رہا ہے۔ جو اس کی عقل میں آتا ہے وہ اسے قبول کرتا ہے اور جو اس کی عقل میں نہیں آتا اسے مسترد کر دیتا ہے۔ دینی اصلاح کے مروجہ طریقہ کار اسے مطمئن کرنے کے لیے ناکافی ہے کیونکہ یہ طریقہ کمہار کے طریقہ کار سے مشابہ ہے جسے کچھ بنانے کے لیے کچی گیلی مٹی درکار ہوتی ہے، کمہار پکی ہوئی مٹی میں تبدیلی لانے سے قاصر ہوتا ہے۔ مغربی تعلیم سے آراستہ نوجوان کی مثال پکی ہوئی مٹی کی سی ہے۔ ان میں تبدیلی لانا آسان نہیں ہوتی ہے۔ اس کے لیے مروجہ طریقہ کار سے ہٹ کر نئے طریقوں کی ضرورت تھی۔

دوسری طرف اسلام کا مروجہ نصاب پڑھ کر مدرسوں سے فارغ التحصیل ہونے والے نوجوان تھے جو جدید دنیا کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے تھے۔ بابا صاحب کی نظروں سے یہ سب خطرات اوجھل نہیں تھے اور ان کے خیال میں ان کا سب سے زیادہ نشانہ نوجوان طبقہ ہی ہو سکتا تھا۔

عالم اسلام کو ان فتنوں سے بچانے کے لیے کسی باقاعدہ ادارے کا قیام یوں بھی ضروری ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ملکوں میں جا بسی تھی۔ وہ کئی نسلوں سے وہاں رہ رہے تھے اور ان کے بچے اسی معاشرے میں اور ان کے تعلیمی نظام کے تحت پلے بڑھے تھے۔ دنیا کے لحاظ سے ہوشیار اور سمجھدار یہ نوجوان نسل دین کے معاملے میں بہت کم سمجھ اور تقریباً نا واقف تھی۔ ان لوگوں کو دین کا درست فہم دینے اور اچھا مسلمان بنانے کے لیے بہت زیادہ کوشش کی ضرورت تھی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بابا صاحب نے اپنی تین اہم ترین تصنیفات یعنی رباعیات قلندر بابا اولیا، لوح و قلم اور تذکرہ تاج الدین بابا میں روحانیت کے معنی اور اس کے اسرار و رموز اس انداز میں بیان کیے جو پڑھے لکھے نوجوان طبقے میں مقبول ہوں اور ایسا ہی ہوا۔ انسان کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ عالمِ لاہوت، عالمِ جبروت اور عالمِ ملکوت کیا ہوتے ہیں؟ ارض و سما کے خفیہ پہلو، حواس کیا ہوتے ہیں؟ انسانی جسم کی ساخت اور اس کے روحانی پہلو، ان سب پر بابا صاحب نے ان کتابوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہی نہیں بلکہ آسانی کے لیے ایسے نقشے اور فارمولے بنا کر دیے جن سے سری علوم کو سمجھنا آسان ہوا۔ لیکن ان نقشوں اور فارمولوں کا مقصد لوگوں کو جھٹ پٹ روحانیت کا ماہر بنانا نہیں تھا۔ بلکہ ان کا بنیادی مقصد پڑھے لکھے اور عقل پسند افراد کے ان تشنہ سوالوں کا جواب دینا تھا جو عام طور سے لاجواب رہ جاتے تھے۔

رسالوں کی ادارت اور پھر کہانی نویسی کے دوران بابا صاحب نے محسوس کیا کہ رسالے اس دور کا طاقتور میڈیا ہیں۔ کیونکہ ریڈیو اور ٹی وی محدود تھا۔ انٹرنیٹ کا آغاز ابھی بہت دور تھا۔ لوگوں میں اور خاص طور سے تعلیم یافتہ طبقے میں مطالعے کا رجحان تھا۔ کتابوں اور ناولوں کے ساتھ ساتھ وہ رسالے بھی پڑھتے تھے۔ مگر اکثر رسالے اخلاق سوز کہانیوں اور واقعات کے چٹخارے دار قصے شائع کرتے تھے اور اس کا نئی نسل پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ اس موقع پر بابا صاحب نے وہ کیا جو ایک راست رو اور دین کی درست فہم رکھنے والا شخص ہی کر سکتا ہے۔ انہوں نے رسالوں کو برا اور غیر شرعی کہنے کے بجائے ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے خود بھی کہانیاں لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں وہ اس پُر اثر میڈیا کو دین اور اس کے فہم کی تبلیغ کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

بابا صاحب کی شخصیت اور ان کے روحانی اثر نے رسالوں میں لکھنے والے مصنفین کو بھی متاثر کیا۔ انہوں نے نہ صرف بابا صاحب کی روحانی سائنس کے حوالے سے کہانیاں لکھیں بلکہ خود بابا صاحب کو جدید روحانی کردار کے طور پر بیشمار کہانیوں میں پیش کیا گیا۔ انہوں نے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کو اتنے عام فہم انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ جب اس موضوع پر کہانیاں لکھی گئیں تو وہ لوگوں کو قطعاً عجیب اور حقیقت سے بعید نہیں لگی تھیں۔ ایک کہانی نویس نے تو بابا صاحب کی مکمل شخصیت اور ان کے بنائے ادارے تک کو اپنی کہانی کا موضوع بنا لیا۔ میں نام نہیں لوں گا لیکن پڑھنے والے جانتے ہیں کہ راقم کا اشارہ کس طرف ہے۔ یہ بابا صاحب کی شخصیت اور ان کی علمیت کا اعجاز تھا کہ انہوں نے ان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا جن کے لاکھوں لوگ گرویدہ تھے۔

ٹیلی پیتھی یا خیال خوانی صدیوں سے ایک معروف اصطلاح ہے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ذہن تک یوں رسائی حاصل کر لینا کہ وہ نہ صرف اس کی سوچیں پڑھ سکے بلکہ حسب منشا اسے اپنی مرضی پر بھی چلا سکے۔ ٹیلی پیتھی یا خیال خوانی کہلاتی ہے۔ انہوں نے اس شعبے کو بہت زیادہ وسعت دے دی ہے۔

مشرق اور خاص طور سے برصغیر میں ان علوم کے حوالے سے پہلی بار بابا صاحب نے کام کیا۔ انہوں نے عوام الناس کی یہ غلط فہمی دور کی کہ یہ مغربی علم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ خالصتاً مشرقی، اسلامی اور روحانی علوم ہیں۔ مگر ان کا طریقہ کار اور مقاصد وہ نہیں ہے جو مغرب والوں کا ہے۔ روحانی دنیا میں عام طور سے دماغ کی نفی کی جاتی ہے۔ اسے اہمیت نہیں دی جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں دل کو فوقیت دی جاتی ہے۔ روحانیت کا مرکز دل کو کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دماغ کو صرف چالاکی اور کسی حد

تک شیطان کا مرکز بھی کہا جاتا ہے۔ پہلے مذہب اور اُس کے بعد معاشرت میں دماغ کے حوالے سے ایسی باتیں عام ہوئیں جن سے لگتا تھا کہ دماغ ایسا ٹول ہے جو مثبت مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے صوفیا ازم میں دماغ کی نفی عام سی بات تھی۔ حالانکہ دین اور دنیا کے سارے معاملے ان دونوں کی متوازن شرکت سے ہی سلجھتے ہیں۔

بابا صاحب نے دماغ کو روحانیت کا مرکز قرار دیا۔ اسے ایسا سپر کمپیوٹر کہا جس کا بہت معمولی سا حصہ ہم استعمال کر پاتے ہیں اور اگر ہم اپنے دماغ کے بند حصوں تک رسائی حاصل کر لیں تو وہ کام کر سکتے ہیں جو عام معمول میں نہیں کر پاتے۔ اولیا اللہ میں انہیں کرامات کہا جاتا اور غیر مسلموں میں استغراق۔ ٹیلی پیتھی اور مراقبے کی مشقیں دماغ کے ان غیر فعال حصوں کو فعال بنانے کے لیے ہوتی ہیں۔ بابا صاحب نے جسم اور روح کو روشنیوں کا مرکب قرار دیا۔ جب روشنیاں ملتی ہیں تو جسم وجود میں آتے ہیں اور روح نور کی لطیف ترین شکل ہے۔ عجیب بات ہے کہ جدید سائنس بھی یہی بتاتی ہے کہ کائنات شروع میں صرف روشنی تھی اور پھر یہ روشنیاں ایک جگہ مرتکز ہوئیں اور سب کی سب سمٹ کر ایک ناقابلِ یقین حد تک مختصر نقطے میں سما گئیں۔

پھر یہ نقطہ پھٹا اور اس نے نظر آنے والی کائنات کی تشکیل کی۔ مگر سائنس یہ بھی کہتی ہے کہ نظر آنے والی کائنات اصل کائنات کا صرف دس فیصد ہے اور جو کائنات نوّے فیصد مادہ رکھتی ہے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ انسان اپنے دماغ کا زیادہ سے زیادہ دس فیصد استعمال کرتا ہے اور یہ بھی بہت ذہین لوگ استعمال کر پاتے ہیں گویا ہمارے دماغ کا نوّے فیصد حصہ استعمال نہیں ہوتا ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ نوے فیصد مادہ جو نظر نہیں آتا ہے اگر انسان اس پر قابو پالے تو ناقابلِ یقین کام کر سکتا ہے۔ اسی طرح انسان اگر اپنے دماغ کے غیر فعال شدہ حصوں کو فعال کر لے تو ان سے وہ کام لے سکتا ہے جن کے بارے میں ابھی صرف سوچا جاتا ہے۔ بابا صاحب نے جو فارمولے بتائے اور طریقے عام فہم انداز میں بیان کیے ان کا مقصد دماغ کے ان حصوں کو استعمال کرنا تھا۔ مگر اس کا مقصد دنیاوی فوائد نہیں بلکہ اخروی فوائد ہیں۔ ایک دوسرے کے کام آنا اور دکھ درد بانٹنا، یہی اصل زندگی ہے اور بابا صاحب کی تمام تعلیمات کا بنیادی نچوڑ یہی رہا۔

ساٹھ کی دہائی بابا صاحب کی زندگی میں بہت زیادہ تبدیلیاں لے کر آئی تھی۔ روحانیت کے سفر میں وہ اتنے آگے ضرور جا چکے تھے کہ بہت سے اسرار و رموز ان پر کھل چکے تھے اور بہت سے لاینحل مسائل کی گتھیاں سلجھ چکی تھیں۔ جن سوالوں کے جوابات کے لیے وہ خود بھی سرگرداں تھے اب وہ ان کے جواب نہ صرف پا چکے تھے بلکہ تشنگانِ علم کو ان کے سوالوں کے جواب دے بھی سکتے تھے۔ جو نہ صرف خود ان سے رابطہ کرتے تھے بلکہ خطوط اور کالز کی مدد سے بھی ان سے رابطے میں رہتے تھے۔

سلسلہ عظیمیہ کے جاری ہونے کے وقت بابا صاحب نے اس کے لیے مقاصد متعین کر دیے تھے۔ مقاصد طے کیے بغیر کسی ادارے کا قیام بے کارِ محض ہوتا ہے۔ وہ مقاصد یہ ہیں۔ بندے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر دین کی خدمت کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر صدقِ دل سے پوری طرح عمل کر کے آپ ﷺ کے روحانی مشن کو فروغ دیا جائے۔ مخلوق کی خدمت کی جائے۔ دینی علوم کے ساتھ لوگوں کو روحانی اور سائنسی علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے۔ لوگوں میں ایسی طرزِ فکر کو بیدار کرنا کہ وہ اپنی روح اور اپنی صلاحیتوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کریں۔ تمام بنی نوع انسانی کو بنا فرق ملت، مذہب، قوم، نسل، زبان اور فرقے کے ایک سمجھنا، سب سے ایک سی ہمدردی اور خلوص سے پیش آنا اور ان کے کام آنا۔

بابا صاحب نے صرف مقاصد اور نصاب ہی طے نہیں کیے بلکہ اپنی حیات میں ان پر عمل کرانا شروع کر دیا اور سب سے پہلے اسے خود پر لازم کر لیا۔ اگرچہ بیماری اور پیرانی کی وجہ سے انہیں کچھ امور میں مشکل پیش آتی تھی مگر وہ دوسروں کے لیے مثال چھوڑنے کے لیے اس مشکل سے بھی گزر جاتے تھے۔ فرض عبادات کو خاص طور سے اہمیت دیتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ کسی کو نماز یا روزہ چھوڑتے دیکھتے تو بہت رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ مگر کسی کو کہتے بھی تو بہت پیار اور نرمی سے۔ دین کے معاملے میں درشتی اور غصہ انہوں نے اپنی ذات سے خارج کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایسے واقعات اور حالات جن کی توجیہہ انسانی عقل

نہ پیش کر سکے اور وہ پہلے دیکھنے میں نہ آئے ہوں۔ ہم انہیں معجزات کہتے ہیں جو انبیاؑ کی ذات سے منسوب ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت صالحؑ کی اونٹنی کا چٹان سے برآمد ہونا اور بچہ دینا، حضرت موسیٰؑ کا دریا پر عصا مارنا اور اس کا دو حصوں میں تقسیم ہوکر درمیان میں صاف اور خشک راستہ چھوڑ دینا اور حضرت عیسیٰؑ کا مردوں کو زندہ کر دینا۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک سے تو بے شمار معجزے ظہور پذیر ہوئے۔ شق القمر ایسا معجزہ ہے جو کفار کے.... مانگنے پر دکھایا گیا اور اسے دنیا کے بہت سے حصوں میں دیکھا گیا تھا۔ آپ ﷺ آخری نبی تھے اور آپ ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ قیامت تک کے لیے بند ہوگیا۔ مگر اللہ کی سنت جاری رہی اور خرق فطرت واقعات کا ظہور جاری رہا۔ اب یہ اللہ کے ولیوں کے ہاتھ سے ہونے لگا۔ ہم اسے کرامت کہتے ہیں۔

بابا صاحب بھی اللہ والے تھے اور ان کی ذات سے بہت سے ایسے واقعات منسوب ہیں جن کی عقل توجیہہ پیش نہیں کر پاتی ہے۔ اگرچہ بابا صاحب نے نہ تو کبھی اس حوالے سے باقاعدہ محفلیں سجائیں اور نہ پہلے سے اعلان کر کے کرامت دکھائی۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو ہمیشہ ضرورت کے تحت اور اتفاق سے ہوا تھا۔ ورنہ وہ اس معاملے میں بہت محتاط تھے اور خاص طور سے ان لوگوں کے سامنے زیادہ محتاط رہتے تھے جو ان سے واقف نہ ہوں۔ انہوں نے دعا اور مراقبے کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر اسے تماشا نہیں بنایا تھا۔ اس کے باوجود بندگان خدا دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ ان محفلوں میں شامل ہوتے اور آکر اپنی اپنی مشکلات اور حاجات بابا صاحب کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان واقعات کے سب سے معتبر راوی جناب خواجہ صاحب ہیں اور ان کے بیان کیے ہی چند واقعات پیش خدمت ہیں۔

جن دنوں ان کی بیٹھک خواجہ صاحب کے گھر تھی۔ بابا صاحب کا معمول تھا کہ ہفتے کی شام وہ اپنے گھر تشریف لے جاتے تھے اور اتوار کی شام واپس آتے تھے۔ ایک بار وہ گھر گئے ہوئے تھے کہ شدید بارش ہو رہی تھی اور خواجہ صاحب نے سوچا کہ بابا صاحب آج واپس نہیں آئیں گے۔ اس لیے انتظار کرنے کی بجائے سو گئے۔ مگر جب اٹھ کر دیکھا تو بابا صاحب موجود تھے۔ باہر شدید بارش جاری تھی اور بابا صاحب کی شیروانی پر پانی کا ایک چھینٹا بھی نہیں تھا۔ خواجہ صاحب نے سوال کیا کہ آپ اتنی بارش میں اتنی دور سے آئے اور لباس قطعی نہیں بھیگا تو بابا صاحب نے فرمایا۔ ”خواجہ صاحب ٹائم اینڈ اسپیس ایک مفروضہ ہے لیکن یہ بات ابھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔“

عجیب بات ہے کہ جدید سائنس کہتی ہے کہ وقت اور خلا دونوں اضافی ہیں۔ ان کو حسبِ ضرورت تبدیل کیا جا سکتا ہے وہ اس کی مثال کاغذ سے دیتے ہیں ایک مربع فٹ کاغذ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا فاصلہ ایک فٹ ہوتا ہے لیکن اگر کاغذ کو تہہ کر کے اس کے سرے ملا دیے جائیں تو فاصلہ صفر رہ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح وقت اور خلا کو طے کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت وقت خلا کا دوسرا نام ہے اگر خلا صفر ہو جائے تو وقت بھی صفر ہو جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں انسان کوئی کام ایک طویل مسافت اور طویل وقت میں کرتا ہے وہ پلک جھپکنے یا اس سے بھی پہلے ممکن ہو سکتا ہے۔ مگر سائنس وقت اور خلا پر یہ قدرت حاصل نہیں کر سکی ہے کہ اسے اپنی مرضی سے تبدیل کر دے۔ البتہ اللہ نے اپنے نیک بندوں کو یہ قوت دی ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

خواجہ صاحب کا نکاح ڈھاکا مشرقی پاکستان میں ہوا تھا مگر عین نکاح کے وقت مہر کی رقم پر تنازعہ ہو گیا۔ خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ مہر ان کی آمدنی کے لحاظ سے ہو اور وہ اسے آسانی سے ادا کر سکیں۔ دوسری طرف لڑکی والے زیادہ مہر رکھوانے پر بضد تھے۔ اسی بحث و تکرار کے دوران خواجہ صاحب نے معاً دیکھا کہ بابا صاحب ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ حالانکہ وہ اس وقت کراچی میں تھے۔ بابا صاحب نے ان سے کہا۔ ”لڑکی والے جتنا مہر کہہ رہے ہیں مان لو۔“

انہوں نے عرض کیا۔ ”میری استطاعت سے زیادہ ہے۔“

بابا صاحب نے کسی قدر غصے سے کہا۔ ”ہم جو کہہ رہے ہیں مان لو۔“

چنانچہ یہ مان گئے اور اس کے بعد جیسے غیب سے مہر کی رقم کا انتظام ہوگیا اور وہ اس ذمے داری سے سبک دوش ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب سے بابا صاحب کی محبت و تعلق کچھ ایسا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ بابا صاحب کا اندازِ نشست اپنے نانا بابا تاج الدین کی طرح فقیرانہ تھا یعنی دونوں پاؤں سمیٹ کر سینے سے لگاتے ہوئے ان کے گرد ہاتھ باندھ کر بیٹھتے تھے۔ یہ اللہ والوں کا عاجزی اور انکساری کا انداز

ہے۔ایک دن خواجہ صاحب نے فرطِ محبت سے بابا صاحب کے پیروں پر سر رکھا اور اسی حالت میں سو گئے۔جب ان کی آنکھ کھلی تو بابا صاحب اسی طرح بیٹھے تھے اور ذرا بھی حرکت نہیں کی تھی کہ خواجہ صاحب کی نیند نہ خراب ہو جائے۔خواجہ صاحب نے گھڑی دیکھی تو غرق ندامت ہو گئے کہ بابا صاحب پورے چھ گھنٹے سے اسی حالت میں ساکت بیٹھے رہے تھے۔نفس کشی کی ایسی مثال مشکل سے ملے گی۔ انسان اپنے لیے تو سخت سے سخت حالات سے گزر جاتا ہے لیکن دوسروں کے لیے تکلیف برداشت کرنا اور اپنا نفس مارنا اللہ والوں کا ہی کام ہے۔

بابا صاحب کے پاس آنے والوں کا ایک ہجوم رہنے لگا تھا اور ان سے ملاقات میں بہت وقت صرف ہونے لگا۔ لیکن جتنے بھی لوگ آتے بابا صاحب ان سے مل کر ہی اٹھتے تھے۔اکثر کسی مشکل یا بیماری کے سلسلے میں آئے ہوتے تھے۔ایک بزرگ جو عرصہ دراز سے بیماری کی وجہ سے چلنے سے قاصر ہو گئے تھے ان کے متعلقین ان کو اٹھا کر لائے اور بابا صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے حکم دیا۔''آپ کھڑے ہو جائیں۔''

بزرگ نے عرض کی۔''سالوں ہو گئے ہیں کہ میں کھڑا نہیں ہو سکا اور اب تو پاؤں بھی جڑ گئے ہیں۔''

مگر جب بابا نے زور دے کر پھر کہا تو وہ بے ساختہ کھڑے ہو گئے اور صرف کھڑے نہیں ہوئے بلکہ اپنے پیروں سے چلتے ہوئے وہاں سے گئے۔بزرگ آخری وقت تک چلتے پھرتے رہے اور دوبارہ ان کو یہ مسئلہ کبھی درپیش نہیں آیا تھا۔اسی طرح بہت سے مریض جو بظاہر لاعلاج تھے اور ڈاکٹرز یا حکیموں نے جواب دے دیا تھا۔وہ جعلی پیروں کے پاس جا کر لٹ چکے تھے مگر جب بابا صاحب کے پاس آئے تو بنا کسی خرچ کے صحت اور بابا صاحب کی دعائیں دونوں لے کر گئے۔ان میں ایسے مریض بھی تھے جن کے مرض کا واحد علاج ڈاکٹروں نے آپریشن بتایا تھا۔ایسے ہی ایک صاحب پیٹ کی تکلیف میں مبتلا ہوئے اور ڈاکٹروں کی سمجھ میں ان کا مرض نہیں آ رہا تھا کیونکہ ٹیسٹوں اور ایکسرے میں تو سب ٹھیک آ رہا تھا۔وہ تکلیف سے تڑپتے تھے۔ایک لمحے کو سکون نہیں تھا۔مجبوراً ڈاکٹروں نے پیٹ چاک کر کے دیکھنے کا فیصلہ کیا۔بابا صاحب کے علم میں آیا تو انہوں نے کہلوا بھیجا کہ ناف ٹل گئی ہے کسی اچھے بٹھانے والے سے بٹھا لیں ٹھیک ہو جائیں گے۔انہوں نے ایسا کیا اور بالکل ٹھیک ہو گئے۔

انسانوں کے علاوہ جن بھی بابا صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔کبھی خواجہ صاحب رات کو بیدار ہوتے تو انہیں بابا صاحب کے کمرے اور غلوہ سے انوکھی اور تیز روشنیاں نظر آتی تھیں۔بعض اوقات ایسے مناظر دکھائی دیتے کہ خواجہ صاحب ڈر جاتے اور ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔انہوں نے بارہا دیکھا کہ مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم بابا صاحب کو گھیرے ہوئے ہے جن کے آنے جانے کا پتا نہیں چلتا تھا۔پوچھنے پر بابا صاحب صرف اتنا کہتے تھے کہ یہ تمہارے پیر بھائی اور بہنیں ہیں۔برسوں بعد خواجہ صاحب پر عقدہ کھلا کہ وہ جن تھے جو حاضری دیتے تھے اور بابا صاحب کی زیارت و ملاقات کے لیے آتے تھے۔یہ لوگ دروازوں سے آتے جاتے نظر نہیں آتے تھے۔

بابا صاحب اللہ کے ایسے ہی بندے تھے جن کی زندگی بتاتی ہے کہ انہوں نے خود کو اللہ کی مرضی اور خواہش پر چھوڑ دیا تھا تو اللہ نے اپنے بندے کی وہ خواہشات پوری کر دیں جو اس نے دوسروں کے لیے کیں اور اپنے لیے انہوں نے کچھ چاہا تو دنیا میں اس کا کوئی گواہ نہیں ہے۔اگر ایسا ہے تو یہ اللہ اور بندے کے درمیان ہی ہے۔اس معاملے میں ان کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔وہ جوانی میں بھی ایسے بے نیاز اور غنی تھے اور جب دنیا چاروں طرف سے ان کے پاس آنے لگی تب بھی وہ اس سے بے نیاز رہے بلکہ زیادہ اجتناب کرنے لگے تھے۔عمر کے ساتھ اپنا حصہ کم سے کم کرتے جا رہے تھے۔غذا معمولی سی اور لباس بھی عام سا۔محفل میں اور باہر عام طور سے شیروانی اور جناح کیپ زیب تن کرتے تھے۔مگر گھر میں زیادہ تر کرتہ پاجامہ اور بعض اوقات بغیر کرتے کے رہتے تھے۔

چند ایک جوڑے تھے ان ہی کو بدل بدل کر پہنتے تھے۔دوست احباب اور عقیدت مند ہدیے میں چیزیں لاتے تو بانٹ دیتے۔ذاتی استعمال کی چیز ہوتی تو پہلے سے موجود چیز میں سے کسی کو دے دیتے۔اپنے پاس گنی بندھی چیزیں ہی رکھتے تھے۔دعوتوں میں کم ہی شریک ہوتے تھے خاص طور سے جہاں فضول خرچی اور دنیا دکھاوا ہو۔اگر کوئی زیادہ اصرار کرتا تو کچھ دیر کے لیے چلے جاتے۔انواع و اقسام کے کھانوں سے چند لقمے لیتے تھے۔اگر کسی کے

بارے میں شبہ ہوتا کہ اس کے گھر مال حرام آتا ہے تو وہاں کا پانی پینے سے بھی گریز کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بگاڑ کا آغاز مشکوک خوراک سے ہوتا ہے۔

محفلوں میں اپنی قطع وضع ایسی رکھتے کہ دیکھنے والا ان میں کوئی خاص بات محسوس نہیں کرتا تھا۔ دس لوگوں کے درمیان ہوتے تو نمایاں نہ ہونے کی اپنی نبی ﷺ کی سنت پوری کرتے تھے۔ انہیں نمایاں ہونا اور لوگوں کا ایک حد سے زیادہ احترام کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ دوسروں سے بے تکلفی سے پیش آتے تھے اور اگر کوئی ادب یا عقیدت میں ان سے دب کر بات کرتا تو وہ اسے یوں مخاطب کرتے کہ وہ بابا صاحب کے کھلے پن پر حیران ہی رہ جاتا۔ مگر عام طور پر وہ سنجیدہ اور خاموش رہنا پسند کرتے تھے۔ بلا ضرورت بات کرنا پسند نہیں تھا۔ محفل میں اپنی کہنے سے زیادہ دوسروں کی سننا پسند کرتے تھے۔ بحث اور دوسروں کی بات کاٹنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کے پاس ایسے لوگ بھی آتے تھے جو صوفی ازم اور خانقاہوں کے مخالف ہوتے تھے اور وہ تیز و ترش انداز میں بابا صاحب سے بات یا بحث کرتے مگر بابا صاحب ہمیشہ انہیں دھیمے لہجے میں جواب دیتے۔ کبھی ان کی آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ اگر کوئی زیادہ ہی بحث پر آمادہ ہوتا تو اسے کہہ دیتے۔ ''بھائی تمہارا دین تمہارے ساتھ اور ہمارا دین ہمارے ساتھ ہے۔''

نصف صدی سے کم خوراک پر گزارے کے باوجود بابا صاحب جسمانی طور پر صحت مند اور ہمیشہ چاق و چوبند رہے۔ بیماریاں اور تکالیف بھی آتی رہیں اور اللہ کے بندوں پر تو زیادہ ہی آتی ہیں مگر انہیں اپنے معمولات اور محفلوں میں ذرا بھی حارج ہونے نہیں دیا۔ جب بیماری کی وجہ سے آنے جانے سے قاصر ہو گئے تب بھی آنے والوں سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ جب کوئی اور ان کی تکلیف محسوس کرتا تو اس سے کہتے۔ ''اللہ بڑا مہربان ہے اپنے بندے کو اتنی ہی تکلیف دیتا ہے جتنی کہ وہ برداشت کر سکے۔''

انتقال سے آٹھ مہینے پہلے غذا بالکل ہی ترک کر دی تھی۔ خاص طور سے ٹھوس غذا کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ مشکل سے ایک پیالی دودھ چوبیس گھنٹے کی غذا تھی۔ پانی بھی کم پیتے تھے اور جب خواجہ صاحب یا کوئی دوسرا منت سماجت کرتا تو ایک دو گھونٹ پانی پی لیتے تھے۔ یہ بھی بہت ہوتا تھا ورنہ اکثر درخواست کے جواب میں ہاتھ کے اشارے سے منع فرما دیتے تھے۔ طعام کے ساتھ کلام بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ جسم کمزور سے کمزور ہونے لگا مگر روح اتنی ہی توانا تھی۔ اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہوتا اپنے معمولات نمٹاتے رہے۔ واقفانِ حال پریشان تھے اور ان کے دل اندیشوں سے لبریز ہونے لگے تھے۔ ہوائیں کہہ رہی تھیں کہ وقتِ رخصت قریب ہے۔ جب خزاں آتی ہے تو پتے مرجھانے لگتے ہیں۔ جب کوئی بڑی ہستی دنیا سے جانے لگتی ہے تب بھی لوگ محسوس کرتے ہیں۔

آنے والوں اور ملاقات کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اتنے لوگوں سے ملنا بھی ممکن نہیں تھا۔ جواب دیا جاتا تو لوگ روتے اور منت کرتے کہ اچھا دیدار ہی کرا دیا جائے۔ وصال والے دن بے چین سے تھے۔ اپنے قریبی رشتے داروں کو پاس رہنے کو کہہ رہے تھے۔ دوست اور احباب تو پاس تھے ہی۔ پھر اچانک ہی اجازت دے دی کہ جس نے جانا ہے چلا جائے۔ مگر جلد واپس آئے۔ جو لوگ گئے ان کو پتا نہیں تھا کہ انہیں بہت جلد واپس آنا پڑے گا۔ خاص مریدین میں سے ایک سراج بھائی بھی تھے۔ آخر وقت انہوں نے بابا صاحب کی بہت خدمت کی اور اتفاق کی بات ہے وہی آخری وقت میں کچھ دیر کے لیے چلے گئے۔ انتقال سے ایک ہفتہ پہلے اعلان کر دیا تھا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری ہفتہ ہے۔ سردیاں عروج پر تھیں۔ 27 جنوری 1979ء کی شب ایک بجے اچانک حالت بگڑی۔ رب کی طرف سے بلاوا آیا اور بندے نے لبیک کہا۔

اگلے دن یہ خبر تمام بڑے اخبارات میں نمایاں شائع ہوئی۔ پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دل شق ہو گئے تھے۔ بہت سوں کو سکتہ ہو گیا تھا۔

بابا صاحب نے پسماندگان میں چار اولادیں چھوڑیں۔ ان میں دو صاحب زادے شمشاد احمد اور رؤف احمد جب کہ دو صاحب زادیاں سلیمہ خاتون اور تسلیمہ خاتون بقیدِ حیات ہیں۔

ماخذ

تذکرہ قلندر بابا اولیا
لوح و قلم
تذکرہ تاج الدین بابا
مضامین

کچھ ایسی لایعنی باتیں جن پر لوگ اعتقاد رکھتے ہیں

اسما صدیقی

زندگی کے اس خرابے میں، لوگ خود کو کس طرح پامال کرتے ہیں۔ اس کی ایک جھلک خود ہماری زندگی ہے۔ کوا منڈیر پر کیوں بولا، شیشے کا گلاس کیوں ٹوٹا، بلی نے راستہ کیوں کاٹا، پیچھے سے کسی نے کیوں پکارا؟ ایسی ہی بے سروپا باتوں سے ہم زندگی کو دشوار بنا لیتے ہیں۔ چاہ کر بھی اس فسونِ باطل کے اسیر بنے رہتے ہیں۔

آج صبح ہی سے گھر میں عجب ہڑبونگ مچی تھی۔ ظاہر ہے جانِ پدر، نورِ چشم، اماں کی آنکھوں کے تارے، ابا کے بڑھاپے کے سہارے، بہن کے راج دُلارے، دادی بی کے جگر کے ٹکڑے اور سہارنپوری گھرانے کے اکلوتے چشم و چراغ عزت مآب جناب شہریار سہارنپوری صاحب خیر سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد حسبِ دستور نوکری تلاش کرنے کی مہم پر روانہ ہو رہے تھے۔ سارا گھران کو طرح طرح کے مفید مشوروں سے نواز رہا تھا۔ ابا نے سر پر تھپکی دیتے ہوئے دُلار سے کہا۔ ”جاؤ بیٹا، مگر خیال رکھنا کہ انٹرویو دیتے وقت میاں صاحب کی دی ہوئی کراماتی انگوٹھی جیب سے نکال کر سیدھے ہاتھ کی مٹھی میں دبا لینا۔ خاندانی انگوٹھی ہے یہ ہماری! اس انگوٹھی کے ہوتے ہوئے بڑی بڑی

مشکلیں میاں صاحب کی برکت سے آسان ہو گئی ہیں۔ بس تم اسے ہاتھ میں تھامنا نہ بولنا۔''

ابا سے فارغ ہوئے تو اماں بڑے چاؤ سے دہی سے.. لبالب بھرا پیالہ لے کر آگئیں۔ ''سیانے کہتے ہیں کہ کسی بھی اچھے کام پر روانہ ہونے سے پہلے دہی کھانا چاہیے۔ اب یہی دیکھ لو، سوموار کو تمہارے ابا نجانے کس دھیان میں دہی کھائے بغیر ہی مستری کو لینے نکل پڑے۔ کرموں جلا نجانے کہاں کا مستری تھا۔ کمبخت نے والو ٹھیک کرنے کی بجائے اچھی بھلی چلتی ہوئی واشنگ مشین کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔''

اماں کنکھیوں سے ابا کے چہرے کے بنتے بگڑتے تاثرات کو دیکھتے ہوئے اپنی تقریر ابھی جاری رکھتیں مگر شہر یار میاں گھڑی پر نگاہ پڑتے ہی انٹرویو کے لیے لیٹ ہو جانے کی دہائی دیتے کمرے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اماں ہائیں ہائیں کرتی پیالہ تھامے پیچھے دوڑیں۔ شومیٔ قسمت، صحن میں دادی بی تخت پر براجمان امام ضامن تھامے انہی کا انتظار کر رہی تھیں۔ چار و ناچار ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر داہنا بازو آگے کر دیا۔ دادی منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتے ہوئے ان کی آستین چڑھا کر امام ضامن باندھنے لگیں۔ اماں بھی موقع تاک کر جلدی جلدی دہی سے بھرے چمچے شہر یار میاں کے منہ میں دینے لگیں۔

دادی بی اور اماں سے فارغ ہو کر ابھی وہ اٹھ ہی رہے تھے کہ باورچی خانے سے چھمی آپا ہاتھ میں سرخ سرخ گول مرچیں تھامے نکلیں اور دادی بی کی ہدایت کے مطابق جلدی جلدی شہر یار میاں کی نظر اتارنے لگیں۔ گو یہ سب شہر یار کے لیے نیا نہیں تھا مگر اس وقت وہ انٹرویو کی ٹینشن کی وجہ سے سخت جھلاہٹ میں مبتلا تھے۔ نظر اترنے کے بعد چھمی آپا مرچوں کو چولہے پر رکھنے کے لیے بھاگیں اور ادھر شہر یار میاں جلدی جلدی اپنی فائلز سنبھال کر دروازے کی جانب دوڑے۔ اسی لمحے مرچوں سے اٹھنے والے تیز دھوئیں کی وجہ سے باورچی خانے سے چھمی آپا کے چھینکنے کی آواز آئی۔ گھر بھر کو ایک لمحے کے لیے سانپ سونگھ گیا، خود شہر یار میاں کے قدم جہاں کے تہاں رہ گئے۔ دادی بی تلملا کر پکاریں۔ ''او بد بخت چھمی کی بچی تجھ سے دو منٹ اپنی چھینک نہ روکی گئی مردود! بھائی گھر سے باہر قدم نکال رہا تھا کہ تُو نے برا شگون کر دیا۔ تبھی تو میں کہوں آج صبح ہی سے میری بائیں آنکھ رہ رہ کر کیوں پھڑک رہی تھی۔''

اماں کلیجہ تھامے شہر یار کی جانب لپکیں۔ ''آ جا میرے بچے، دو منٹ کو اندر آ کر بیٹھ جا۔ نحوست کے اثرات کم ہو لیں تو نکل جانا۔''

شہر یار میاں نے گھڑی کی جانب نگاہ کی تو اس کی تیزی سے بھاگتی سوئیوں کے سامنے انھیں اماں کی بات پر عملدر آمد کرنا ممکن ہوتا نظر نہ آیا۔ وہ اماں سے ہاتھ چھڑا کر جلدی سے باہر نکل گئے کہ مبادا دادی بی بھی ان کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ البتہ ان کو اپنے پیچھے ابھرتی دلخراش نسوانی چیخیں ضرور سنائی دے گئی تھیں جو اس 'بری گھڑی' میں ان کے گھر سے نکل کھڑے ہونے پر اماں، دادی بی اور چھمی آپا کے منہ سے ایک ساتھ بلند ہوئی تھیں۔

راستے بھر ان کو یہی خیال ستاتا رہا کہ اماں کے کہنے پر انھیں رک جانا چاہیے تھا۔ بزرگوں کے کہے میں کوئی نہ کوئی سچائی ضرور ہوتی ہے۔ مستقیم چچا نے بھی دادی بی کی بات جھٹلائی تھی اور مہینے کی تیرہ تاریخ کو دُلہن بیاہ کر لے آئے تھے۔ کیسی کیسی پریشانیاں نہیں اٹھائیں انھوں نے، وہ تو اللہ بخشے میاں صاحب کو کہ انھوں نے دم درود کر کے دونوں میاں بیوی پر سے ہندسے کی نحوست کے اثرات کو ٹالا ورنہ ان کی تو شادی ختم ہو گئی ہوتی۔ اپنی سوچوں میں گم وہ تیز تیز قدم اٹھاتے اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک منظر دیکھ کر ان کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ان کے عین سامنے کہیں سے بلی کا ننھا سا بچہ آ گیا تھا، ستم یہ تھا کہ وہ بالکل سیاہ تھا، کسی کوئلے کی طرح! شہر یار میاں کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ آج ضرور کچھ برا ہونے والا ہے! دل کی بے قابو ہوتی دھڑکنوں کے باعث قریب تھا کہ ان کو اختلاج کا دورہ پڑ جاتا مگر قریب آتی بس کو دیکھ کر وہ خود کو سنبھال کر بس میں چڑھ گئے۔ پورا راستہ اور پھر انٹرویو کے دوران بھی ان کا ذہن صبح ہونے والے واقعات میں الجھا رہا، اسی پریشانی میں وہ میاں صاحب کی دی ہوئی کرشاتی انگوٹھی بھی مٹھی میں دبانا بھول گئے اور اس کے نتیجے میں ان کا انٹرویو بھی الٹا سیدھا ہوا۔ گھر آ کر منہ، سر لپیٹ کر پڑ گئے۔ انھیں یقین تھا کہ اتنی بدشگونیوں کے بعد انھیں یہ نوکری نہیں ملنے کی!!

مگر ایک ہفتے بعد انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا جب ابا نے کمپنی سے آنے والا اپائنٹمنٹ لیٹر انھیں تھمایا جس میں واضح طور پر درج تھا کہ کمپنی ان کی 'قابلیت اور ذہانت' کی بدولت ان کا انتخاب کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہی ہے۔

یہ واقعہ اور اس سے ملتے جلتے کئی نیک شگون اور بد

شگونی کے واقعات دیکھنا اور سننا ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں بلکہ یہ ہماری روٹین میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ہم کسی معمول کی طرح انھیں بھی نمٹائے جاتے ہیں اور اگر ان کو انجام دیتے ہوئے ذرا بھی اونچ نیچ ہوجائے تو بدشگونی اور کچھ برا ہوجانے کے خوف سے ہمارے اوسان ہی خطا ہوجاتے ہیں۔ توہم پرستی انسانی تاریخ میں اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود حضرت انسان! مثلاً دورِ قدیم ہی سے انسان ستاروں کی چال ڈھال دیکھ کر اپنے اہم کام یا سفر کا منصوبہ ترتیب دیتے تھے اور اگر برج میں کسی گڑبڑ کی نشاندہی ہوجائے تو وہ اپنا کام یا سفر ملتوی کردیا کرتے تھے۔ قدیم عربوں میں رواج تھا کہ انھیں کہیں جاتے ہوئے راستے میں کوئی بدصورت شخص مل جاتا تو وہ اسے براشگون گردانتے ہوئے واپس گھر کو لوٹ جاتے تھے۔

اس کے علاوہ بہت سے لوگ ماہ صفر کے مہینے کو سخت اور بھاری گردانتے ہیں اور یہ مانا جاتا ہے کہ اس مہینے میں آسمان سے بلائیں اور طرح طرح کی آفات نازل ہوتی ہیں جبکہ اسلامی اعتبار سے اس مہینے سے کوئی نحوست وابستہ نہیں۔

ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل ہم ایک طویل عرصہ ہندوؤں کے ساتھ ان کے تنگ نظر اور توہمات سے بھرپور معاشرے میں رہے ہیں اور اسی وجہ سے بہت سی بدعات اور توہم پرستی کے جراثیم ہمارے معاشرے .... میں وہیں سے منتقل ہوئے ہیں مثلاً بلی کا رونا کسی پریشانی یا خدانخواستہ کسی کی موت کو ظاہر کرتا ہے، کوے کا بولنا مہمانوں کی آمد کا اشارہ ہے، داہنے ہاتھ میں کھجلی ہونے پر مالی فائدے کی اُمید کی جاتی ہے، بلاوجہ قینچی چلانے سے رشتوں میں ناچاقی ہوتی ہے یا والدین میں لڑائی ہوتی ہے، نادانستگی میں چپل پر چپل چڑھ جائے تو اس شخص کو جلد سفر پر روانہ ہونے کی بشارت دے دی جاتی ہے، دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ کر کھانا کھانے کو برا سمجھا جاتا ہے اور مانا جاتا ہے کہ وہ آدمی مقروض ہوگا، قرآن کریم میں مور کا پر رکھنا گھر کے لیے مبارک سمجھا جاتا ہے، شیشہ ٹوٹنے پر کہا جاتا ہے کہ اس سے کوئی بڑی مصیبت ٹل گئی نیز دودھ کا ابلنا، رات کو جھاڑو لگانا، پتیلی سے کھانا کھانا، رات کو مرغے کا اذان دینا، کسی مخصوص پرندے کا بولنا، چاند گرہن یا سورج گرہن کے دوران حاملہ خاتون کا قینچی یا چھری چلانا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا، بائیں آنکھ کا پھڑکنا، تین تیرہ اور تیئس کی تاریخیں منحوس اور بیمار شخص کے پاس کتے کے بھونکنے جیسی بے سروپا باتوں کو بدشگونی اور نحوست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ توہم پرستی صرف پاکستان اور بھارت میں ہی عام نہیں ہے بلکہ دنیا کی کئی ترقی یافتہ اقوام بھی اس بدعت سے محفوظ نہیں ہیں اور وہاں بھی ایسے کئی اوہام کا بسیرا ہے کہ ان کو رائج کرنے والوں کی عقل پر شبہ ہونے لگتا ہے اور جاہل تو ایک طرف، کئی پڑھے لکھے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ بھی اس کا شکار نظر آتے ہیں۔ مثلاً امریکی صدر روزویلٹ دیگر امریکیوں کی طرح تیرہ کے ہندسے کو منحوس .... گردانتے تھے۔ انھوں نے بھی اس میز پر کھانا نہ کھایا جہاں تیرہ افراد موجود ہوتے تھے۔ کئی امریکی ہوٹلز اور عمارتوں میں تیرہویں منزل نہیں بنائی جاتی اور تیرہ کے ہندسے کو بدقسمتی اور پریشانی کی علامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آپ کی دلچسپی کے پیشِ نظر یہاں مختلف ممالک میں رائج چند حیرت انگیز اور معروف اوہام کا مختصر سا جائزہ دیا جارہا ہے۔

روس: پرندوں کی بیٹ کو یہاں بہت مبارک گردانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پرندہ آپ پر، آپ کے گھر پر یا آپ کی گاڑی پر بیٹ کردے تو یہ آپ کے لیے نہایت سعد علامت ہے۔

چین: چینیوں کا ماننا ہے کہ گر کوئی عورت یا مرد اپنے سے تین / چھ سال بڑے یا چھوٹے سے شادی کرلے تو وہ شادی اس کے لیے بدقسمتی لے کر آتی ہے۔ چینی نئے سال کی آمد سے ایک دن قبل اپنے گھر کی صفائی کرلیتے ہیں ورنہ کہا جاتا ہے کہ نئے سال کی رات جھاڑو لگانے سے اس گھر کی خوش قسمتی پر بھی جھاڑو پھر جاتی ہے۔

جاپان: جاپان کو ترقی یافتہ ممالک کی دوڑ میں سب سے آگے ہے مگر یہاں توہم پرستی عام ہے۔ ان کا ایک عام عقیدہ ہے کہ اگر آپ کا گزر کسی قبرستان سے ہو یا آپ کے پاس سے کوئی جنازہ گزرے تو اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو فوراً اپنی جیبوں میں اڑس لیں۔ اس کے پیچھے یہ منطق کارفرما ہے کہ ایسا کرنے سے آپ کے والدین کسی ناگہانی حادثے یا پریشانی سے محفوظ رہیں گے۔

ترکی: ترکی عوام سورج ڈھلنے کے بعد چیونگ گم چبانے کو مردے کا گوشت چبانے سے تعبیر کرتے ہیں نیز ان کا عقیدہ ہے کہ کوئی شخص اگر دو ہم نام آدمیوں کے بیچ کھڑا ہو

کر کسی چیز کی خواہش کرے تو وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔

روونڈا: ایک نہایت دلچسپ مفروضے کی بناء پر یہاں لڑکیوں کو بکرے کے گوشت سے مکمل پرہیز کرایا جاتا ہے کیونکہ روونڈا میں یہ مانا جاتا ہے کہ بکرے کا گوشت کھانے سے عورتوں کی داڑھیاں اُگ آتی ہیں۔

ہائتی: یہاں یہ مانا جاتا ہے کہ اگر آپ رات کو جھاڑو لگاتے ہیں، تربوز اور گریپ فروٹ کے چھلکے کھاتے ہیں، گھٹنوں کے بل یا ایک پیر میں جوتا پہن کر چلتے ہیں تو ایسے عمل کرنے سے آپ دراصل اپنی والدہ کی موت کو دعوت دیتے ہیں۔

ویتنام: دنیا کے تقریباً تمام ہی طالبعلم امتحانات کے دنوں میں کچھ کچھ توہم پرست ہو ہی جاتے ہیں مگر ویتنامی طلبہ ان سب سے ایک قدم آگے ہیں۔ یہ لوگ امتحانات کے موسم میں کیلا بالکل نہیں کھاتے کیونکہ اس کا چھلکا پھسلن کا موجب ہوتا ہے اور ویتنامی زبان میں لفظ 'پھسلن' اور 'ناکامی' ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اسی لیے ویتنامی طلباء اس پھل سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہیں۔

لتھوانیا: اس ملک میں آپ کو کوئی شخص اپنے گھر کے اندر سیٹی بجاتا نظر نہیں آئے گا کیونکہ یہ مانا جاتا ہے کہ اس طرح کرنے سے آپ اپنے گھر میں آسیب اور بھوت پریت کو داخلے کی دعوت دیتے ہیں۔

برازیل: گھر کے کونے پر کسی بھی برتن میں تھوڑا سا نمک رکھ دیا جاتا ہے اور خیال یہ کیا جاتا ہے کہ اس عمل سے گھر کے افراد کے لیے خوش بختی آتی ہے۔

یمن: لوگوں کا عام عقیدہ ہے کہ ہوا میں محض مردہ سانپ اچھالنے سے حاملہ خاتون اپنے بچے کی جنس کا اندازہ اس کی پیدائش سے قبل لگا سکتی ہے۔ اگر سانپ اس خاتون کے پیچھے گرے تو یہ لڑکی کی علامت ہے جبکہ سانپ سامنے گرے تو لڑکے سے منسوب کیا جاتا ہے۔

یورپ و امریکا: یہاں کئی بدعات عام ہیں۔ مثلاً گھوڑے کی نعل کو مبارک سمجھا جاتا ہے اور اسے گھر کے داخلی دروازے پر خوش قسمتی کے حصول کے لیے لٹکایا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کی موجودگی کے باوجود اگر اچانک خاموشی چھا جائے تو مانا جاتا ہے کہ وہاں سے کسی روح یا فرشتے کا گزر ہو رہا ہے۔ کئی یورپی اور امریکی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آئینہ میں روح کو قید کر لینے کی طاقت ہوتی ہے اسی لیے وہ آئینہ کے استعمال سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔ بری نظر سے بچنے کے لیے نظر بد کا نگینہ یا evil eye اپنی جیب میں رکھا جاتا ہے، گلے میں پہنا جاتا ہے یا بیڈروم اور دروازوں پر بھی لٹکایا جاتا ہے۔ بھیڑیئے یا اُلو کے بولنے کو براشگون گردانا جاتا ہے۔ کپڑا اگر پھٹ جائے تو اسے پہنے پہنے ہی سی لینا برا سمجھا جاتا ہے۔ برطانیہ میں ایک مشہور عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد اگر مقتول کو اس کا قاتل چھولے تو مقتول کے زخموں سے فوراً خون رسنے لگتا ہے۔ جرمنی کے باشندے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ راستے میں اگر کسی ضعیف خاتون سے سامنا ہو جائے تو یہ بدشگونی کی علامت ہوتی ہے جبکہ اگر کسی نوجوان لڑکی سے ملاقات ہو جائے تو یہ نیک شگون ہے۔ امریکیوں کا یہ ماننا ہے کہ اگر شہد کی مکھیوں کا گچھا کسی گھر پر بھنبھنائے تو وہ گھر آگ لگنے سے بہت جلد تباہ ہو جاتا ہے۔

غرض چاہے وہ پاکستانی معاشرہ ہو یا دنیا کا کوئی اور معاشرہ، کوئی بھی توہم پرستی کے شر سے محفوظ نہیں ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے کی ہی بات ہے کہ کراچی کے ایک پوش علاقے میں میری نظر سے جدید ماڈل کی نہایت عالی شان گاڑی گزری جس کو چلانے والا بھی اپنے چہرے مہرے اور لباس سے پڑھا لکھا اور مہذب آدمی لگ رہا تھا۔ سگنل کھلنے پر جب وہ گاڑی آگے بڑھی تو اس کے سائلینسر سے لٹکتی۔ چھوٹے سے بچے کی سینڈل کو دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میری کولیگ نے میری حیرانی دور کرنے کے لیے بتایا کہ اب تو پاکستان میں یہ چلن عام ہو چلا ہے کہ بری نظر سے بچنے کے لیے لوگ اکثر اپنی گاڑیوں پر اس طرح کالا کپڑا، لیموں مرچ کی مالا یا چپل ٹانگ لیا کرتے ہیں۔ اسی طرح شہروں کے در و دیوار پر لکھے جعلی عاملوں، پیروں، قسمت کا حال بتانے والوں کے فون نمبرز ہمارے کمزور ایمان کی دلیل ہیں۔ تعویز گنڈے، کالا جادو اور دیگر مشرکانہ اعمال سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ ساری باتیں اللہ کے غیض وغضب کو دعوت دینے کے مترادف ہیں۔ دین اسلام میں تو ہم پرستی اور بدعات کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اور ہر اچھے اور برے کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی دن، کوئی تاریخ، کوئی شخص یا مقام منحوس نہیں ہوتا بلکہ خالق کی تو بنائی ہوئی ہر تخلیق بے مثال ہے۔ سورہ یٰس میں اللہ بجا طور پر فرماتے ہیں۔ "تمہاری نحوستیں تمہارے اعمال کی وجہ سے ہیں۔"

جنوری کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے پہلے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

☆سعادت حسن منٹو

11 مئی 1912ء کو ضلع لدھیانہ میں پیدا ہونے والے سعادت حسن منٹو کے بارے میں جتنے مباحث آج ہو رہے ہیں، شاید اُس وقت بھی نہ ہوئے ہوں، جب وہ مقدمے بھگت رہا تھا، جب بیماریوں نے اُسے گھیر رکھا تھا اور کسمپرسی کی حالت میں وہ دھیرے دھیرے موت کی سمت بڑھ رہا تھا۔

اِس بات کا امکان ہے کہ چند نقاد کرشن، بیدی اور عصمت کو منٹو سے بڑا افسانہ نگار قرار دیں، کچھ کو اُس کے ہاں موضوعات کی تکرار ملے، چند اس کی تکنیک کو تنقید کا نشانہ بنائیں، مگر اِس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو دوام منٹو کے افسانوں کو نصیب ہوا، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ عام قاری سے بھی پوچھیں تو وہ کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، دھواں، سیاہ حاشیے اور موذیل کا نام بتا دے گا، دیگر ادیبوں کی بابت سوال کریں تو شاید ایک دو افسانوں کے تذکرے سے بات آگے نہ بڑھے۔ الغرض آپ منٹو کا ادبی قد تو گھٹا سکتے ہیں مگر اس کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔

ان کے والد غلام حسن منٹو کشمیری تھے۔ ملازمت انھیں لدھیانہ لے گئی۔ وہیں منٹو کی پیدائش ہوئی۔ وہ ایک شرمیلے بچے تھے۔ والد نے دوسری شادی کی تھی، سوتیلے بہن بھائیوں کے درمیان وہ خود کو ظاہر کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ ڈرے سہمے رہتے۔ ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ اسکول میں جی نہیں لگتا تھا۔ نصابی کتب انھیں کبھی نہیں بھائیں۔

1921ء میں انھیں مڈل اسکول میں داخل کروایا گیا۔ وہ دور نوجوان منٹو کے لیے کٹھن تھا۔ میٹرک کے امتحان میں تین مرتبہ فیل ہوئے۔ 1931ء میں بمشکل یہ مرحلہ طے ہوا۔ اب ہندو سبھا کالج میں داخلہ لے لیا۔ بڑے تلون مزاج تھے۔ کچھ عرصے بعد ایم او کالج کی طرف چلے گئے۔

افسانہ نویسی کا ابتدائی زمانہ دشوار تھا، مگر دھیرے دھیرے ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ انھوں نے انسانی نفسیات کو اپنا موضوع بنایا۔ زبان سادہ، مگر منظر کشی پُر پیچ، بیانیہ کاٹ دار۔ جنس کا عنصر غالب۔ ان کے بے باک انداز نے ایک طبقے کو سراسیمہ کر دیا، تنقید شروع ہوگئی، مگر شہرت کو پر لگ گئے تھے۔ تقسیم کے تناظر میں لکھے ان کے افسانے ”کھول دو“ اور ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ کو شاہ کار کا درجہ حاصل ہوا۔

افسانہ نگاری کے ساتھ خاکہ نویسی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ انتہائی کاٹ دار تحریر ہوتی۔ ناقدین کے نزدیک وہ ایک صاحبِ اسلوب افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے جانی پہچانی دنیا میں ایک ایسی دنیا دریافت کی، جسے لوگ درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔ یہ دنیا گمراہ لوگوں کی تھی۔ دھتکارے ہوئے طبقات، منفی کردار منٹو کا موضوع تھے۔ ان معنوں میں وہ فکشن میں بڑی موضوعاتی تبدیلی لائے۔ ان کے افسانے محض واقعاتی نہیں، ان کے بطن میں تیسری دنیا کے پس ماندہ معاشرے کے تضادات کی داستان موجود ہے۔

شہرت نے انھیں خود پسند بنا دیا۔ اور یہ حیران کن نہیں۔ اس زمانے میں بھلا کون سا افسانہ نگار ہوگا، مدیران جس کے پیچھے بھاگتے ہوں، جس کی کہانی پرچے کی اشاعت بڑھا دے۔ انھیں ہاتھ کے ہاتھ افسانے کا معاوضہ ادا کر دیا جاتا۔ جو قیمت ان کے افسانے کی مقرر تھی، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ جہاں باقی فکشن نگار جی جلاتے، سر کھپاتے، وہاں وہ ایک ہی نشست میں افسانہ لکھ مارتے۔ اس عمل سے ان کی ہاں کمزوریاں بھی پیدا ہوئیں۔ زود نویسی کی وجہ سے یکسانیت در آئی۔ کبھی کبھی خیال بھی سطحی ہوتا۔ پاکستان میں ان پر فحاشی کے الزامات لگے۔ مقدمات بنے۔ بڑی لے دے ہوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انھیں لاہور آنے کے بجائے ہندوستان ہی میں رہنا چاہیے تھا۔

منٹو کی زندگی ناداری، انسانی جدوجہد اور ناقدری کا تسلسل تھی۔ وہ بڑے حساس انسان تھے۔ انا مجروح ہوجائے، تو پھر کسی کو خاطر میں لاتے تھے۔ اپنی حیثیت کا انھیں خوب ادراک تھا، مگر پھر وقت بدل گیا۔ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے 18 جنوری 1955ء میں ان کا انتقال ہوا۔

گذشتہ دنوں منٹو سے متعلق فلم بھی ریلیز ہوئی۔ یہ شاید پہلا موقع ہے، جب پاکستان میں کسی ادیب کی زندگی کو بڑے پردے پر پیش کیا گیا۔ یہ اقدام احسن تو ہے، مگر کچھ حلقوں کے نزدیک صارفیت کے اس دور میں منٹو کو بھی ایک پراڈکٹ بنا دیا گیا ہے۔

☆شاہ جہاں

ہندوستانی تاریخ مغلوں کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔ کیسے کیسے گوہر نایاب گزرے۔ کتنے ہی قصے جڑے ہیں ان صاحبان سے۔ کہیں عادل کا تذکرہ، کہیں جبر کی کہانیاں۔ کبھی محبت کی داستان، کبھی انتقام کا قصہ۔

مغل بادشاہ شاہ جہاں کی زیست میں آپ کو وہ تمام رنگ ملیں گے، جن سے مغلوں کی تصویر بنتی ہے۔ وہ ہندوستان کے عظیم ترین شہنشاہ اکبر کا پوتا اور جہانگیر کا بیٹا تھا۔ جب کبھی اکبر اور جہانگیر (سلیم) کا تذکرہ آتا ہے، تو انارکلی کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ شاہی راہداریوں میں جنم لینے والی اور پھر وہیں دفن ہوجانے والی محبت کی ایک ادھوری مگر لازوال داستان۔

5 جنوری 1592ء کو لاہور میں پیدا ہونے والا شہاب الدین محمد شاہجہاں اسی جہانگیر کا بیٹا تھا۔ جہانگیر کی راجپوت بیوی تاج بلقیس کے بطن سے پیدا ہونے والا شاہجہاں ایک دلیر اور شجاع نوجوان تھا۔ اس نے جنگی تربیت حاصل کی۔ کم سنی ہی میں وہ گن ظاہر ہونے لگے، جو ایک عظیم حکمران میں پائے جاتے ہیں۔

25 جنوری 1628ء کو باپ کے انتقال کے بعد آگرہ میں اس کی تاجپوشی ہوئی۔ اسے اپنے عہد میں بغاوتوں کا مسئلہ درپیش رہا۔ ایک طرف لودھی، دوسری طرف جگت سنگھ۔ پرتگیزی بھی جان کا وبال بنے ہوئے تھے۔ اس نے تدبیر اور بہادری کے ساتھ ان بغاوتوں کو کچلا۔ سکھوں اور پرتگیزیوں کی

گوشالی کی۔ اس نے قندھار پر حملے کیے۔ احمد نگر فتح کرنا ایک بڑا کارنامہ رہا۔

اسے رعایا پرور بادشاہ کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے دور میں علوم و فنون نے ترقی کی۔ شاہ جہاں اپنے دور کا ایک مشہور معمار تھا۔ اس نے کئی تعمیرات کروائیں۔ کچھ مؤرخین اس کے عہد کو ہندوستانی وسطی تاریخ کا سنہری دور کہتے ہیں۔

نوجوانی میں تو اس نے بغاوتوں کو کامیابی سے کچل دیا، مگر بڑھاپے میں تخت کے لیے خاندان میں پھوٹ پڑ گئی۔ بھائی بھائی کے درپے ہو گیا۔ بہت خون خرابا ہوا۔ بالآخر اس کے بیٹے اورنگزیب کے تخت پر بیٹھنے کے بعد انتشار کم ہوا۔ اورنگزیب کو تاریخ دانوں نے مذہبی اور انصاف پسند شخص کے طور پر بتایا ہے، مگر اس کی سخت گیری اور مظالم کے قصے بھی مشہور ہیں۔ اس نے اپنے باقی بھائیوں کو قتل کر کے اقتدار سنبھالا اور باپ کو زنداں میں ڈال دیا۔ قید خانے ہی میں 31 جنوری 1694ء کو شاہجہاں کا انتقال ہوا۔

گو اس کے آخری دور اور موت سے کئی المیے سے جڑے ہیں، مگر ایک حوالہ ایسا ہے، جو شاید صدیوں تک اس کی پہچان بنا رہے۔ یہ ہے آگرہ کے تاج محل کی تعمیر، جو عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا ہے۔ یہ انوکھی اور دلکش عمارت اس نے اپنی بیوی ممتاز کی یاد میں تعمیر کی۔ صدیاں گزر گئیں، مگر لوگ اس کے سحر سے نہیں نکل سکے۔ یہ جنت نظیر ہے۔ اس سے کئی افسانوی قصے جڑے ہیں، جیسے یہ کہ تعمیر کے بعد بادشاہ نے مزدوروں کے ہاتھ قلم کروا دیے تھے۔

آج کئی مؤرخین اس کے فیصلوں اور اقدامات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، مثلاً جب یورپ میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں بن رہی تھیں، یہ مغل بادشاہ خزانے کا بڑا حصہ لال قلعہ، موتی مسجد اور تاج محل تعمیر کرنے میں صرف کر رہا تھا۔ جب مغرب میں صنعتی دور کا آغاز ہو رہا تھا، وہ اپنے لیے تخت طاؤس تیار کروا رہا تھا، جسے بعد میں نادر شاہ دہلی پر حملے کے بعد اپنے ساتھ ایران لے گیا۔ شاہ جہاں اور ممتاز کی محبت کو بھی قصہ کہانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے کئی شادیاں کی تھیں۔ ممتاز سے رشتۂ ازدواج میں بندھنے کے بعد بھی اس سلسلے میں توقف نہیں آیا۔ یہ زچگی کے مسلسل واقعات تھے، جنھوں نے ممتاز کی جان لی۔

تجزیے اور تبصرے تو کیے جاسکتے ہیں، مگر اس بات سے انکار مشکل ہے کہ اس نے معمار کی حیثیت سے ہندوستانی تاریخ پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔

☆ ذوالفقار علی بھٹو

وہ 5 جنوری 1928ء کو لاڑکانہ، سندھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، سر شاہنواز بھٹو ریاست جوناگڑھ کے دیوان اور بمبئی حکومت کے مشیر اعلیٰ رہے۔ 1950ء میں انھوں نے برکلے یونیورسٹی کیلیفورنیا سے سیاسیات میں گریجویشن کیا۔ دو برس بعد آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ وہ پہلے ایشیائی تھے، جنھیں برطانوی یونیورسٹی ساؤتھمپٹن میں بین الاقوامی قانون کا استاد مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصے مسلم لا کالج، کراچی میں بھی پڑھاتے رہے۔ 1953ء میں سندھ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔

سیاست تو گھٹی میں پڑی تھی۔ اپنا راستہ تلاش کیا۔ ایوب خان کا اعتماد حاصل کرنا بڑی کامیابی تھی۔ 1958ء تا 1960ء ایوب کابینہ میں وزیر تجارت رہے۔ آنے والے برسوں میں اقلیتی امور، قومی تعمیر نو اور اطلاعات، صنعت و قدرتی وسائل، امور کشمیر جیسے قلمدان ان کے پاس رہے۔ وزیر خارجہ کا منصب سب سے اہم تھا۔ اختلافات نے انھیں ایوب خان سے الگ کر دیا۔ دسمبر 1967ء میں انھوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1970ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں پاکستان تقسیم ہو گیا۔ دسمبر 1971ء میں جنرل یحییٰ خان نے اقتدار بھٹو کو سونپ دیا۔ دسمبر 1971ء تا اگست 1973ء وہ صدر مملکت رہے۔ 14 اگست 1973ء کو نئے آئین کے تحت وزیر اعظم کا حلف اٹھایا۔

1977ء کے عام انتخابات میں ان کی حکومت پر دھاندلیوں کا الزام لگا۔ پی این اے کی تحریک شروع ہوئی۔ ملک میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، جس کے نتیجے

میں 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ بھٹو کو نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ 18 مارچ 1978ء کو لاہور ہائی کورٹ نے انھیں سزائے موت سنادی۔ فروری 1979ء میں سپریم کورٹ نے اس فیصلے کی توثیق کردی۔ 4 اپریل کو انھیں راولپنڈی جیل میں پھانسی دی گئی۔

☆ خان عبدالغفار خان

پختون سیاست میں شاید ہی کوئی ایسا شخص گزرا ہو، جس کی مقبولیت اور اثر پزیری کا موازنہ 6 فروری 1890ء کو چارسدہ کے علاقے اتمان زئی میں پیدا ہونے والے خان عبدالغفار خان سے کیا جاسکے۔ چاہنے والے انھیں باچا خان کہتے تھے۔ انھیں سرحد کا گاندھی کا بھی خطاب دیا گیا کہ وہ عدم تشدد کے پرچارک تھے۔ مگر یہ مت سمجھیں کہ اس فلسفے نے فقط مداح عطا کیے۔ جتنے ہر دل عزیز، اتنے ہی متنازع ٹھہرے، بالخصوص مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے انھیں آج بھی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

وہ برطانوی تسلط کے سخت خلاف تھے، مگر کیا کیجیے کہ خاندانی دباؤ کی وجہ سے برطانوی فوج میں شامل ہونا پڑا، مگر یہ رشتہ انھیں راس نہیں آیا۔ نسل پرستی اور ایک برطانوی افسر کے ناروا رویے سے تنگ آکر نوکری چھوڑ دی۔ انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ بھی موخر کرنا پڑا۔ برطانوی راج کے خلاف تحاریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مگر نتائج زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہے۔ اب انھوں نے پختون قبائل میں اصلاحات کو اپنا مقصد بنا لیا۔ اسی فکر سے خدائی خدمت گار تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے دوران میں انھیں دھمکیاں ملیں، تشدد ہوا، سلاخوں کے پیچھے ڈالا گیا، مگر حوصلے پست نہیں ہوئے۔

گاندھی کی فکر سے متاثر تھے۔ 1920ء میں کانگریس کے ساتھ الحاق کیا، جو اس وقت عدم تشدد کی سب سے بڑی حامی جماعت تصور کی جاتی تھی اور ہندوستان میں تیزی سے قوت حاصل کررہی تھی۔ مورخین اُن کے اس فیصلے کو تو درست تصور کرتے ہیں، مگر اس الحاق کے 1947ء تک قائم رہنے پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ جب واضح ہو گیا تھا کہ انگریز اور کانگریس مسلمانوں کے مفادات کے خلاف سرگرم ہیں، سرحد کے مسلمان مسلم لیگ کے حامی ہیں، ایسے میں باچا خان کا عوامی امنگوں کی ترجمانی نہ کرنا سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ان کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ وہ حکومت کے ناقد تھے اور ان کے نظریات سماج کے لیے ہضم کرنا دشوار تھا۔ 60 اور 70 کی دہائی میں کبھی وہ نظر بند رہے، کبھی جیل یاترا کی۔ جلاوطنی بھی کاٹی۔ ہندوستان میں ان کی مقبولیت بھی کچھ حلقوں کو کھٹکتی رہی۔ 1987ء میں انھیں ہندوستان کا سب سے بڑا سول اعزاز ''بھارت رتن ایوارڈ'' دیا گیا۔ وہ یہ اعزاز پانے والے پہلے غیر ہندوستانی تھے۔ کسی زمانے میں انھیں امن کے نوبیل انعام کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔

20 جنوری 1988ء کو یہ عظیم پختون لیڈر انتقال کر گیا۔ وصیت کے مطابق جلال آباد، افغانستان میں ان کی تدفین ہوئی تھی۔ اس وقت افغانستان میں جنگ جاری تھی، مگر تدفین کے موقع پر فریقین نے جنگ روک دی۔ یہ واقعہ اس خطے کی سیاست پر ان کے اثرات کا عکاس ہے۔ ان کے سیاسی وارث ولی خان نے بھی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

☆ چوہدری شجاعت

27 جنوری 1946ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ معروف سیاست داں چوہدری، ظہور الٰہی کے بیٹے ہیں۔ گو چوہدری خاندان روایتی سیاسی گھرانوں میں سے نہیں تھا، مگر جنرل ایوب، جنرل ضیاء اور جنرل پرویز مشرف سے تعاون کی بدولت گجرات میں قدر و قیمت اور قوت حاصل کرلی۔ ظہور الٰہی بھٹو کے سخت ناقد تھے۔ کہا جاتا ہے، جنرل ضیاء الحق نے جس قلم سے بھٹو کی پھانسی کے حکم پر دستخط کیے تھے، وہ انھوں نے صدر سے مانگ کر محفوظ کرلیا تھا۔ ضیاء دور ہی میں چوہدری ظہور الٰہی کو قتل کردیا گیا۔ اور الزام الذوالفقار پر عائد ہوا۔

شجاعت حسین نے والد کی وفات کے بعد سیاست میں قدم رکھا۔ 1985ء کے انتخابات میں وہ پہلی بار قومی اسمبلی

کے رکن منتخب ہوئے۔ جونیجو کی کابینہ میں وزیر صنعت رہے۔ 1988ء، 1990ء اور 1997ء میں بھی رکن قومی اسمبلی بنے۔ ایک زمانے میں پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے لیے چوہدری اور شریف خاندان ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ سیاست میں تو تعلقات استوار ہوگئے، مگر اختلافات ختم نہیں ہوئے۔ میاں نواز شریف کے دور میں چوہدری شجاعت وفاقی وزیر داخلہ رہے، مگر اصل اختیارات احتساب بیورو کے سربراہ سیف الرحمان کے پاس تھے۔ اسی طرح اپنے کزن پرویز الٰہی کو وزیر اعلیٰ بنوانے کی کوششیں بھی لاحاصل رہیں۔ پرویز مشرف نے میاں صاحب کی حکومت ختم کی، تو ن لیگ کا ایک بڑا حصہ الگ ہو کر ق لیگ میں ڈھل گیا۔ ابتدا میں میاں اظہر اس کے صدر تھے، مگر مشرف دور میں ہونے والے انتخابات کے بعد ق لیگ میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ چوہدری شجاعت جماعت کے سربراہ ہوگئے۔ ظہور الٰہی نے وزیر اعلیٰ پنجاب کا منصب سنبھالا۔ ظفر اللہ جمالی پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے۔ بعد میں جمالی اور چوہدری شجاعت میں اختلافات ہوگئے۔ ظفر اللہ جمالی کو دو برس بعد وزیر اعظم کا عہدہ چھوڑنا پڑا۔ دو ماہ چوہدری شجاعت حسین اس عہدے پر فائز رہے۔ پھر شوکت عزیز نے عہدہ سنبھالا۔

2007ء کے انتخابات میں انھیں توقع سے بہت کم سیٹیں ملیں۔ گو پرویز الٰہی نائب وزیر اعظم رہے، مگر 2012ء کے انتخابات میں بھی قسمت روٹھی رہی۔ اس وقت یہ جماعت پس منظر میں دکھائی دیتی ہے۔

☆ سلطان راہی

پاکستانی فلم انڈسٹری کے ممتاز اداکاروں کا ذکر ہو، سنتوش، محمد علی، وحید مراد، ندیم کا تو تذکرہ آئے مگر ہم سلطان راہی کو بھول جائیں، یہ ممکن ہی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شاید فلم نگری کے کئی اسٹارز کو کچھ برس بعد بھلا دیا جائے، مگر سلطان راہی کو بھلانا دشوار ہوگا۔

ان کا اصل نام سلطان محمد تھا۔ وہ 1938ء میں اتر پردیش میں مقیم ایک ارائیں گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اداکاری کا شوق بچپن سے ساتھ۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان آگئے اور گوجرانوالہ میں سکونت اختیار کی۔ فلمی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے وہ اسٹیج ڈراموں میں کام کرتے تھے۔ اس وقت ان کا نام نادر شاہ درانی تھا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ یہ شخص بہت جلد انڈسٹری پر چھا جائے گا۔ انھوں نے 1956ء میں فلم انڈسٹری میں قدم رکھا۔ آغاز میں کئی مسائل کا سامنا رہا۔ ناکامیاں بھی ملیں، مگر 1959ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”باغی“ سے وہ توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اینگری ینگ مین کی امیج ان پر خوب بھائی۔ وہ اور گنڈاسا لازم وملزوم تھے۔ دشمن کو للکارنے کا انداز فلم بینوں میں بڑا مقبول تھا۔ ستر کی دہائی میں فلم ”بشیرا“ ریلیز ہوئی، جو انھیں شہرت کی بلندیوں پر لے گئی۔ 1979ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”مولا جٹ“ نے نہ صرف سلطان راہی، بلکہ پوری انڈسٹری کا نقشہ بدل دیا۔ فلم سازی اور کہانی کار کا انداز یکسر تبدیل ہو گیا۔ بعد میں کتنی ہی فلمیں اس طرز پر بنیں۔ سلطان راہی پورے ملک کا ہیرو بن چکا تھا۔ 1981ء میں ریلیز ہونے وایل فلم ”شیر خان“ نے ایک اور کامیابی بخشی۔ وحشی جٹ، شریف بدمعاش، لاہوری بادشاہ نے ان کی شہرت کو مہمیز کیا۔ وہ ہندوستان میں بھی بہت مقبول تھے۔ بالخصوص سکھ ان کے مداح تھے۔ ایک اندازے کے مطابق انھوں نے اردو اور پنجابی کی 750 سے زاید فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں درج ہے۔ سلطان راہی نے مسعود رانا اور یونس ملک جیسے ہدایت کاروں کے ساتھ کئی کامیاب فلمیں دیں۔ مصطفی قریشی کے ساتھ کئی فلموں میں نظر آئے۔ 9 جنوری 1996ء کو پاکستانی فلمی صنعت کے اس بے تاج بادشاہ کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔ ان کے قتل کی گتھی سلجھانے کی کوششیں لاحاصل

ثابت ہوئیں۔

☆ظفر اللہ خان جمالی

پاکستان کے 13ویں وزیراعظم ظفر اللہ خان جمالی یکم جنوری 1944ء کو ضلع نصیر آباد کے علاقے روجھان جمالی میں، میر شاہ نواز جمالی کے گھر پیدا ہوئے۔ وہ پاکستانی تاریخ میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے اکلوتے وزیراعظم ہیں۔

ان کا گھرانا عشروں سے ملکی سیاست میں متحرک ہے۔ ان کے تایا، جعفر خان جمالی قائداعظم کے قریبی ساتھی تھے۔ جب محترمہ فاطمہ جناح ایوب خان کے خلاف اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں اُن کے علاقے میں آئیں، تو نوجوان ظفر اللہ جمالی محافظ کے طور پر ان کے ساتھ تھے۔ جمالی خاندان کے افراد صوبائی اور وفاقی حکومتوں میں شامل رہے۔ اُن میں میر تاج محمد جمالی، میر عبدالرحمٰن جمالی، میر فائق جمالی اور جان جمالی کا نام نمایاں ہے۔ اب تک روجھان جمالی سے تین وزرائے اعلیٰ منتخب ہو چکے ہیں۔

اُنھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر سے حاصل کی۔ پھر سینٹ لارنس کالج مری، ایچیسن کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہے۔ تاریخ میں ماسٹرز کیا۔ پیپلز پارٹی سے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ 1970ء کے انتخابات میں تو کامیابی نہیں ملی، مگر 1977ء میں بلامقابلہ منتخب ہوئے اور صوبائی وزیر مقرر ہوئے۔ مارشل لا نے پیپلز پارٹی سے تعلق توڑ دیا۔

1982ء میں وہ وزیر مملکت برائے خوراک وزراعت ہوئے۔ محمد خان جونیجو کی کابینہ میں پانی اور بجلی کے وزیر رہے۔ اس زمانے میں وزیر ریلوے بھی رہے۔ 1988ء میں وہ بلوچستان کے نگران وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ آنے والے برسوں میں کچھ نشیب وفراز آئے۔ البتہ مسلم لیگ سے وابستگی اور آبائی حلقے میں اثر کے باعث پھر مرکزی حیثیت حاصل کرلی۔ ایک بار پھر نگران وزیر اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔ سینیٹر رہے۔

میاں صاحب کی جلاوطنی کے بعدن لیگ ٹوٹی، تو وہ نئی جماعت ق لیگ کے جنرل سیکریٹری ہوئے۔ انتخابات کے بعد نومبر 2002ء میں وزیراعظم کا منصب سنبھالا۔ اقتدار کانٹوں کا تاج ثابت ہوا۔ بیوروکریسی اور پنجاب میں طاقت کا مرکز تصور کیے جانے والے چوہدری خاندان سے ان کی نبھ نہیں سکی۔ پھر نیشنل سیکیورٹی کونسل اور صدر کی وردی کے معاملات نے سنگین شکل اختیار کرلی۔ جون 2004ء میں انھیں استعفیٰ دینا پڑا۔

ظفر اللہ جمالی کے قبیلے کا ایک بڑا حصہ بلوچستان کے علاوہ صوبہ سندھ میں بھی آباد ہے۔ یعنی ان کا سیاسی اور قبائلی اثرورسوخ دو صوبوں پر محیط ہے۔ سیاست کے ساتھ انھیں کھیلوں میں بھی خاصی دلچسپی ہے۔ وہ پاکستان ہاکی فیڈریشن کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

☆سدھیر

پاکستان فلم انڈسٹری کا حال شاید اتنا درخشاں نہ ہو، مگر ماضی شان دار تھا۔ بالخصوص بٹوارے کے فوراً بعد کا زمانہ۔ کیسے کیسے اداکار ملے۔ ان ہی میں ایک نام سدھیر کا بھی ہے۔ انھیں پاکستان کا پہلا ایکشن ہیرو کہا جائے، تو غلط نہیں ہوگا، بلکہ وہ تو فلم انڈسٹری کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ فقط اداکار نہیں تھے، ہدایت کاری اور فلم سازی کا بھی کامیاب تجربہ کیا۔ چار عشروں پر محیط کیریر میں انھوں نے 173 فلمیں کیں۔

اکثریت پنجابی فلموں کی تھی۔ 1952ء میں ریلیز ہونے والی ”دوپٹا“ اور 1954ء میں آنے والی ”سسی“ میں سدھیر کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ کچھ لوگ انھیں سلور جوبلی کرنے والی اوّلین فلموں میں شمار کرتے ہیں۔ چین میں ریلیز ہونے والی پہلی پاکستانی فلم ”باغی“ کے ہیرو کوئی اور نہیں سدھیر ہی تھے۔

واقعہ مشہور ہے کہ 1960ء میں فلم ”ساحل“ میں

سدھیر نے اصلی شیروں سے لڑائی کی تھی۔ ان کی دلیری کے اور بھی کئی قصے ہیں۔

25 جنوری 1922ء کو وہ پشاور میں پیدا ہوئے۔ اصل نام شاہ زمان خان آفریدی تھا۔ پشتو ان کی مادری زبان تھی۔ انھوں نے 40 کی دہائی میں انڈسٹری میں قدم رکھا۔ کچھ محققین کے مطابق ''فرض'' ان کی پہلی فلم تھی۔ البتہ جس فلم نے توجہ حاصل کی، وہ 1949ء میں سنیما کی زینت بننے والی فلم ''ہچکولے'' تھی۔ پھر تو کامیاب فلموں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ دوپٹا، سسی، دلا بھٹی، ماہی منڈا اور یکے والی جیسی فلموں نے سدھیر کو ہردل عزیز اداکار بنا دیا۔ انھوں نے حاتم، مرزا غالب اور فلم انارکلی میں شہزادہ سلیم جیسے تاریخی کردار ادا کر کے خوب داد سمیٹی۔

فلم ''کرتار سنگھ''، ''فرنگی'' اور ''عجب خان'' میں وہ آزادی کے متوالے کے طور نظر آئے اور اپنی بھرپور اداکاری سے ہزاروں کے دل جیت لیے۔ 1965ء میں ریلیز ہونے والی سدھیر کی پنجابی فلم جی دار نے پلاٹینیم جوبلی کی۔

اس اداکار نے 19 جنوری 1997ء کو 75 برس کی عمر میں جہاں فانی سے کوچ کیا۔ ان کی آخری فلم ''سن آف ان داتا'' تھی۔ ان کے بیٹے شیر زمان نے بھی فلم نگری میں قدم رکھا۔ 1978ء میں وہ اپنے بیٹے کے ساتھ فلم ''دشمن کی تلاش'' میں نظر آئے۔

☆ واصف علی واصف

''عظیم لوگ بھی مرتے ہیں، مگر موت ان کی عظمت میں اضافہ کر دیتی ہے!''

جس شخص کا یہ قول، اس کی اپنی زندگی پر بھی یہ صادق آتا ہے۔ گو 18 جنوری 1993ء کو واصف علی واصف نے آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر ان کی فکر کی خوشبو آج بھی لاکھوں ذہنوں کو مہکا رہی ہے۔ وہ استحکام پاکستان کے آرزو مند تھے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب آنکھوں میں تھا۔ ان کے چاہنے والے یقین رکھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ان کا خواب تکمیل کی سمت بڑھ رہا ہے۔

وہ 15 جنوری 1929ء کو خوشاب میں پیدا ہوئے۔ تعلق اعوان قبیلے کی شاخ کنڈان سے تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ پھر اپنے نانا کے پاس جھنگ چلے آئے۔ نانا تحریک پاکستان کے کارکن اور ایک قابلِ احترام ماہر تعلیم تھے۔ باقی تعلیم نانا کے زیرِ نگرانی جھنگ سے حاصل کی۔ میٹرک، انٹر اور گریجویشن وہیں سے کیا۔ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔

سول سروس کا امتحان پاس کر لیا تھا، مگر طبیعت سرکاری نوکری سے میل نہیں کھاتی تھی۔ تدریس کی سمت آ گئے۔ ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتے رہے۔ پرانی انارکلی میں ''لاہور انگلش کالج'' کے نام سے اپنا ادارہ قائم کیا۔

روحانیت کی جانب جھکاؤ ظاہر ہونے لگا تھا۔ شعر کہنے لگے تھے۔ کلام مختلف اخبارات میں شائع ہوتا اور لوگوں کے دلوں کو موہ لیتا۔ بات کرتے تو باتوں سے خوشبو آتی۔ شاگردوں کے لیے وہ صاحب علم شخص تھے۔ زندگی کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد فیض یاب ہونے کالج چلے آتے۔ اسی زمانے میں لاہور کے ادیب اور شعرا سے تعلق قائم ہوا۔ عقیدت مندوں میں بیوروکریٹ، وکلا اور سیاسی شخصیات بھی شامل تھیں۔

''شب چراغ'' ان کے پہلے مجموعے کا عنوان تھا، جس کی روشنی دور دور تک پھیل گئی۔ چاہنے والوں کی بڑھتی تعداد کے باعث گفتگو لیکچرز کی صورت اختیار کرنے لگی۔ سوال و جواب کا سیشن خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا۔ کالم نویسی کے ذریعے بھی ان کے خیالات کی رسائی بڑھی۔ ''نوائے وقت'' سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ ان کالموں نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ کتابی صورت میں ان کی اشاعت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ انھیں عہد حاضر کا درویش تصور کیا جاتا ہے۔

☆ احمد حسن دانی

علم آثاریات زیادہ قدیم نہیں۔ اس میدان میں زیادہ کام مغرب میں ہوا، مگر قابلِ احترام ماہرین آثاریات کی فہرست میں ایک شخص ایسا بھی ہے، جس کا تعلق پاکستان سے تھا، خصوصاً گندھارا تہذیب کا تو وہ حوالہ بن چکے تھے۔ یہ

پروفیسر حسن دانی کا تذکرہ ہے، حکومتِ پاکستان نے جنھیں ستارۂ امتیاز اور ہلالِ امتیاز سے نوازا۔ مغرب نے بھی ان کے علم کے سامنے سرِتسلیم خم کیا۔ دنیا کی اعلیٰ درس گاہوں نے انھیں لیکچرز کے لیے مدعو کیا۔ امریکا، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، جرمنی اور اٹلی میں انھیں اعلیٰ ترین تعلیمی، تدریسی اور شہری اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ نہ صرف ماہر آثاریات تھے، بلکہ ایک مفکر، مؤرخ اور ماہر بشریات بھی تھے۔

پروفیسر احمد حسن دانی کے اجداد کشمیری تھے۔ وہ 20 جون 1920ء کو چھتیس گڑھ میں پیدا ہوئے۔ 1944ء میں بنارس یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ وہ اس جامعہ سے ماسٹرز کرنے والے پہلے مسلمان تھے۔ اگلے برس محکمۂ آثاریات میں ملازمت اختیار کر لی۔ ٹیکسلا اور موئن جودڑو میں ہونے والی کھدائی میں حصّہ لیا۔ تاج محل پر تعینات رہے۔

بٹوارے کے بعد پاکستان آگئے۔ اوائل میں ڈھاکے میں رہے۔ آثاریاتی تحقیق کو عوام تک پہنچانے کے لیے عجائب گھروں کی اہمیت کے قائل تھے۔ سو 1950ء میں وریندر میوزیم راج شاہی کی بنیاد رکھی۔ ڈھاکا میوزیم کے منتظم ہونے کے بعد بنگال کی مسلم تاریخ سے متعلق نشانیاں دریافت کیں، جو آج بھی ڈھاکا میوزیم کی زینت ہیں۔

70 کی دہائی میں انھیں انگلستان اور امریکا کے طویل مطالعاتی دوروں کا موقع ملا۔ یوں وہ بیش بہا تاریخی، ثقافتی اور تمدنی خزانہ دیکھنے کی خواہش پوری ہوئی جو انگریزوں نے دنیا بھر سے جمع کیا تھا۔

گندھارا تہذیب میں دلچسپی کی وجہ سے زیادہ وقت ان کا پشاور یونیورسٹی میں گزرا۔ اس زمانے میں پشاور اور لاہور کے عجائب گھروں کی تزئینِ نو کا کارنامہ انجام دیا۔ 1971ء میں وہ اسلام آباد منتقل ہوگئے، قائدِ اعظم یونیورسٹی میں علومِ عمرانی کا شعبہ قائم کیا۔ 1980ء میں وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پتھروں پر کندہ قدیم تحریروں پر کام کیا۔ آخری برسوں میں وہ گلگت، بلتستان، چترال اور کالاش کے علاقوں میں جرمن ماہرین کے ساتھ قدیم حجری کتبوں پر کام کرتے رہے۔

انھوں نے طویل عمر پائی۔ وہ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے۔ 26 جنوری 2009ء کو ان کا انتقال ہوا۔

☆ ثریا

15 جون 1929ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہونے والی ثریا جمال شیخ کا شمار برصغیر کی ممتاز گلوکار اور اداکاراؤں میں ہوتا ہے۔ 50 اور 60 کی دہائی میں ہندوستان میں ان کا ڈنکا بجا کرتا تھا۔ وہ مہنگی ترین اداکارہ تصور کی جاتی تھیں۔ دیو آنند کے ساتھ ان کی جوڑی بہت مقبول ہوئی۔

وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ انھوں نے موسیقی کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ یہ صلاحیت ان میں بہ درجہ اتم موجود تھی۔ 1937ء میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے بچوں کے ایک پروگرام میں پہلی بار ان کی سریلی آواز سنائی دی۔ ریڈیو میں جن صاحبان کی انھیں سرپرستی حاصل ہوئی، اُن میں زیڈ اے بخاری نمایاں تھے۔

12 برس کی عمر میں فلم ''تاج محل'' سے بطور چائلڈ آرٹسٹ اپنا کیریر شروع کیا۔ 1942ء میں معروف موسیقار نوشاد نے ریڈیو کے ایک پروگرام میں ان کی آواز سنی تو اتنے متاثر ہوئے کہ فلم ''کاردار'' میں گانے کی پیشکش کر دی۔ اس واقعے نے ثریا کی کایا پلٹ دی۔ اب وہ فلموں میں گانے لگیں۔

''سوچا تھا کیا، کیا ہوگیا''، ''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'' اور ''یہ عجیب داستاں'' جیسے گانوں نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ بقول رضا علی عابدی، وہ پنجاب کی تھیں، مگر ان کے لہجے سے پنجابی نہیں جھلکتی تھی۔ ستھری نکھری آواز تھی۔ گلوکارہ کی حیثیت سے شہرت ملی۔ خوبرو تھیں۔ بطور اداکارہ بھی بڑی کامیاب رہیں۔ فلم پیار کی جیت، بڑی بہن، دل لگی، انمول گھڑی، مرزا غالب بلاک بسٹر شامل ہوئیں۔ دیو آنند اور

ان کا عشق ایک عرصے تک موضوعِ بحث بنا رہا۔

1963ء میں ریلیز ہونے والی رستم وسہراب ان کی آخری فلم تھی، جو بہت کامیاب ہوئی۔ اس دل کش اداکارہ نے فقط 34 برس کی عمر میں فلموں سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ باقی زندگی ممبئی میں واقع اپنے بڑے سے فلیٹ میں گزاری، جہاں وہ تنہا رہتی تھیں۔ شادی کی نہیں تھی اور تمام رشتے دار پاکستان چلے گئے تھے۔ آخری ایام میں ان کی دیکھ بھال ان کے پڑوسی کررہے تھے۔ 31 جنوری 2004ء کو 74 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ کینسر میں مبتلا تھیں۔

☆ ولی خان

پاکستان کی سیاست پر انمٹ نقوش چھوڑنے والے خان عبدالولی خان باچاخان کے سپوت تھے۔ اپنے باپ کے مانند انھوں نے بھی ترقی پسندی اور قوم پرستی کا علم بلند کیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، کتنے ہی برس پابند سلاسل رہے، مگر اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ جسے سچ جانا، اسے چھپایا نہیں۔ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔۔۔۔ ان کی جماعت نیپ پر ایک مرتبہ یحییٰ خان اور دوسری مرتبہ ذوالفقار علی بھٹو نے پابندی لگائی۔ ملک کے تقریباً تمام چوٹی کے قوم پرست اور ترقی پسند رہنما ان کی قیادت میں جمہوری جدوجہد کا حصہ رہے۔

مسلم لیگ کے نظریات سے وہ کبھی متفق نہیں تھے، مگر صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا۔ بھٹو دور میں انھیں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر ضیا دور میں جمہوریت بحالی تحریک میں پی پی کا ساتھ دیا۔ گرفتاریوں اور صوبہ بدری کو کبھی خاطر میں نہیں لائے۔

وہ 11 جنوری 1917ء کو اتمان زئی، چارسدہ میں پیدا ہوئے۔ 40 کی دہائی میں خدائی خدمت گار تحریک سے سیاست کا آغاز کیا۔ اگلے ہی برس پہلی جیل یاترا کی۔ پھر تو ایک سلسلہ چل نکلا۔ تقسیم کے بعد حکومت بدل گئی مگر گرفتاریوں کا سلسلہ نہ تھما۔ جون 1948ء کو انھیں پھر گرفتار کرلیا گیا۔ اسی دوران میں ان کے بیٹے اسفند یار ولی کی پیدائش ہوئی۔ اس خوش خبری کے ساتھ ایک بری خبر بھی تھی۔ ان کی بیگم دورانِ زچگی انتقال کرگئیں۔

1953ء میں رہائی کے بعد سیاسی سرگرمیاں پھر شروع ہوگئیں۔ 1968ء میں نیپ کے مرکزی صدر بنے، تو گرفتاریوں کا سلسلہ زور پکڑ گیا۔ 1970ء کے انتخابات کے بعد معرضِ وجود میں آنے والی قومی اسمبلی میں وہ قائدِ حزبِ اختلاف تھے۔ بھٹو دور میں بم دھماکے کے الزام میں گرفتار کیے گئے، تو دو برس قید رہے۔ معتقدین کا دعویٰ ہے کہ انھیں ہر حکمراں نے خریدنے کی کوشش کی، مگر وہ جدوجہد سے دستبردار نہیں ہوئے۔ حیدرآباد سازش کیس میں انھیں گرفتار کیا گیا، تو مقدمہ انتہائی سست روی سے چلایا گیا۔ ان پر بارہا غداری کے الزامات لگے۔ وہ افغان جنگ میں پاکستان کی شمولیت کے خلاف تھے۔ ان کے اندیشے بعد میں سچ ثابت ہوئے اور یہ جنگ پاکستان میں بگاڑ کا سبب بنی۔ بھارت سے خوشگوار تعلقات کے حامی تھے۔ چند حلقے کے مطابق شملہ معاہدہ اور بھارت سے 90 ہزار مسلمان قیدیوں کی واپسی میں ان کا کردار اہم رہا۔

صاحب کردار آدمی تھے۔ نظریاتی اختلاف اپنی جگہ، مگر ان پر کرپشن کا الزام ثابت نہیں کیا جاسکا۔

1990ء کے انتخابات میں جب قومی اسمبلی کی نشست پر ان کا مدمقابل کامیاب ہوا، تو انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ کرلیا۔ آخری انٹرویو میں وہ بڑے دکھ کے ساتھ کہا کرتے تھے: پختون وہ بدقسمت ہیں، جو دوسروں کے گھر کو بنانے کے لیے اپنا گھر اجاڑ دیتے ہیں۔

26 جنوری 2006ء کو ولی خان کا انتقال ہوا۔

☆ پیر پگارا

حروں کے اس روحانی پیشوا کا اصل نام شاہ مردان شاہ تھا۔ وہ 22 نومبر 1928ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد پیر صبغت اللہ شاہ راشدی ان دنوں انگریزوں سے برسرپیکار تھے۔ انگریز سرکار نے حرا ایکٹ نافذ کرکے حروں کو دہشت گرد قرار دے دیا۔ پیر صبغت اللہ شاہ کو بغاوت کی پاداش میں گرفتار کرکے 1943ء میں حیدرآباد جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ گدی معطل ہوگئی اور ان کے وارث کو تحویل میں لے

لیا گیا۔ پہلے شاہ مردان شاہ علی گڑھ کے اسکول میں زیرِ تعلیم رہے، پھر انھیں لندن میں نظر بند رکھا گیا۔ البتہ ان کا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔

1950ء میں ان کی وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان سے لندن میں ملاقات ہوئی۔ انھیں یقین دلایا گیا کہ اگر وہ واپس آجائیں، تو ان کی گدی بحال کردی جائے گی۔ دو برس بعد وہ وطن واپس آئے، ان کی گدی بحال ہوئی، گرفتار حروں کو رہائی ملی۔ خیر پور کے علاقے پیر جو گوٹھ میں ایک تقریب رکھی گئی، جہاں ان کی پیر پگارا کی حیثیت سے تاج پوشی ہوئی۔

دھیرے دھیرے سندھ کی سیاست میں ان کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ صدارتی انتخابات میں انھوں نے ایوب خان کا ساتھ دیا۔ بعد میں جب مسلم لیگ مختلف دھڑوں میں تقسیم ہوئی، تو انھوں نے مسلم لیگ فنکشنل کے نام سے اپنی جماعت بنالی۔ وہ پرویز مشرف کے حامی تھے۔ البتہ جب مسلم لیگیں ایک پلیٹ فورم پر اکٹھی ہورہی تھیں، انھوں نے اپنی جماعت کی انفرادیت برقرار رکھی۔

بڑی منفرد شخصیت تھے۔ گھوڑوں کے دوڑ کے شوقین۔ زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے میکاؤ طوطا بھی پال لیا تھا۔ سگار پینے کا مخصوص انداز۔ علم فلکیات میں دلچسپی۔ میڈیا کی پسندیدہ شخصیت۔ ان کے بیانات، بالخصوص پیش گوئیاں اخبارات کی سرخیاں بنتیں۔ روحانی پیشوا ضرور تھے، سال میں ایک دو بار پیر جو گوٹھ میں اپنی حویلی سے مریدوں کو دیدار کراتے تھے، مگر نظریاتی طور پر لبرل آدمی تھے۔ فوج کے قریب تصور کیے جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی حر جماعت نے پاکستانی فوج کے ساتھ 65ء اور 71ء کی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔

وہ پھیپھڑوں کے انفیکشن میں مبتلا تھے۔ طبیعت بگڑنے کی وجہ سے انھیں لندن روانہ کیا گیا، مگر وہ جاں بر نہ ہوسکے۔ 10 جنوری 2012ء کو ان کا انتقال ہوا۔

سندھ حکومت نے پیر پگارا کے انتقال پر صوبے میں تین روزہ سوگ کا اعلان کیا۔ آخری رسومات کے موقع پر سندھ میں عام تعطیل تھی۔ انھیں آبائی گاؤں پیر جو گوٹھ میں دفنایا گیا۔

☆ مظفر وارثی

لیا جو اس کی نگاہوں نے جائزہ میرا
تو ٹوٹ ٹوٹ گیا، مجھ سے رابطہ میرا

بطور شاعر ان کا اسلوب جداگانہ تھا۔ موضوعات میں تنوع پایا جاتا۔ ایک بے باک انسان تھے۔ خیر کے پرچارک۔ دیانت دار اور محبِ وطن۔

یہ مظفر وارثی کا تذکرہ ہے، جن کا شمار مستند اور معتبر نعت گو شاعر میں ہوتا ہے۔ غزل گوئی میں بھی اپنی مثال آپ۔ معروف شاعر، احسان دانش کے بہ قول ”نئی طرز کے لکھنے والوں میں جدید غزل کا معیار مظفر وارثی کی غزل سے قائم ہوتا ہے۔“

البتہ تنگ نظر نقادوں کے ہاں ان کی غزل گوئی کا تذکرہ نہیں ملتا۔ مختلف جرائد غزل نمبر نکالتے، مگر ان کا ذکر نہیں ہوتا۔ کچھ حلقوں کے مطابق ایسا جان بوجھ کر کیا گیا، تاکہ عام قارئین کو یہ تاثر ملے کہ وہ فقط نعت گو شاعر ہیں۔

مظفر وارثی کا اصل نام محمد مظفر الدین احمد صدیقی تھا۔ وہ 20 دسمبر 1933ء کو میرٹھ میں صوفی شرف الدین احمد کے گھر پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آگئے اور لاہور میں رہائش اختیار کی۔

برف کی ناؤ (غزلیں)، بابِ حرم (نعت)، لہجہ (غزلیں)، نورِ ازل (نعت)، الحمد (حمد و ثنا)، حصار (نظمیں)، لہو کر ہریالی (گیت)، کھلے دریچے بند ہوا (غزلیں) ان کی اہم تصانیف میں شامل ہیں۔

یوں تو انھوں نے غزل، نظم، حمد، قطعات، ہائیکو اور گیتوں میں بھی طبع آزمائی کی، کبھی معیار پر سمجھوتا نہیں کیا مگر اصل شہرت نعت کی صنف بنی۔ حمد ”اے خدا اے خدا“ اور نعت ”میرا پیامبر عظیم تر ہے“ بہت مقبول ہوئی۔

کچھ گلوکاروں نے ان کے لکھے گیت گائے، ان کی غزلیں پیش کیں، جن میں لتا، جگجیت، چترا سنگھ اور پاکستانی گلوکار مسعود رانا نمایاں ہیں۔ فلم ''ہمراہی'' کے لیے مظفر وارثی کے گیت بہت مقبول ہوئے۔ انھیں پرائیڈ آف پرفارمنس، پی ٹی وی کی جانب سے بہترین نعت گو شاعر اور غالب اکیڈمی، دہلی کی جانب سے افتخار غالب سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ مظفر وارثی کو رعشے کا مرض تھا۔ کافی عرصہ علیل رہنے کے بعد 28 جنوری 2011ء کو وہ 77 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

زندگی تجھ سے ہر اک سانس پر سمجھوتا کروں
شوق جینے کا ہے مجھ کو مگر اتنا بھی نہیں

ان کے مداحوں اور عقیدت مندوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

☆ضیا سرحدی

برصغیر کی کلاسیکی فلموں میں ''ہم لوگ'' نمایاں ہے۔ اس کا ایک مکالمہ آج بھی فلم بینوں کے ذہنوں میں گونجتا ہے ''جس دیے میں تیل نہ ہو، اسے جلنے کا کیا ادھیکار (حق) ہے!''

یہ فلم 1951ء میں ہندوستان اور پاکستان میں ریلیز ہوئی اور بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ اس فلم میں شیام اور نوتن نے مرکزی کردار نبھائے۔ یہ شاہکار ضیا سرحدی کی تخلیقی اپچ کا نتیجہ تھا۔ ''فٹ پاتھ'' بھی ضیا سرحدی ہی کا ماسٹر پیس تھا، جس میں مینا کماری اور دلیپ کمار نے اپنی زندگی کے یادگار کردار ادا کیے۔ 1953ء میں ریلیز ہونے والی یہ فلم آج بھی شائقین کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔

یہ باصلاحیت ہدایت کار 1914ء میں پشاور میں پیدا ہوا۔ اصل نام فضل قادر سیٹھی۔ اوائل سے سپنے دیکھنے کی عادت اپنالی۔ معروف ہدایت کار محبوب خان سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ انھوں نے ہی ضیا سرحدی سے پہلی فلم ''دکن کوئین'' کا اسکرین پلے اور گیت لکھوائے۔ اس نگری میں قدم رکھنے کے بعد مڑ کر نہیں دیکھا۔ 1936ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''من موہن'' سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ صرف گیت اور اسکرین پلے نہیں لکھے، فلموں میں اداکاری بھی کی۔

''ہم لوگ'' اور ''فٹ پاتھ'' نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ''بھولے بھالے''، ''مدھر ملن''، ''نادان'' بھی پسند کی گئیں۔ مکالمہ نگار کی حیثیت سے بھی انھوں نے بڑا نام کمایا۔ اس ضمن میں جاگیردار، گراموفون، سنگر، جیون ساتھی اور بیجو باورا کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ ضیا سرحدی نے محبوب خان کی ممتاز فلم ''مدر انڈیا'' کا اسکرپٹ لکھنے میں بھی معاونت کی۔

وہ مارکسی نظریات کے حامل تھے۔ اسی فکر کے زیرِ اثر سماجی موضوعات پر فلمیں بنائیں۔ پھر وہ پاکستان چلے آئے۔ یہاں بھی معیاری کام کیا، مگر چند دشواریاں پیش آئیں۔ ان کی اہم ترین فلم ''راہگزر'' پر مارشل لا نافذ ہونے کے بعد سنسر کی قینچی چل گئی۔ اس کا انھیں بڑا قلق تھا۔

1966ء میں انھوں نے ''لاکھوں میں ایک'' کے مکالمے لکھے، جو لوگوں کے دل میں اتر گئے۔ جنرل ضیا کا دور ان کے لیے کٹھن ثابت ہوا۔ غداری کے الزامات لگے۔ قید تنہائی میں رکھا گیا۔ مایوس ہو کر وہ لندن چلے گئے۔ 27 جنوری 1997ء کو 82 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحب زادے خیام سرحدی نے بھی فنِ اداکاری میں اپنا لوہا منوایا۔

☆عبدالستار ایدھی

وہ پاکستان کا اصل چہرہ ہیں۔ ایک جانب جہاں شدت پسند اسلامی تشخص مسخ کر رہے ہیں، وہیں یہ نیک طینت اور منکسر المزاج انسان دنیا کو امن کا پیغام دے رہا ہے۔ شہرت بین الاقوامی، مگر زندگی انتہائی سادہ۔ روایتی لباس۔ چھوٹا سا مکان۔ تنظیم کا ماہانہ بجٹ کروڑوں میں، مگر اپنی ذات پر ایک روپیا خرچ کرنا گوارا نہیں۔

عبدالستار ایدھی کی قائم کردہ ایدھی فاؤنڈیشن کا پوری دنیا میں شہرہ ہے۔ مغرب کے کتنے ہی اہلِ قلم اور سماجی شخصیات خواہش مند کہ انھیں امن کا نوبیل انعام دیا جائے۔ واضح رہے کہ ایدھی فاؤنڈیشن یہ نہ صرف پاکستان، بلکہ دنیا کی چند بڑی اور منظم فلاحی تنظیموں میں سے ایک ہے۔ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق ایدھی فاؤنڈیشن کی ایمبولینس سروس دنیا کی سب سے بڑی فلاحی ایمبولینس سروس ہے۔

ایدھی چھٹی کیے بغیر طویل ترین عرصہ تک کام کرنے والے سماجی کارکن ہیں۔

عبدالستار ایدھی 1928ء میں بھارتی ریاست گجرات میں پیدا ہوئے۔ والد کپڑے کے تاجر تھے۔ لوگوں کی مدد کرنے کا جذبہ شروع سے ساتھ تھا۔ والدہ انھیں اسکول جاتے وقت دو پیسے دیتی تھیں، وہ ایک پیسا خرچ کرتے، ایک کسی ضرورت مند کو دے دیتے۔ والدہ بیمار تھیں۔ گیارہ برس کے تھے، جب ان کی کمر بستر سے لگ گئی۔ انھوں نے والدہ کی دیکھ بھال کا ذمہ سنبھال لیا۔

1947ء میں تقسیم کے بعد خاندان پاکستان آگیا اور کراچی میں ڈیرا ڈالا۔ 1951ء میں اپنی جمع پونجی سے ایک چھوٹی سی دکان خریدی۔ اسی میں چھوٹی سی ڈسپنسری کرلی۔ وہیں بینچ ہی پر سو جاتے، تاکہ بہ وقت ضرورت فوری طور پر مریض کی مدد کو پہنچ سکیں۔

1957ء میں کراچی میں فلو کی وبا پھیلی، تو انھوں نے فوراً ردعمل دیا۔ شہر کے نواح میں خیمے لگوائے، ادویہ تقسیم کیں۔ جذبہ دیکھتے ہوئے علاقے کے مخیر حضرات نے دل کھول کر مدد کی۔ کچھ پیسے اکٹھے ہوئے تو وہ عمارت خرید لی جہاں ڈسپنسری تھی۔ ایک زچگی سینٹر اور نرسوں کا تربیتی اسکول شروع کیا۔ بس، یہیں سے ایدھی فاؤنڈیشن کا آغاز ہوا۔

دھیرے دھیرے یہ تنظیم پھیلنے لگی۔ کاروباری شخصیات نے بھی جی کھول کر ساتھ دیا۔ انھوں نے ایک ایمبولینس خرید لی، جسے وہ خود چلاتے تھے۔ آج ایدھی فاؤنڈیشن کے پاس 600 سے زیادہ ایمبولینسیں ہیں۔ اسپتالوں کے علاوہ ایدھی فاؤنڈیشن نے کلینک، زچگی سینٹر، پاگل خانے، معذوروں کے لیے گھر، بلڈ بینک، یتیم خانے، لاوارث بچوں کو گود لینے کے مراکز، پناہ گاہیں اور اسکول بھی کھولے۔ یہ فاؤنڈیشن خواتین کو مختلف کورسز بھی کرواتی ہے۔ ایدھی سینٹر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر مرکز کے باہر ایک جھولا لگا ہوتا ہے، تاکہ جو خاندان بچے کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا، وہ اُسے اس میں ڈال جائے۔ پاکستان کے علاوہ یہ فاؤنڈیشن افغانستان، عراق، چیچنیا، بوسنیا، سوڈان، ایتھوپیا میں بھی کام کررہی ہے۔

16 اگست 2006ء کو ایدھی انٹرنیشنل ایمبولینس فاؤنڈیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا، جس کے تحت دنیا کے مختلف ممالک میں کام کرنے والے فلاحی اداروں کو ایمبولینس بہ طور عطیہ دی جاتی ہے۔

یہ فاؤنڈیشن مخیر حضرات سے چندہ لیتی ہے، مگر حکومتوں، سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے مدد نہیں مانگتی۔ گذشتہ دنوں جب گیتا کیس کے سلسلے میں عبدالستار ایدھی ہندوستان گئے اور نریندر مودی کی جانب سے انھیں امدادی چیک دیا گیا، تو انھوں نے اسے شکریہ کے ساتھ لوٹا دیا۔

☆ احمد فراز

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

کوئی ان سا کہاں۔ جو کلام سنتا، گرویدہ ہو جاتا۔ جو ملتا، ان کے سحر میں جکڑ جاتا۔ عہد ساز شخصیت تھے۔ ان کا کلام علی گڑھ یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ کتنی ہی جامعات میں اُن پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے۔ کلام کے انگریزی، جرمن، روسی، فرانسیسی، ہندی، یوگوسلاوی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر اصل شہرت غزل سے ملی۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ موجودہ عہد کے بہترین غزل گو شاعر تھے۔ اس دور میں اردو شاعری میں جگہ بنائی جب فیض کا ڈنکا بجا کرتا تھا۔ وہ خود بھی فیض سے متاثر تھے۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ انھوں نے فیض کی زمینیں اور لفظیات برتیں، مگر اکثریت اس موازنہ کے بجائے ان کی علیحدہ حیثیت پر اصرار کرتی ہے اور انھیں رومانوی شاعری میں رجحان ساز ٹھہراتے ہیں۔ ویسے ان کی شاعری میں بغاوت بھی ملتی ہے۔ اس وجہ سے زیرِ عتاب بھی آئے۔

''اباسین ایوارڈ''، بھارت کی جانب سے ''فراق گورکھ

پوری ایوارڈ" اور "ٹاٹا ایوارڈ" ان کے حصے میں آیا۔ اکیڈمی آف اردو لٹریچر، کینیڈا نے بھی نشان سپاس سے نوازا۔ انھیں جنرل پرویز مشرف کے دور میں ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا تھا، لیکن دو برس بعد سرکاری پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے یہ ایوارڈ واپس کر دیا۔

اردو کے ہر دل عزیز شاعر احمد فراز 12 جنوری 1931 کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کوہاٹ۔ اصل نام سید احمد شاہ علی۔ زمانۂ طالب علمی میں ریڈیو کے لیے فیچر نگاری شروع کی۔ اسی زمانے میں شعر کہنے لگے۔ مشاعروں میں خاصی پزیرائی ہوئی۔ جب پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" شائع ہوا، وہ بی اے کے طالبِ علم تھے۔ ایڈورڈ کالج پشاور اور پشاور یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے۔ اردو اور فارسی میں ایم اے کیا۔ تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی زمانے میں دوسرا مجموعہ "درد آشوب" چھپا، جو پاکستان رائٹرز گلڈز کی جانب سے "آدم جی ادبی ایوارڈ" کا حق دار ٹھہرا۔ پاکستان نیشنل سینٹر، پشاور کے ڈائریکٹر رہے۔ 1976ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کا انھیں پہلا سربراہ بنایا گیا، تاہم مارشل لا ان کی طبیعت پر گراں گزرا۔ انھوں نے آمریت کے خلاف نظمیں لکھیں، جنھیں بہت شہرت ملی۔ محاصرہ اسی زمانے کی نظم ہے، جسے شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ دورانِ مشاعرہ انھیں گرفتار کیا گیا۔ جھکنے کو تیار نہیں تھے، سو جلاوطنی اختیار کر لی۔

وہ ایک عرصے "نیشنل بک فاؤنڈیشن" کے سربراہ رہے۔ اس سے علیحدگی بھی تنازعات پر منتج ہوئی۔ ان کی دیگر تصانیف میں نایافت، جاناں جاناں، شب خون، مرے خواب ریزہ ریزہ، بے آواز گلی کوچوں میں، غزل بہانہ کروں، خواب گل پریشاں ہے نمایاں ہیں۔ کلیات شہر سخن آراستہ ہے کے زیر عنوان شائع ہوا۔ ان کے کلام کو کئی گلوکاروں نے گایا۔ یوں ان کی غزلیں قریہ قریہ پہنچ گئیں۔ 25 اگست 2008 کو اس رجحان ساز شاعر کا انتقال ہوا۔

شکوۂ ظلمت شب سے کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

☆ قرۃ العین حیدر

اردو میں کتنے ہی فکشن نگار گزرے مگر کون ہے جو ان کے درجے کو پہنچا ہو۔ جو شہرت ان کے حصے میں آئی، اس کا عشرِ عشیر بھی اوروں کو نصیب نہیں ہوا۔ دہائیاں گزر گئیں، مگر ان کے فکشن نے آج بھی لاکھوں کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا شہرۂ آفاق ناول "آگ کا دریا" ٹھہرا۔

اردو میں یہ انوکھی ساخت کا ناول تھا، جس کی کہانی ڈھائی ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے اور بیسویں صدی کے نصف پر آ کر رکتی ہے، لیکن اس تاثر کے ساتھ کہ بہتے دریا کی لہروں کے یہ کتھا ابھی چلتی رہے گی۔ جب انھوں نے "آگ کا دریا" لکھا، عمر تیس برس تھی۔ دو قومی نظریے کے حامی ادیبوں اور نقادوں کے لیے یہ ایک ناخوشگوار ادبی واقعہ تھا۔ البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے فنی محاسن پر داد دینے میں کبھی کنجوسی برتی گئی، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

بے شک قرۃ العین حیدر کا ہم پلہ کوئی نہیں۔ اُن کے قلم نے اردو ادب کو "آخرِ شب کے ہم سفر"، "میرے بھی صنم خانے"، "چاندنی بیگم" جیسے ناول دیے۔ افسانے بھی باکمال لکھے۔ بہت نفیس تراجم کیے۔

قرۃ العین حیدر 20 جنوری 1927ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ مطالعہ وسیع تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں قلم سنبھال لیا۔ متمول گھرانے میں پلی بڑھیں، وہیں کی کہانیوں کو موضوع کیا، مگر اس خوبی سے کہ اس خطے کی تاریخ اور مختلف طبقات کا دکھ اس میں سمٹ آیا۔ انھیں اردو ادب کی "ورجینا وولف" کہا جاتا ہے۔ پہلی بار اردو ادب میں "اسٹریم آف کونشیسنس" یا شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا۔ اس تکنیک کے تحت کہانی ایک ہی وقت میں مختلف سمت میں چلتی ہے۔ یہ تکنیک "آگ کا دریا" میں ابھر کر سامنے آئی، جس نے نسلوں کو گرویدہ بنا لیا۔

تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلی آئیں، مگر یہاں کے حالات سے نبھا مشکل تھا۔ سبب ان کا تخلیق کردہ ادب ٹھہرا۔ انھیں ہندوستان لوٹنا پڑا۔ دراصل تقسیم کا کرب ان کے فکشن کا بنیادی موضوع تھا۔ "آگ کا دریا" اور "آخرِ شب کے ہم سفر"

میں یہ اوج پر نظر آتا۔ یہ فکر نوزائیدہ ریاست کی پالیسی سے متصادم تھی۔

1989ء میں انھیں ہندوستان کے سب سے باوقار ادبی اعزاز ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ 1985ء میں پدم شری اور 2005ء میں پدم بھوشن جیسے ایوارڈز ان کے حصے میں آئے۔

72 برس کی عمر میں انھوں نے خود اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ اسے ایڈٹ بھی کیا، جس کے باعث کچھ لوگ اسے زیادہ بہتر اور موثر قرار دیتے ہیں، مگر وہ بین الاقوامی ادب میں وہ توجہ حاصل نہیں کرسکا، جس کا حق دار تھا۔ کچھ لوگوں نے ترجمے کی زبان پر بھی اعتراضات اٹھائے۔

ان کی ادبی حیثیت اپنی جگہ، مگر ہم عصر انھیں ایک خود پسند اور نک چڑھی خاتون قرار دیتے تھے، جو غصے کی تیز تھیں۔ اپنی زندگی میں انھیں معاشی مسائل بھی درپیش رہے۔ یہ دکھ بھی تھا کہ انھیں کتابوں کی مناسب رائلٹی نہیں ملی۔ 21 اگست 2007ء کو دہلی میں طویل علالت کے بعد ان کا انتقال ہوا۔

☆اصغر خان

یہ ایک ایسے شخص کا قصہ ہے، جس نے بطور فوجی افسر ایک بھرپور اور کامیاب زندگی گزارنے کے بعد خدمت کا جذبہ لیے سیاست میں قدم رکھا، مگر یہ دنیا ہی اور تھی۔ خلوص اور نیک نیتی کے باوجود انتخابی سیاست میں وہ کبھی کامرانی حاصل نہیں کرسکے، مگر ناکامیاں اسے توڑ نہیں سکیں۔ اس نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

یہ اصغر خان کا قصہ ہے، جنھیں پاکستانی سیاست میں بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ کئی رازوں کے امین ہیں۔ کتنے ہی واقعات کے شاہد بنے۔ خود فوجی تھے، مگر سیاست میں فوج کی مداخلت کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ اقدام اصغر خان کیس کے نام سے مشہور ہوا۔

اصغر خان 17 جنوری 1921ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ وہ رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ دون میں زیر تعلیم رہے۔ 1940ء میں گریجویشن کیا۔ اسی سال کمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ 1941ء میں انڈین ایئر فورس میں چلے گئے۔ انبالہ اور سکندر آباد میں ہوابازی کی تربیت حاصل کی۔ اگلے برس پشاور میں تعینات ہوئے۔ 1944ء میں برما میں خدمات انجام دیں۔

1945ء وہ میں اسکواڈرن لیڈر ہوئے۔ برطانیہ میں جیٹ طیارے اڑانے کی تربیت حاصل کی۔ فلائنگ ٹریننگ اسکول انبالہ میں چیف فلائنگ انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد رسالپور نوشہرہ کے ایئر فورس کالج کو منظم کیا۔ دو برس بعد گروپ کیپٹن ہوگئے۔ آپریشنل پاکستان ایئر فورس کی کمان سنبھالی۔ 1957ء میں فقط 36 سال کی عمر میں ایئر وائس مارشل بنائے گئے، اگلے برس وہ ایئر مارشل ہوگئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد محکمۂ ہوابازی کے ناظم اعلیٰ اور پی آئی اے کے صدر نشین رہے۔

انھوں نے 1969ء میں سیاست میں قدم رکھا اور جسٹس پارٹی قائم کی۔ اگلے برس اس کا نام بدل کر تحریکِ استقلال کردیا۔ ایوب مخالف تحریک میں وہ بھٹو کے ساتھ کھڑے تھے۔ 1970ء کے انتخابات میں انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بھٹو دور میں حزب اختلاف میں رہے۔ 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف پی این اے کی جو احتجاجی تحریک شروع ہوئی، اس میں وہ پیش پیش تھے، مگر اس تحریک کے نتیجے میں ملک میں مارشل لا لگ گیا۔

انھوں نے جمہوری قوتوں کا ساتھ دیا۔ اس پاداش میں نظر بند بھی رہے۔ 1981ء میں پی این اے سے الگ ہوکر ایم آر ڈی سے وابستہ ہوگئے۔ 1988ء کے انتخابات میں بھی ان کی جماعت بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکی۔ صدر پرویز مشرف کے دور میں ان کے صاحب زادے عمر اصغر خان کو کابینہ میں شامل کیا گیا۔ عمر اصغر خان کی موت بڑے پُراسرار حالات میں ہوئی۔

اصغر خان کو ہلال قائداعظم اور ہلال پاکستان جیسے اعزازات سے نوازا گیا تھا، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر انھوں نے یہ اعزازات واپس کردیے۔

☆جی ایم سید

خطۂ سندھ پر ان مٹ نقوش چھوڑنے والے جی ایم سید 17 جنوری 1904ء کو ضلع دادو میں پیدا ہوئے۔

ان کی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ اوائل میں ہم انھیں تحریکِ پاکستان کے ایک کارکن کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ جی ایم سید ہی تھے جنھوں نے سندھ اسمبلی میں قرارداد پاکستان پیش کی اور اسے بھاری اکثریت سے پاس کروایا، جس کی بدولت سندھ پاکستان کا حصہ بنا۔ بعد میں وہ قوم پرستی کے علم بردار کے طور پر ابھرے۔ ان پر غداری کے الزام لگے۔ نظر بندر ہے۔

تصوف میں بھی ان کی گہری دلچسپی تھی۔ بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ شاعری، تاریخ، اسلامی فلسفہ، لسانیات جیسے مضامین میں بڑی گرفت تھی۔ انھوں نے 60 کے قریب کتابیں لکھیں۔ ان کی کتب کا محور سیاست، مذہب، صوفی ازم، سندھی قومیت اور ثقافت رہی۔ ''مذہب اور حقیقت'' ان کی اہم ترین تصنیف تصور کی جاتی ہے۔

اصل نام غلام مرتضیٰ سید تھا۔ تعلق سندھ کے صوفی بزرگ، سید حیدر شاہ کاظمی کے خانوادے سے تھا۔ وہ ان کی درگاہ کے سجادہ نشین بھی رہے۔ 1930ء میں انھوں نے سندھ ہاری کمیٹی کی بنیاد رکھی، جس کی سرپرستی بعد میں حیدر بخش جتوئی کے ہاتھوں میں آئی۔

''سندھ عوامی محاذ'' کے بانیوں میں بھی شامل تھے۔

1955ء میں انھوں نے نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) میں شمولیت اختیار کر لی، پھر سندھ کے ممتاز مفکر محمد ابراہیم جویو سے طویل مشاورت اور مکالموں کے بعد قوم پرستی کا نعرہ بلند کیا۔ مؤرخین کے مطابق یہ نعرہ مارکسزم، کبیر اور گرونانک کے فلسفے کا ملغوبہ تھا۔

انھوں نے 1966ء میں بزم صوفی سندھ، 1969ء میں سندھ یونائیٹڈ فرنٹ اور 1972ء میں جیے سندھ محاذ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ 1971ء میں سقوط ڈھاکا کے بعد جی ایم سید نے وزیر اعظم پاکستان سے ''سندھو دیش'' کا مطالبہ کر دیا۔ وہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے اساسی نظریے کے شدید ناقد تھے۔ ان نظریات کی پاداش میں وہ ایک طویل عرصے نظر بند رہے۔

19 جنوری 1992ء کو ان کو گرفتار کیا گیا اور موت تک انھیں نظر بند رکھا گیا۔ 91 سال کی عمر میں 25 اپریل 1995ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

جہاں ان کے چاہنے والے کئی، وہیں ناقد بھی کم نہیں۔ وہ کبھی انتخابی سیاست میں بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ ان کی سیاست پی پی کا سندھ میں اثر توڑنے میں ناکام رہی۔ ان کی پارٹی بھی دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ صوفی روایت کی تجدید بھی اس ڈھب پر نہ ہوسکی۔ ان نکات کے باوجود جدید سندھ کی تاریخ جی ایم سید کے بنا ادھوری ہے۔

آپ سے پوچھا جائے کہ انسانی جسم کا سب سے مضبوط عضو کیا ہے۔ تو ہوسکتا ہے کہ آپ مختلف نام بتائیں لیکن یہ جان لیں کہ انسانی جسم کا سب سے مضبوط حصہ ہے ''زبان۔'' زبان ہی کے حوالے سے ایک بات اور سن لیں کہ زرافہ کی زبان اکیس انچ تک لمبی ہوتی ہے (جب کہ ہمارے یہاں یہ محاورے کے طور پر بولا جاتا ہے لمبی زبان والا۔ یا لمبی زبان والی)۔ وہ اپنی لمبی زبان کو باہر نکال کر اپنے کانوں کی صفائی تک کر لیتا ہے۔

مرسلہ: نرجس افروز۔ کراچی

☆ حکیم سعید

حکیم سعید 9 جنوری 1920ء کو دہلی کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دہلی ہی میں ان کے اجداد نے ہمدرد دواخانے کی پہلی اینٹ رکھی تھی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ چند عشروں بعد اس دواخانے کا ڈنکا پورے برصغیر میں بجنے والا ہے۔ دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ خاندانی دوا خانے سے وابستہ ہوگئے لیکن تقسیم کے بعد پاکستان آگئے۔ کراچی کو قیام کے لیے مناسب پایا۔ صفر سے اپنا سفر شروع کیا۔ بے سروسامانی کے باوجود ایک نیا جہاں آباد کیا۔ 1948ء میں انھوں نے اپنا مطب قائم کرنے کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کچھ عرصے تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے ہمدرد نونہال کے نام سے بچوں کا رسالہ

شروع کیا، جسے رجحان ساز قرار دیا جاتا ہے۔ پوری ایک نسل کی اس پرچے نے آب یاری کی۔ یہ آج بھی پڑھنے والوں میں مقبول ہے۔ نونہال ادب کے نام سے بچوں کے لیے کتب کا ایک خوبصورت سلسلہ شروع کیا۔ 1985ء میں انھوں نے ہمدرد یونیورسٹی قائم کی۔ اس درس گاہ اور اس کے تحت مدینۃ الحکمت جیسے شہر کی تعمیر کو ان علمی و تعلیمی تحریک کا ایک سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نیک طینت انسان نے مذہب، طب اور حکمت پر 200 سے زائد کتب تصنیف و تالیف کیں۔ وہ اخبارات و رسائل کے ذریعے مریضوں کو مشورے دیا کرتے۔

1993ء میں انھیں سندھ کا گورنر بنایا گیا۔ وہ چند ہی ماہ اس عہدے پر رہے۔ 17 اکتوبر 1998ء کو انھیں شہید کر دیا گیا۔ اس جرم میں چند لوگوں کو سزائیں ہوئیں مگر یہ معاملہ آج بھی حل طلب ہے۔

☆ عارفہ کریم

آپ نے عبقری طفل (Prodigy) کی ترکیب تو سنی ہوگی۔ عبقری طفل ایسے بچے کو کہا جاتا ہے جو خداداد صلاحیتوں کا مالک ہو، کم عمری ہی میں بڑے کارنامے کر دکھائے۔

ہماری عارفہ کریم بھی ایسی تھی۔ 2 فروری 1995ء کو پیدا ہونے والی اس فرشتہ صفت بچی نے پوری دنیا میں پاکستان کا نام روشن کیا۔ 2004ء میں فقط نو برس کی عمر میں مائیکروسافٹ کی تصدیق شدہ پروفیشنل (MCP) بن کر اس نے اس ملک میں تہلکہ مچا دیا۔ امن و امان کی مخدوش صورت حال اور غربت کے حوالے سے یاد کیے جانے والے پاکستان کو یکدم نئی شناخت ملی۔ اسے پاکستان کا چہرہ کہا جانے لگا۔ بل گیٹس نے عارفہ کو مائیکروسافٹ کے دفتر مدعو کیا۔ اس نے جدید ٹیکنالوجی سے متعلق دنیا بھر میں ہونے والے سیمینارز اور کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ حکومت نے بھی اپنی اس کی بیٹی کو پرائیڈ آف پرفارمینس سے نوازا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والی کم عمر ترین شخصیت تھی۔ وزیر اعظم کی جانب سے فاطمہ جناح میڈل بھی عارفہ کو دیا گیا۔ اس کے جذبے نے پاکستانی بچوں کو جوش سے بھر دیا۔ لاہور کا عارفہ سوفٹ ویئر ٹیکنالوجی پارک اس سے موسوم کیا گیا۔

وہ لاہور گرامر اسکول کی طالبہ تھی۔ 22 دسمبر 2011ء کو اسے مرگی کا دورہ پڑا۔ دورہ اتنا شدید تھا کہ اس کا دماغ بری طرح متاثر ہوا۔ اسے سی ایم ایچ لاہور میں ایڈمٹ کر دیا گیا۔ اس کی حالت بگڑتی گئی اور وہ کوما میں چلی گئی۔ اس واقعے نے پورے ملک کو سوگوار کر دیا۔ بین الاقوامی میڈیا میں بھی اس کی بازگشت سنائی دی۔ بل گیٹس نے اس کیس میں خصوصی دلچسپی لی۔ مائیکروسافٹ کے سربراہ کی جانب سے عارفہ کے والدین سے رابطہ کیا گیا اور بین الاقوامی معالجین کا ایک پینل تشکیل دیا گیا، جو اس کیس میں پاکستانی ڈاکٹروں کی معاونت کرتا رہا۔ اُس کی نازک صورتِ حال کی وجہ سے اسے بیرونِ ملک منتقل کرنا ممکن نہیں تھا۔ 13 جنوری 2012 کو اس کی حالت میں کچھ بہتری دیکھی گئی۔ اس کے والد امجد عبدالکریم نے ایک بیان دیا کہ ڈاکٹر اسے امریکا منتقل کرنے پر غور کر رہے ہیں، مگر یہ ہو نہ سکا۔ 14 جنوری 2012ء کو یہ گوہر نایاب ہم سے جدا ہو گیا۔ اس کی تدفین میں مشاہیر کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

کچھ لوگوں نے اس کی موت کو متنازع بنانے کی کوشش کی، میڈیا میں طرح طرح کی خبریں آئیں، مگر وہ جلد دم توڑ گئیں۔ پاکستانی بچوں نے عارفہ کے نقش پا کا تعاقب کیا۔ مارچ 2006ء میں بابر اقبال نامی بچے نے کم عمر ترین مائیکروسافٹ پروفیشنل بن کر اس کا ریکارڈ توڑا تھا۔ اس وقت عارفہ زندہ تھی۔ اس نے بابر کو مبارک باد دی۔ ستمبر 2014ء میں ایان قریشی نے فقط پانچ برس کی عمر میں یہ ریکارڈ بنا کر عارفہ کی یاد تازہ کر دی۔

زومبی

فیصل ظفر

مشرق کے لوگ اس بات پر بالکل یقین نہیں رکھتے ہیں لیکن مغرب کے لوگ اندھا اعتقاد رکھتے ہیں کہ ایک دن مُردے زندہ ہو کر آبادیوں پر حملہ کردیں گے۔ ان زندہ مُردوں سے بچنے کے لیے یورپ کے ہر شہر میں تیاریاں ہورہی ہیں۔ کہیں اونچی اونچی دیواریں تعمیر ہورہی ہیں تو کہیں ایسے پرفیوم متعارف کرائے جارہے ہیں جس کی کراہیت آمیز بُو سے زندہ مُردے دور رہیں گے۔ امریکن فوج میں ایک خصوصی دستہ بھی تیار ہے جو حکم ملتے ہی ان زندہ مُردوں سے جنگ کے لیے نکل پڑے گا۔

زندہ مُردوں کا ہوا جس نے یورپیوں کی نیندیں حرام کردی ہیں

گزشتہ چند برسوں کے دوران زومبیز یا زندہ مردوں کی خبروں نے مغربی دنیا پر گویا غلبہ پالیا ہے۔ ہر جانب انہی کے چرچے ہیں۔ وہ ان سے ڈرتے بھی ہیں اور محبت بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس دن کے لیے بھی تیار ہیں جب یہ لاشیں دوبارہ زندہ ہوکر لوگوں کا شکار کریں گی۔ اس اعتقاد کے شکار ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد ہیں۔

اس حوالے سے متعدد تحقیقی رپورٹس اور انتظامات

بھی سامنے آرہے ہیں جن کو دیکھ کر لوگوں کو سمجھ نہیں آتا کہ وہ قہقہے لگائیں یا روشن خیال دنیا کی اس توہم پرستی پر سر پکڑ لیں۔ ان میں سے کچھ سنجیدہ رپورٹس ہیں تو کچھ تفریح سے بھرپور مگر جو بھی ہے واقعی بہت زیادہ حیرت انگیز اور توجہ اپنی جانب مرکوز کرا لینے والا ہے۔

فلموں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر ہیروز بھوکے زومبیز سے بچنے کے لیے کچھ خون اور مواد اپنے جسم پر مل لیتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ان زندہ مردوں کے درمیان چلتے رہتے ہیں اور وہ ان کی جانب متوجہ بھی نہیں ہوتے مگر کیا یہ واقعی حقیقی زندگی میں بھی کام آئے گا؟

جہاں تک سائنس اور زومبی تھیوری کی بات ہے تو یہ مکمل طور پر کارآمد طریقہ ہے جس سے اب ان زندہ مردوں کو احمق بنا سکتے ہیں۔

نبراسکا لنکن یونیورسٹی کی تحقیق کے مطابق زومبیز نامی مخلوق زندہ افراد کو خوراک بناتے ہیں اور اپنے جیسوں کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ان کے بقول یہ زندہ مردے اپنے ہم جنسوں کو سونگھنے کی حس سے پہچانتے ہیں تو کسی زومبی جیسی بُو اپنے جسم سے آنا بچاؤ کا موثر طریقہ ثابت ہوتا ہے۔

اسی تحقیق کو دیکھتے ہوئے اور لوگوں کو کسی بھی ممکنہ زومبی ''قیامت'' سے بچانے کے لیے محقق و کیمسٹ ریچیلی بروکس نے ایسا پرفیوم بھی متعارف کرا دیا جس کو لگا کر زندہ افراد کے جسموں سے بھی زومبیز کی بُو نکلنے لگے۔

اس ''ڈیتھ'' نامی کلون میں Sulfhydryl methanethiol (گندے انڈوں جیسی بو) اور مختلف نامیاتی مرکب استعمال کیے گئے ہیں جو کہ کسی گلتی لاش جیسی سڑاند پیدا کرتے ہیں جن کی مہک سے خود کو مہکا کر اب زومبیز کو باآسانی بے وقوف بنا سکتے ہیں۔

اگرچہ انسانوں کے لیے تو زومبیز کا نظارہ دہشت ناک ثابت ہوسکتا ہے مگر متعدد جانور ایسے ہیں جن کے لیے یہ مخلوق دنیا کے خاتمے کی نہیں بلکہ زبردست ضیافت کا باعث ہوتی ہے۔

امریکی نیشنل وائلڈ لائف فیڈریشن کے ماہر ڈیوڈ میز جیوسکی کے مطابق یہ حیرت انگیز نہیں کہ انسانوں کا شکار کرنے والی زومبیز خود جانوروں کا شکار ہوسکتی ہیں۔

گدھ خاص طور پر ان زندہ مردوں کے لیے کسی ڈرون سے کم تباہ کن نہیں اور جس کی وجہ ان کا مردار خور ہونا ہے۔

سب سے حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ٹیکساس اسٹیٹ یونیورسٹی نے سائنس کے نام پر انسانی جسم کے اعضاء اکٹھا کر کے گدھوں کو کھلا دیے تاکہ دیکھا جاسکے کہ وہ انسانی جسم کو کس حد تک نقصان پہنچا سکتے ہیں اور اس سے کسی قتل کے جائے وقوع پر ان جانوروں کی موجودگی سے کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں مگر ان سائنسدانوں نے جو دریافت کیا وہ ان کے لیے چونکا دینے والا تھا۔ گدھوں کے ایک گروپ نے انسانی لاشوں کو محض 5 گھنٹوں کے اندر ٹھکانے لگا دیا اور صرف ہڈیاں ہی باقی بچیں۔

ان کی تحقیق کے مطابق جب زومبیز دنیا پر حملہ آور ہوں گی تو گدھ اور دیگر مردار خور پرندے زومبیز کے گوشت کی دعوت اڑانے میں بہت زیادہ خوشی محسوس کریں گے جب کہ بڑے درندے جیسے ریچھ کسی زومبی کو مارنے میں ذرا توقف نہیں کریں گے۔ بڑی تعداد میں مگرمچھ اور کیڑے بھی اس صفائی کے عمل میں اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔

امریکی فوج تو زندہ مردوں سے بھی لڑنے کے لیے تیار ہے۔ جی ہاں یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ حقیقت میں امریکی فوج نے دنیا پر زندہ مردوں کے کسی بھی حملے سے نمٹنے کے لیے ہنگامی پلان تیار کر رکھا ہے۔ یہ دلچسپ انکشاف امریکی جریدے فارن پالیسی کی ایک رپورٹ میں سامنے آیا۔

رپورٹ میں ایک خفیہ دستاویز CONOP 8888 کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ کسی بالی ووڈ فلم کی طرح کے زومبیز کے حملے سے نمٹنے کے لیے پینٹاگون نے منصوبہ تیار کر رکھا ہے تاکہ انسانیت کو بچایا جاسکے۔

30 اپریل 2011ء کی اس دستاویز کے مطابق امریکی فوج ہر قسم کے زندہ مردوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہے۔ اب چاہے وہ انسانوں کو شکار کریں یا چکن زومبیز، سبزیاں کھانے والے مردے یا خلا سے آنے والی زومبیز سب کا خاتمہ امریکی اسپیشل فورسز کے ذمے ہوگا۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ یہ منصوبہ کسی نے مذاق میں تیار نہیں کیا بلکہ یہ کسی بھی ایسے منظر نامے میں قومی ایمرجنسی کی صورت میں نافذ ہوگا۔

زومبیز بھی بیمار ہوتی ہیں۔ جی ہاں، یہ بات تحقیق

رپورٹ میں بتائی گئی ہے وہ لکھتے ہیں کہ بولنے میں تمام تر مشکلات کے ساتھ یہ بات بالکل واضح نظر آتی ہے کہ ایک زومبی کی تحلیل نفسی کی جاسکے۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر اور زومبی کے محقق بریڈلے ویوٹک نے ان زندہ مردوں کے دماغی افعال کا چارٹ مرتب کیا ہے اور وہ اس کے علاج کے قریب بھی پہنچ گئے ہیں۔

انہوں نے کوشش کی ہے کہ دیکھا جاسکے کہ ایک زومبی کے دماغ میں کیا سرگرمیاں چل رہی ہیں یا کم از کم ان کی کوشش تو یہی تھی۔

فلموں میں بیشتر زومبیز یادداشت کھونے کی علامات ظاہر کرتی ہیں اور اپنے ہی دوستوں ورشتے داروں پر ایک اجنبی کی طرح حملہ کردیتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے ہپو کیمپس (دماغ کا ایک خاص حصہ) فعال نہیں ہوتا۔ وہ آگے لکھتے ہیں کہ کئی سو اقسام کی زومبیز ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نہ کسی کی یادداشت برقرار رہتی ہو۔

یہ زندہ مردے حرکت کی اہلیت تو رکھتے ہیں مگر انسانی حرکت نہیں جس کا مطلب ہے کہ ان کا سریبلم (حرام مغز) کام تو کررہا ہوتا ہے مگر اسے کسی نہ کسی قسم کا نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے۔

اسی طرح ان کی مضطربانہ حرکات اور جارحیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دماغی اوپری تہہ کو بھی نقصان پہنچا ہے جس سے ان کے لیے بنیادی جبلتوں کو کنٹرول کرنے کی وہ اہلیت محدود ہو چکی ہے جو انسان اپنی خواہشات اور ضروریات پر رکھتا ہے۔ زومبیز بولنے کی صلاحیت تو رکھتی ہیں۔ جسمانی طور پر آوازیں نکال سکتی ہیں مگر الفاظ ان کی زبان سے نکل نہیں پاتے جس کا مطلب ہے کہ ان کے دماغ کا وہ حصہ بھی متاثر ہوتا ہے جو الفاظ کو سمجھنے اور ہمارے خیالات کو ترجمہ کرکے ہماری زبان سے ادا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

زومبی وائرس سے بچنے کے لیے بہترین مقامات کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

جیسا کہ یقین ہے کہ زومبی کی قیامت آنے کا امکان بالکل نہیں تاہم ایسا ہوتا بھی ہے تو وہ منظر ایسا نہیں ہوگا جیسا مغربی دنیا سوچتی ہے۔ یعنی خوفزدہ نیوز کاسٹر دہشت زدہ انداز میں متاثرہ شہروں کے نام اور زندہ مردوں کو شہروں کی گلیوں میں مارچ کرتے دکھارہی ہوتی ہے۔ جب

بھی ایسا ہوگا تو بلاشبہ وہ انتہائی ست رفتار سے ہوگا۔ کارنیل یونیورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق اگر ایسا وائرس یا بیماری وباء کی طرح لوگوں کو زومبیز میں بدلنے لگے تو ایک بڑے شہر میں تو جنگل کی آگ کی طرح کچھ دن میں پھیل جائے گی مگر پہاڑی اور دیہی علاقے اس سے مہینوں تک بچے رہیں گے اور توقع ہے کہ وہاں تک پہنچنے سے پہلے اس وائرس کی روک تھام یا علاج بھی سامنے آجائے گا۔ اگر آپ امریکا کے رہنے والے ہو تو سب سے آخری مقام جو اس وائرس سے متاثر ہوگا وہ راکی ماؤنٹین ہوگا۔

خلاء سے زومبیز کی آمد کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

گزشتہ برس سان فرانسسکو یونیورسٹی کے پروفیسر اسٹیفن کین نے ایک مقالہ شائع کیا جو کہ یکم اپریل یعنی اپریل فول ڈے پر سامنے آیا مگر اس مقالے کا خیال کافی سازشی قسم کا تھا۔

اس مقالے میں ہمارے اردگرد کے متعدد سیاروں کا جائزہ لے کر اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہاں کسی قسم کی آبادی ہوسکتی ہے یا نہیں اور یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ آخرانہوں نے اب تک ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔

مقالے کے بقول یہ بات بہت مضحکہ خیز ہے کہ قریبی خلائی مخلوق نے اب تک کسی سے رابطہ کیوں نہیں کیا اور اسٹیفن کین کے مطابق ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب وہاں کی رہائشی مخلوق کسی زومبی قسم کے وائرس سے متاثرہ ہو۔

تھیوری میں یہ نکتہ بھی اٹھایا گیا کہ زمین متعدد اقسام بلکہ ہر قسم کے امراض کا گھر ہے۔ یعنی ہم انسانوں نے انفلوائنزا، ہیضے اور دیگر کو ارتقاء کے عمل سے گزارا، ہم نے طاعون کی بہت بڑی وبا دیکھی اور بہت بڑی تعداد میں آبادی کا صفایا ہوگیا تو امکانات ہیں کہ دیگر سیاروں میں بھی اسی طرح کی وباؤں نے حملہ کردیا ہو بلکہ یہ تو بالکل ممکن ہے کہ دہاں کوئی ایسا وائرس موجود ہو جو دنیا میں زومبیز کی قیامت ڈھانے کا باعث بن جائے۔

اسٹیفن کے تخمینے کے مطابق کائنات میں ڈھائی ہزار سے زائد سیارے زومبیز سے متاثر ہوسکتے ہیں اور وہ اس پر بحث بھی کرتے ہیں کہ یہ تھیوری بالکل قابل فہم ہے۔

ان کے خیال میں ایسا ممکن ہے کہ کسی ذہین خلائی تہذیب کا ایک سفر کسی زومبیز سے متاثرہ سیارے پر ختم ہو اور ان کے ذریعے یہ وباء دیگر سیاروں میں پھیل جائے۔

اس کا مطلب ہے کہ یہ اچھا ہی ہے کہ ہم اب تک خلائی رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے کیونکہ وہاں تو اسپیس زومبیز منہ پھاڑے ہماری منتظر ہیں۔

زومبیز پر عوامی خیالات کی دلچسپ نفسیاتی تھیوری:

اپنی نشست پر بیٹھ کر ایسا لگتا ہے کہ جب ایک زومبی کسی فرد کو مارنے یا کھانے کے لیے آتی ہے تو اس کے سامنے کوئی اور انتخاب نہیں ہوتا اور یہ اس کی دماغی خرابی یا مختلف شخصیات میں تقسیم کا ثبوت ہوتا ہے۔

دماغی طور پر تقسیم کی اصطلاح 1956ء میں ماہرین نفسیات نے پیش کی تھی جو کہ دنیا کے خاتمے کے خواہش مندوں اور ان کے اندر زندگی کی موجودگی کے نظریے کو پیش کرنے کے لیے سامنے آئی تھی اور اب یہی نظریہ زومبیز کے حملے کے حوالے سے پیش کیا جارہا ہے کہ ان زندہ مردوں کو لگتا ہے کہ لوگوں کو مارنا غلط ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ ان کی بقاء کے لیے ضروری بھی محسوس ہوتا ہے۔

ان متضاد حقائق نے ماہرین نفسیات کے سامنے ایک دلچسپ منظرنامہ پیش کردیا ہے کہ کس طرح لوگ اس کا سامنا کرتے ہیں اور جب بات زومبیز کی ہو تو لوگوں کا اس حقیقت سے مطابقت پیدا کرنے کا طریقۂ کار ایک دوسرے سے الگ ہوسکتا ہے۔ اس سے یہ سوال بھی ماہرین نے اٹھایا ہے کہ کیا ایک زومبی کو قتل کرنا قابلِ قبول ہے، کیا آپ ایسے فرد کو مار سکیں گے جو زندہ مردہ بن چکا ہو یا بننے والا ہو؟ یا آپ کس حد تک اخلاقی طور پر انہیں پہلے زومبی بننے کا موقع فراہم کرکے ان پر حملہ کریں گے؟ کیا کسی علاج کے امکان کے پیشِ نظر انہیں زومبی کی حالت میں زندہ رکھنا اخلاقی طور پر زیادہ بہتر نہیں ہوگا؟

ایسے دلچسپ سوالات نے انسانیت کے لیے زومبیز کے قتل کی مشق کو حیرت انگیز بنادیا ہے اور یہ کہ کس طرح ہم اپنی بقاء کو اخلاقی طور پر مطمئن رہتے ہوئے ممکن بناسکتے ہیں۔

آپ کو کتنے دماغ کی ضرورت ہے؟

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ زومبیز کی دماغی سرگرمیاں

کچھ حد تک ہی فعال ہوتی ہیں اور وہ بھی بے مقصد بھوک کے گرد گھومتی ہے مگر اس سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک زندہ شخص جس کے دماغ کو کسی حادثے میں نقصان پہنچا ہو یا کسی وجہ سے نکالنا پڑا ہو تو اسے زندگی کے لیے کس حد تک دماغ کی ضرورت ہوتی ہے؟

ہم دماغ کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتے اور ہمارے پاس اوپر دیئے گئے سوال کا بھی کوئی جواب نہیں بس اندازہ ہے کہ دماغ کا آدھا حصہ بھی زندگی کے لیے کافی ثابت ہوسکتا ہے۔

سال 2014ء میں برطانیہ میں ایک شخص کا حیرت انگیز کیس سامنے آیا جس کے دماغ میں ٹیپ وارم کی تشخیص ہوئی تھی جو اس کے سر میں چار سال سے موجود تھے اور دماغ کے اندر سرنگیں تک بنالی تھیں۔

اس شخص نے عجیب بو آنے اور یادداشت کھونے کی شکایت کی تھی مگر عملی طور پر وہ ایک عام انسان ہی تھا تو اگر زومبی جیسا کوئی وائرس پھیلتا بھی ہے تو انسانی دماغ جو اپنے اندر کیڑوں سے بھی بچنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اس مرض کا شکار کیسے ہوسکتا ہے؟

زومبی ماڈلنگ اور ایچ پی وی:

زومبی انفیکشن کے پھیلنے کو ٹریک کرنے کا ریاضیاتی ماڈل بظاہر تو افسانوی کام لگتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ ماہرین بوریت کے وقت ہی ایسا کرنے کا سوچ سکتے ہیں مگر یوتاہ یونیورسٹی کے ماہر ریاضیات رابرٹ اسمتھ؟ (جی ہاں سوالیہ نشان ان کے نام کا حصہ ہے) نے یہ دلچسپ کام کیا ہے۔

ان صاحب نے زومبیز کی یلغار کے امکان پر کافی کام کیا ہے اور ریاضیاتی اعتبار سے شرح پیدائش، مخفی انفیکشن، قرنطینہ کی کوشش اور اس کی ناکامی کی صورت میں سامنے آنے والے منظر نامے وغیرہ کو ریاضیاتی پیمانے پر پیش کیا ہے۔

رابرٹ نے دریافت کیا کہ زومبیز کے خاتمے کے لیے بڑے پیمانے پر جارحانہ مہم کے بغیر انسانوں کا بچنا ممکن نہیں۔ ان کے بقول اگر کسی پانچ لاکھ آبادی کے شہر میں ایک زومبی سامنے آجائے تو سات دن بعد یا تو وہاں کا ہر فرد مر چکا ہوگا یا زندہ مردہ بن چکا ہوگا مگر ان کا ماڈل اور اس کے پیچھے کا حساب کسی ہارر فلم کا مواد نہیں، درحقیقت انہوں نے ایک سے دوسرے میں پھیلنے والے یا چھوت کے امراض کے منظر نامے کو پیش نظر رکھ کر یہ ماڈل تیار کیا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ زومبیز کی آمد کی صورت میں کیا ان کا وائرس ہیومین پی پی لوما وائرس یا ایچ پی وی کے امراض کی طرح تو نہیں پھیلے گا۔

چونکہ ایچ پی وی امراض مختلف طریقوں سے پھیل سکتے ہیں اس وجہ سے اس مرض کے پھیلاؤ کا ماڈل بنانے میں کافی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ عام طور پر ماڈلز میں ایک طریقہ کار کو ہی مدنظر رکھا جاتا ہے۔

اس کو دیکھتے ہوئے رابرٹ نے ایچ پی وی کی ترسیل کا مکمل طور پر درست ماڈل تیار کیا تاکہ زومبی انفیکشن کے پھیلاؤ کا صحیح اندازہ کیا جاسکے اور یہ انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے دلچسپ کام قرار دیا ہے۔

زومبی توانائی:

اگر زومبی کی آفت آجاتی ہے اور بڑی تعداد میں انسانی آبادی کا صفایا ہوجاتا ہے اور باقی بچ جانے والے معاشرے کی دوبارہ تعمیر پر جت جاتے ہیں تو سائنس اس معاملے میں بھی تیاری کر چکی ہے۔

آرکیٹیکٹس ساؤتھ ویسٹ نامی تعمیراتی کمپنی نے دنیا بھر میں ایسی تعمیرات کا تصور پیش کیا ہے جو اس آفت کے بعد کے زمانے کے لیے بہترین گھر ثابت ہوگا۔ یہ سوراخوں تک سے محروم ایسی پناہ گاہیں ہوں گی جو باہر گھومنے والے زندہ مردوں کی دسترس سے محفوظ ہوں گی۔

کچھ کمپنیوں نے بحری جہازوں اور کشتیوں کو اپنانے کے منصوبے بنائے ہیں جب کہ کچھ پہاڑوں کی جانب سے پسپائی کو بہترین خیال تصور کرتے ہیں اور چونکہ دنیا کی دوبارہ تعمیر میں کسی چیز کو ضائع کرنے کی اجازت نہیں ہوگی تو ایک کمپنی نے تو گھروں کی بجلی کے لیے زومبیز کو ہی استعمال کرنے کے امکانات پر غور کیا ہے۔

اس کمپنی نے ایسے عمودی گھروں کو ڈیزائن کیا ہے جس کی بنیادوں میں ٹربونز کی بھرمار ہوگی۔ زومبیز کو وہاں کسی زندہ چیز کا لالچ لاکر پھنسایا جائے گا اور ایک بار جب وہاں پہنچ جائیں گے تو بس گول گول گھومتے ہی چلے جائیں گے۔ ان کے چلنے سے ٹربون چل پڑیں گے اور گھر کی ضروریات کے مطابق بجلی پیدا ہوجائے گی۔

ننھے شیطان

دانیہ

بچے معصوم ہوتے ہیں۔ گناہوں کی غلاظت سے بھی مبرا ہوتے ہیں اس لیے مشہور ہے کہ بچے نادیدہ مخلوق کو بہ آسانی دیکھ لیتے ہیں۔ اس بات میں کتنی سچائی ہے اسے جانچنے کے لیے یورپ کے ماہرین نے ایک دلچسپ سروے کیا۔

کیا ننھے بچے مستقبل میں جھانک لیتے ہیں

ہم اکثر یہ کہاوتیں سنتے رہتے ہیں کہ ''بچے زمین پر اللہ کی رحمت کا عکس ہیں۔'' یا ''ننھے بچے بالکل فرشتوں جیسے ہوتے ہیں۔'' اور ان باتوں میں کوئی شک بھی نہیں ہے کیونکہ آپ بھی اس بات سے متفق ہوں گے کہ بچے واقعی معصومیت اور بھولپن کا امتزاج ہوتے ہیں جن کا دنیا اور اس کے مکروفریب سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ کچھ بچے انتہائی سیدھے ہوتے ہیں تو کچھ بچے بے پناہ شریر بھی ہوتے ہیں اور اپنی شرارتوں...... سے سب کی ناک میں دم کیے رکھتے ہیں۔ مگر دونوں ہی صورتوں میں ان کے دل شفاف آئینوں کی مانند ہوتے ہیں جس میں عیاری اور دھوکا دہی جیسی بیماریاں نہیں ہوتیں۔ جو بات ان کے دلوں میں ہوتی ہے وہ اسے زبان پر لانے میں بالکل نہیں جھجکتے اور سچائی سے سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیتے ہیں۔

دراصل کچھ عرصہ قبل چند غیر ملکی ماہرین بچوں کی نفسیات پر تحقیق کر رہے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے ایک سروے کا اہتمام کیا جس کا مقصد والدین سے یہ جاننا تھا کہ کیا کبھی ان کے بچوں نے ان سے کوئی ایسی بات کی یا ایسا عمل کیا جو ناقابلِ یقین ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے ڈراؤنی بھی تھیں۔ جواب میں انہیں دنیا بھر کے والدین سے ایسے روح فرسا واقعات موصول ہوئے جس نے ماہرین کے ہوش اڑا دیے اور وہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے کہ کبھی کبھار تو بچے اپنی معصومیت میں انتہائی غیر متوقع طور پر ایسی بات یا حرکت کر گزرتے ہیں جو دوسروں کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے یا پھر وہ ماضی میں بھی جھانک لیتے ہیں۔

آپ کی دلچسپی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہاں چند ایسے جوابات دیے جا رہے ہیں جو ماہرین کو چکرا دینے کے لیے کافی تھے۔ واضح رہے کہ یہ سروے صرف ڈھائی سے دس سال تک کے بچوں پر محدود تھا۔

ٹورنٹو کینیڈا میں رہنے والی مسز کیتھرین نے ایک واقعہ لکھ کر بھیجا۔

میرے بیٹوں کی عمریں بالترتیب دو اور چار سال تھی جب ہماری پالتو مچھلی مر گئی میں نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے چار سالہ بیٹے کو موت اور اس کے بعد کی زندگی کے متعلق چند باتیں بتائیں۔ میرے بیٹے نے حیرت سے اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ ''ممی، کیا کبھی آپ بھی مر جائیں گی؟''

یہ سن کر میرے دل میں اس کے لیے محبت کا دریا موجزن ہو گیا اور میں نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں میرے بچے، ایک دن ممی بھی مر جائیں گی۔''

تھوڑی دیر بعد جب ہم مردہ مچھلی کو کموڈ میں ڈال کر فلش کرنے والے تھے کہ وہ بول پڑا۔ ''کیا میں اس مچھلی کو کھا لوں؟''

میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''ہم پالتو جانوروں کو مرنے کے بعد نہیں کھاتے!''

وہ مزے سے بولا۔ ''لیکن جب آپ مر جائیں گی تو میں آپ کو دفن نہیں کروں گا بلکہ بھون کر کھا جاؤں گا۔ جسے میں تب کھاتا جب خوب بڑا تھا۔''

اس نے یہ بات کیوں کہی میں سمجھ نہیں پائی ہوں۔ اس نے آج تک کوئی افریقن معاشرے کی فلم نہیں دیکھی پھر بھی کبھی کبھی وہ ہاتھ میں چھڑی لے کر اسی طرح اچھلتا ہے جیسے افریقا کے قبائل برچھا بلند کر کے جنگی رقص کرتے ہیں۔

لیزا نے لاس اینجلس سے لکھا۔

ایک رات جب ہم سو رہے تھے تو میرے والدین کو میری دس سالہ بہن کے کمرے سے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ وہ لوگ دوڑ کر اس کے کمرے میں پہنچے تو وہ اپنے بستر پر بیٹھی اپنے گلے میں لٹکتی صلیب چہرے کے سامنے کیے زور زور سے چلا رہی تھی۔ ''بھوت! بھوت!'' میرے والد اسے سنبھالنے آگے بڑھے مگر اس نے صلیب کا رخ ان کی طرف کر دیا اور گلا پھاڑ کر چلائی۔ ''بھوت! بھوت! بیٹھ جاؤ، جلدی کرو!''

میرے والد خوفزدہ ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد میری بہن بستر پر گر کر سوگئی۔ اگلی صبح ہم نے اس سے یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ رات کو اسے کیا ہو گیا تھا اور وہ کسے دیکھ رہی تھی مگر حیرت انگیز طور پر اسے کچھ بھی یاد نہ تھا۔

میری ٹوڈ نے ایلی نوس سے لکھا کہ ایک رات میں اپنی نو سالہ بیٹی کو سلا رہی تھی تب اچانک وہ بولی۔ ''ممی، وہ لوگ کون ہیں؟''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون لوگ؟'' تو وہ معصومیت سے بولی۔

''وہ لوگ جو میری الماری میں رہتے ہیں اور آپ کے جانے کے بعد مجھ سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ ممی، بتائیں ناں! وہ لوگ کون ہیں؟'' اور میں شدید خوف اور حیرانگی کے عالم میں سُن رہ گئی۔ اس لیے میں نے اکثر الماری کو بے ترتیب پایا تھا۔

لوسی نے مشی گن سٹی سے لکھا ہے۔ میرا ننھا بیٹا اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اکثر اپنے کمرے کے ایک کونے پر اشارہ کر کے کہتا۔ ''وہ دیکھو! پری!'' کافی عرصے تک اس کا یہی معمول رہا پھر ایک دن جب میں اس کے ساتھ بیٹھی پرانا البم دیکھ رہی تھی تو اس نے چونک کر ایک تصویر کی طرف

اشارہ کیا اور پھر اسی کونے کی طرف دیکھ کر قلقاری ماری۔ ”یہی والی پری، وہ کھڑی ہے!“

وہ جس تصویر کی طرف اشارہ کر کے پری کہہ رہا تھا وہ میری والدہ کی بچپن کی تصویر تھی۔ میری والدہ اس کی پیدائش سے چار سال پہلے مر چکی تھیں۔ کیا واقعی میری ماں میرے گھر میں اپنی جوانی کی خوب صورتی کے ساتھ مقیم ہے۔ میرے اس تجسس کو دور کریں۔

اوک لینیٹر کی رہائشی ایلکس الیگزینڈر لکھتی ہیں۔ میری بیٹی مجھ سے کہتی تھی۔ ”آپ کے پاس رہنے سے قبل میں دوسری فیملی کے ساتھ رہتی تھی۔ ہم گھاس سے بنے نیلے رنگ کے گھر میں رہتے تھے، وہاں بڑا سا کھیت تھا اور ہمارے ساتھ گھوڑے بھی رہتے تھے۔“ وہ یہ بات اس تواتر سے دہراتی کہ کئی لوگوں کو شک پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ لے پالک تو نہیں۔ ایک مرتبہ وہ میرے ساتھ کہیں جا رہی تھی کہ وہ خوشی سے اچھل پڑی اور بولی۔ ”وہ گھاس پھوس والا میرا گھر یہیں تھا اور گھوڑے بھی یہیں تھے۔“ اس سے پہلے ہم کبھی اس دور دراز علاقے سے نہیں گزرے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے گاڑی گھمائی اور سڑک کے آخری سرے تک لے گئی جہاں حیرت انگیز طور پر نیلے رنگ کا فارم ہاؤس موجود تھا۔ جس کے آگے دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے جبکہ وہیں کونے پر ایک اصطبل میں گھوڑے بھی بندھے تھے۔

لیری جن نے سان فرانسسکو سے پوچھا ہے۔ ”یہ واقعہ میری والدہ نے مجھے سنایا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جب میں تین سال کا تھا تو ایک رات میں نیند سے بیدار ہو گیا اور رو رو کر ان سے کہنے لگا کہ وہ دیوار کے پاس کون آدمی کھڑا ہے؟ جبکہ وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اسی طرح کئی راتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا اور میں روز رات کو نیند سے بیدار ہو کر اس آدمی کے بارے میں سوال کرتا کہ وہ یہاں کیوں کھڑا ہے۔ یہاں تک کہ ایک رات میری والدہ اٹھ کر اس دیوار تک گئیں اور اس نادیدہ آدمی کو یہ کہہ کر وہاں سے چلے جانے کو کہا کہ اس کی وجہ سے ان کا بیٹا خوفزدہ ہو رہا ہے۔ اس رات کے بعد سے میں نے کبھی اس آدمی کی شکایت نہ کی۔ اس واقعے کو بیتے برسوں گزر گئے ہیں مگر میری والدہ آج تک بھوت پریتوں کے وجود پر کامل یقین رکھتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے اپنے گھر میں ایک اجنبی آدمی کو چلتے پھرتے دیکھتا ہوں جو پل بھر میں غائب ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے، ایلوشن یا بڑھتی عمر کا شاخسانہ۔“

میری اسٹیو گریور نے ڈبلن سے لکھا ہے۔ میرا بھانجا اس وقت بمشکل دو سال کا تھا۔ ان دنوں اس کی عادت تھی کہ وہ روز صبح پانچ بجے اٹھ جایا کرتا۔ اپنی بہن کی نیند کا خیال کرتے ہوئے میں اسے نیچے بنے ٹی وی لاؤنج میں لے جایا کرتی تھی جہاں وہ کھیلا کرتا تھا جبکہ میں وہیں اس کے پاس ہی لیٹ کر سو جاتی تھی۔ ایک صبح میں اسے لے کر حسبِ معمول نیچے اتری اور اسے وہاں بٹھا کر خود سو گئی۔ آدھے گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو میں نے اسے کچن کی طرف اشارہ کر کے بولتے ہوئے سنا۔ ”وہ دیکھو! میری ممی کچن میں اڑ رہی ہیں!“ پھر وہ غور سے کچن کی طرف دیکھنے لگا اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ ”ممی اڑ رہی ہیں! ممی اڑ رہی ہیں!“ مجھے تھوڑا عجیب تو لگا مگر میں کروٹ بدل کر سو گئی۔

تھوڑی دیر بعد کچن میں ہونے والی کھٹر پٹر سے میری آنکھ کھل گئی۔ میری بہن اپنے لیے کافی تیار کر رہی تھی۔ مجھے اٹھا ہوا دیکھ کر وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے حیرت سے اس کے جلدی اٹھنے کی وجہ پوچھی تو اس کے جواب نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ میری بہن نے بتایا کہ ہمارے نیچے چلے جانے کے بعد وہ پھر سے سو گئی تھی پھر تھوڑی دیر بعد ہی اسے عجیب سا خواب آیا جس میں اس نے دیکھا کہ اس کی روح اس کے جسم سے الگ ہو کر زینے سے پرواز کرتی ہوئی نیچے واقع کچن تک گئی جہاں وہ کافی دیر تک موجود رہی۔

کیا میرا بھانجا تھوڑی دیر قبل سچ مچ اپنی ماں کی روح کو دیکھ رہا تھا؟

میڈونا گوڈین نے ڈبلن سے لکھا ہے کہ ایک دن میں ڈرائیو کر رہی تھی جبکہ میرا تین سالہ بیٹا پچھلی سیٹ پر بیٹھا مستقل مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں بھی ڈرائیونگ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے معصومانہ سوالات کے جوابات دیتی جا رہی تھی جب اس کے ایک سوال نے مجھے خوف سے تقریباً شل کر دیا۔ ”ممی، آپ نے میرے بھائی کو کیوں مارا؟“ میں نے بمشکل اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ”کون سا بھائی؟“

جواباً وہ مزے سے بولا۔ ”وہی جو میرے ساتھ آپ کے پیٹ میں تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے پھر ایک دن آپ نے اسے مار دیا! میرا خیال ہے کہ وہ غلط پیٹ میں تھا۔“

میں حیرت اور خوف سے گنگ یہ سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر نے مجھے جڑواں بچوں کی نوید سنائی تھی مگر دوسرا بچہ کمزور ہونے کی وجہ سے خود ہی میری کھوکھ میں ختم ہو کر جذب ہوگیا (جڑواں بچوں میں اکثر ایسا ہو جایا کرتا ہے)۔ مگر اس بات سے میرے علاوہ صرف میری ڈاکٹر یا میرے شوہر واقف تھے اور میرے بیٹے کی پیدائش کے بعد سے آج تک میرے شوہر نے میرے اداس ہوجانے کے خیال سے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ تو کیا میرا حیران اور خوفزدہ ہونا بجا نہ تھا؟

رومر کین بیل نے الاسکا سے لکھا ہے۔ میرے میوزک کے استاد اپنی چار سالہ بیٹی کو الاسکا میں واقع ایک قدیم میوزک تھیٹر لے گئے۔ اندر جانے پر ان کی بیٹی رونے لگی تو وہ اس کو بہلانے کے لیے باہر لے آئے، تھوڑی دیر بعد وہ اسے دوبارہ اندر لے گئے تو وہ پھر سے رونے لگی چنانچہ وہ اسے باہر لے آئے۔ اسی طرح دو، تین مرتبہ ہوا تو تنگ آ کر انھوں نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ وہ اندر جانے پر کیوں رونے لگتی ہے۔ بیٹی آنسو پونچھ کر بھولپن سے بولی۔ ’’اس لیے کہ اندر مکڑیوں کی طرح دیواروں پر چپکے بغیر آنکھوں والے لوگ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔‘‘

تانیا پٹسی نے لاس اینجلس سے لکھا ہے۔ ایک روز میں اپنے چھ سالہ بیٹے کا بستر بچھا رہی تھی تو وہ بولا۔ ’’جب میں بڑا تھا تو اپنا بستر خود کرتا تھا۔‘‘ میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔ ’’تم کب بڑے ہوا کرتے تھے؟‘‘ تو وہ اداسی سے بولا۔ ’’میں سچ میں بڑا تھا بالکل ڈیڈی کی طرح! اس وقت میں فائر فائیٹر ہوا کرتا تھا اور اپنا بستر بھی خود بچھاتا تھا۔ اب تو میں بڑا نہیں ہوں مگر مجھے یقین ہے میں ایک دن پھر سے پہلے کی طرح بڑا ہوجاؤں گا!‘‘

فلچر میسی نے نیویارک سے لکھا ہے۔ میرے بھائی کے متعلق یہ واقعہ میرے والدین اکثر سناتے ہیں۔ ایک مرتبہ میرا بھائی میرے دادا اور ڈیڈ کے ساتھ ایک پرانے آرمی بیس گیا جسے میوزیم کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ جب وہ تینوں ایک بنکر کے اندر گئے تو وہ ڈیڈ کی گود سے ضد کر کے اتر گیا اور ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ ڈیڈ اور دادا نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور خود بنکر کے اند موجود چیزیں دیکھنے لگے۔ تب میرے ڈیڈ نے اسے یہ بولتے سنا۔ ’’جب میں یہاں ہوتا تھا تو یہاں بڑے بڑے دیو آیا کرتے تھے اور ہم ان سے لڑتے تھے۔ ان سے لڑتے ہوئے بوم، بوم، بوم کی آوازیں آتی تھیں۔‘‘ تھوڑی دیر بعد ڈیڈ اور دادا اسے لے کر بنکر سے باہر نکل آئے۔ چند لمحوں بعد وہاں سے ایک جنگی جہاز نیچی پرواز کرتا ہوا گزرا تو میرا بھائی خوشی سے تالیاں پیٹتا ہوا بولا۔ ’’ہاں، ہاں! یہی دیو آتے تھے اور ہم ان کو گرا دیتے تھے پھر زور کی آواز آتی تھی بوم! بوم! بوم!‘‘ اس وقت میرے بھائی کی عمر ڈھائی سال تھی اور یہ انیس سو اکانوے کا سال تھا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ میرے ڈیڈ اور دادا یہ سن کر کتنا حیران و پریشان ہوئے بلکہ آج بھی وہ اس واقعے کو یاد کر کے خوفزدہ سے ہوجاتے ہیں۔

کوئین فری منٹل نے الاسکا سے لکھا ہے۔ ایک صبح میں نے اپنی چار سالہ بیٹی کے کمرے کے دروازے کے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ حسب عادت ہمارے پاس بیڈ پر آ کر لیٹ جائے گی مگر وہ نہیں آئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دوبارہ دروازے کی آواز سنی۔ میں کچھ دیر لیٹا اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئی تو میں خود اسے دیکھنے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اس وقت اپنے بیڈ پر بیٹھی تھی۔

’’سویٹی؟‘‘

’’جی ڈیڈ؟‘‘

’’تم کمرے سے باہر کیوں نکلیں؟‘‘

’’میں نہیں نکلی، میں سونا چاہ رہی تھی مگر وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور سوالات پوچھ پوچھ کر سونے نہیں دے رہا تھا۔‘‘

’’وہ؟ کون وہ؟‘‘

’’ایک شخص جو میرے کمرے میں تھا۔‘‘

’’اوہ، سویٹی تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ تمہارے کمرے میں کوئی نہیں ہے!‘‘

’’مجھے پتا ہے کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے کیونکہ اب تو وہ چلا گیا ہے۔‘‘

’’اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کر رہا تھا؟‘‘

’’وہ پنکھے سے لٹکا ہوا تھا اور مجھ سے ڈھیروں سوالات کر رہا تھا۔‘‘

’’وہ پنکھے سے کیسے لٹکا ہوا تھا؟ کیا اپنے ہاتھوں سے؟‘‘

’’نہیں، وہ اپنے گلے میں پڑی ہوئی رسی کی مدد سے لٹکا ہوا تھا!‘‘

اپنی بیٹی کے منہ سے یہ سب سننا میرے لیے انتہائی

خوفناک مرحلہ تھا۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد میں نے اسے اس واقعے کے بارے میں کریدا لیکن اس نے کہا کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔

اوین موفٹ نے ایلی راس سے لکھا۔ میرے تینوں بچے جن کی عمریں بالترتیب تین، چار اور پانچ سال تھی ہمیشہ ان دو لڑکیوں کے بارے میں بات کیا کرتے تھے جو خون میں لت پت انہی کے کمرے میں رہا کرتی تھیں۔ وہ تینوں ان کے بارے میں بتاتے، ان کا نام، ان کا لباس اور یہاں تک کہ وہ ان سے کون سے کھیل کھیلنا پسند کرتی ہیں۔ یہ سب میرے بیٹے کی تیسری سالگرہ سے شروع ہوا جب اس نے مجھے بتایا۔ ''ہمارے کمرے میں دو بہنیں رہتی ہیں۔ ایک دن وہ دونوں اپنے والدین کے ساتھ سبز رنگ کی کار میں گھومنے جا رہی تھیں تو ان کی کار پل سے نیچے گری اور لڑھکتی ہوئی ندی میں جا گری اور سارا پانی سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے والدین بہت اداس رہتے تھے۔ اسی لیے وہ یہیں رہنے کے لیے آ گئی ہیں اور ان کو ہمارا کمرا اور کھلونے بہت پسند ہیں۔''

جینے بالٹی مورسن ..... نے مشی گن سے لکھا ہے۔ میرا بیٹا جب تین سال کا تھا تو ایک دن وہ مجھ سے بولا۔ ''ممی، مجھے اپنے نئے ڈیڈی بہت پسند ہیں۔ اب میں ہمیشہ انہی کے ساتھ رہوں گا۔'' میں اس کی یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گئی کیونکہ میرے شوہر ہی اس کے سگے باپ ہیں اور ان سے قبل میری کسی آدمی سے کوئی شناسائی تک نہ تھی۔ میں نے حیرانگی سے اس سے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟'' تو وہ معصومیت سے بولا۔ ''میرے پچھلے ڈیڈی بہت خراب تھے۔ مجھے بہت مارتے تھے اور ایک دن انھوں نے میری پیٹھ پر اس زور سے مارا کہ میں مر گیا۔ مگر میرے نئے والے ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ کبھی بھی میرے ساتھ ایسا نہیں کریں گے۔''

اس نے یہ بات کیوں کہی آج تک میں سمجھ نہیں پائی ہوں۔ کیا آپ رہنمائی کریں گے؟

معصومیت

''ڈیڈی، مجھے اپنی الماری میں لٹکتے اس لڑکے سے کب نجات ملے گی؟'' میں اخبار پڑھ رہا تھا جب یہ سوال میری پانچ سالہ بیٹی نے مجھ سے کیا۔ میں چونک کر بولا۔ ''کون سا لڑکا؟'' تو وہ بولی۔ ''وہی لڑکا جو میری الماری میں اتنے دنوں سے گلے میں بیلٹ ڈالے لٹک رہا ہے۔'' یہ سن کر میں دوڑ کر اس کے کمرے میں گیا اور اس کی الماری کو چیک کرنے لگا جہاں حسب توقع کوئی نہ تھا۔

''ہنی، یہاں تو کوئی لڑکا نہیں ہے!''

وہ مزے سے آنکھیں گھماتی ہوئی بولی۔ ''ہاں، مجھے پتا ہے کیونکہ وہ تب ہی نظر آتا ہے جب آپ آس پاس نہیں ہوتے۔''

عرصہ بعد مجھے انٹیک شاپ کے مالک تھامسن نے بتایا کہ جس الماری کو میں نے پانچ سال پہلے خریدا تھا اس میں اس کے سابقہ مالک کا بیٹا بند ہو گیا تھا اور تیسرے دن اس کی لاش الماری سے دریافت ہوئی تھی۔

از بیلا اور ڈے نے سان فرانسسکو سے لکھا ہے۔ میرا بیٹا مجھے کھانے پینے کے لیے بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ وہ حد سے زیادہ کمزور تھا اور ڈاکٹر کی کڑی ہدایت کے مطابق میں اسے زیادہ سے زیادہ پھل اور دودھ کا استعمال کرواتی تھی۔ ایک دن میں اسے زبردستی جوس پلا رہی تھی مگر وہ کارٹونز دیکھنے میں ایسا مگن تھا کہ کسی طرح پینے پر راضی نہ ہو رہا تھا۔ تنگ آکر میں نے ٹی وی بند کر دیا۔ میرے اس اقدام پر وہ غصے سے بولا۔ ''ممی! مجھے اتنا مت تنگ کریں کہ میں واپس اسی فیملی کے پاس چلا جاؤں جن کے ساتھ میں پہلے رہتا تھا! وہ لوگ مجھے کمرے میں بند رکھتے تھے اور کھانے پینے کو کچھ نہیں دیتے تھے۔ بھوکا پیاسا میں ایک دن مر گیا۔ اسی وجہ سے مجھے زیادہ کھانے پینے کی عادت نہیں ہے مگر آپ سمجھتی ہی نہیں ہیں!'' اس کے بعد وہ دوبارہ ٹی وی کھول کر مزے سے کارٹونز دیکھنے لگا جبکہ میں کتنی ہی دیر شل دماغ کے ساتھ وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

آپ نے سروے کے جواب میں موصول ہونے والے ہزاروں جوابات میں سے چند منتخب جوابات ملاحظہ کیے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ اپنے بچوں کے منہ سے ایسی باتیں سننے کے بعد ان کے والدین کو ضرور کسی اچھے نفسیات دان سے مشورہ کرنا پڑا ہوگا۔ گو ان میں سے کئی باتوں کا جواب تو والدین کو بعد میں مل گیا کہ ان کے آفت کے پرکالے بچے کسی فلم، کہانی یا ڈرامے سے متاثر ہو کر اور کچھ اپنے ننھے ذہنوں کی مدد سے قصے گڑھ کر یہ بات کر رہے تھے۔ جبکہ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں کہ جن کا جواب والدین آج تک نہیں ڈھونڈ پائے۔

◆ ◆

خبردار

منظر امام

کراچی ایک میٹروپولیٹن شہر ہے۔ کروڑ سے زیادہ لوگ آباد ہیں۔ ایک طویل و عریض رقبے پر یہ شہر پھیلا ہوا ہے۔ لاکھوں لاکھ مکانات کا ایک جنگل آباد ہے۔ انہی میں سے چند مقامات ایسے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جگہیں آسیب زدہ ہیں۔

کراچی و بیرون کراچی کے آسیبی مقامات کا ذکرِ خاص

یہ دنیا بہت عجیب ہے۔

ہمارے اردگرد جو کچھ بھید دکھائی دے رہا ہے اس سے بھی پرے ایک اور دنیا ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے لیکن کبھی کبھی ہم اسے دیکھ بھی لیتے ہیں۔

اور جب دیکھ لیتے ہیں تو جنوں، بھوتوں، چڑیلوں اور اس طرح کی غیر انسانی مخلوقات کی کہانیاں گردش کرنے لگتی ہیں کہ فلاں جگہ فلاں روح بھٹکتی دیکھی گئی اور فلاں جگہ فلاں مرا ہوا شخص نظر آ گیا۔

پُراسرار آوازیں، انجانے چہرے، طرح طرح کے جانور ہماری نگاہوں کے سامنے آنے لگتے ہیں اور ہم پریشان ہو کر رہ جاتے ہیں کہ خدایا یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔

پوری دنیا اس قسم کی کہانیوں اور اس قسم کے غیر فطری کرداروں کے سحر میں گرفتار ہے۔ ایسی کہانیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

یورپی اور مغربی ممالک میں تو گھوسٹ اسٹوریز ایک پسندیدہ موضوع ہے۔ اس قسم کے مقامات اور کرداروں پر پوری ریسرچ کی جاتی ہے کہ واقعی ایسا کچھ ہے بھی یا صرف کہانیاں ہیں۔

ٹی وی چینلز میں بھوتوں کو تلاش کرنے کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی کچھ چینلز نے یہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ جو کردار ہیں یا جو ایسے مقامات ہیں۔ ان کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے۔ ہم کیوں ان کی وجہ سے پریشان ہوں۔

لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موقع پر وہ ہماری زندگی میں داخل ہو ہی جاتے ہیں اور ہم یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم جو زندگی گزار رہے ہیں وہ خواب ہے یا جو کچھ ہم نے محسوس کیا ہے وہ خواب ہے۔ بہرحال یہ بہت وسیع موضوع ہے۔

اس وقت تو ہم گفتگو کر رہے ہیں کہ پُراسرار مقامات اور پُراسرار کردار۔ کہاں کہاں ہیں۔ ریسرچ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مقامات اور ایسے کردار دنیا میں ہر ملک ہر شہر اور ہر گاؤں میں ہیں۔

جب پوری دنیا میں ہیں تو پھر کراچی کیسے محروم رہ سکتا تھا۔ لہٰذا یہ کراچی میں بھی ہیں۔ ویسے تو کراچی میں رہنے والے یہ بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے مقامات، سڑکوں اور عمارتوں کے بارے میں کہانیاں سن رکھی ہیں لیکن ہم آپ کو ان مقامات وغیرہ کے بارے میں بتا رہے ہیں جو مستند ہیں یا مستند سمجھی جاتی ہیں۔

لیاری

لیاری کراچی کا ایک قدیم ترین محلہ۔ یہاں کے رہنے والے اپنی زندہ دلی اور فٹ بال سے محبت کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

ابھی حال ہی میں لیاری کے اسٹریٹ چلڈرنز نے فٹ بال کپ جیت کر عالمی شہرت بھی حاصل کی۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ سہی لیکن پچھلے کئی برسوں سے یہ علاقہ شدید بدامنی میں مبتلا ہے۔

مار دھاڑ، گینگ وار، اغوا، ٹارگٹ کلنگ، بم حملے اور نہ جانے کیا کیا۔ نہ جانے کتنی کہانیاں اس علاقے سے وابستہ کر دی گئی ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی پُراسرار مقتول کی ہے۔

کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ اس کا پس منظر کیا ہے؟ کس نے اس کو قتل کیا؟ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

لیکن وہ رات کے وقت لیاری کی سڑکوں پر دیکھا گیا ہے۔ ایک لہولہان شخص جس کی گردن آدھی کٹ کر ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی، سفید کرتہ شلوار، خون میں تر۔ وہ لیاری کی سڑکوں پر ٹہلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کچھ لوگ ہمت کر کے اس کے پاس پہنچتے ہیں تو وہ بے معنی سی آوازیں نکالتا ہوا اچانک غائب ہو جاتا ہے اور دیکھنے والے خوف زدہ ہو کر بھاگ لیتے ہیں۔

لیاری کے بہت سے لوگوں میں اس لہولہان شخص کی یہ کہانی بہت عام ہے۔ آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ کون تھا؟ کیا نام تھا اس کا؟ اور کس نے اتنی بے رحمی سے اس کا خون کر دیا؟

موہٹہ پیلس

کراچی کی ایک خوب صورت عمارت۔ راجستھانی طریقے کا شاہکار۔ اس عمارت کو کراچی کے ثقافتی اثاثے میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موہٹہ پیلس کراچی کے ماتھے پر کسی جھومر کی طرح جگمگا رہا ہے۔

یہ محل کراچی کے اولڈ کلفٹن میں واقع ہے۔

18500 اسکوائر فٹ میں پھیلا ہوا یہ محل دیکھنے والوں کو بری طرح متاثر کر دیتا ہے۔ اس کی تعمیر 1927ء میں مکمل ہوئی تھی۔

اس کو بنوانے والے راجا شیورتن، چندرارتن تھے۔ انہوں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں رہنے کے لیے بنوایا تھا۔ اس کے آرکیٹیکٹ آغا احمد حسین تھے۔

راجا 1947ء میں یہ محل اسی طرح چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔ پھر حکومت پاکستان نے اسے خرید لیا۔ اب یہاں باقاعدہ ایک بڑا میوزیم قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ تو تھا موہٹہ پیلس کا تھوڑا سا پس منظر۔

اب کہانی موہٹہ پیلس کے ایک محافظ کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔

اس رات جس محافظ کی ڈیوٹی تھی اس کا دوسرا ساتھی کمرے میں سو رہا تھا۔ محافظ نے بری طرح اپنے ساتھی

کو جھنجوڑ کر جگا دیا۔

دوسرا پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔ ”ارے کیا ہوا ہے۔“ اس نے پہلے والے سے پوچھا۔ جس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

”وہ......وہ انگریز سپاہی۔“ پہلے والے نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ......وہاں۔“

”کیا پاگل ہو گئے ہو کون سے انگریز سپاہی۔“

”آؤ خود......خود دیکھ لو۔“

دونوں کمرے سے باہر نکلے۔

سامنے انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ مارچ کر رہا تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا انہوں نے تصویروں میں دیکھا ہو گا۔ برطانوی فوجیوں جیسے لباس میں۔ توڑے دار لمبی لمبی بندوقیں لیے۔ چاند کی روشنی میں ان کے ہنستے ہوئے چہرے بہت بھیانک لگ رہے تھے۔

دوسرے محافظ پر بھی کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ کیا منظر تھا۔ دونوں آیتیں پڑھتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

برطانوی فوجیوں کا یہ دستہ ابھی بھی کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے موہٹہ پیلس کو ہانٹیڈ سمجھا جاتا ہے۔

برسٹل ہوٹل

یہ ہوٹل میرے بچپن کی یادوں میں سے ہے۔

انگریزی طرز کی ایک خوب صورت عمارت۔ ایسی عمارتیں آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ ہوٹل کراچی کینٹ اسٹیشن کے پاس ہوا کرتا تھا (اب نہیں معلوم کہ وہ قائم ہے یا نہیں۔ یا وہاں کوئی پلازہ بن گیا ہے)۔

یہ انگریزوں کے وقت کی ایک خوب صورت عمارت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ قائداعظم نے بھی ایک بار یہاں ڈنر کیا تھا۔

میں اس زمانے میں اس ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے سوچا کرتا کہ وہاں کون لوگ آ کر ٹھہرے ہوں گے۔ یہاں کا ماحول کیسا ہو گا۔ اب تو سب خواب و خیال بن چکا ہے۔

اس ہوٹل کے حوالے سے بھی ایک کہانی بہت مشہور ہے۔ یہ ایک میاں بیوی کی کہانی ہے۔ بہت خوب صورت جوڑا تھا جنہوں نے ایک کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔

دونوں شام کے وقت ہوٹل کی روش پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ٹہلتے رہتے۔ سامنے لان میں بید کی کرسیاں بچھی ہوتیں۔ بہت دیر واک کرنے کے بعد وہ ان کرسیوں

پر آ کر بیٹھ جاتے۔ اس وقت ویٹر ان کی میز پر شام کی چائے لے آتا۔

یہ ان کا معمول تھا۔ وہ ناشتا اپنے کمرے میں ہی کیا کرتے تھے۔ ایک صبح ویٹر کے بار بار دستک دینے کے باوجود ان کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔

ویٹر مینیجر کو بلا کر لے آیا۔ اس نے بھی بہت کوشش کی پھر سب کے مشورے پر دروازہ توڑ دیا گیا۔

کمرے کے بستر پر دونوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کوئی بے رحم اور نامعلوم قاتل رات میں ان کا خون کر گیا تھا۔

کمرے کی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ یہ کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔ پولیس میں رپورٹ کروائی گئی لیکن قاتل گرفتار نہیں ہوا۔

بہر حال قاتل چاہے جو بھی ہو ہوٹل کی روش پر دونوں میاں بیوی بعد میں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ٹہلتے ہوئے دکھائی دیتے رہے۔

برسوں گزر جانے کے بعد بھی بہت سے لوگوں نے ان دونوں کو اسی طرح دیکھا ہے۔ اس کے بعد یہ ہوٹل آسیب زدہ مشہور ہوتا چلا گیا۔ (وہ مقام بھی کراچی کے چند ایک پُراسرار مقامات میں سے ایک ہے)۔

ہل پارک کا بھوت بنگلا

ہل پارک کراچی کی ایک مشہور تفریح گاہ ہے۔ اسے ہل پارک اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس پارک کو ایک بہت اونچے پہاڑی سلسلے پر بنایا گیا ہے۔ یہاں بچوں اور بڑوں کے لیے تفریح کی بہت سی چیزیں ہیں۔

ہوٹل، ریستوران، برقی جھولے، رائیڈنگ اور بہت کچھ۔ ایک اونچی چوٹی پر جنگل لگا کر ایک بڑا سا چبوترا بنا دیا گیا ہے جس پر کھڑے ہو کر شہر کے دور دور تک کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

اس اونچے چبوترے کے بالکل برعکس جس طرف ریستوران بنے ہوئے ہیں ان کے پیچھے چٹانیں اور جھاڑیاں ہیں۔ ان جھاڑیوں اور چٹانوں کے درمیان ایک بوڑھا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی ہوتی ہے وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر چٹانوں سے نیچے کی طرف دیکھ رہا ہوتا ہے اور یہ معمول برسوں کا ہے۔

ادھر سے گزرنے والے اسے دیکھتے ہیں اور جب

اس کے قریب جاتے ہیں تو وہ غائب ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان ہی چٹانوں کے نیچے مکانات تھے (جو آج بھی ہیں) وہ مکانات پرانے وقتوں کے امیروں کی رہائش گاہیں تھیں اور یہ ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھا نظر آنے والا شخص اس علاقے کا چوکیدار تھا۔

اب تو مکین بھی نہیں رہے۔ وہ چوکیدار بھی نہیں رہا لیکن اس کا عکس ابھی بھی دکھائی دیتا ہے۔

یہ ایک عجیب بھید ہے۔ کیا واقعی مرجانے کے بعد بھی کچھ لوگ اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں یا یہ پھر صرف کہانیاں ہیں۔ انسانی ذہن کی اختراع۔

بہر حال ہم صرف ایسے مقامات کے حوالے سے وابستہ کہانیاں دہرا رہے ہیں سچائی کی تحقیق آپ کریں۔

کارساز روڈ

ایک زمانے میں کارساز روڈ کی کہانی پورے شہر بلکہ پورے ملک میں مشہور ہو چکی ہے۔

کارساز روڈ کراچی نیشنل اسٹیڈیم کے سامنے سے ہوتی ہوئی شاہراہ فیصل سے جا کر مل جاتی ہے۔ اس سڑک پر کہانیاں جنم لیتی ہیں۔

لڑکی والی کہانی تو مشہور ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات محترم سرور موسوی صاحب نے بتائی تھی۔ سرور موسوی صاحب بہت پڑھے لکھے اور ایڈورٹائزنگ کے ایک بڑے آدمی ہیں۔ وہ انڈس ویلی میں پڑھاتے بھی رہے ہیں۔

بہر حال ایک بار انہوں نے کارساز روڈ کے بارے میں ایک عجیب بات بتائی کہ آپ جس وقت بھی یہاں سے

گزریں کوئی نہ کوئی گاڑی خراب کھڑی ہوئی آپ کو ضرور مل جائے گی۔

ہے نا دل چسپ، میں خود کئی بار آزما چکا ہوں۔

کارساز روڈ سے وابستہ مشہور کہانی کچھ اور ہے۔ وہ کہانی کچھ یوں ہے کہ کسی مہینے کی مخصوص تاریخ کو پکارا صاحب کے مکان کے سامنے ایک جوان اور خوب صورت لڑکی گاڑی والوں سے لفٹ کا اشارہ کرتی ہے اور اگر کوئی اسے لفٹ دے دے تو کچھ دنوں کے بعد اس شخص کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

یہ بہت مشہور داستان تھی۔ اخبارات اور رسائل میں اس کے تذکرے ہوتے رہے۔ بے شمار منچلے نوجوان اپنی بائیک یا گاڑی لے کر کارساز روڈ پہنچ جاتے تھے۔

تو اس طرح کارساز روڈ بھی ایک دھند میں لپٹی ہوئی پُراسرار کہانی بن گئی ہے۔

پُراسرار زرد رنگ کی روشنی جو آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ وہ روشنی ایک ہالے کی طرح ایک عورت کو گھیرے رہتی ہے۔

اس عورت کے جسم پر ایک لمبا سا چوغہ یا لبادہ ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح چل رہی ہوتی ہے کہ جیسے فضا میں تیر رہی ہو۔

وہ کچھ دیر تک دکھائی دیتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔

اس عورت سے وابستہ کہانی کچھ یوں ہے کہ یہاں اس بلاک میں ایک عورت کا قتل ہو گیا تھا اور اس کی روح بھٹکتی نظر آتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جس کی موت غیر فطری ہو۔ اس کی روح اس طرح بھٹکتی رہتی ہے۔ غیر فطری موت کے سبب فضا میں ایک منفی سا ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ارتعاش

پی ای سی ایچ ایس

کراچی کا ایک مشہور رہائشی پوش علاقہ۔ اس علاقے میں طارق روڈ اور خالد بن ولید روڈ جیسی مشہور سڑکیں ہیں۔

اس علاقے کے بلاک 6 سے ایک پُراسرار کہانی وابستہ ہے۔

رات بارہ کے بعد اس بلاک کی کسی گلی میں جب ہر طرف سناٹا اور اندھیرا ہوتا ہے تو ایک روشنی دکھائی دیتی ہے۔

(ان دیکھی لہروں) میں مرنے والے کا عکس محفوظ ہو جاتا ہے اور وہی عکس چکرا تا رہتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

کچھ بھی ہو کراچی کے چند پُراسرار مقامات میں سے ایک علاقہ یہ بھی ہے۔ اس کا مشاہدہ بہت سے لوگ کر چکے ہیں اور ان کے پاس اس حوالے سے مختلف کہانیاں ہیں۔

بزنس ایونیو

شاہراہ فیصل کراچی کی مشہور ترین سڑک ہے۔ اسے

شاید کراچی کی طویل ترین سڑک ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

یہ سڑک ائرپورٹ سے سیدھی میٹروپول تک آیا کرتی ہے۔ اس کے دونوں جانب اونچی اونچی عمارتیں ہیں جو اس کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔

ان ہی عمارتوں میں سے ایک مشہور ترین کئی منزلہ خوب صورت عمارت بزنس ایونیو بھی ہے۔ اس میں بے شمار دفاتر ہیں۔

اور اس عمارت کی تیسری منزل ہانٹیڈ سمجھی جاتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفاتر میں رات گئے تک کام جاری رہتا ہے اور اس عمارت کی تیسری منزل کے دفاتر میں کام کرنے والوں کا بیان ہے کہ وہ جب لفٹ میں نیچے سے اوپر آتے ہیں تو تیسری منزل پر لفٹ بھی نہیں رکتی۔

اس کے علاوہ اس منزل پر رات بارہ بجے کے بعد کچھ ایسے لوگوں کی آمدورفت شروع ہو جاتی ہے جن کو اس عمارت میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

اور جب محافظوں سے پوچھا جاتا ہے تو وہ قسم کھا کر بتاتے ہیں کہ انہوں نے کسی کو نیچے سے اوپر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

تو پھر وہ کون لوگ ہوتے ہیں۔ لفٹ کیوں نہیں رکتی۔ روشنیاں کیوں نظر آتی ہیں؟

کراچی یونیورسٹی (فارمیسی ڈیپارٹمنٹ)

مادرِ علمی، پاکستان کا ایک مستند ادارہ۔ جہاں تعلیم اور تدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں علم کی مہک بھی ہے اور زندگی کی دمک بھی۔

جب لڑکے اور لڑکیاں اپنی اپنی کلاسز میں لیکچرز سنتے ہیں نوٹس بناتے ہیں لائبریری میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے ہیں۔ کینٹین اور اِدھر اُدھر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہیں تو یہ سب کتنا خوب صورت معلوم ہوتا ہے لیکن یہاں سب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔

یہاں کی فضاؤں میں سائے منڈلا رہے ہیں۔ خوف کے سائے، پُراسرار سائے، پُراسرار کہانیاں جو یہ احساس دلاتی ہیں کہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس سے بھی پرے کچھ اور ہے۔

یونیورسٹی کا فارمیسی ڈیپارٹمنٹ ایسے ہی ایک سائے کی گرفت میں ہے۔

وہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی ہے جس کے بال کھلے ہوئے ہیں جس کے ہاتھوں میں کتابیں ہیں اور جو

سفید لباس میں ملبوس اِدھر اُدھر دکھائی دیتی ہے۔

اس کا ظہور رات کے وقت ہوتا ہے۔

یونیورسٹی کے احاطے میں ایک بہت وسیع وعریض اسٹاف کالونی بھی ہے جس کا ایک راستہ فارمیسی کی طرف سے ہو کر جاتا ہے۔

کالونی میں رہنے والے لوگ اکثر رات کے وقت کسی تقریب وغیرہ سے شہر سے اپنی کالونی کی طرف جاتے ہیں تو انہیں وہ لڑکی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

شروع شروع میں کچھ لوگ گاڑی روک کر اس خیال سے اس کی طرف گئے کہ شاید اس لڑکی کو کسی مدد کی ضرورت ہے لیکن وہ ان تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو چکی تھی۔

پھر جب اس لڑکی کو کئی بار دیکھا گیا تو یہ کہانی عام ہو گئی۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور اس ڈیپارٹمنٹ سے اس کا کیا تعلق ہے۔

یہ تو ایک لڑکی ہے۔ اس طرح کی اور نہ جانے کتنی کہانیاں اس شہر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ عام طور پر اس قسم کی پُراسرار اور حیرت زدہ کہانیوں کے ساتھ لڑکیاں ہی وابستہ ہوتی ہیں اور ان سب کہانیوں میں ایک مشترکہ بات یہ ہوتی ہے کہ بہت خوب صورت، کھلے ہوئے بال اور سفید لباس۔

کیا سفید لباس میں ہی کوئی مری ہوتی ہے یا یہ محض اتفاق ہوتا ہے۔ آپ نے فلموں میں بھی دیکھا ہوگا اگر کسی روح کو دکھایا جاتا ہے تو وہ سفید لباس میں ہی نظر آتی ہے۔

ہاکس بے (جنات کا ہٹ)

ہاکس بے کراچی کا ایک ساحلی تفریحی مقام ہے۔

یہاں ویسے بھی سمندر کی ہوائیں جب سرسراتی ہیں اور لہروں کا دھیما دھیما شور سنائی دیتا ہے تو دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو جاتی ہے۔

یہاں ساحل کے ساتھ ساتھ بہت دور تک Huts بنے ہوئے ہیں۔ یہ ہٹس بہت سی کمپنیز کی ہیں۔ جن میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر اور ضرورت کی ہر چیز ہوتی ہے۔

یہ ہٹس ملازمین اور اسٹاف کے لیے ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی فیملیز کے ساتھ آتے ہیں اور ان میں قیام کرتے ہیں۔ ان میں باقاعدہ چوکیدار ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی پارٹی رات کے وقت بھی رک جاتی ہے۔ اس وقت کوئی ہٹ مکمل طور پر آباد ہو جاتا ہے۔

پکنک منانے والے عام طور پر شام ہوتے ہی واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس ساحل پر گہرے اندھیرے کا راج ہوتا ہے اور سمندر کی آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس وقت سمندر کو دیکھ کر خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ دور تک تنی ہوئی گہری سیاہ چادر کی طرح۔ کبھی کبھی دور بہت دور کچھ روشنیاں جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ روشنیاں بحری جہازوں کی ہوتی ہیں جو اپنی منزلوں کی طرف رواں ہوتے ہیں۔

رات کے وقت ہٹس ویران ہو جاتے ہیں۔ چوکیدار بھی کہیں جا کر سو جاتے ہیں۔ صرف کتوں کے بھونکنے اور سمندر کی لہروں کی آوازوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ ایک خاندان کا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے پہلے اور لوگوں کو اس قسم کا تجربہ ہو چکا ہو لیکن یا تو انہوں نے اظہار نہیں کیا یا پھر ان کی کہانی عام نہیں ہو سکی۔

یہ خاندان ایک خوب صورت ہٹ میں رات کو رک گیا تھا۔ سات آٹھ آدمی تھے۔ لڑکے، لڑکیاں، مرد، عورتیں، ایک ہی فیملی کے افراد۔ وہ رات ہاکس بے ہی پر گزارنے کے ارادے سے آئے تھے۔

رات نو دس بجے کھانا کھا کر وہ ہٹ سے باہر آ گئے۔ دور سمندر کی کالی چادر تنی ہوئی تھی۔ لہروں کا شور تھا اور کچھ بھی نہیں۔

اچانک انہیں کچھ فاصلے پر ایک ہٹ میں روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ بہت سی روشنیاں۔ ایسی جیسے شادی وغیرہ کے موقعوں پر سجاوٹ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

ان روشنیوں میں انہیں بہت سے لوگ بھی دکھائی

دیے۔ ہٹ سے باہر آتے ہوئے اور جاتے ہوئے۔ ان میں مرد، عورتیں اور بچے بھی تھے۔

''بھائی ایسا لگتا ہے جیسے کوئی تقریب ہو رہی ہو۔'' ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''اس ویرانے میں کون تقریب کرے گا۔''

''کیوں نہیں، ایک سے ایک شوقین مزاج لوگ ہوتے ہیں۔ کسی کو یہاں بھی تقریب کرنے کا آئیڈیا آگیا ہوگا۔''

''یار کیوں نہ چل کر دیکھیں۔''

''بن بلائے مہمان۔''

''تو کیا ہوا کہہ دیں گے روشنی دیکھ کر آگئے۔''

دونوں اس ہٹ کی طرف چل دیے۔ انہوں نے ہٹ میں موجود دوسروں کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

دونوں جب ہٹ کے پاس پہنچے تو دور ہی سے دکھائی دے گیا کہ کئی جگہ بڑے بڑے چولہے روشن ہیں اور دیگیں چڑھی ہوئی ہیں اور بہت سے لوگ کھانا بنانے میں مصروف ہیں۔

اب ان کا شبہ یقین میں تبدیل ہوگیا کہ یہاں کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ ایک خاص بات انہوں نے یہ نوٹ کی کہ جو لوگ دکھائی دے رہے تھے وہ بہت طویل قامت تھے۔ سب کے سب اونچے اونچے۔ اس وقت بھی انہیں کوئی خاص شبہ نہیں ہوا اور وہ آگے بڑھتے رہے۔

پھر انہوں نے کچھ بچوں کو دیکھا۔ وہ بچے بھی عام بچوں کے قد سے بڑے تھے۔ طویل قامت اب جا کر انہیں کچھ خوف محسوس ہونے لگا۔

وہ واپس ہونا چاہتے تھے کہ اچانک ایک آدمی ان کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی طویل قامت تھا اور اس کی آنکھیں جیسے شعلے برسا رہی تھیں۔

''کیوں آئے ہو یہاں؟'' وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''بھاگو یہاں سے، بھاگ جاؤ...... جاؤ۔''

اور وہ دونوں گرتے پڑتے واپس آگئے۔ بے پناہ خوف نے ان کی زبان بند کر دی تھی۔ جب کچھ حالت سنبھلی تو انہوں نے دوسروں کو یہ واقعہ بتا دیا۔

صبح ہٹ کا چوکیدار بھی آگیا تھا۔ اس نے یہ واقعہ سن کر بتایا۔ ''صاحب جی ہم لوگ تو روز رات کو یہی تماشا دیکھتے ہیں۔''

''آخر کون لوگ ہیں وہ۔''

''جن لوگ ہیں صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''اس ہٹ میں ان کی شادیاں ہوتی ہیں۔ آپ اس وقت جا کر دیکھیں آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔''

ان میں سے کچھ لوگ اور وہ دونوں ہمت کر کے اس ہٹ کی طرف چل پڑے۔ واقعی وہاں کچھ نہیں تھا۔ کوئی آثار بھی نہیں۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہاں رات کے وقت کوئی تقریب ہوئی تھی۔

انہوں نے اپنی آنکھوں سے بڑی بڑی دیگوں میں کھانے بنتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اب کچھ بھی نہیں۔ نہ کوئی چولہا نہ کسی قسم کا نشان سب غائب ہو چکا تھا۔ صرف ساحل کی خاموشی تھی۔

اس ہٹ میں آج بھی ہر رات تقریبات ہوا کرتی ہیں اور کسی میں اس کی طرف جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

صدر کی عمارت

صدر کراچی کا مشہور ترین علاقہ۔

یہ علاقہ واقعی پورے شہر کا صدر (قلب) ہے۔ یہاں شہر بھر کی بسوں، ویگنوں وغیرہ کا سنگم ہوا کرتا ہے۔

تقریباً ہر شخص کا صدر کی طرف ضرور آنا ہوتا ہے۔

یہاں ایمپریس مارکیٹ ہے، زیب النساء اسٹریٹ ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔

آپ صدر کے کسی فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جائیں۔ آپ کو پاکستان میں بسنے والے ہر نسل اور زبان کے لوگ مل جائیں گے۔

ان کے علاوہ مسلمان، عیسائی، پارسی، ہندو سب آپ کو صدر ہی میں دکھائی دیں گے۔

یہ چونکہ بہت پرانا علاقہ ہے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے دور کی بے شمار عمارتیں آپ کو صدر میں مل جائیں گی۔

اس علاقے میں ایک فریسکو چوک ہے۔ اس چوک کے پاس ایک بہت قدیم عمارت ہے۔ بالکل اجاڑ۔ نہ جانے کب سے ویران پڑی ہوئی ہے۔

اس عمارت کے احاطے میں قدآور جھاڑیاں ہیں۔ دروازوں کے ساتھ اونچے اونچے پودے ہیں۔ گھاس پھوس ہے، کئی دیواریں اور چھتیں ایک طرف گری ہوئی ہیں۔ یہ عمارت دیکھنے ہی سے آسیب زدہ معلوم ہوتا ہے۔

اس عمارت کے بارے میں آس پاس والوں کا یہ کہنا ہے کہ رات ہوتے ہی یہاں سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔

عورتوں کی چیخیں، مردوں کے قہقہے، زور زور سے جھگڑا کرنے کی آوازیں۔ پرانے انگریزی گانے۔ کبھی کبھی ڈرم کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ جیسے اس عمارت میں کوئی پارٹی ہو رہی ہو پھر وقت کے کسی حادثے نے ایک آن میں سب کچھ تھما کر رکھ دیا ہو۔

اب صرف آوازیں رہ گئی ہیں اور سائے رہ گئے ہیں۔ رات گئے جاننے والے اس عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی گھبرایا کرتے ہیں۔

عزیز آباد (اسکول)

عزیز آباد (بھنگوریہ گوٹھ) میں ایک اسکول ہے۔

یہ سرکاری اسکول ہے۔ یہاں متوسط اور غریب طبقوں کے بچے تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے ہیں۔ یہ اسکول بھی پُر اسرار اور ان جانے سایوں کی زد میں رہتا ہے۔

کچھ ایسے بچے بھی کلاس روم میں دیکھے جاتے ہیں جو اس سے پہلے اس اسکول میں نظر ہی نہیں آئے اور پھر دوبارہ نظر بھی نہیں آتے۔

اس کے علاوہ جس طرف لیٹرین بنائی گئی ہے اس طرف بھی انجانی شکلیں اور قدآور لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ پھر غائب ہو جاتے ہیں۔

ان واقعات کی وجہ سے اس اسکول کے بچے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔

یہ سب کچھ صرف کراچی میں نہیں، بلکہ پاکستان کے دوسرے بڑے شہر لاہور میں بھی ہے۔

لکشمی چوک

یہ لاہور کا بہت مشہور علاقہ ہے۔

کسی زمانے میں یہ فلمی دفاتر کا مرکز تھا۔ ہر وقت اس علاقے میں فلمی ستارے آتے جاتے ہوئے دکھائی دیتے

تھے۔
کنگ سرکل نام کا ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ یہ ہوٹل فلم والوں کی بیٹھک تھی۔ پروڈیوسر، ڈائریکٹر، سنگر، موسیقار، غرض یہ کہ ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص اس ہوٹل میں ضرور نظر آجاتا تھا۔
اب فلمی صنعت کے زوال کے بعد لکشمی چوک کی پہلی سی رونقیں ختم ہو چکی ہیں لیکن یہ علاقہ اب بھی اپنی کمرشل ویلیو رکھتا ہے۔
اس علاقے میں نسبت روڈ اور ایبٹ روڈ کے سنگم پر ایک دومنزلہ پرانی عمارت ہے، جواب کھنڈر ہو چکی ہے۔
اس عمارت کو بھی آسیب زدہ کہا جاتا ہے۔ ایسی عمارتیں اپنا ایک خاص تاثر رکھتی ہیں۔ ان کی طرف دیکھنے سے ایک بے نام سی اداسی اور بے چینی کے ساتھ ساتھ خوف کا ایک ہلکا سا احساس ہوتا ہے۔ چاہے آپ اس عمارت کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں لیکن آپ کی چھٹی حس آپ کو بتادیتی ہے کہ یہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔
اس عمارت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔
آپ اس کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ جس مقام کے سامنے سے گزر رہے ہیں وہاں پُراسرار سایوں کی حکومت ہے۔

لاہور (ڈی ایچ اے بلاک 2)

یہاں بھی فیز 3 کے ایک مکان کے بارے میں کئی کہانیاں ہیں اور ان کہانیوں کا محور ایک ہی ہے کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ یہاں سے گزرنے والوں کو ہوشیار رہنا چاہیے۔
ہوسکتا ہے کہ ان سب کہانیوں میں وہم کا بھی شائبہ ہو لیکن ایسی کہانیاں جب عام ہو جائیں تو اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔
(ہمارے یہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کسی مکان یا پراپرٹی کی قیمت گرانی ہوتی ہے تو اس کو آسیب زدہ مشہور کردیا جائے۔ پھر وہ جگہ خود ہی کم قیمت کی ہوجاتی ہے یہ بھی ایک پہلو ہے)۔
لاہور کے اس علاقے کے ٹی بلاک میں ایک اور مکان ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسی کہانیاں لگی ہوئی ہیں۔
اس مکان کی چھت پر رات کے وقت سفید لباس میں ایک لڑکی پریشانی سے بھٹکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جب کہ اس مکان میں کوئی نہیں رہتا۔
یہاں ایک بار پھر سفید لباس ہمارے سامنے آیا ہے سیکٹر W کے ایک مکان کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔
اور اس کی انتہا یہ تھی کہ گھر والے اس گھر کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور اب اس مکان پر مکمل طور پر ان ہی سایوں کا قبضہ ہے۔
اس لیے ہمارے بزرگ یہ کہا کرتے تھے کہ مکان کو خالی نہیں رکھنا چاہیے۔ ''خانہ خالی را دیوی گیرو۔''
99ء کے ورلڈ کپ کے موقع پر لاہور کے علاقے گلبرگ میں ایک پُراسرار سفید پوش دیکھا جاتا تھا جو قریب جانے پر غائب ہو جاتا۔
اس سفید پوش کی بھی بہت دہشت رہی ہے۔
غرض یہ کہ صرف کراچی اور لاہور ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان میں اس قسم کے مقامات موجود ہیں جن کے حوالے سے طرح طرح کی کہانیاں ہیں۔
اور اب کچھ دیگر ممالک کے عجیب وغریب مقامات کا ذکر ہو جائے کیونکہ یہ دنیا بہت عجیب دنیا ہے۔
حیرت انگیز حیران کردینے والے واقعات اور مقامات سے یہ دنیا بھری ہوئی ہے۔ کہیں ویرانوں میں بنے ہوئے خالی مکان ہیں اور کہیں کنارے پر کھڑا ہوا صدیوں پرانا کوئی جہاز۔ کہیں ایسے مقامات ہیں جنہیں وقت نے گرد آلود کردیا اور کہیں ایسے مقامات بھی ہیں جنہیں خود انسان نے دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل کردیا ہے۔
بدلتے ہوئے سناٹے، کہانیاں سناتے ہوئے درو دیوار۔ یہ سب دنیا کے بھید میں اضافہ کرتے جاتے ہیں اور ہمیں اپنی بے چارگی اور انسانی بے بسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔
ایسے بھی مقامات ہیں جو چشم عبرت کے لیے سامانِ عبرت ہیں۔ بڑے بڑے محل، قلعے۔ یہ سب ویران ہو چکے ہیں اور وہ سمجھنے والوں کو بتاتے ہیں کہ زندگی بہت پُراسرار اور ناپائیدار ہے۔ جہاں کل تک بہت کچھ ہوتا ہوگا چہل پہل ہوگی، لوگوں کی اپنی مصروفیات ہوں گی۔ وہاں آج صرف سناٹے ہیں۔
یا ان سناٹوں سے وابستہ آسیبی کہانیاں، خوف ناک

اور ڈراؤنے قصے۔

آئیں ہم آپ کو مزید ایسے مقامات کے بارے میں بتاتے ہیں جہاں آج صرف سناٹے بولتے ہیں۔ جھینگروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور ویرانی پسند پرندوں نے بسیرا کر رکھا ہے۔

یہ شکاگو کا لاؤنڈیل تھیٹر ہے

کیا زبردست عمارت ہے۔ درمیان میں بہت بڑا اسٹیج ہے۔ چاروں طرف تماشائیوں کی نشستیں، تھیٹر کے
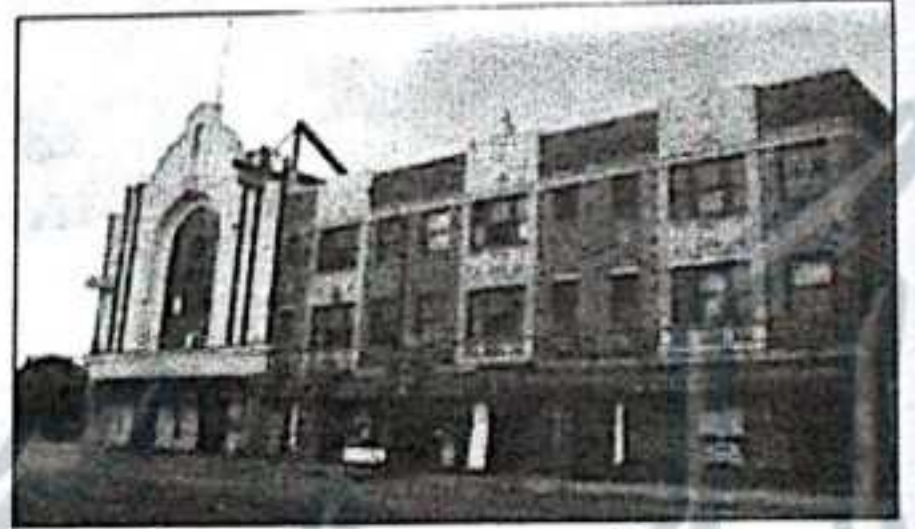
اسٹائل، اونچی اونچی دیواریں، لائٹنگ کا انتظام۔ کبھی یہاں مشہور زمانہ کھیل کھیلے جاتے دیکھنے والوں کی بھیڑ رہتی تھی۔

لیکن اب خاموشی ہے۔ ازلی اور ابدی خاموشی۔ تھیٹر ویران ہو چکا ہے۔ صرف اس کی دیواریں اور چھت باقی ہے۔

اس کے اطراف جھاڑ جھنکار اگ آئے ہیں۔ اب اس کی طرف جاتے ہوئے ہول ہوتا ہے۔ اس کے درودیوار یہ بتا رہے ہیں کہ یہ دنیا کتنی بے ثبات اور کتنی عارضی ہے۔

یوکرائن کی محبت بھری سرنگ

دور تک پھیلی ہوئی سرنگ۔ اتنی سرسبز جیسے سبزے کو کاٹ کر سرنگ بنائی گئی ہو۔ ایک زمانہ تھا کہ محبت بھرے جوڑے اس راستے پر سفر کیا کرتے۔ ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی جاتیں۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ یہ سرنگ ویران ہوتی چلی گئی۔

اب اس طرف کوئی نہیں جاتا۔ اس کے سرسبز و شاداب راستے کسی کی آہٹ کے منتظر رہتے ہیں کہ شاید پھر کوئی اس طرف آنکلے۔

لیکن کوئی نہیں جاتا۔ سیاح بھی اس کی ویرانی دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور اس میں جانے کی ہمت نہیں کرتے۔

آپ اس سرنگ سے گزریں تو دل پر ایک عجیب سی وحشت ہونے لگتی ہے۔

سرجیو بوسنیا میں اولمپک ویلج کا ایک حصہ

آپ نے اگر میدان میں نہ سہی ٹی وی پر تو اولمپک گیمز دیکھے ہوں گے جن علاقوں میں یہ گیمز ہوتے ہیں وہاں زندگی چاروں طرف سے سمٹ کر آجاتی ہے۔

پوری دنیا کے لوگ، لڑکے، لڑکیاں، مرد خواتین، سیاح، صحافی اور نہ جانے کون کون۔ ان کے علاوہ کھیلوں میں حصہ لینے والے۔

وہ علاقہ دنیا بھر کی رعنائیاں سمیٹ لیتا ہے اور گیمز ختم ہوتے ہی مکمل ترین ویرانے اور سناٹے کا راج ہو جاتا ہے۔

یہ کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے ٹرین گزر جانے کے بعد کسی پلیٹ فارم کی۔ کتنی ویرانی، کتنا سناٹا اور کتنی اداسی۔

سرجیو کے اولمپک ویلج کا یہ حصہ بھی ایسا ہی ہے۔ یہ وہ ٹنل ہے جس میں تیز دھار پانی گزارتے تھے اور کھلاڑی اس ٹنل سے پوری رفتار کے ساتھ گزرتے تھے جب کہ اس کے دونوں طرف کھیل دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی۔

لیکن اب یہ حصہ مکمل ویران ہے۔ اس ٹنل پر اور اس
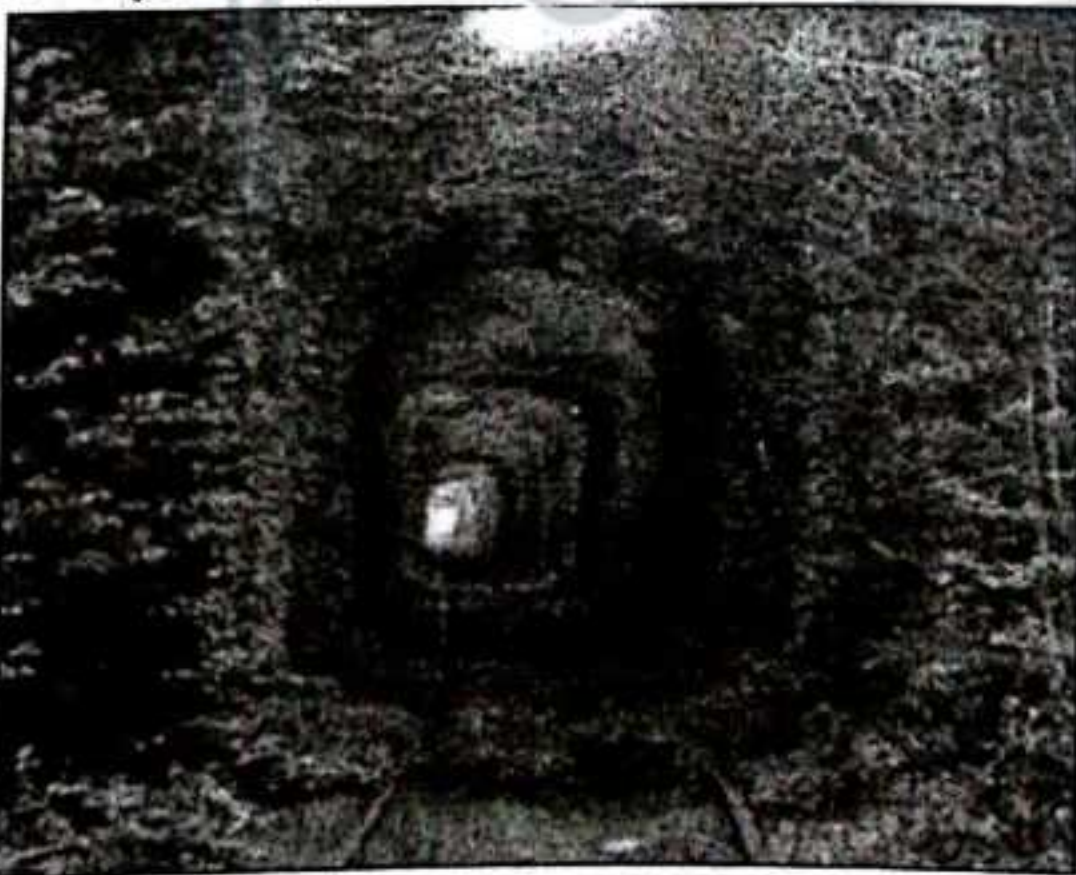
کے اطراف میں پودے اور جھاڑیاں ہیں اور گونجتا ہوا سناٹا ہے۔

روس کی قدیم راکٹ ساز فیکٹری

ایک زمانہ تھا کہ جب یہاں راکٹ سازی ہوا کرتی تھی۔ سائنس داں، انجینئر اور ہنر منداپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے۔ ہر طرف ایک چیخ و پکار سی مچی رہتی۔

لیکن یہ پرانی باتیں ہیں۔ اب وہ فیکٹری ویران ہو چکی ہے۔ اس کے درودیوار پر بقول غالب سبزہ اگ آیا ہے۔

اب وہاں کوئی آواز نہیں ہے۔ کوئی شور نہیں ہے۔ سیاحوں کو بھی اس طرف نہیں جانے دیا جاتا (اور ویسے بھی آہنی پردے کے پیچھے کی دنیا میں سیاحت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے)۔

اٹلی کی فیکٹری

اٹلی ایک قدیم ترین ملک ہے۔ اس کی شناخت صدیوں پرانی ہے۔ دنیا بھر سے لاکھوں افراد اٹلی کی قدیم عمارتیں اور سڑکیں وغیرہ دیکھنے کے لیے جایا کرتے ہیں۔

اس حوالے کو دینے کی وجہ یہ بتانا ہے کہ اٹلی میں اگر کوئی عمارت قدیم ہو جائے تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر تصویریں کھنچوائی جاتی ہیں لیکن یہ مرتبہ اس بدقسمت فیکٹری کو نہیں حاصل ہو سکا جو 1866ء میں قائم ہوئی تھی۔

یہ اجاڑ فیکٹری اٹلی کے علاقے سوونیٹو میں ہے۔ اس کی دیواریں گر چکی ہیں اور گری ہوئی دیواروں پر بھی چھوٹے چھوٹے پودے اگ آئے ہیں۔

اس فیکٹری کی چھتیں تک اجاڑ جنگل کا منظر پیش کرنے لگی ہیں اب اس کی طرف کوئی نہیں جاتا۔ اس کے درودیوار اپنی زبان خاموشی سے لوگوں کو اپنی طرف بلاتے بلاتے تھک چکے ہیں۔

کراکو اٹلی کا ایک تباہ قلعہ

اٹلی کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے کہ اس ملک میں قدیم آثار کی حفاظت کی جاتی ہے۔ ایک ایک اینٹ کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں کیونکہ یہ سب اس ملک کا سرمایہ ہیں۔ اثاثہ ہے۔

اٹلی کی معاشی زندگی کا ایک اہم جز اس ملک میں ہونے والی سیاحت ہے۔ پوری دنیا کے لوگ آیا

کرتے ہیں لیکن اس ملک کا یہ قدیم قلعہ بالکل ویران ہو چکا ہے۔ کراکو میں بنا ہوا یہ ایک عظیم قلعہ ہے۔ قدیم طرز تعمیر کا یہ شاہکار کسی زمانے میں کتنا آباد ہوگا اس کی داستان اس کے عظیم الشان درو دیوار اور اس کی اونچی فصلیں سنا رہی ہیں۔

جس زمانے میں یہ قلعہ بنایا گیا ہوگا اس زمانے میں یہ اپنے بنانے والوں کی شان و شوکت کا سفیر ہوگا لیکن اب عبرت کا مظہر ہے۔

ساحل کے گنبد

یہ گنبد مغربی فلوریڈا کے ساحل پر بنے ہوئے ہیں اور دیکھنے میں آسیب زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان گنبدوں سے سمندر کی لہریں آ کر ٹکراتی ہیں اور واپس ہو جاتی ہیں۔

ان کی دیواریں کائی زدہ ہیں۔ ان گنبدوں کو موسم کے تغیرات کی جانچ کے لیے تعمیر کیا گیا تھا لیکن اب وہ

استعمال میں نہیں آتے۔ اس لیے ویران ہو گئے ہیں۔

ساحل کے کیبن

یہ کیبن انگلینڈ کے ایک ساحل پر بنائے گئے ہیں۔ ان کا مقصد سمندر کی نگرانی کرنا تھا۔ ان میں بیٹھے ہوئے نگران سمندر کے مزاج کی کیفیت کا جائزہ لیا کرتے اور مناسب ہدایات جاری کرتے۔

یہ کیبن تعداد میں دس بارہ ہیں اور اب بالکل ویران ہیں۔ ایک عرصہ ہوا کوئی ان کی طرف گیا بھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سمندر کی طرف بھٹکتی ہوئی آوارہ روحوں نے ان کیبنز کو اپنا مسکن بنا رکھا ہو۔ کم از کم انسان تو اس طرف نہیں جاتے۔

بلغاریہ کا کمیونسٹ پارٹی ہال

کیا شان تھی اس عمارت کی۔ کیا رعب دبدبہ تھا۔ یہ وہ عمارت تھی جس میں فیصلے ہوا کرتے۔ پالیسیاں بنائی جاتیں اور قسمتوں پر مہریں بھی لگ جاتیں۔

کیسے کیسے سرکشیدہ لوگ اس عمارت میں آیا کرتے ہوں گے لیکن اب یہ اجڑ چکا ہے۔ ویران، کسی صحرا کی طرح۔ فریاد کرتا ہوا کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ اس عمارت کے اندر جا کر دیکھ لے۔ جب اس عمارت کے معاملات اپنے عروج پر تھے تو اس وقت کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی اور اب ویسے ہی کوئی نہیں جاتا۔

فرانس کی فیکٹری

آپ ذرا اپنے چشم تصور میں ایک صدی پیچھے چلے جائیں۔ کیا معاشرہ ہوگا۔ خاص طور پر یورپ کا معاشرہ اس کی جھلکیاں آپ کو ان فلموں میں مل جائیں گی جن میں دو تین سو سال پرانا زمانہ دکھایا گیا ہوگا۔

ہاتھوں میں باسکٹ لیے گھاگھرے میں ملبوس جوان اور خوب صورت لڑکیاں جو اس فیکٹری میں مختلف بیجوں سے تیل نکلوانے آتی ہوں گی۔ ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہوں گی لیکن اب فیکٹری کی ویران عمارت رہ گئی ہے۔

اس کے احاطے میں اونچی اونچی جھاڑیاں اگ آئی ہیں۔ ایک طرف ایک کنواں ہے جس پر پانی نکالنے کی چرخیاں لگی ہوئی ہیں لیکن اب وہ کنواں بھی پودوں سے بھر چکا ہے۔

اس فیکٹری کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ شاید ان گم شدہ لڑکیوں کے قہقہے اب تک اس کی فضاؤں میں گونج رہے ہوں گے اور ان کے لباسوں کی سرسراہٹیں سنائی دے رہی ہوں گی۔

صحرائے Namib کا مکان

خدا جانے کس نے اس صحرا میں مکان بنایا تھا۔

دور دور تک یہاں سوائے ریت کے اور کچھ نہیں ہے۔ دور دور تک کوئی نخلستان بھی نہیں ہے اور صحرا کے درمیان جدید طرز کا یہ مکان بنا ہوا ہے۔

اس میں کئی کمرے ہیں۔ برآمدہ ہے۔ کچن ہے۔ سب کچھ ہے اور ہر کمرے میں ریت ہی ریت ہے کم از کم انسانی کمر تک ریت ہی ریت۔

خدا جانے اس مکان میں رہنے والے مکین کون تھے اور وہ اس مکان کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

اس مکان کے چاروں طرف صحرا کی تیز ہوائیں بھٹکتی رہتی ہیں اور ریت کے ٹوکرے بھر بھر کے اس مکان میں پھیلاتی رہتی ہیں جس کے سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں جس کی کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں۔

کوئی اس طرف نہیں جاتا۔ اس مکان سے زندگی روٹھ گئی ہے۔ صرف وحشت ہے اور گہرے سناٹے کی حکمرانی ہے۔

بوڈیم کا قلعہ

انگلینڈ میں واقع یہ قلعہ دیکھنے والوں کو بھوت کی داستان سنایا کرتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اس قلعے میں جنگجوؤں کی تلواروں کی جھنکاریں گونجا کرتیں۔ گھوڑے ہنہنایا کرتے لیکن اب ایک تصویرِ عبرت ہے۔

قلعہ سائیں سائیں کرتا ہے۔ ہر طرف پیڑ ہی پیڑ ہیں۔ جنگلی جھاڑیاں ہیں جن میں جانوروں اور پرندوں نے بسیرا کر رکھا ہے۔

اس طرف کوئی جانا بھی پسند نہیں کرتا اور اگر کوئی بھولے سے چلا جائے تو خو بھی اس ویرانے کا حصہ بن جاتا ہے۔ آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول۔ عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو۔

مچھیرے کا کیبن

آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے کوئی خوب صورت پینٹنگ آپ کے سامنے آگئی ہو۔ دونوں طرف سرسبز پہاڑیاں، درمیان میں ایک خوب صورت نیلے پانی والی جھیل اور اس جھیل کنارے بنا ہوا لکڑی کا ایک کیبن۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ نے پریوں کی داستان کے کسی ایسے کردار کے بارے میں جان لیا ہو جو اس کیبن میں رہتا ہے۔

لیکن وہ کیبن بھی ویران ہے۔ نہ جانے کب سے۔ اس پورے علاقے کی بے پناہ اور دل ہلا دینے والی خاموشی کے درمیان یہ کیبن دل کو ایک اداس سی گرفت میں لے لیتا ہے۔

کمبوڈیا کا مندر

آپ نے ایسے مندر ایڈونچر فلموں میں دیکھے ہوں گے۔

چاروں طرف میلوں میل تک پھیلا ہوا مہیب جنگل۔

ایک دوسرے سے الجھے ہوئے درخت، جن پر اچھلتے ہوئے بندر۔ دوسرے چھپے ہوئے جانوروں کی آوازیں۔

اور جب ان کے درمیان سے گزر کر آپ ایک صاف ہموار سی جگہ پہنچتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ سامنے ایک قدیم مندر کے آثار ہیں۔

بالکل ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا آپ نے خزانے کی تلاش وغیرہ جیسی فلموں میں دیکھا ہوگا۔ مندر کے ستون، ایک طرف ایک بڑے بت کا مجسمہ، دیواروں سے جنگلی بیلیں لپٹی ہوئیں۔ بے شمار چمگادڑیں۔ ہر طرف ایک خوف کا ماحول اور خاموشی کو توڑتی ہوئی بندروں کی آوازیں۔ اس طرف کوئی نہیں آتا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ لوکیشن فلموں میں استعمال ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ اس اجاڑ مندر کا اور کوئی استعمال نہیں ہے۔

مغربی ویلز کا ہال۔

مغربی ویلز میں ایک ہال ہے۔

انتہائی شاندار اور بہت خوب صورت اور بہت بڑے رقبے پر بنا ہوا کسی زمانے میں اس ہال میں رونقیں ہوا کرتیں۔ طرح طرح کے لوگ دیکھنے آتے لیکن اب ویران ہے۔ کوئی اس طرف دھیان نہیں دیتا اور اس پر وقت کی گرد جمتی چلی جارہی ہے۔

یہ تو وہ چند مقامات تھے جو افتادِ زمانہ کے ہاتھوں ویران ہو گئے لیکن اس دنیا میں کچھ ایسے بھی پُراسرار مقامات ہیں جنہیں خود انسانی ہاتھوں نے یا تو ویران کردیا ہے یا انہیں ممنوعہ قرار دے دیا گیا ہے۔

ہم ایسے چند مقامات کا ذکر کررہے ہیں جو بلاشبہ بہت خوب صورت ہیں لوگ اسے دیکھنے کے لیے جانا بھی چاہتے ہیں لیکن جا نہیں سکتے۔

حکومتوں کی طرف سے وہ علاقے ممنوعہ قرار دیے جاسکتے ہیں اس کی کوئی بھی وجہ ہوسکتی ہے۔ حکومتوں کی خفیہ سرگرمیاں یا کسی قسم کی احتیاطی تدابیر۔

بہرحال جو بھی ہو اگر کوئی اس طرف جانے میں کامیاب ہوا ہے تو وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے ایک بار دیکھا

ہے۔دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔
آئیں آپ کو بھی ایسے چند مقامات کی سیر کرواتے ہیں۔

جزیرہ انڈیان

یہ ہندوستان کا ایک دل کش اور خوب صورت ترین جزیرہ ہے۔اس جزیرے میں اونچے اونچے ناریل کے

درخت، ہر طرف سبزہ، درمیان میں نیلے پانیوں جیسی ایک جھیل۔لیکن بدقسمتی سے اس جزیرے کی خوب صورتی صرف داستانوں اور کہانیوں میں رہ گئی ہے۔

کیونکہ اس کی طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔کم از کم باہر کی دنیا کا کوئی فرد وہاں نہیں جاسکتا۔البتہ جزیرے کے مقامی لوگ ہیں وہی اس جزیرے کی خوب صورتی کے بارے میں بتاتے ہیں۔

ایسی پابندی سے پہلے کچھ غیر ملکی سفیر اس جزیرے کی تفریح کے لیے گئے تھے۔رات میں انہوں نے وہاں کے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا تو کچھ مقامی لوگوں نے ان پر حملہ کردیا۔

ان مقامی لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ان کا یہ خوب صورت علاقہ پوتر یعنی مقدس ہے اور وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ باہر کے لوگ ان کے جزیرے پر آکر اس کو ناپاک کردیں۔

اس حادثے کے بعد ہندوستان کی حکومت نے سیاحوں کے لیے اس جزیرے پر جانے کی پابندی لگادی۔ اب وہاں سوائے مقامی کے اور کوئی نہیں جاسکتا۔

لیس کاوس (فرانس)

یہ غار ہیں۔فرانس کے ان غاروں کی دلکشی قابلِ دید ہے۔بیس ہزار سال پہلے کسی تہذیب نے ان غاروں کی دیواروں پر تصاویر بنائی تھیں اور نقاشی کی تھی۔

ان غاروں کی مثال ہندوستان کے اجنتا اور ایلورا کے غاروں سے دی جاسکتی ہیں لیکن ہندوستان کے غار تو سیاحوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں جس کی مرضی آئے وہاں جا سکتا ہے۔تصاویر لے سکتا ہے لیکن فرانس کے ان غاروں کو سیاحوں کے لیے بند کردیا گیا ہے۔ اس طرف کوئی نہیں جاسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ بہت پہلے ان غاروں میں ایک غیر معمولی واقعہ یا حادثہ پیش آگیا تھا اس کے بعد حکومت نے اس پر پابندی لگادی۔

اس جزیرے سے منسلک جزائر کا ایک سلسلہ ہے جو نیکو بار کہلاتا ہے۔

عبادت گاہیں

جاپان کی آنش گرانڈ عبادت گاہیں۔ یہ عبادت گاہیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور پورے جاپان میں پھیلی ہوئی ہیں۔

ان عبادت گاہوں کو 45 BC میں تعمیر کیا گیا تھا۔ شنٹو عقیدے کی یہ عبادت گاہیں عام آدمیوں کے لیے نہیں ہیں۔ قدیم ترین رسم ورواج کے مطابق ان عبادت گاہوں میں یا تو راہب اور راہبائیں جاسکتی ہیں یا پھر وہ افراد جن کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے۔

دراصل یہ عبادت گاہیں صرف شاہی خاندان کے افراد کے لیے مخصوص ہیں اس لیے عام آدمی کا گزران کی طرف نہیں ہوتا۔

یہ عبادت گاہیں جاپانی طرز تعمیر کا شاہکار ہوا کرتی ہیں۔ ان کے آس پاس بھی کسی کو پھٹکنے کی اجازت نہیں ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر بیس سال بعد ان عبادت گاہوں کو توڑ کر دوبارہ بالکل ویسا ہی بنا دیا جاتا ہے۔ یہ شنٹو مذہب کے فلسفے کے مطابق ہے۔

یعنی جنم، موت، پھر جنم۔ یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ کم از کم معلوم تاریخ کی حد تک تو چل ہی رہا ہے۔

کلب 33

جی نہیں۔ ڈزنی لینڈ کا یہ کلب ہرگز ممنوعہ نہیں ہے۔ آپ بھی جب چاہیں وہاں جاسکتے ہیں۔ انجوائے کرسکتے ہیں وہاں ڈنر کرسکتے ہیں۔

اس کے باوجود وہ کلب عام آدمیوں کے لیے ہرگز نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں داخلے کی فیس ہی دس ہزار ڈالر ہے۔

آپ خود اندازہ کرلیں کہ دس ہزار ڈالر کتنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کلب تک عام انسان کی رسائی ہی نہیں ہے۔

نہ جانے کتنے امریکن بھی ایسے ہوں گے جنہوں نے اس کلب کی کہانیاں سن رکھی ہوں گی لیکن انہیں اندر جانے کی نہ تو ہمت ہوئی ہوگی اور نہ ہی اجازت ملی ہوگی۔ اس لیے وہ علاقہ بھی ممنوعہ ہے۔

ماسکو کی زیر زمین میٹرو بس کا راستہ۔

بہت طویل راستہ ہے اور سنا ہے کہ بہت شاندار طور پر بنایا بھی گیا ہے لیکن کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ یہ ہے نا دلچسپ بات۔

اس راستے کی پلاننگ اسٹالن کے دور میں روس کی خفیہ ایجنسی کے جی بی نے کی تھی۔

مقاماتِ خوف

ابنِ کبیر

اس جہانِ رنگ و بو میں ایسے لاتعداد جگہیں ہیں جہاں خوف کا بسیرا ہے۔ لوگ وہاں جانے سے کتراتے ہیں، گھبراتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہاں نادیدہ مخلوق آباد ہے۔ ایسے ہی چند اہم اور معروف مقامات کا تذکرہ۔

ان جگہوں کا ذکر خاص جہاں آسیب کا ڈیرا ہے

لفظ کُن سے وجود میں آنے والی یہ کرۂ ارض اپنے سینے میں لاتعداد اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ اس کا ہر گوشہ خود میں پُراسراریت بھرا ہے۔ ایسے ایسے مقامات ہیں جن کا اسرار صدیوں بعد بھی کھل نہیں سکا ہے۔ ایسے ہی چند مشہور مقامات کا تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔

ڈھانچوں کی جھیل، ہندوستان

1942ء کا موسم سرما اتنا شدید تھا کہ ضلع چمولی کے باسیوں کے ذہن سے سورج کی حدت کا تصور زائل ہوگیا۔

یہ ضلع بھارتی ریاست اترکھنڈ کا حصہ ہے جس کی شمالی سرحد تبت سے جڑتی ہے۔ اُس برس سردیاں تیز ہوائیں ساتھ لائیں، جن کے تھمتے ہی اتنا پالا پڑا کہ معمولاتِ زندگی درہم برہم ہوگئے۔ لوگ گھروں تک محدود ہوگئے تھے۔ پہلے بارشیں ہوئیں۔ پھر برف گرنے لگیں۔ تمام راستے مسدود ہوگئے اور چھتیں برف سے ڈھک گئیں۔ دور سے دیکھنے پر یہ علاقہ سفید قبرستان معلوم ہوتا۔

اور ایک صبح جب روپ کنڈ کے باسی اس خوف کے ساتھ بیدار ہوئے کہ آج پھر انھیں ایک سرد اور سخت دن سے نبرد آزما ہونا پڑے گا تو حیران رہ گئے۔ آسمان میں سورج چمک رہا تھا۔ سردی چپکے سے جا چکی تھی۔

گرمیوں کی آمد شروع شروع میں تو کسی تہوار کے مانند تھی، مگر جلد انھیں اندازہ ہوگیا کہ اگر کڑاکے کی سردی پڑی ہے تو اب تڑاکے کی دھوپ ہوگئی۔ بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔

توقع سے زیادہ گرمی پڑی۔ اور اسی گرمی نے ضلع چمولی کے پہاڑوں میں چھپا ایک ایسا راز عیاں کردیا جس نے پورے بھارت میں سنسنی پھیلادی۔

چمولی میں سطح سمندر سے سولہ سو فٹ بلندی پر روپ کھنڈ نامی ایک جھیل ہے جو ایک چھوٹے سے گاؤں کے کنارے واقع ہے۔ گرمی پڑی تو یہ جھیل جس کی سطح پر اکثر برف جمی رہتی تھی، دھیرے دھیرے پگھلنے لگی۔ اب آس

پاس سے گزرتے لوگ اندر جھانک سکتے تھے۔ بلوریں پانی میں اپنا عکس دیکھ سکتے تھے۔

ایک گاؤں والا بکریاں چراتے ہوئے ایک سہ پہر ادھر سے گزرا۔ اُسے پیاس نے ستایا۔ گرمی زیادہ تھی۔ پیاس بجھا کر وہ ٹھنڈے پانی میں اتر گیا۔ ذرا آگے بڑھا تو چونکا۔

شفاف پانی کی تہہ میں کچھ موجود تھا۔ کچھ بے حد عجیب۔ اس نے بغور دیکھا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ دوڑا دوڑا گاؤں گیا۔ گاؤں والوں نے اس کی حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔ جھنڈ کی صورت وہ لاٹھیاں اٹھائے جھیل کی سمت دوڑے آئے۔ ان کے دلوں میں اندیشے تھے۔

پہاڑوں کے بیچوں بیچ وہ جھیل بالکل خاموش تھی۔ پُرسکون۔ آسمان اس کے پانیوں پر منعکس ہو رہا تھا۔

وہ کنارے کھڑے رہے۔ پہلی بار انھوں نے جھیل کو اس حال میں دیکھا تھا ورنہ تو اس پر برف کا تالا پڑا ہوتا۔ وہ آنکھیں چندھیا کر ہاتھ کا چھجا بنا کر جھیل میں جھانک رہے تھے۔ یکدم جیسے ان پر بجلی گری۔ انھوں نے تہہ میں موجود شے کو شناخت کر لیا تھا۔

وہ انسانی ہڈیاں تھیں۔ کھوپڑی۔ سینے کا پنجرہ۔ پنجے۔

وہ چیختے چلاّتے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ گرمی کے باوجود وہ بری طرح کانپ رہے تھے۔ انھوں نے خود پر لحاف ڈال لیے۔ یکبارگی انھیں پہاڑوں کی کھوہ سے ملنے والی ہڈیوں کا... اپنے اجداد کے بیان کردہ قصوں اور اماوس کی راتوں کو سنائی دینے والی چیخوں کا جواز مل گیا۔ اب تک وہ سنتے آئے تھے کہ اُن کا گاؤں موت کی جھیل کے کنارے آباد ہے مگر اب اس کا ثبوت وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

یہ پُراسرار خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سرکاری اہل کار دلوں میں اندیشے لیے جھیل کی سمت آئے۔ گو انیسویں صدی کے اوائل ہی سے اس علاقے سے ہڈیاں مل رہی تھیں، مگر ایک جھیل میں اتنی ہڈیوں کی موجودگی پریشان کن تھی۔

شفاف پانی کی تہہ میں پڑے ہڈیوں کے ڈھیر واضح دیکھے جاسکتے تھے۔ غوطہ خور اندر اترنے سے خوف زدہ تھے۔ گاؤں والے جھیل کے پاس بھی نہیں پھٹکے۔

بڑی مشکل سے چند اہل کار جھیل میں اترے۔ اور جو اُن کے ہاتھ آیا وہ تحیر خیز تھا۔ وہاں فقط ہڈیاں نہیں تھیں لکڑی سے تراشی ہوئی اشیاء، لوہے کے نیزے اور چمڑے کی جوتیاں بھی تھیں۔ پورا قافلہ یہاں موت سے ہم آغوش ہوا تھا۔

اُس وقت آج سی ٹیکنالوجی نہیں تھی جو اشیاء کی عمر جانچ سکے۔ پہلے گمان گزرا کہ یہ اوزار صدیوں پرانے ہیں مگر جب ان پُراسرار ڈھانچوں کی شہرت پھیلی اور غیر ملکی ماہرین نے یہاں کا رخ کیا تو انھوں نے ہڈیوں کے جائزے اور اشیاء کے تجزیے سے نتیجہ اخذ کیا کہ یہ زیادہ قدیم نہیں۔

یہ انکشاف زیادہ پریشان کن تھا۔ انسان سانحات کو ماضی کے قصے کہانیاں سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ عہد حاضر میں طوفان نوح، خون کی بارش اور دریا کے دو پاٹوں میں تقسیم ہونے کا خیال ہی لرزا خیز ہے۔ اِسی باعث یہ تصور کہ روپ کھنڈ میں ملنے والے ڈھانچے کسی تازہ آفت کا نتیجہ تھے، خوف طاری کر دینے والا تھا۔

چند مورخین نے اِن ڈھانچوں کو قنوج کے راجا جسی دھاوال کا قافلہ قرار دیا جو اپنی حاملہ بیوی، حواریوں اور سپاہیوں کے ساتھ نندا دیوی کے مندر کی یاترا کے لیے نکلا تھا مگر ہولناک طوفان میں پھنس گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ راجا کو ایک بدھ بھکشو۔ نے بددعا دی تھی کہ وہ اور اس کا گھرانا نشان عبرت بن جائے گا۔

ایک خیال یہ بھی تھا کہ یہ جاپانی سپاہیوں کی باقیات ہیں۔ واضح رہے کہ وہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ یہ ممکن تھا کہ جاپانی سپاہیوں کا کوئی دستہ اس علاقے سے گزرتے ہوئے دشمن کے ہتھے چڑھ گیا ہو جنھیں قتل کر کے جھیل میں پھینک دیا گیا اور پھر برف نے اس راز کو ڈھانپ دیا۔

جاپانی سپاہیوں کی موت کا نظریہ جتنی تیزی سے مقبول ہوا اتنی ہی تیزی سے اپنی حیثیت کھو بیٹھا۔ جھیل میں لگ بھگ دو سو ڈھانچے تھے۔ اتنے بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہو اور آس پاس کے کسی گاؤں کو بھنک نہ پڑی، یہ ممکن نہیں تھا۔ پھر یہ تھیوری سائنسی تجزیے کی میز پر بھی فیل ہوگئی۔ ہڈیاں نسبتاً قدیم تھیں اور یہ جھیل تو برسوں سے منجمد تھی۔

کچھ عرصے بعد ایک برطانی ماہر نے نیا تصور پیش کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ جھیل صدیوں قبل ایک اجتماعی خودکشی کی گواہ بنی تھی۔ اس ہولناک عمل کے پیچھے مذہبی عقائد کارفرما تھے۔ اس نے کچھ ایسے گروہوں کی نشاندہی بھی کی جو مذہبی بنیادوں پر اپنی جان لیتے آئے تھے۔ (ایسے گروہ ماضی قریب کی تاریخ میں بھی ملتے ہیں)

عشروں تک یہ جھیل پُراسرایت کا مرکز بنی رہی۔ لوگوں نے طرح طرح کے دعوے کیے۔ کچھ نے سرد راتوں میں عورتوں کے رونے کی آوازسنی، کچھ کو چیخیں سنائی دیں، کچھ نے تودے گرتے ہوئے دیکھے۔ گاؤں والوں کا دعویٰ تھا کہ سال میں ایک بار انھیں نیچے وادی میں الاؤ کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ الغرض لوگ اس سمت جانے سے ڈرنے لگے۔

پھر نیشنل جیوگرافک کی ٹیم اس اسرار کی جانب متوجہ ہوئی۔ انھوں نے جب باقیات کا تجزیہ کیا تو حیرت نے انھیں آن لیا۔ کچھ ڈھانچوں پر گوشت کے ریشے اب بھی موجود تھے صدیاں گزرنے کے بعد اب کچھ سربستہ رازوں سے پردہ اٹھایا جاسکتا تھا۔

جھیل سے ملنے والے نمونوں کا حیدرآباد میں ڈی این اے ٹیسٹ ہوا۔ اُن کا اس خطے میں بسنے والوں کے ڈی این اے سے موازنہ کیا گیا۔

تجزیے سے ایک اہم بات سامنے آئی۔ پہلے تو یہ سمجھا جارہا تھا کہ تمام ڈھانچے ایک ہی گروہ یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں مگر اب پتا چلا کہ 70 فی صد افراد کا تعلق خطۂ ایران سے تھا جب کہ باقی بدقسمت مقامی تھے۔ غالباً یہ ایران سے ہجرت کرنے والوں کا قافلہ تھا جو یہاں آباد ہونے کے خواہش مند تھے۔ اس ضمن میں مقامی افراد اُن کی مدد کر رہے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، نہ جانے کون سی افتاد ٹوٹ پڑی کہ ان کی زندگیاں اس جھیل میں دفن ہوگئیں۔ ماہرین کے مطابق یہ ناقابلِ فہم اور تحیر خیز واقعہ اس علاقے میں 1200 برس قبل پیش آیا تھا۔

سائنس دانوں کے پاس حتمی ثبوت تو نہیں تھے۔ ان کا قیاس یہی تھا کہ یہ قافلہ ژالہ باری کے کسی ہولناک طوفان میں پھنس گیا تھا۔ ژالہ باری کا تصور یوں مضبوط ہوتا ہے کہ ہر کھوپڑی پر چوٹ کا نشان دیکھا جاسکتا تھا۔ یہ طے تھا کہ انھیں زخمی کرنے والی قوت آسمان سے اتری تھی۔

اولوں کے بھیانک طوفان نے کچھ گتھی تو سلجھائی مگر یہ معما کبھی حل نہیں ہوسکا کہ تمام افراد موت سے ہم کنار ہونے کے لیے ایک ہی جھیل میں کیوں کود پڑے۔

ماہرین بار بار اجتماعی خودکشی کی تھیوری کی جانب لوٹتے ہیں۔ مقامی قصے بھی اس نظریے کو تقویت پہنچاتے ہیں، جن کے مطابق اس وادی میں صدیوں قبل نندا دیوی نے ایک عظیم قربانی قبول کی تھی۔

آؤکیگاھارا کا جنگل (جاپان)

پہاڑوں سے سناٹے کی دھند اتر کر درختوں پر چھا جاتی۔ بھیڑیوں کا گریہ قرب وجوار پر مایوسی طاری کر دیتا، مرد لحاف میں سمٹ جاتے، بچے ماؤں کے سینے سے لگ جاتے ہیں اور بوڑھی عورتیں دعاؤں کا جاپ کرنے لگتی ہیں۔

ماؤنٹ فوجی کے شمال مشرقی دامن میں وہ جنگل پھیلا ہے جسے آسیب کا ٹھکانا تصور کیا جاتا ہے۔ یہ 35 کلومیٹر پر محیط آؤکیگاھارا کا جنگل ہے جو جاپان کا سب سے پُراسرار مقام تصور کیا جاتا۔

یہ جنگل بلند قامت اور گھنے درختوں پر مشتمل ہے۔ یہ درخت اتنے گھنے ہیں کہ کچھ حصوں میں سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچ پاتی۔ مقامی زبان میں اِسے درختوں کا سمندر بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں جگہ جگہ کھائیاں ہیں۔ زمین کائی سے ڈھکی ہوئی۔ یہاں قدم رکھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے وہ زمانۂ قدیم میں داخل ہوگیا ہو، جیسے وقت رُک گیا ہو مگر یہاں قدم رکھنے کا حوصلہ صرف دن ہی میں ممکن ہے۔۔ رات کو

یہاں کوئی نہیں آتا۔ اُس کی پُراسراریت کا ایک سبب اور۔ یہاں خودکشی کی شرح حیران کن ہے۔ مایوس لوگ یہاں مرنے چلے آتے ہیں۔

پچیس سالہ ہونڈائی ساکو جب محکمہ جنگلات میں ملازم ہوا تو پہلی تعیناتی جزیرہ ہونشو کے علاقے میں ہوئی۔ اُسی یونٹ میں، جس کے ذمے مذکورہ جنگل کی دیکھ ریکھ تھی۔

اس کی ماں اِس ملازمت کے سخت خلاف تھی مگر اس زمانے میں نوکریوں کا کال تھا۔ پھر ہونڈائی دلیر لڑکا تھا جو بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا تھا... اس کا یہ یقین جلد ڈگمگانے والا تھا!

پہلے دن ہی مڈبھیڑ ساکا سوزی سے ہوگئی۔ گو آدمی تیس کے پیٹے میں تھا مگر چہرے سے انتہائی مضمحل اور بیمار معلوم ہوتا تھا۔ پُرجوش ہونڈائی نے جب اس کی خیریت دریافت کی تو اس نے سرد آہ بھری۔ ''اس منحوس مقام پر بھلا کون خوش رہ سکتا ہے!''

''کیا بڑے میاں، بھوت پریت تمہیں بھی ستاتے ہیں؟'' لڑکے کی آواز میں شوخی تھی۔ ''کہیں تمہارا ارادہ بھی تو خودکشی کا نہیں۔''

ساکا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر ہونڈائی کو دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ سینئر افسر نے ڈانٹ پلائی۔

''نوجوان، اتنی شوخی اچھی نہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کہاں کھڑے ہو۔ یہ آؤکیگا ھارا کا جنگل ہے، ہمارا مقابلہ موت سے ہے۔'' افسر کی آواز سرد تھی۔

اس وقت تو لڑکے نے کچھ محسوس نہیں کیا مگر رات گئے ٹھنڈا چانک بڑھ گئی اور کہرا پڑنے لگا۔ اس کا دل گھبرایا۔

وہ جنگل کے داخلی حصے پر نصب سائن بورڈ کے سامنے کھڑا تھا جس پر ایک پُرسوز التجا درج تھی۔ ''آپ کی زندگی آپ کے والدین کا دیا ہوا تحفہ ہے، اس کی قدر کریں!''

وہ ایسا ہی ایک سائن بورڈ کچھ فاصلہ پر بھی دیکھ چکا تھا۔ ''اپنی جان لینے سے قبل ایک بار پولیس سے ضرور مل لیجیے!''

''دھند دیکھ رہے ہو!'' آواز نے چونکا دیا۔ ساکا اندھیرے سے ظاہر ہوا۔ اس کی چہرہ ستا ہوا تھا۔ لڑکا خاموش رہا اور ہاتھ رگڑنے لگا۔

''اس دھند میں موت کا سندیسہ ہے۔'' آدمی کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ ''جاپان میں اس سے زیادہ ہولناک جگہ کوئی نہیں۔ اب تک کتنے ہی لوگ یہاں خودکشی کر چکے ہیں۔''

''ہوں۔'' لڑکے نے گردن ہلائی۔ ''میں نے کہیں پڑھا تھا، یہ خودکشی کا دوسرا بڑا اسپاٹ ہے۔''

''خودکشی کا دوسرا بڑا اسپاٹ!'' آدمی نے اس کا جملہ دہرایا۔ ''کس قدر عجیب لگتا ہے مگر یہی حقیقت ہے۔ مقامی لوگوں کو یقین ہے کہ یہاں بدروحوں کا بسیرا ہے۔ کوئی مقامی شخص یہاں رات میں داخل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ انھوں نے اپنے گھروں کے باہر تعویذ لٹکا رکھے ہیں۔''

وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی کھوکھلی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ کیبن میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ انھیں شفٹ انچارج کا بلاوا آیا۔ بوڑھے آدمی کے چہرے پر اکتاہٹ تھی۔ اس نے ایک لڑکی کی تصویر لہرائی۔ ''یہ دو روز سے لاپتا ہے۔ اس کی ڈائری سے اشارہ ملا تھا کہ اسی جنگل کی طرف آئی ہے۔ ہمیں اسے تلاش کرنا ہوگا۔''

وہ ساکا کے ساتھ مانیٹرنگ روم میں آگیا۔ ہونڈائی کی نظر پھر سائن بورڈ پر پڑی۔ ''دوستو، زندگی قیمتی ہے!''

جب مانیٹرنگ روم کا کارندہ جمائیاں لیتے ہوئے وڈیو ریکارڈنگ چیک کر رہا تھا، ساکا نے اسے بتایا کہ حالیہ برسوں میں اس جنگل میں پچاس سے زائد لاشیں مل چکی ہیں۔ بیش تر لوگوں نے خودکشی کی مگر کچھ کی حالت دیکھ کر لگتا ہے جیسے وہ موت سے قبل شدید اذیت سے گزرے ہیں۔ ان کے جبڑے سخت ہوتے اور مٹھیاں بھنچی ہوئی ہوتیں۔ آدمی نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ درجنوں لاشیں اب بھی جنگل میں موجود ہوں گی مگر اس کے وسیع رقبے اور اسٹاف کی کمی کی وجہ سے انھیں کبھی تلاش نہیں کیا جاسکے گا۔

''جنگل کے کچھ حصے دلدلی ہیں۔ کچھ بالکل تاریک ہیں۔'' ساکا نے کہا۔ ''اگر کسی کے اہل خانہ مطلع کر دیں تو ہم تلاش پارٹی بناتے ہیں، ورنہ اگر کوئی غریب اور اکیلا شخص یہاں آکر موت سے ہم کنار ہوجائے تو کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کی لاش جنگل کا حصہ بن جاتی ہے۔''

دور ایک چیخ سنائی دی۔ لڑکے نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ شیشے کے ادھر خاموش درخت لہرا رہے تھے۔

''دیکھو ذرا، شاید یہی لڑکی ہے۔'' مانیٹرنگ افسر نے کہا۔ سب کی نظریں اسکرین پر گڑ گئیں۔ فوٹیج میں دیکھا جاسکتا تھا کہ لڑکی سر جھکائے مشرقی حصے سے جنگل میں داخل ہو رہی ہے۔ چال عجیب سی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے حواس میں نہیں۔

''یہ چوبیس گھنٹے پرانی فوٹیج ہے۔'' افسر نے کہا۔

کچھ دیر بعد ساکا، ہونڈائی تین اہل کاروں کے ساتھ مشرقی حصے کی سمت جا رہے تھے۔ وہ گھنے حصے میں داخل ہوئے۔ وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ اگر ٹارچ نہ ہو تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ ہر سو خاموشی تھی۔ بس جیپ کے انجن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''رک جاؤ۔'' ساکا چلّایا۔ جیپ کے ٹائر چرچرائے۔ سامنے ہی کوئی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ پھر اُس نے گردن دائیں طرف موڑی۔ بالکل خاموشی تھی۔ خشک پتے پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔

''کک... کون!'' ہونڈائی کو خوف محسوس ہوا۔ ساکا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ عجیب کیفیت میں تھا۔ آدمی نے گہرا سانس لیا۔ وہ ہوا کو محسوس کر رہا تھا۔

''اس طرف!'' وہ چلّایا۔ جیپ آگے بڑھی۔

لڑکی درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔ اس نے سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔

''کیا وہ زندہ ہے؟'' ہونڈائی نے پوچھا۔

''نہیں!'' ساکا کا لہجہ سرد تھا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ لڑکی کو مرے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ انھوں نے لاش اسٹریچر پر رکھ کر جیپ میں ڈالی۔ واپسی کے سفر میں سب خاموش تھے۔ لڑکے کی نظر لاش پر تھی۔ اسے لگا جیسے لڑکی کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔

انھوں نے لاش کیبن سے ملحقہ سرد خانے میں پہنچا دی۔ جب وہ لوٹنے لگے تو ایک اہلکار نے ہونڈائی کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم یہیں ٹھہرو گے۔''

''میں... میں کیوں!'' وہ چلّایا۔

''یہ رسم ہے۔'' ساکا نے کہا۔ ''ورنہ موت کا آسیب روح کو قید کرلے گا، ایک زندہ شخص کو اس کے ساتھ رہنا پڑے گا۔''

''کیا بکواس ہے۔'' لڑکے کو غصہ آگیا۔

''چلّاؤ مت۔'' اس نے لڑکے کو جھڑکا۔ ''یہ آؤ کیگاھارا ہے!''

وہ دروازہ بھیڑ کر چل دیے۔ لڑکا کھڑا رہ گیا۔

''کیا آج رات بھی لاش آنسو بہائے گی؟'' ایک اہل کار سے ساکا نے پوچھا۔

''ہر لاش آنسو بہاتی ہے، ہر لاش گریہ کرتی ہے۔''

ساکا نے سگریٹ سلگائی۔ ”میں قریب ہی رہوں گا۔ لڑکے کا پہلا دن ہے!“

وہ جیپ میں دبک کر بیٹھ گیا اور خود پر لحاف ڈال لیا۔ صبح تک مردہ خانے پر نظریں لگائے بیٹھا رہا۔ وہ کھڑکی میں ایک سائے کو ٹہلتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ لڑکا مضطرب تھا۔ اُسے گھٹی گھٹی سسکیاں بھی سنائی دیں۔ ایک بار اُس نے لڑکے کو دروازے میں کھڑا پایا۔ شاید وہ کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر وہ دروازہ بند کرکے اندر چلا گیا۔

پو پھٹ رہی تھی۔ ساکا انگڑائی لے کر جیپ سے نکلا۔ اس نے آئینہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑنے لگی تھیں۔ اس نے مردہ خانے کے دروازے پر دستک دی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہونڈائی نے دروازہ کھولا۔ ساکا کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ پھر وہ مسکرایا۔ ”تمھارا چہرہ زرد کیوں پڑ گیا لڑکے!“

ہونڈائی نے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھا۔ ”کیوں کہ یہ آؤکیگاھارا کا جنگل ہے! اور یہاں صرف موت کی آہٹ گونجتی ہے۔“

آؤکیگاھارا کا جنگل آج بھی موت کا جنگل کہلاتا ہے۔ وہاں جانے والا پتا نہیں کیوں پُراسرار انداز میں مر جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس علاقے میں نگرانی کی ذمہ داری جن پر ہوتی ہے انہیں کچھ نہیں ہوتا جب کہ انجان کوئی بھی جائے وہ مرجاتا ہے۔ لگاتار تحقیق کے بعد بھی اس کی وجہ کوئی جان نہیں پایا ہے۔

شیطانی تکون (بحرالکاہل)

”جہنم کے سات دروازے ہیں... اُن سے ایک ہمارے سمندر میں واقع ہے!“

جاپان اور فلپائن کے جزائر پر بسنے والے اس روایت سے یوں واقف ہیں، جیسے لوگ اپنے اجداد کی خبر رکھتے ہیں۔ روایت کے مطابق تاریخ کے آغاز سے قبل خیر اور شر کی جنگ پانیوں پر لڑی گئی۔ نیکی کی قوت غالب آئی، مگر شیطان کو ختم نہیں کیا جاسکا۔ وہ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں چلا گیا اور وہاں اس نے جہنم کا دروازہ کھول دیا۔

اگر آپ جاپان کے شہر یوکوہاما کے ساحل پر کھڑے ہوں تو آپ کی ایک جانب ماریانا اور دوسرے جانب فلپائن کے گوام جزائر ہوں گے۔ یوں ایک پُراسرار تکون جنم لے گی جو برموداٹرائی اینگل جتنی ہی ہولناک ہے مگر عالمی دنیا کو اُس کی ہولناکی کی زیادہ خبر نہیں۔ 50 کی دہائی میں جب وہاں رونما ہونے والے تحیر خیز واقعات کا چرچا ہوا تو اسے مغربی دنیا نے ڈریگن ٹرائی اینگل کا نام دیا۔ ویسے جاپانی میں اسے مانوامی کہتے ہیں یعنی شیطان کا سمندر!

وہاں کتنے ہی ہوائی اور بحری جہاز غائب ہوچکے ہیں۔ کچھ جہاز یوں غرق ہوئے جیسے سمندر میں موجود کسی مقناطیس نے انھیں کھینچ لیا ہوا۔ کیا وہاں پُراسرار چٹانیں ہیں جن کی حرکت سے گھاتک شعاعیں جنم لیتی ہیں؟ یا پھر وہ قدیم روایت ہی سچ ہے کہ یہاں شیطان کا بسیرا ہے؟

جنگِ عظیم اوّل کی چند دستاویزات میں چھوٹی موٹی

لانچ اور ماہی گیروں کی گمشدگی کی اطلاع ملتی ہے مگر دوسری جنگِ عظیم بالخصوص جاپان پر ایٹمی حملے کے بعد یہ سمندر بپھر گیا۔ جہازوں کی گمشدگی کے پے در پے واقعات ہونے لگے۔ اوائل میں تو یہ کہہ کر جان چھڑالی جاتی کہ یہ دشمن کی کارستانی ہے مگر جب کچھ آبدوزیں غائب ہوئیں تو حکومت چونک اٹھی۔

حکومت نے ایک تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی۔ یہ جدید ٹیکنالوجی سے لیس 31 نڈر افراد تھے۔ جہاز کا نام Kaiyo Maru نمبر پانچ رکھا گیا۔ وہ ہر قسم کے مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بڑے سے بڑا طوفان سہہ سکتا تھا... مگر بدقسمتی کا بھلا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔

1952ء کے موسم گرما کی یہ مہم عبرت کا نشان بن گئی۔ جہاز ایک روز دھند میں الجھا اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیا۔ تمام رابطے منقطع ہو چکے تھے۔ پورا سمندر کھنگالا گیا، ہوائی جہازوں نے گشت کیا، مگر کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ وہ جہنم میں اتر چکا تھا۔

لاپتا اہل کاروں کے رشتے داروں نے خاصا شور مچایا مگر وہ حکومتی دباؤ برداشت نہیں کر سکے۔ سرکار نے اس تکون سے متعلق مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لگتا تھا جیسے اُسے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا گیا ہے مگر وہ اس سے جڑے قصے کہانیوں کو نہیں دبا سکی۔ وقفے وقفے ہی سے سہی، یہاں ہوائی اور بحری جہازوں کی گمشدگی کے واقعات ہوتے رہے۔ البتہ حکومت نے انھیں کبھی درخورِ اعتنا نہیں جانا۔ شاید انھوں نے سوچا ہو کہ جس معمے کو حل کرنے والے خود معما بن جائیں، اُسے نہ ہی چھیڑا جائے یہی بہتر ہے۔

انگریز محقق چارلس برلٹز نے اس علاقے کو اپنی کتاب ''دی ڈریگن ٹرائی اینگل'' کا موضوع بنایا۔ اس کی تحقیق کے مطابق 1952ء تا 1954ء جاپان کے پانچ بڑے فوجی جہاز اس علاقے میں غائب ہوئے۔ گمشدہ افراد کی تعداد 700 سے اوپر ہے۔ سُکی سے بچنے کے لیے اس کیس کو دبا دیا گیا۔

البتہ ایک مؤقف اور ہے۔ 1995ء میں امریکی مصنف لیری کوسیج نے اپنی کتاب میں برمودا اور ڈریگن ٹرائی اینگل کو موضوع بنایا تو ان سے جڑی بیش تر کہانیوں کو لغو اور گھڑے ہوئے قصے ٹھہرایا۔ اس کے مطابق جو تحقیقاتی ٹیم 1952ء میں جاپان نے روانہ کی تھی وہ 100 افراد پر مشتمل تھی، جن میں سے صرف 31 غائب ہوئے۔ باقی زندہ بچ گئے تھے۔ اور اس گمشدگی کا سبب بھی مافوق الفطرت نہیں تھا۔ اس حادثے کی وجہ زیرِ سمندر آتش فشاں بنا۔ اسی واقعے کو مافوق الفطرت رنگ دے کر سیاسی مقاصد حاصل کیے گئے۔

وجہ جو بھی رہی ہو، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں ایک عرصے سے پُراسرار واقعات ہو رہے ہیں، جن کی توجیہہ کی ہر کوشش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ہیل ٹاؤن، (اوہائیو، امریکا)

وہ سیاہ رات تھی۔ ہوا تھم گئی۔

قصبے کی گلیاں خاموش تھیں۔ ہنری دالان میں بچھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ گندم کے کھیتوں میں سناٹا تھا۔ کھیتوں کے پیچھے پہاڑ کسی سیاہ دیو کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ آدمی کے دل میں جذبات کا ریلا بہہ رہا تھا۔ غم اسے کھا رہا تھا۔

اس کی بیوی اور بچے گرم بستروں میں سوئے پڑے تھے۔ انھیں اس درد کا ادراک نہیں تھا جس سے جارج گزر رہا تھا۔ انھیں اس المیے کا بھی اندازہ نہیں تھا جو اُن کی دہلیز تک پہنچ چکا تھا۔ قصبے کے مردوں نے یہ بات اپنے اہل خانہ سے چھپائی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں کمتر یا کمزور جانتے تھے درا صل وہ خود صدمے میں تھے۔ ان کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ انھیں یقین دلایا گیا تھا کہ انھیں بے گھر نہیں کیا جائے گا تمام معاملات سنبھال لیے جائیں گے. ان کی چھت کوئی نہیں چھینے گا مگر جو لوگ ان کا کیس لڑ رہے تھے انھیں خرید لیا گیا۔ قصبے والوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپا گیا۔

ہنری نے گہرا سانس لیا۔ کھیت میں کھڑی فصل میں کچھ سرسراہٹ ہوئی۔ اس کا ذہن ماضی میں چلا گیا۔

1806ء میں بوسٹن ولیج کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس زرخیز زرعی زمین میں پہلا بیج بونے والوں میں اس کا دادا بھی شامل تھا۔ پھر اس کے باپ نے اس کی ترقی کی جنگ لڑی۔ شعور کی دہلیز عبور کرنے کے بعد ہنری بھی اپنے باپ کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑا ہوا۔ بوسٹن ولیج کو اس کے حقوق دلائے۔ اُنھوں نے زمین پر اپنے لیے جنت بنالی تھی مگر کسے خبر تھی کہ یہ جنت ان سے چھین لی جائے گی۔

60 کی دہائی میں قومی محکمۂ باغ نے اس کاؤنٹی میں ایک نیشنل پارک بنانے کا فیصلہ کیا۔ بوسٹن ولیج کے باسیوں

کے لیے اس میں کوئی تشویش کا پہلو نہیں تھا۔ ایک معنوں میں وہ خوش تھے کہ ان کے نزدیک ہی جنگلی پہاڑی علاقہ ہوگا جہاں جنگلی حیات قدرتی ماحول میں پلیں بڑھیں گی مگر پھر انھیں یہ پریشان کن اطلاع ملی کہ اس باغ کی تعمیر کے لیے جس علاقے کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں بوسٹن ولیج بھی شامل ہے۔ انھیں یہ علاقہ خالی کرنا پڑے گا۔

صدمے سے وہ گر گئے۔ یہ ناقابلِ یقین تھا۔ ایسے میں ہنری نے قانونی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے مدمقابل حکومت تھی مگر انھیں عدالتوں پر بھروسا تھا۔ کیس کورٹ میں پہنچا۔ میڈیا کو بھی خبر ہوئی۔ یہ معاملہ ملک بھر میں بحث کا موضوع بن گیا۔

قصبے کا کیس لڑنے والی لیگل ٹیم نے اُنھیں یقین دلایا تھا کہ فیصلہ اُن ہی کے حق میں ہوگا مگر 1974ء میں حالات تیزی سے تبدیل ہوئے۔ لیگل ٹیم کی دلچسپی گھٹ گئی۔ سرکاری اہلکاروں کا رویہ درشت ہوگیا۔ قصبے کے نمائندوں کو دھمکیاں ملنے لگیں۔ آخر کار حکومت کے حق میں فیصلہ آ گیا۔

باغ کی تعمیر کے متاثرین کو متبادل رہائش دی گئی مگر وہ اجنبی اور کٹھور زمین تھی۔ زراعت کے لیے نامناسب۔ وہاں موسم غیر دوستانہ تھا اور جدید سہولیات کا فقدان تھا مگر اب کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔ انھیں یہ قصبہ چھوڑنا تھا۔

ہنری [illegible] کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھیت میں کچھ ہلچل ہوئی۔

پہاڑوں پر بھیڑیے گشت کر رہے تھے۔ صبح اس نے قصبہ چھوڑ دیا۔ جاتے ہوئے وہ اپنی دیوار پر لکھ گیا۔ ”اب ہم جانتے ہیں کہ تم نے کیسے یہاں کے مقامی باشندوں (ریڈ انڈینز) کو بے دخل کیا ہوگا!“

سرکاری اہل کار قصبے میں داخل ہوئے اور خالی مکانات پر تالے ڈال دیے۔ انھوں نے دروازے اور کھڑکیوں پر تختے لگا کر انھیں بند کر دیا۔ جب قصبہ پورا خالی ہوگیا تو تیار فصلیں تلف کر دی گئیں۔ اب یہ ایک ویران اور آسیبی علاقہ تھا۔ مکانات تھے، سڑکیں اور بازار تھے، مگر انسان نہیں تھے۔ عجیب سا خلا اور کھوکھلا پن تھا۔

اور پھر ان واقعات کا سلسلہ شروع ہوا، جن کی عقلی توجیہہ ناممکن تھی۔ ایک روز کچھ گھروں میں آگ بھڑک اٹھی۔ قصبہ ویران تھا۔ امدادی ٹیموں کو بہت دیر میں خبر ہوئی۔ جب تک وہ پہنچتے خاصا حصہ شائع ہو چکا تھا۔ کچھ ہفتے بعد آوارہ کتے قصبے کی داخلی سڑک پر مردہ پائے گئے۔ اگلے برس بہت سے پرندے جھیل کنارے مرے پڑے تھے۔ اس کے بعد میڈیا میں اس نوع کی خبروں کا تانتا بندھ گیا۔ کبھی کوئی عینی شاہد قصبے کے بارے اٹھتے قہقہوں کا ذکر کرتا۔ کبھی کوئی مکانات کی کھڑکیوں میں روشنی دیکھنے کا دعویٰ کرتا۔ مکانات گرانے والی کمپنی کے کئی مزدور یہ کہتے ہوئے بھاگ گئے کہ انھیں رات میں عورتوں کی سسکیاں سنائی دیتی

ہیں۔ چند کا یہ دعویٰ تھا کہ ان پر رات کے اندھیرے میں تیز دھار آلے سے حملہ ہوا تھا۔ یوں دھیرے دھیرے اس علاقے کا نام ہیل ٹاؤن یعنی جہنمی قصبہ پڑگیا۔

یہ افواہیں بے سبب نہیں تھیں۔ حکومتی رویہ بھی عجیب تھا۔ ایک جانب انھیں قصبہ خالی کروانے کی جلدی تھی دوسری جانب وہ ایسے سست پڑے کہ خالی مکانات اور دکانیں کتنے ہی برس کھڑی رہیں، وہ بارشیں، برف باری اور تڑاکے کی دھوپ سہتی رہیں مگر حکومت نے اس جانب توجہ ہی نہیں دی۔ اس سست روی نے افواہوں کو ہوا دی۔

اس پورے معاملے سے ایک سازشی تھیوری بھی نتھی ہے۔ اس نظریے کے مطابق پارک بنانے کا منصوبہ فقط ایک ڈھونگ تھا۔ یہ ایٹمی ریکٹر کے کیمیائی مادے سے ہونے والی تباہی ٹالنے کی کوشش تھی۔

یہ خبر اس وقت پھیلی جب ایک سیاح نے علاقے کے قریب واقع وسیع و عریض کچرا کنڈی میں ڈرموں سے نکلنے والے مادے کو ہاتھ لگایا اور گھر پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا۔ وہ فاسد کیمیائی مادوں کا شکار ہوگیا تھا۔ چند تجزیہ کاروں کے مطابق انسانی آبادیوں کے قریب اس مادے کو ٹھکانے لگانے کا سلسلہ عشروں سے جاری تھا جس کی وجہ سے بوسٹن ویلیج اور اس کے گردونواح کی زمین اور پانی زہریلا ہوگیا اور اس کیس پر پردہ ڈالنے کے لیے "قومی باغستان" کی تعمیر کا ڈھونگ رچایا گیا۔

شاید یہ تھیوری سچ ہی ہو۔ کیونکہ قصبہ خالی کروانے کے برسوں بعد بھی کتنے ہی مکانات نہیں گرائے گئے۔ بہت سے ٹھیک اسی حالت میں کھڑے ہیں، جیسے پہلے تھے۔ حکومت نے قصبے کی طرف آنے والی سڑک پر ایک سائن بورڈ لگا دیا ہے۔ جس کے مطابق یہ سڑک بند ہے۔ البتہ یہ سائن بورڈ کالا جادو کروانے والوں کو یہاں آنے سے نہیں روک سکا، جنھیں یقین ہے کہ ہیل ٹاؤن کا جنگل بدروحوں سے بھرا ہوا ہے۔ جادو سیکھنے کے شائقین اب بھی چھپتے چھپاتے یہاں آتے ہیں لیکن اخبارات میں اب بھی شائع ہوتا ہے کہ وہاں پُراسرار روحیں متروکہ مکانات میں نظر آتی ہیں۔

ریڈل ہاؤس (فلوریڈا)

بیسویں صدی کے اوائل میں فلوریڈا کی ویسٹ پام بیچ کاؤنٹی ایک پُرسکون قصبہ تھا۔ یہ ابھی تازہ تازہ تھا۔ دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ مضافات میں نئے مقامات تعمیر ہورہے تھے۔ جنگلات کاٹے گئے۔ اُسی لکڑی کو کام میں لایا گیا۔ مکانات کی تعمیر کا ٹھیکا ہنری فلیگر ہوٹلز نامی کمپنی کے پاس تھا۔ انھوں نے ہی وہ مکان تعمیر کیا جس کے تذکرے سے آج سیکڑوں کتابیں بھری ہیں۔

بظاہر عام سے نظر آنے والے اس مکان کے ساتھ ابتدا ہی میں موت کا رشتہ جڑ گیا۔ یہ قصبے کے اکلوتے قبرستان سے ملحقہ تھا اور مردے کی آخری رسومات کے لیے مختص کیا گیا تھا۔

327 اسٹریٹ پر واقع اس مکان کو نئے نئے آباد ہونے والے "گیٹ کیپرز کاٹیج" کہتے تھے۔ اس زمانے میں توہم پرستی کی وبا عام تھی۔ قبرستان سے متعلق عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ اس سے بھی کچھ چھوٹے موٹے واقعات منسوب کیے گئے مگر کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی، ہاں 1920ء میں جب کارل ریڈل نے اسے خرید کر اس پر شوخ رنگ کردیا تب اس عام سے مکان کی کہانی میں عجیب موڑ آیا۔

ریڈل اعلیٰ عہدے پر فائز ایک سرکاری اہل کار تھا۔ معاشرے میں اس کی بڑی عزت تھی۔ اس نے مکان کو ریڈل ہاؤس کا نام دیا۔ اپنے بھائی کے ساتھ اس علاقے میں ٹھیکے پر کئی مکانات تعمیر کیے۔ ریڈل ایک بااخلاق اور خوش باش آدمی تھا۔ اسے یہ قصبہ بھا گیا۔ سوچا تھا کہ اب اپنے خاندان کے ساتھ یہیں بس جائے۔ اسے علم نہیں تھا کہ موت آج بھی اس گھر سے جڑی ہوئی ہے۔

یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی جب مسٹر ریڈل کا ایک ملازم جوزف عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگا۔ وہ قبرستان کی سمت نکل جاتا اور راتیں وہاں گزارتا۔ وہ معاشی مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ مسٹر ریڈل نے اپنے طور پر اس کی مدد کی۔ مگر قرضوں کا بوجھ بے حد بڑھ گیا تھا۔ ایک شام وہ اپنے کوارٹر میں مردہ پایا گیا۔ کرب سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا اور آنکھیں ابل پڑی تھیں۔

اس کی تدفین والے روز موسلا دھار بارش ہوئی۔ اگلے روز لوگ قبرستان پہنچے تو قبر ڈھے چکی تھی۔

جوزف کی خودکشی کے بعد گھر میں عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے۔ ملازمین نے رات میں کسی کی چیخیں سنیں۔ دیوار پر پنجوں کے نشان دیکھے گئے۔ ایک صبح

گھر والے اٹھے تو باغ اجڑا ہوا تھا۔ سہ پہر باورچی کو تمام مرتبان ٹوٹے ہوئے ملے۔ کرسمس والے روز فانوس مسٹر ریڈل کے سر پر آن گرا۔

آدمی تو توہم پرست نہیں تھا مگر سیاہ فام ملازمین میں خوف پھیل گیا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے فرار ہونے لگے۔ ریڈل نے ان پر سختی کی مگر وہ سخت ڈرے ہوئے تھے۔

مسٹر ریڈل کے روزنامچے آج بھی موجود ہیں جس میں انھوں نے اس نوع کے واقعات پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ اس نے اپنی سی کر لی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کسی کے مشورے پر اس نے جھاڑ پھونک بھی کروائی مگر اگلی صبح دروازے پر بکری کا دل پڑا ملا۔ جوزف کے کوارٹر کی دیواریں سیاہ پڑ چکی تھیں۔ اب ملازم رات ہوتے ہی اپنے کواڑ بند کر لیا کرتے۔ ریڈل ہاؤس منحوسیت کی علامت بن چکا تھا۔

یہ قصے اتنے مشہور ہوئے کہ جب اس نے اسے فروخت کرنے کا فیصلہ کیا تو کوئی خریدار نہیں ملا۔ آخر مایوس ہو کر اس نے یہ جگہ چھوڑ دی۔ کچھ روز بعد مکان کے اطراف میں لگے پودے سوکھ گئے اور چھت گرد سے اٹ گئی۔ لوگوں نے اس کے پاس سے گزرنا چھوڑ دیا۔ انھیں کھڑکیوں میں سائے ڈولتے نظر آتے۔ برسوں تک یہ مکان خالی پڑا رہا۔ آخر شہری انتظامیہ نے اسے گرانے کا فیصلہ کر لیا مگر کبھی فائلیں اِدھر اُدھر ہو گئیں تو کبھی افسر بدل گیا اور یہ منصوبہ ٹلتا ہی رہا۔

90 کی دہائی میں انتظامیہ نے اسے گرانے کا منصوبہ ترک کرتے ہوئے یہ مکان ریڈل کے بھانجے جون ریڈل کو عطیہ کر دیا۔ جون نئے دور کا آدمی تھا۔ اس نے مکان کی تعمیرِ نو میں خاصی دلچسپی لی مگر اس کی کوششوں میں وہ مزدور رکاوٹ بن گئے جو وہاں کام کرنے سے خوف زدہ تھے۔ ہر شام وہ روتے دھوتے اس کے پاس آتے اور طرح طرح کے قصے سناتے۔ کبھی وہ آلات کی پُراسرار گمشدگی کا ذکر کرتے، کبھی فرش پر پیروں کے نشان دیکھنے کا دعویٰ کرتے۔ ایک مزدور نے اُسے اپنی کمر دکھائی، اس پر بھاری ضرب کا نشان تھا۔
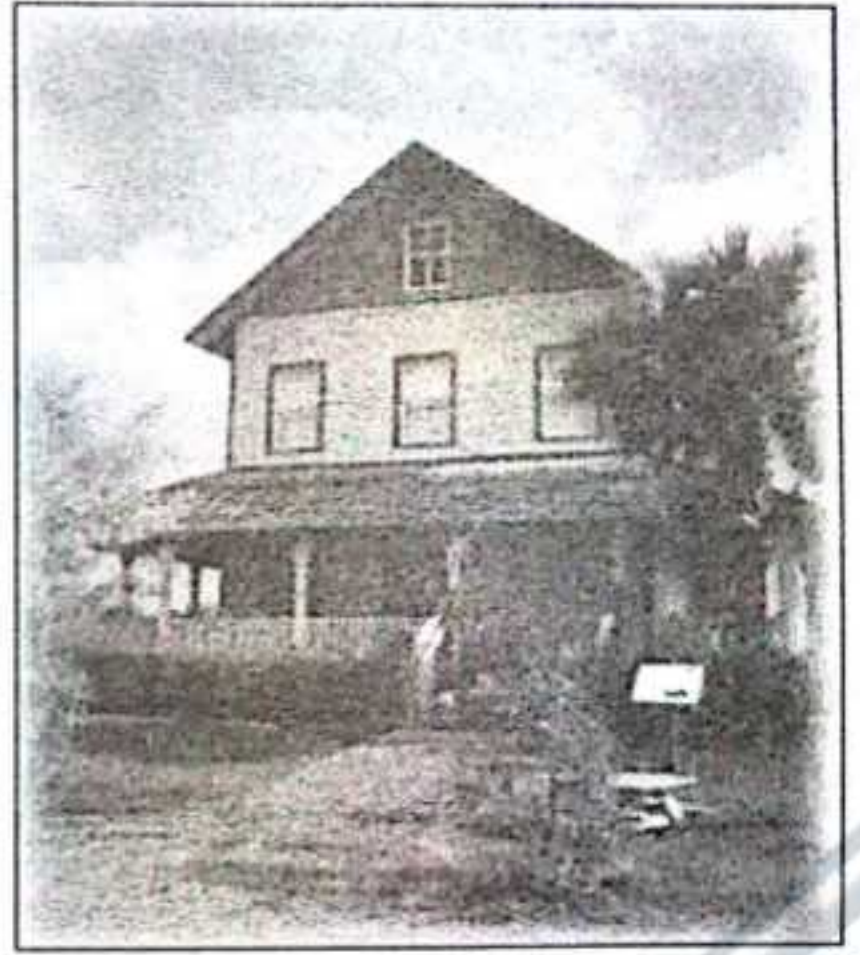
شہری انتظامیہ اور ریڈل خاندان دونوں ہی اب اس قصے سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ بالآخر اس کی چھت اور فرش کو کامیابی سے کھول لیا گیا۔ عمارت کو مختلف ٹکڑوں میں لیسٹرا ایرز ولیج منتقل کر دیا گیا جہاں اسے دوبارہ جوڑا گیا۔ یہ آج اسی جگہ واقع ہے۔ لوگ آج بھی اس سے دور رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ مکان متعدد کتابوں کے علاوہ ٹی وی شوز اور فلموں کا موضوع بھی بنا۔

انجے کونی جھیل کا اسرار (کینیڈا)

کینیڈا کی ریاست نناوت میں انجے کونی نامی ایک شانت جھیل ہے۔ سبزے اور سیاہ پتھروں کے درمیان یہ جھیل انگوٹھی میں نگینے کی مانند ہے۔ یہاں خاموشی ہے۔ کسی اسرار کے نشان نہیں ملتے لیکن اگر آپ اس کے ماضی میں جھانکیں تو ایک ایسے قصے کی بازگشت سنائی دے گی جو اس خطے میں اساطیر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

30 کی دہائی کے اخبارات میں ایک انہونی درج ہے، ایک ایسی گتھی، جو آج تک نہیں سلجھ سکی۔ اس قصے کے مطابق کبھی اس جھیل کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ تجارتی قافلے اور چرواہے ادھر سے اکثر گزرا کرتے تھے۔ وہ اسی گاؤں کی سرائے میں آرام کرتے۔

جون کیبلی بھی مویشیوں کے ان تاجروں میں سے تھا جو سال میں دو بار اپنے ریوڑ کے ساتھ جھیل کے پاس سے گزرتا۔ گاؤں کے باسیوں سے اس کے اچھے روابط تھے۔ وہ اکثر یہاں ٹھہرا کرتا مگر جولائی 1930ء کی صبح جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو حیرت اس کی منتظر تھی۔

وہاں سناٹا تھا۔ مکانات خالی پڑے تھے۔ کہیں کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ شاید کسی گھر میں کوئی تقریب ہو، سب وہاں اکٹھے ہوئے ہوں، مگر یہ کیا... پورا گاؤں ویران تھا۔ اس نے گھروں میں جھانکا۔ سلائی کڑھائی کا سامان پڑا تھا۔ کپڑے میں سوئیاں پروئی ہوئی تھیں، چولھوں پر کیتلی چڑھی تھی۔ یوں لگتا تھا عورتوں کو عجلت میں یہ جگہ چھوڑنی پڑی۔

کھیتی باڑی کے اوزار بھی گھروں میں موجود تھے۔ کھلونے بھی جوں کے توں پڑے تھے۔ جانے کیسی افتاد ٹوٹ پڑی کہ انھیں سب چھوڑ چھاڑ کر جانا پڑا۔ جانے کون سی بلا تعاقب میں تھی کہ انھیں اپنا مال و اسباب چھوڑ کر نکلنا پڑا۔

اسے خطرہ محسوس ہوا۔ وہ گاؤں سے نکل آیا۔ کچھ آگے بڑھا تھا کہ اسے پتھریلی زمین پر کچھ بے حد عجیب دکھائی دیا۔ یہ سات کتوں کی لاشیں تھیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کے جسموں پر کوئی زخم نہیں تھا۔ البتہ پسلیاں گنی جاسکتی تھیں۔ ان کی موت بھوک کے باعث ہوئی تھی۔

اس پر خوف طاری ہوگیا اور وہ اپنے ریوڑ کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ قریبی گاؤں پہنچ کر جب اس نے یہ قصہ سنایا تو لوگ ہنسنے لگے۔

''کیوں دل لگی کرتے ہو؟'' ایک بوڑھے تاجر نے اسے ٹھوکا دیا۔ ''پرسوں ہی تو اس گاؤں کے مکھیا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔''

جون کیبلی کے اصرار پر کچھ لوگ اس کے ساتھ ہو لیے۔ جھیل کے نزدیک پہنچ کر انھیں خلافِ توقع ٹھنڈ محسوس ہوئی۔ جون کے مانند باقی لوگوں کے لیے بھی وہاں کے مناظر پریشان کن تھے۔ گتھی کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔ انھوں نے رائل کینیڈین ماؤنٹ پولیس کو چٹھی بھجوائی۔

جلد گھوڑوں اور خچروں پر سوار ایک تفتیشی ٹیم یہاں پہنچ گئی۔ ان کے ذہن میں خدشہ تھا کہ گاؤں والے لٹیروں کا نشانہ بن گئے ہیں مگر یہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ تمام قیمتی اشیاء جوں کی توں موجود ہیں۔

قبرستان کا جائزہ لیتے ہوئے ان پر انکشاف ہوا کہ ایک قبر تازہ تازہ کھولی گئی ہے۔ جب انھوں نے باریکی بینی سے جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ مردہ غائب ہے۔

''یہ جانوروں کا کام نہیں ہوسکتا۔'' ایک تفتیش کار نے کہا۔ ''یہاں کسی کے پیروں کے نشان نہیں۔ پھر کتے بھی خوراک نہ ملنے کے باعث مرے تھے۔''

پولیس نے پورا علاقہ کھنگال مارا، غوطہ خوروں نے جھیل کا بھی جائزہ لیا مگر کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

قریبی گاؤں کے باسیوں کو شاملِ تفتیش کیا گیا، تو دو پریشان کن بیانات سامنے آئے۔ ایک تاجر نے انکشاف کیا کہ چار روز قبل وہ جھیل کے نزدیک سے گزرا تھا۔ اس نے آرام کرنا چاہا مگر گاؤں والوں نے اُسے جگہ نہیں دی۔ وہ کسی کی موت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ تاجر ان کے رویے سے مایوس ہوکر آگے بڑھ گیا۔

دوسرا بیان ایک بوڑھی عورت کا تھا، جس نے دو راتوں قبل جھیل کے پانیوں پر گول گول روشنیاں تیرتی دیکھی تھیں۔ وہ تیزی سے دائیں بائیں حرکت کر رہی تھیں۔

توقع کے عین مطابق پُراسرار روشنیوں اور گاؤں کے باسیوں کی گمشدگی کو اڑن طشتریوں سے جوڑ دیا گیا۔ یاد رہے، اس زمانے میں اڑن طشتریوں کے دیکھے جانے کے واقعات خاصے مشہور تھے۔ اخبارات نے بھی خوب مرچ مسالا لگا کر اس کہانی کو بیان کیا۔ جلد ہی اس پُراسرار قصے نے اساطیری شکل اختیار کرلی۔ اس پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، ناول ترتیب دیے گئے، ٹیلی فلمز بنیں۔ کئی مہم جو اس سمت آئے اور اپنے اپنے طور پر اس معمے کو سلجھانے کی کوشش کی۔

کچھ افراد نے اسے عقلی طور پر پرکھنے کی بھی کوشش کی۔ ایک محقق نے دعویٰ کیا کہ جون لیبیلی کے قصے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، اس نے فقط چھ خالی خیمے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا، جس میں زیادہ سے زیادہ پچیس افراد مقیم تھے۔ اس ضمن میں جو تصویر پیش کی جاتی ہے وہ 1930ء کی نہیں، 1905ء کی ہے۔ ایک تجزیہ یہ بھی ہے کہ اس دور افتادہ علاقے میں اتنے بڑے گاؤں کی موجودگی ہی غیر امکانی تھی۔ اور پھر... دوبارہ وہاں کوئی انوکھا واقعہ بھی نہیں ہوا۔

لوگ جو بھی کہتے رہیں، اس قصے کی بازگشت آج بھی ریاست نناوت کے پہاڑوں میں گونجتی ہے۔ جھیل پر آج بھی پُراسرار چپ طاری ہے۔ مکانات اسی طرح خالی ہیں۔

ہوٹل دیل سالتو (کولمبیا)

آسمان سے نور کا دھارا بہہ رہا تھا۔ دھند میں لپٹے ماحول میں پانی گرنے کی دلکش آواز حرکت کرتی ہے۔ سر اٹھائیں یوں لگتا ہے کہ سبزے کی گود سے دودھ کی ندی بہہ رہی ہے۔ یہ پانچ سو فٹ بلند تیکیوندیما آبشار ہے، جس کا نظارہ انسان کو مبہوت کردے۔ وہ دریا کنارے کسی پتھر پر آسن جما کر بیٹھ جائے اور فطری حسن میں ڈوب کر دنیا سے بیگانہ ہو جائے۔

لیکن اس خوبصورت اور پُرسکون مقام پر وحشت کی ایک نشانی بھی ایستادہ ہے۔ جیسے چاند پر لگا داغ۔ اگر آپ نظر اٹھا کر مشرقی سمت دیکھیں گے تو اوپر پہاڑی پر جہاں سے سڑک گزرتی ہے، ایک عمارت کھڑی ہے۔

قدیم قلعے کی طرز پر تعمیر ہونے والی یہ عمارت ہوٹل دیل سالتو ہے، جو اب یاسیت کی علامت بن چکا ہے۔ یہ برسوں سے بند ہے مگر اس کی کھڑکیوں میں سائے حرکت کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی بالکونی میں ہیولہ دکھائی دیتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی چیخ بھی اٹھتی سنائی دیتی ہے۔ وہاں آسیب کا بسیرا ہے۔

کبھی یہ ہوٹل بھی اس حسین مقام کا ایک حصہ تھا۔ قدرتی نظاروں کے دلدادہ اس آبشار کا رخ کرتے، تو اسی ہوٹل میں قیام کرتے۔ یہ آبشار کولمبیا کے مرکزی شہر بوگوتا سے جنوب مشرق میں تیس کلومیٹر پرے ہے۔ یہ زیادہ فاصلہ نہیں۔ اسی وجہ سے ہر سال لاکھوں لوگ اس آبشار کی سمت کھنچے چلے آتے۔

سیاحوں کی تعداد کو سامنے رکھتے ہوئے جب ایک تاجر نے 1928ء میں یہ ہوٹل قائم کیا، تو لوگوں نے اسے ایک منافع بخش فیصلہ قرار دیا۔ گو پہاڑ کی چوٹی پر ہوٹل تعمیر کرنے کے لیے کثیر سرمایہ خرچ ہوا۔ سڑک بھی بنی، پھر کرایہ بھی بہت تھا، مگر وہ لوکیشن ایسی تھی کہ شرفا اور امراء رقم بہ خوشی عطا کر دیتے۔ وہاں سے آپ پوری وادی پر نظر ڈال کر اپنے دل کو تسکین دے سکتے تھے۔ ہر سو سبزہ سانس لیتا تھا۔

مگر پھر... ایک رات ہوٹل کے بیرونی حصے میں ایک چیخ سنائی دی۔ ساری بتیاں روشن کر دی گئیں۔ ملازمین دوڑے مگر چیخ کا ماخذ نہیں ملا۔ آبشار آواز پیدا کیے بغیر بہہ رہی تھی۔ لوگ وہم سمجھ کر بھول جاتے مگر کچھ روز بعد یہی واقعہ دوبارہ ہوا۔

اگلے چند ماہ میں ہوٹل میں کچھ ناقابل فہم واقعات ہوئے۔ مہمان کھڑکی کے پردے گرا دیتے مگر کچھ دیر بعد وہ کھلے ملتے، ملازمین کمرا درست کر کے نکلتے مگر کچھ لمحوں بعد بستر کی چادر پر شکنیں پڑی ہوتیں، آرڈر غلط کمرے میں پہنچ جاتا۔

مالکان نے ان خبروں کو دبانے کی کوشش کی مگر یہ بات پھیل گئی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک دوشیزہ نے

ہوٹل کی بالکونی سے کود کر خودکشی کر لی تھی مگر اپنی شہرت بچانے کے لیے ہوٹل کے مالک نے اس خبر کو دبا دیا۔

چھوٹے موٹے واقعات ہوتے رہے مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی مگر جب جنگ عظیم دوم کے بعد یہاں ٹھہرے ایک اطالوی تاجر نے بھی بالکونی سے کود کر اپنی جان دے دی، تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ یہ واقعہ ہوٹل کی بدبختی کا آغاز تھا۔

اس پرسکون مقام کی بلندی کو لوگوں نے خودکشی کے لیے بہترین جانا۔ گردونواح میں خودکشی کے چند اور واقعات بھی ہوئے۔ گو واقعات میں تسلسل نہیں تھا مگر ان کا اثر براہِ راست ہوٹل پر پڑ رہا تھا۔

اس کی شہرت ماند پڑنے لگی تھی۔ دیواروں پر کائی جم گئی۔ بیرونی دیواریں اپنے رنگ سے محروم ہوگئیں۔ مینار یاست کی علامت بن گئے۔ اُسے آسیبی تصور کیا جانے لگا تھا۔ اس کی بدنامی کا سبب وہ صحافی بھی بنے، جو اسٹوری کی تلاش میں یہاں آکر ٹھہرے اور پھر لوٹ کر اخبارات میں مسالے دار خبریں شائع کیں۔

1990ء میں اس پرشکوہ ہوٹل کا دھندا بالکل چوپٹ ہوگیا۔ مالکان نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے، مالکان کے ساتھ کوئی عجیب واقعہ پیش آیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اس سے جان چھڑانے میں عافیت جانی۔

اب اٹھارہ کمروں پر مشتمل یہ عمارت اس حسین آبشار کے کنارے مایوسی کی علامت بنی ایستادہ ہے۔ خودکشیوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی رات کے اندھیرے میں کوئی نہ کوئی کھڑکی روشن نظر آجاتی ہے۔

جہنمی گڑھا (ترکمانستان)

یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ چھوٹا سا ملک سوویت یونین کے زیرِ تسلط تھا۔

1971ء میں روسی سائنس دانوں کو خبر ملی کہ ترکمانستان کے گاؤں دروازہ کے قریب معدنی تیل کے ذخائر موجود ہیں۔ یہ صحرائے قراقم کا علاقہ تھا۔ اوزاروں سے لیس ماہرین کی ٹیم فوراً وہاں پہنچ گئی۔ دشت میں دور دور تک ویرانی کا راج تھا۔ صحرائی علاقے میں چند ہی گاؤں تھے۔

مقامی افراد اس مہم کے سخت خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا اس وسیع و عریض صحرا میں صدیوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی، نہ تو یہاں کا موسم بدلا ہے، نہ ہی ماحول میں کسی قسم کا بدلاؤ آیا ہے، ایسے میں یہ مہم کہیں قدرت کے قہر کو بیدار نہ کر دے۔

سائنس دان ہنس کر آگے بڑھ گئے۔ اُنھوں نے کیمپ لگالیا اور ڈرلنگ شروع کردی۔ کئی راتوں تک گاؤں والے ان کے اوزاروں کی کھٹ پٹ کے باعث سو نہیں پائے۔ اس شور میں بھی وہ اس مصیبت کی آواز سن سکتے تھے جو ان کی سمت بڑھ رہی تھی۔

ایک صبح کیمپ میں عجیب واقعہ ہوا۔ زمین کھودنے والا ایک مزدور بے ہوش ہو کر گڑھے میں گر گیا۔ جو اسے بچانے گئے ان کا بھی یہی حال ہوا۔ بہ مشکل انھیں وہاں سے نکالا گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ حواس مختل ہو چکے تھے۔ انجینئرز نے کام جاری رکھا۔ شام میں ڈرل مشین نے ایک بڑی چٹان کو توڑا تو اجنبی سا شور اٹھا۔

وہ عجیب سی آواز تھی۔ پورے علاقے میں تیز بو پھیل گئی۔ روسی گھبرا گئے۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے، زمین اندر دھنسنے لگی... جہنم کا دروازہ کھل رہا تھا۔

مزدور اور انجینئر پیچھے کی سمت دوڑے۔ وہ دور کھڑے اس ہولناک گڑھے کو دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا، جیسے زمین اندر ہی اندر خود کو نگل رہی ہو۔ مٹی کے سرکنے کی رفتار پریشان کن تھی۔ پھر ایک مسئلہ وہ تیز بُو بھی تھی، جو ان کے نتھنوں میں گھسی جاتی تھی۔ آخر ایک تجربہ کار انجینئر چلایا۔ ''لعنت ہے، ہم تیل کی تلاش میں آئے تھے اور یہاں گیس کا ذخیرہ تھا۔''

بُو اتنی تیز تھی کہ انھیں دور ہٹنا پڑا۔ اس رات اردگرد کے دیہی علاقوں میں بے چینی گشت کرتی رہی۔ لوگوں کے لیے سانس لینا دشوار ہوگیا تھا۔ کھدائی کے لیے آئی ٹیم نے ماسکو میں اعلیٰ حکام سے رابطہ کیا۔ انھیں خدشہ تھا کہ زمین سے نکلنے والا گیس کہیں انسانی زندگیاں نہ نگل لے۔

ماسکو سے جو تجویز آئی وہ کوئی ایسی حیران کن نہیں تھی۔ ماضی میں بھی اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اگر کسی غار یا کھوہ میں قدرتی گیس پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے تو وہاں آگ جلادی جاتی ہے تاکہ تمام تر گیس جل کر ضائع ہوجائے۔

جب انجینئرز نے اس گڑھے میں جو ایک فٹبال اسٹیڈیم جتنا بڑا تھا، آگ لگائی تو یہی سوچا تھا کہ چند ہفتوں بعد اوپر کی سمت موجود ذخیرہ جل کر ختم ہو جائے گا۔

اس عرصے میں وہ ماسکو میں بیٹھ کر حساب کتاب کرتے رہے۔ اس ذخیرے سے اچھی آمدنی کی توقع تھی مگر گاؤں کے باسی جب صحرا قراقم میں روشن اس الاؤ کو دیکھتے تو ان کی ہڈیوں میں خوف کی لہر دوڑ جاتی۔ اس کی روشنی دن میں بھی دور دور تک دیکھی جا سکتی تھی۔ رات میں وہ دوزخ کے مانند معلوم ہوتا۔ سرخ شعلوں کی لپٹیں اٹھتیں۔ ایسی آوازیں آتیں، جیسے کوئی عفریت انگڑائی لے رہا ہو۔

دن ہفتوں میں بدلے اور ہفتے مہینوں میں۔ سب کی بے چینی بڑھنے لگی۔ آگ کی شدت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی تھی۔ انھوں نے کچھ اور انتظار کرنے کا فیصلہ کیا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ سوویت حکومت نے ایک اور ٹیم تشکیل دی جس نے بڑی باریک بینی کے ساتھ زیرِ زمین ذخائر کی جانچ کی۔

ماسکو پہنچنے والی رپورٹ نے حکام کے ہوش اڑا دیے۔ صحرا قراقم میں روئے زمین پر موجود قدرتی گیس کا سب سے بڑا ذخیرہ دفن تھا۔ اس انکشاف میں خوشی کا پہلو تھا مگر اندیشہ یہ تھا کہ شاید صحرا میں روشن یہ الاؤ اب کئی دہائیوں تک نہ بجھے۔

اعلیٰ حکام نے اس رپورٹ کو دیوانے کی بڑ کہہ کر نظر انداز کر دیا مگر وہ حقیقت کو نہیں جھٹلا سکے۔ ترکمانستان میں جہنم کا دروازہ کھل گیا تھا۔ بیس برس بعد... 1991ء میں جب یہ ملک روسی تسلط سے آزاد ہوا، صحرا قراقم میں سلگتے گڑھے میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔ دروازہ گاؤں کے باسیوں کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ صحرا میں اٹھنے والے مشینوں کے غیر فطری شور نے ایک عفریت کو جگا دیا تھا، جس کا منہ اب آگ اگل رہا تھا۔

اس آتش کدے میں گزشتہ 40 برس سے آگ روشن ہے، لوگ دور دور سے اس عجوبے کو دیکھنے آتے ہیں۔ اس کے نزدیک کھڑے ہوں تو لگتا ہے جیسے آپ کسی اور جہان میں ہیں، یہ کوئی اور ہی دنیا ہے۔ اس سے جھلسے ہوئے جسموں کی بو اٹھتی ہے۔

اس گڑھے سے منسلک مافوق الفطرت قصوں اور افواہوں سے تنگ آ کر... ترکمانستان کے صدر نے اسے پاٹنے کا حکم جاری کیا تھا، مگر کوششیں رائیگاں گئیں۔ ماہرین نے یہی مشورہ دیا قدرت کے ساتھ مزید چھیڑ خانی نہیں کی جائے۔ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگا، یہ الاؤ خود ہی بجھ جائے گا۔ البتہ دیہی آبادی اس خیال سے متفق نہیں۔ انھیں لگتا ہے، یہ آگ قیامت تک نہیں بجھے گی۔

پیرس کی تاریک کانیں (فرانس)

یہ خوشبوؤں کا شہر ہے۔ یہاں ہر سوں رنگ بکھرے ہیں، ہر طرف روشنی ہے، سیاح جوق در جوق یہاں آتے ہیں مگر اس کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے انھیں اس بات کا قطعی ادراک نہیں ہوتا کہ ان کے پیروں تلے ایک پُراسرار دنیا آباد ہے، ایسی کانوں کا جال پھیلا ہے، جہاں پھنسنے کا

مطلب ہے موت۔

قدیم روم کے مانند فرانس میں بھی کسی زمانے میں زیرِ زمین سرنگوں میں مردوں کو دفنایا جاتا تھا۔ آج یہ جگہ Catacombs of Paris کہلاتی ہے۔ سیاح اس زیرزمین حصے تک تو رسائی حاصل کرسکتے ہیں، ترتیب سے رکھی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کو قریب سے دیکھ سکتے ہیں مگر اُنھیں اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے داخلی حصوں پر سخت پہرہ ہے اور عام لوگوں کا اس سمت آنا ممنوع ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو کڑی سزا دی جاتی ہے۔

ان سرنگوں کا جال پورے پیرس میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ بڑے ہی پُرپیچ انداز میں ایک دوسرے سے جڑی ہیں۔ ان سے باہر نکلنے کے فقط تین راستے ہیں۔ کئی مہم جو اس دشوار گزار راستے پر اپنی جان گنوا چکے ہیں۔ گو حکام کی جانب سے وہاں جدید ترین آلات نصب ہیں مگر کچھ دیوانے انھیں چکما دے کر ان تنگ اور تاریک کانوں میں اتر جاتے ہیں مگر انھیں اس کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

ابتدا کا حصہ تو اتنا دشوار نہیں، مگر کچھ آگے بڑھنے کے بعد دیواریں قریب آنے لگتی ہیں۔ جھک کر گزرنا پڑتا ہے۔ کچھ حصوں کو فقط رینگ کر ہی عبور کیا جاسکتا ہے۔ چند علاقے اتنے تنگ ہیں کہ فربہ آدمی پھنس جائے۔ وہاں آکسیجن کی کمی ہے۔ گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق اس گھٹن سے التباسات بھی جنم لیتے ہیں۔ اس ہولناک جگہ میں آلات ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ کچھ مہم جوؤں کے مطابق یہاں آکر ٹرانسسٹر کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، قطب نما دھوکا دیتے ہیں، بیرونی دنیا سے رابطہ منقطع ہوجاتا ہے۔

سب سے قیمتی شے روشنی ہے۔ اگر ٹارچ ناکارہ ہوگئی تو زندگی کا سفر تمام سمجھیں۔ خود کو گھپ اندھیرے میں کھڑا پائیں گے۔ نہ تو آگے جاسکیں گے نہ ہی پیچھے۔ روشنی بجھتے ہی موت سامنے آن کھڑی ہوگی۔

اس پُرپیچ جگہ سے کئی قصے مشہور ہیں۔ کچھ برس قبل یہاں سے ایک ویڈیو کیمرا ملا تھا۔ اس میں موجود فوٹیج کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ویڈیو بنانے والا کسی شے کو دیکھ کر خوفزدہ ہوگیا۔ کیمرا گر گیا اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ دھندلی ویڈیو میں اس کے پیر دیکھے جاسکتے تھے، چیخیں سنائی دیتی تھیں۔

اس اندیشے کے پیش نظر کہ ویڈیو بنانے والا یہ بدقسمت شخص کہیں بھٹک کر اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھا ہو، ایک ریسکیو آپریشن شروع کیا گیا۔ امدادی کارکن سرنگ کے انتہائی گہرے اور عمیق حصوں تک پہنچے، جہاں صدیوں پرانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بوسیدہ صندوقوں میں پڑی تھیں۔ انھوں نے ان حصوں تک بھی رسائی حاصل کی جہاں برسوں

سے کسی کے قدم نہیں پڑے تھے مگر انہیں اس شخص کا کوئی نشان نہیں ملا۔ یہ کہتے ہوئے آپریشن ختم کر دیا گیا کہ شاید اس نے باہر نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرلیا ہو۔

ایک کہانی اور ہے۔ 2004ء میں فرانسیسی پولیس کو ان سرنگوں میں ایک عجیب شے ملی۔ یہ نسبتاً کشادہ حصے میں دیوار پر لگا پردہ تھا۔ اس کا قریب سے جائزہ لینے پر انکشاف ہوا کہ یہ ایک سینما ہے۔ انھوں نے وہ تاریں بھی تلاش کرلیں۔ جو اسے بجلی فراہم کرتی تھیں، مگر وہ کوئی فلم ریل وہاں تلاش نہیں کر سکے۔ جب پولیس کچھ گھنٹے بعد مزید ماہرین کے ساتھ پہنچی تو حیرت انگیز طور پر وہاں کچھ نہیں تھا۔ نہ تو کوئی پردہ، نہ ہی تار۔ اس واقعے کی ایک توجیہہ یہ کی جاتی ہے کہ پولیس جب دوسری بار کانوں میں داخل ہوئی تو بھٹک گئی اور اس جگہ تک پہنچ ہی نہیں سکی، جہاں پردہ موجود تھا۔ کچھ لوگ پورے واقعے کو من گھڑت ٹھہراتے ہیں۔

پیرس کے نیچے موجود یہ کانیں آج بھی... پُراسرار ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں یہ سرکاری عقوبت خانہ تھا۔ یہاں کتنے ہی قتل ہوئے اور مرنے والوں کی روحیں آج بھی یہاں بھٹکتی ہیں۔ ایک حلقہ سمجھتا ہے کہ صدیوں قبل یہاں ان افراد کو دفنایا جاتا تھا جو دوبارہ جی اٹھنے پر یقین رکھتے تھے۔ کالے جادو پر یقین رکھنے والے توہم پرست اسے ایک ایسا استھان تصور کرتے ہیں جہاں شیطانی قوتوں کا بسیرا ہے۔

قصے تو کئی ہیں، مگر پیرس کے نیچے موجود یہ سرنگیں دنیا کے پُراسرار ترین مقامات میں سے ایک ہیں۔

کمکھیا کا مندر

(آسام) بھارت کے انتہائی جنوب مشرق میں صوبہ آسام واقع ہے۔ آسام ماضی میں بنگال کا حصہ تھا لیکن بعد میں اسے بنگال سے الگ کر کے صوبہ بنا دیا گیا۔ اس صوبے کا ایک ضلع ہے "کام روپ"۔ لفظی معنی خوب صورتی وجنسیات ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کی شہزادی کا یہ نام تھا۔ اس شہزادی کے پاس مخفی قوتیں تھیں اور وہ دور دور سے اپنی پسند کے مرد کو اپنی مخفی قوت سے کھینچ لاتی اور انہیں بھیڑ بنا کر اپنے باڑے میں رکھتی۔ اس کی یہ مخفی قوت اس کے بالوں میں تھی۔ کہتے ہیں کہ جب مسلمان اولیا ہند آنے لگے تو ایک مشہور ولی جن کا مزار بنگلہ دیش کے شہر سلہٹ میں ہے اور

برصغیر کے مشرقی حصے میں آنے والے وہ پہلے ولی تھے۔ جب وہ کامروپ پہنچے تو انہوں نے اس ظلم ناروا کی داستان سنی۔ انہوں نے اس شہزادی کو پیغام دیا کہ اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ۔ وہ اپنی حرکتوں سے باز کیا آتی، اس نے شاہ جلال پر فسوں پھونکا۔ اس کے تمام جادو منتر خالی گئے۔ شاہ جلال نے جب دیکھ لیا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آرہی ہے اور خلق خدا کو آزار پہنچا رہی ہے، منع کرنے کے باوجود لوگوں کو بھیڑ بنا کر رکھ رہی ہے اور ان پر بھی مسلسل جادوئی وار کررہی ہے تو انہوں نے اسے بددعا دی اور وہ پتھر کی بن گئی لیکن ہندو اس پتھر کی مورتی کو کمکھیا دیوی کہتے ہیں جادو سیکھنے والے وہاں جا کر جاپ کرتے ہیں۔ اسی لیے اسے سحر وساحری کی دیوی کہا جاتا ہے۔ یہ مندر ایک کنواں کے اندر بنایا گیا ہے اور مورتی پانچ فٹ اونچی ہے۔

ہارر فلمیں، ڈرامے

انور فرہاد/زین مہدی

پُراسرار کہانیوں پر مبنی فلمیں اور ڈرامے ہر ملک میں پسند کیے جاتے ہیں۔ ایسا ایک بھی ملک نہیں ہے جہاں خوفناک فلمیں نہ بنی ہوں۔ برصغیر میں بھی ایسی فلمیں بنتی رہی ہیں۔ پاکستان بھی پیچھے نہیں ہے۔ کم کم ہی صحیح لیکن بنی ہے۔ ٹی وی چینلز نے بھی ہارر شور پیش کیے ہیں۔

صاحب ذوق کی بدارات، مختصری فلمی تاریخ

برصغیر کی فلمی تاریخ زیادہ پرانی تو نہیں ہے۔ بس تھوڑا سا ذہن پر زور دینا پڑتا ہے اور یاد آجاتا ہے کہ 1896ء میں جولائی کی 14 کو جب برصغیر کے گنے چنے بڑے شہروں میں سے ایک شہر بمبئی میں فرانس کے ایک ادارہ ''لومیرے برادرس'' نے شارٹ فلموں کی ایک سیریز ''ویٹسن ہوٹل'' کے وسیع ہال میں نمائش کی تھی۔ یہ نمائش پندرہ اگست تک یعنی ایک ماہ تک چلی تھی۔ اس ایک ماہ میں ملک کے کونے کونے سے لوگ اسے دیکھنے کے لیے امنڈ

آئے تھے۔ آج کے لحاظ سے اسے شارٹ فلم بھی نہیں کہا جاسکتا۔ مزدوروں کو کارخانے سے نکلتے ہوئے۔ ایک لڑکی اور ایک سولجر کو چلتے ہوئے دکھایا گیا تھا جسے آج کی زبان میں ''کلپ'' کہا جاتا ہے۔ دیکھنے والوں نے اس سیریز میں خوب دلچسپی لی تھی۔ کچھ لوگوں نے اسے جادو بھی کہا تھا کیونکہ تصویریں چل پھر رہی تھیں۔ اس وقت کے لوگوں کے لیے واقعی وہ جادو تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سفید کپڑے کے پردے پر تصویریں بالکل انسانوں کی طرح چل پھر رہی ہیں۔ باتیں کر رہی ہیں (مگر آواز نہیں تھی۔ تمام فلمیں خاموش تھیں) اس نمائش کو دیکھنے والے چند نوجوانوں نے اسی وقت ٹھان لیا کہ ہم بھی ایسی ہی چلتی پھرتی تصویریں بنائیں گے۔

سوچ لینا آسان ہے لیکن اپنے اس خیال کو جس پر غور کیا جا رہا ہے اسے تعبیر دینا مشکل ہے۔ لیکن ان لڑکوں نے عہد کر لیا کہ ہم اس فن کو سیکھیں گے۔ اس فن کو سیکھنے کے لیے انہوں نے ولایت جانے کا منصوبہ بنایا۔ ان میں ایک جوشیلے نوجوان کا نام ہریش چندر سکھارام بھٹوید یکر تھا۔ وہ پہلے بھی فوٹو گرافی کا شوقین تھا اور تصویریں کھینچا کرتا تھا۔ اس نے لندن آرڈر بھیج کر اکیس اشرفی (حکومت برطانیہ کے جاری کردہ سونے کے سکے) میں ایک کیمرا منگوایا جو اس قسم کی چلتی پھرتی تصویریں بنا سکتا تھا۔ اس انوکھے کیمرے سے اس نے ایک چھوٹی سی فلم بمبئی کے ہینگنگ گارڈن میں بنائی اور اس شارٹ فلم کا نام رکھا ''ریسلر'' جو صرف تین منٹ کی تھی اور اسے 1899ء میں نمائش کے لیے پیش کیا۔ اس نے اور بھی کئی شارٹ فلمیں بنائیں۔ اس کے بعد ایف بی تھانے والا نے 1900ء میں دو فلمیں تین اور چار منٹ کی بنائیں جس میں ''بمبئی کا نیا رخ'' اور ''مردے کا آخری سفر'' شامل ہے۔ لیکن برصغیر کی فلمی تاریخ جس کے نام سے شروع ہوتی ہے وہ ہے ''دادا صاحب پھالکے'' جس نے 1913ء میں اس کے مقابلے میں زیادہ لمبی اور مکمل کہانی پر ''داتا ہریش چندر'' نامی فلم بنائی۔ داتا ہریش چندر کی نمائش ہوتے ہی بہت سارے سر پھرے اس میدان میں آگئے اور کلکتہ۔ مدراس میں بھی فلمیں بننے لگیں۔ بمبئی، کلکتہ مدراس کی بنی فلمیں لاہور آ کر اچھا بزنس کرتیں۔ 1920ء تک شہر میں 9 سینما ہال مکمل گئے۔ ان سینما ہالوں کا حال یہ تھا کہ ایک بڑا سا کمرا ہوتا جس میں کرسیاں رکھی ہوتیں۔ سامنے دیوار پر سفید کپڑے کی بڑی سی چادر ٹنگی ہوتی۔ اسے پردہ کہا جاتا۔ کمرے کی دوسری طرف سے اس پردے پر فوکس ڈالا جاتا۔ فلم چلتی، لوگ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ پردے کے برابر میں سازندے بیٹھے ہوتے جو سین کی مناسبت سے ساز بجاتے تاکہ زندگی کا احساس ہو۔ ساز میں پیانو، طبلہ اور سارنگی کا استعمال ہوتا۔

بمبئی کلکتہ اور ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر نارتھ ویسٹ فرنٹیئر ریلوے کے ایک آفیسر جی کے مہتا نے اعلان کر دیا کہ جب بمبئی، کلکتہ والے ایسی چلتی پھرتی تصویریں بنا سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں بنا سکتے۔ اس نے بھی لندن سے کیمرا منگوایا اور اپنے جیسے چند دوسرے نوجوانوں کو ساتھ ملایا اور 1924ء میں کام شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی اسی کی طرح پُرجوش تھا جس کا نام میاں عبدالرشید کاردار تھا جو بعد میں اے آر کاردار کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ فلم کو اسسٹ بھی کر رہا تھا اور بطور مرکزی کردار کام بھی کر رہا تھا۔ اس فلم کی ڈائریکشن کے لیے مہتا نے شنکر دیو آریہ کو بلایا تھا۔ اس فلم میں اے آر کاردار کے ساتھ ولایت بیگم، ایم اسماعیل، وجے کمار، ہیرالال، ماسٹر غلام قادر اور جے کے مہتا نے اداکاری کی تھی۔ سرمایہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ فلم تین سال میں مکمل ہوئی اور 1928ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کا نام ''دی ڈاؤٹر آف ٹوڈے'' رکھا گیا تھا۔ اس فلم کو بہت زیادہ پزیرائی ملی تو ان لوگوں کا حوصلہ بلند ہوا لیکن سرمایہ کی کمی اپنی جگہ موجود رہی۔ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے اے آر کاردار اور اس کے دوستوں نے اپنی زمینیں فروخت کیں اور راوی روڈ پر بھاٹی گیٹ کے نزدیک 1928ء میں یونائیٹڈ پلیئر کارپوریشن کے نام سے ایک اسٹوڈیو کی بنیاد رکھی۔ راوی روڈ کو اس لیے پسند کیا گیا تھا کہ وہاں راوی کا کنارا تو تھا ہی مغل شہنشاہیت کا تاج نور جہاں کا مقبرہ بھی نزدیک تھا۔ اس لیے لوکیشن اچھی بنتی۔

شوٹنگ دن کی روشنی میں کھلے آسمان کے نیچے ہوتی تھی کیونکہ بجلی کا معقول انتظام نہیں تھا اور نہ اتنے ہائی پاور کے بلب ایجاد ہوئے تھے۔ اس اسٹوڈیو میں بننے والی پہلی فلم کا نام تھا ''Mysterious Eagle. عرف حسن کا ڈاکو''۔ اس فلم میں مرکزی رول خود اے آر کاردار نے کیا تھا

اور ہیروئین تھی گلزار بیگم۔ ایم اسماعیل اور ایک امریکی لڑکی ائرس کروفرڈ نے بھی اداکاری کی تھی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد اے آر کاردار نے اعلان کیا کہ اب وہ خود اداکاری نہیں کرے گا۔ اپنی پوری توجہ ہدایت کاری پر لگائے گا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے وقت حکومت کی جانب سے معلومات حاصل کرنے کے لیے محکمہ خفیہ کا ایک بندہ تواتر سے آیا کرتا تھا۔ وہ پشاور کے نزدیک کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس میں مردانہ حسن بہت زیادہ تھا۔ اے آر کاردار نے اس سے کہا ”گل حمید تم اداکاری اگر کرو تو لوگ تمہیں بہت پسند کریں گے۔“

خود گل حمید کے دل میں بھی اداکاری کرنے کی للک جاگ اٹھی تھی اس نے ہامی بھر لی اور محکمہ سے استعفا دیا اور اداکاری کے میدان میں آگیا۔ اسے مرکزی کردار میں لے کر اے آر کاردار نے ایک نئی فلم کا آغاز کیا جس کا نام Braveheart عرف سرفروش رکھا گیا۔ اس فلم نے بھی کامیابی حاصل کی۔ اب لاہور کی پہچان بننے لگی تھی (کچھ لوگوں کا کہنا کچھ اور ہے۔ ان لوگوں کے مطابق لاہور کی پہلی فلم پنا لال گھوش کی تھی جو دو ریل پر مشتمل تھی۔ جسے شالیمار کے علاقے میں پاکستان منٹ میں فلمایا گیا تھا۔ جب کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ لاہور کی پہلی خاموش فلم ”ہماری انار کلی“ تھی جسے چونا منڈی کی حویلی میں فلمایا گیا تھا کیونکہ کہانی مغلیہ کرداروں پر تھی)

لاہور میں فلموں کی تیاری ہونے لگی۔ کچھ اور لوگ بھی میدان میں آگئے جن میں ہیمانشو رائے بھی شامل تھا۔ 1925ء میں ہیمانشو نے لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس موتی لال ساگر اور اس کے بھائی سیٹھ پریم ساگر کے ساتھ مل کر ایک فلم کمپنی کی بنیاد ڈالی جس کا نام گریٹ ایسٹرن فلم کمپنی رکھا گیا اور اس کمپنی کے بینر تلے ”لائٹ آف ایشیا“ بنائی گئی جس کی ہیروئین سیتا دیوی تھی۔ (سیتا دیوی ایک اینگلو انڈین لڑکی تھی جسے کلکتہ سے لاہور لایا گیا تھا) اس کمپنی نے جرمن فلم کمپنی ایملکا فلم کمپنی سے اشتراک کیا تھا۔ اسی گریٹ ایسٹرن فلم کمپنی نے لاہور میں پہلا مکمل اسٹوڈیو ایسٹرن اسٹوڈیو بنایا تھا۔ گویا اب لاہور فلم سازی کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا اور بھاٹی گیٹ مرکزیت اختیار کر چکا تھا۔

بمبئی نے اس کام میں دیگر شہروں سے زیادہ ترقی کی تو فنکاروں کا ٹولہ وہاں جمع ہونے لگا۔ لاہور فنکار بناتا اور

1960ء میں امریکی CIA نے بلیوں کا ایک نیا مصرف تلاش کر لیا۔ اس نے روس اور دیگر ممالک کے سفارت خانوں کی جاسوسی کے لیے بلیوں کو استعمال کیا۔ جی ہاں انہوں نے بلیوں کو آپریٹ کر کے جاسوسی کے آلات اندر رکھ دیے۔ بلیاں بہت مزے سے سفارت خانوں میں گھومتی رہتیں اور سفارت خانوں میں ہونے والی ہر سرگرمی ریکارڈ ہو رہی ہوتی۔

یہ تھا بلیوں کا استعمال۔ انسان بھی کیا چیز ہے۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے معصوم جانوروں تک کو استعمال کر ڈالتا ہے۔

مرسلہ: نازش انصاری۔ حیدر آباد

☆☆☆

میرا دعویٰ ہے کہ آپ میں سے ہر ایک ٹریفک جام ہونے کے عذاب سے ضرور گزرا ہوگا۔ خاص طور پر شہروں میں رہنے والے۔

کتنی کوفت ہوگی۔ دس پندرہ منٹ گزارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو کئی کئی گھنٹوں تک گاڑیاں پھنسی رہتی ہیں۔ اس دوران میں بہت سے لوگ گاڑیوں کو سڑک ہی پر چھوڑ کر پیدل نکل آتے ہیں۔ یہ تو صرف چند گھنٹوں کی بات ہے۔ آپ اندازہ کریں اگر یہی گاڑیاں کئی دنوں تک پھنسی رہیں تو پھر کیا ہوگا۔ جی جناب امریکا میں ایک بار ایسا ہی ہوا تھا۔ دس دنوں تک ٹریفک جام رہی تھی۔ پورے دس دنوں تک۔ یہ ایک ورلڈ ریکارڈ ہے اتنے بڑے مسائل۔

مرسلہ: نیلوفر احسن۔ لاہور

☆☆☆

آپ نے کتابیں تو بہت پڑھی ہوں گی۔ لیکن کیا آپ نے دنیا کی مختصر ترین کتاب دیکھی ہے جس کا مطالعہ آپ صرف دو منٹ میں کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے Green eggs and ham۔ اس کتاب کا مصنف تھا ڈاکٹر سوئس۔ اس نے پبلشر سے شرط جیتی تھی۔ پبلشر نے اس سے کہا تھا کہ وہ دنیا کی مختصر ترین کتاب لکھ کر دکھا دے۔ ڈاکٹر سوئس نے یہ کتاب لکھ کر دکھا دی۔ جانتے ہیں اس کتاب میں کتنے الفاظ ہیں صرف پچاس اور ان پچاس الفاظ میں پورا مفہوم واضح ہو گیا ہے۔

مرسلہ: نعیم الدین۔ کراچی

وہ فنکار مزید کی تلاش میں کلکتہ اور بمبئی منتقل ہوجاتے۔ گوجرانوالہ کے موسیقار روشن (راکیش روشن کے والد۔ ہرتیک روشن کے دادا) راولپنڈی کے بلراج ساہنی، بھیشم ساہنی لاہور کے دیوآنند، چیتن آنند، یش چوپڑا، بینا رائے، امریش پوری، پشاور کے گل حمید، پریم ناتھ، پریم کشن، راجندر ناتھ، (ونود کھنا)، لائل پور (فیصل آباد) کے پرتھوی راج۔ راج کپور (کوئٹہ کے سریش اوبرائے) سیالکوٹ کے راجندر کمار۔ جہلم کے سنیل دت۔ سرگودھا کے جگدیش راج (گنیز ورلڈ ریکارڈ میں ان کا نام آچکا ہے۔ بطور پولیس انسپکٹر انہوں نے ایک سو چوالیس فلموں میں کام کیا)۔ جیسے اداکار لاہور چھوڑ کر بمبئی منتقل ہوگئے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ برصغیر کے افق پر آزادی کا سورج طلوع ہونے کے آثار نظر آنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کھائی جنم لینے لگی۔ پھر نوا کھالی (مشرقی بنگال) سے اٹھنے والی فسادات کی لہر نے پورے بر صغیر کو لپیٹ میں لے لیا۔ فسادات کی آگ پوری طرح بھڑک اٹھی تو بمبئی جانے والے واپس آنے لگے اور لاہور میں مقیم ہندو سکھ بھارت کی طرف کوچ کرنے لگے۔

فسادات نے جہاں انسانی جانوں سے بھوک مٹائی وہاں بڑی بڑی صنعتیں بھی فسادات کا شکار ہوئیں۔ دیگر صنعتوں کی طرح فلم انڈسٹری بھی لپیٹ میں آئی اور اسٹوڈیوز جلنے لگے۔ خاکستر ہوتے گئے۔

اب بمبئی سے آنے والے مسلمان ہنرمندوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس نہ تو سرمایہ تھا اور نہ کوئی لگانے کو تیار پھر ٹیکنیشن کی بھی کمی تھی۔ کیمرا تھا تو کیمرا مین نہیں۔ لیبارٹری تھی تو سامان نہیں۔ ایک عجب کسمپرسی کا عالم تھا پھر بھی وطن کی محبت اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ انہوں نے اس جل کر خاک ہوئی انڈسٹریز کو سنبھالنے کا بیڑا اٹھایا اور بے سروسامانی کے عالم میں کام شروع کردیا۔ 2 ستمبر 1949 کو "تیری یاد" ریلیز ہوئی۔ گوکہ اس فلم کا کچھ حصہ پہلے سے تیار تھا لیکن ریلیز قیام پاکستان کے بعد ہوئی۔

اس فلم کے ساتھ بدقسمتی وابستہ تھی۔ شروع ہوئی تو فسادات شروع ہوگئے اور جب ریلیز ہوئی تو قائداعظم کا انتقال ہوگیا۔ اس وجہ سے اس فلم کو وہ کامیابی نہیں ملی جو ملنا چاہیے تھی کیونکہ پوری قوم غم میں ڈوب گئی تھی فلم دیکھنے کون جاتا۔ پھر بھی اس فلم نے بتادیا تھا کہ پاکستان میں ہنرمند ہیں۔

ان بے سروساماں ہنرمندوں نے کھلے آسمان کے نیچے کام شروع کردیا تھا۔ فلم سازی زور شور سے ہونے لگی تھی۔

فلم بننے لگی تو غور کیا گیا کہ ایک سنسر بورڈ بھی ہونا چاہیے جو اس بات کا تعین کرے کہ کون سی فلم چلنی چاہیے اور کون سی نہیں۔ فلم کی کہانی یا منظرنامے کا اثر مثبت پڑے گا یا منفی۔ اسی خیال کے تحت سنسر بورڈ بنا۔ اس بورڈ کا قیام 1950ء میں عمل میں آیا۔ سنسر بورڈ میں جن لوگوں کو نامزد کیا گیا ان کی سوچ کا عکس 1954ء میں صاف نظر آگیا۔ سنسر بورڈ نے ڈبلیو زیڈ احمد کی فلم روحی پر پابندی لگادی۔ اس فلم میں شوسلزم کو اولیت دی گئی تھی، اس الزام کے تحت روحی پر پابندی لگی تھی۔ یوں بھی پاکستان میں فلم سازی کو بھارت کی طرح ترجیح نہیں دی جارہی تھی۔ اس ضمن میں ایک وزیر کا یہ بیان جو انہوں نے 1948ء میں دیا تھا وہ قابل غور ہے۔ وزیر موصوف نے کہا تھا "اسلامی قوانین کے تحت مسلمانوں کو فلم سازی کرنی ہی نہیں چاہیے۔"

جہاں حکومتی رویہ ایسا ہو تو فلم سازی کی طرف کون جائے اس لیے کہ فلم سازی کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور سرمایہ سیٹھ کی تجوری میں ہوتا ہے۔ سیٹھ نقصان کا سودہ کیوں کرے؟ پھر بھی کچھ سرپھرے فلم سازی کی طرف لگے رہے۔ فلمیں بنتی رہیں اور یہ ثابت ہوتا رہا کہ پاکستان میں اچھے فلم ساز و ہدایت کار موجود ہیں۔

1960ء کی دہائی کو پاکستانی سنیما کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے جب ایک سے بڑھ کر ایک فلم پیش کی گئی۔ لیکن یہ تمام فلمیں گھریلو کہانیوں پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ مل من مزید کی چاہ میں فلم سازوں نے ٹریک بدلنا چاہا اور خوفناک فلم کی تیاری پر غور ہونے لگا۔ اس وقت تک پاکستان میں فلم سازی کے تین مرکز بن چکے تھے۔ لاہور اور کراچی تو تھا ہی، مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکا میں بھی فلمیں بننا شروع ہوچکی تھیں۔ وہاں پہلی فلم بنگلہ زبان میں موکھ و موکھوش 1956ء میں (ڈائریکٹر، عبدالجبار خان) بنی تھی۔ پھر اردو فلمیں بھی بننے لگیں۔ وہاں بھی ہارر فلم کی تیاری ہونے لگی۔ 1966ء میں مشرقی پاکستان سے دو ہارر فلموں کے افتتاح کی خبریں آئیں۔ پہلی فلم تھی بنگلہ زبان میں "کے تومی" جس کے ڈائریکٹر تھے ایم ایس رحمان اور اداکار تھے رزاق، کبوری، کویتا، شوکت اکبر، انور حسین۔ لیکن اس فلم کی تکمیل میں اتنا عرصہ لگ گیا کہ مشرقی

پاکستان کا نام بدل کر بنگلہ دیش رکھ دیا گیا۔ کے تومی کے افتتاح کے کچھ ہی دنوں بعد ایک اور فلم کے افتتاح کی خبر آئی۔ یہ فلم اردو تھی اور اس کے ڈائریکٹر تھے جوہر بلگرامی۔ فلم کا نام تھا ''آدھی رات''۔ یہ فلم ہارر تو تھی مگر عام ڈگر سے ہٹ کر تھی۔ اسے سائنس فکشن کہا جاسکتا ہے۔ ایک ایسے ڈاکٹر کی کہانی تھی جو انسانی دماغ کو بدلنے کا تجربہ کر رہا تھا۔ اسی وقت مغربی پاکستان سے بھی ایک فلم کا اعلان ہوا جس کا نام رکھا گیا زندہ لاش لاہور میں بنی تھی اور 1967ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اسے خواجہ سرفراز نے پیش کی تھی۔ گو کہ یہ انگلش کہانی سے ماخوذ تھی۔ اس وقت تک انگریزی میں ڈریکولا پر بہت ساری فلمیں آچکی تھیں پھر بھی اردو میں بنائی گئی زندہ لاش کو پسند کیا گیا۔ فلم ریلیز ہوئی۔ لوگ سینما ہال پر ٹوٹ پڑے۔ ہر شو ہاؤس فل نہ صحیح پھر بھی اچھا بزنس ملا۔ اس فلم میں وائمپائر کا رول ریحان نے کیا تھا جس کی اداکاری کو بہت سراہا گیا۔ ایسی نیچرل اداکاری تھی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ اس فلم کے بارے میں اداکار حبیب کے کچھ دوستوں نے شکایت کی کہ اس فلم کو دیکھ کر وہ اتنا زیادہ خوفزدہ ہو گئے تھے کہ رات بھر سو نہ سکے۔ اخبارات کے مطابق گوجرانوالہ کی ایک عورت سینما دیکھتے ہوئے دل کی دھڑکن بند ہوجانے کی وجہ سے مرگئی۔

ہوسکتا ہے اس دور کے لحاظ سے وہ فلم خوفناک ہو لیکن آج کے بچے بھی اسے دیکھیں گے تو ڈرنے کی بجائے قہقہہ لگائیں گے۔ اس لیے کہ خون پینے والے کا میک اپ ایسا کیا گیا تھا کہ ہنسی آجائے۔ زندہ لاش کے بعد کئی سال تک دوسری کوئی اور ہارر فلم آئی نہیں۔ 1969ء میں ایک فلم ریلیز ہوئی۔ فلم کا نام ''ڈاکٹر شیطان'' تھا جسے اے عزیز نے پیش کیا تھا۔ اس فلم میں ترانہ، واصف نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ پیاسا 1973ء میں ریلیز ہوئی۔ اپریل 1994ء کو ایک اور ہارر فلم پیش کی گئی۔ اس فلم کا نام رکھا گیا تھا ''سر کٹا انسان''۔ اس فلم کے مرکزی اداکار تھے بابرا شریف۔ غلام محی الدین۔ اس کے ہدایت کار تھے باکمال کیمرامین سعید رضوی۔ ان کے والد رفیق رضوی عرف باپو اپنے وقت کے معروف ہدایت کار تھے۔ وہ بمبئی فلم نگری سے وابستہ تھے انہیں لوگ باپو کے نام سے پکارتے تھے۔ سینئر ہدایت کار ہونے کی وجہ سے بھی میں بہت عزت دی جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد انہوں نے بمبئی کو خیر باد کہا اور پاکستان چلے آئے۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے کراچی سے ایک فلم شروع کی جس کا نام رکھا گیا ''پھر صبح ہو گی''۔ اس فلم کا اسکرپٹ آغا نذیر کاوش نے لکھا تھا جو فلمی اخبار ''کردار'' کے ایڈیٹر تھے۔ اس فلم کے پروڈیوسر چوہدری فرزند علی قلفی والے تھے۔ موسیقی شادی کی تھی اور نغمہ نگار تسنیم فاضلی تھے۔ یہ فاضلی کی پہلی فلم تھی۔ بنگالی نژاد گلوکارہ رونا لیلیٰ کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ رفیق رضوی کے تیسرے بیٹے سعید رضوی نے ''سر کٹا انسان'' بنائی تھی۔ اس کے بعد بھی سعید رضوی نے دو اور پُراسرار فلمیں بنائیں۔ شانی سائنس فکشن تھی تو ''طلسمی جزیرہ'' کچھ الگ انداز کی ماورائی قوتوں کے گرد گھومتی کہانی پر مبنی تھی۔ سعید رضوی ہالی ووڈ سے کورس کر کے آئے تھے۔ اس لیے وژول ایفکٹ پر خصوصی توجہ دی تھی۔

2000ء میں سید نور نے اپنی کہانی اور اپنی ہدایت میں ''بلی'' پیش کی جس میں ندیم، صائمہ، نور، سعود اور ارباز خان نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ 15 مارچ 2013ء کو ریلیز ہونے والی فلم ''سیاہ'' جس کی کہانی عثمان بٹ نے تحریر کی تھی اور اسے اظفر جعفری نے ہدایت دی تھی۔ حریم فاروق اور قاضی جبار نے اداکاری کی تھی۔ کالا جادو پر مبنی اس فلم نے اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ 12 جون 2015ء کو جاوید بشیر کی فلم ''مایا'' ریلیز ہوئی۔ اس میں حنا جاوید اور احمد عبدالرحمان نے اداکاری کی تھی۔

ہارر فلموں کی طرح پاکستان میں ایک سائیکو تھرلر مووی بھی بنی ہے جس کے ڈائریکٹر خالد حسن خان ہیں اور اس کے مرکزی کردار میں ہمایوں گیلانی اور میرا ہیں۔ اس فلم کو دہلی فلم فیسٹیول میں ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

اسی طرح پشتو زبان میں بننے والی پہلی ہارر فلم 1991ء میں قیصر صنوبر نے ''آدم خور'' کے نام سے پیش کی۔ ''حسینہ ایٹم بم'' بھی ہارر تھی۔ 1992ء میں ''بلا'' 1993ء میں ''گورکند'' 1997ء میں ''داخاورلس ے اسپو گے'' 1999ء میں ''لور دا بلا'' 1999ء میں ہی ''بدشکل'' 2000ء میں ''داوینو جام'' بنی۔ عمر خان کی ''ذبحہ خانہ'' 2007ء میں ریلیز ہوئی۔

9 اگست 1991ء کو پنجابی زبان میں ''کوبرا'' ریلیز ہوئی جو کئی معنوں میں اہم تھی۔ سلیم مراد کی کہانی کو شاہد رانا

نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ ذوالفقار علی کی موسیقی تھی۔ اداکاروں میں سلطان راہی، گوری، نادرہ، غلام محی الدین، عابد علی، ہمایوں قریشی، سلمیٰ آغا اور نغمہ شامل تھیں۔

دنیا بھر کی طرح ہمارے ہاں بھی پُراسرار کہانیاں اور ناول لکھی گئیں اور ان پر کچھ فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ اگرچہ یورپ اور امریکا کے مقابلے میں لکھی جانی والی کہانیوں اور ناولوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ انیسویں صدی میں اس سلسلے کا آغاز ہوا تو لیڈی عبدالقادر، مرزا ادیب اور مقبول جہانگیر نے حیرت انگیز اور چونکا دینے والی کہانیاں لکھ کر اردو ادب کو ایک نئی جہت عطا کی۔ لیکن مقبول جہانگیر نے طبع زاد کم اور تراجم زیادہ کیے۔ پھر ان کے بعد کی نسلوں نے اس سلسلے کو اور بڑھایا۔ اس دور کے لکھنے والوں نے سب سے زیادہ اور نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ پھر جب ڈائجسٹوں کا دور شروع ہوا تو پُراسرار کہانیاں بہت بری تعداد میں لکھی جانے لگیں اور انگریزی سے ان کے تراجم بھی کیے جانے لگے۔

پُراسرار اور خوف زدہ کرنے والی فلمیں اور ٹی وی ڈرامے بالی ووڈ میں بھی بنائے جاتے رہے ہیں بلکہ اب بھی بن رہے ہیں۔ ''کیریچر'' کے نام سے ایک فلم حال ہی میں ممبئی کی فلم انڈسٹری میں بنی تھی جس میں بپاشا باسو کے مقابل ایک ابھرتے ہوئے پاکستانی اداکار نے بھی مرکزی کردار کیا تھا مگر یہ فلم باکس آفس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ دیگر وجوہ کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ پُراسرار فلموں میں بار بار دیکھے جانے والی بات نہیں ہوتی۔ جیسی ڈیپ رومانی فلموں میں ہوتی ہے۔ پُراسرار فلمیں اگر تکنیکی طور پر بھی کمزور ہوں تو ان کی کامیابی اور مشکوک ہو جاتی ہے۔ غالباً انہی باتوں کے پیش نظر بعض بھارتی فلمسازوں نے بھوت پریت پر جو ڈراؤنی فلمیں بنائیں ان میں سسپنس کے علاوہ دیگر فلمی مواد بھی ٹھیک ٹھاک رکھا۔ مثال کے طور پر امیتابھ بچن کی ''بھوت ناتھ'' اس فلم نے بہت اچھا بزنس اس لیے کیا کہ یہ ایک بھوت ہی کی کہانی نہیں بلکہ اس میں ملک اور معاشرہ کی بہت سی برائیوں کی بھی بھرپور نشاندہی کی گئی ہے۔ اس فلم میں امیتابھ بچن نے کیلاش کے ناتھ نامی بھوت کا کردار ادا کیا ہے جو اپنے مکان میں رہائش کے لیے آنے والوں کو خوف زدہ کر کے بھاگنے پر مجبور کرتا ہے لیکن ایک فیملی میں شامل ایک بچہ اس سے خوف زدہ نہیں ہوتا جس کے بعد ان میں دوستی ہو جاتی ہے۔

شاہ رخ خان جو کنگ خان کے نام سے مشہور ہے اور رومانوی کردار کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ بالی ووڈ والوں نے ایک فلم میں اسے بھی بھوت بنا دیا۔ 2005ء میں بننے والی فلم ''پہیلی'' میں اسے ایک عاشق بھوت پریم کے روپ میں پیش کیا گیا۔ بالی ووڈ کی فلموں میں اس سے قبل کبھی اتنا خوب صورت بھوت نظر نہیں آیا۔ راجستھان کے ماحول میں بنائی گئی اس فلم میں بھوت کے کردار میں شاہ رخ کی اداکاری لاجواب تھی۔

ایشا دیول ماضی کے سپر اسٹار دھرمندر اور ڈریم گرل ہیما مالنی کی حسین اور باصلاحیت بیٹی ہے۔ جس کے چہرے پر دل کشی کے ساتھ ساتھ معصومیت بھی نظر آتی ہے لیکن فلم ''ڈارلنگ'' میں ایشا نے دکھایا کہ اس کے چہرے کی یہ معصومیت کس خوب صورتی سے وحشت میں بدل سکتی ہے۔ 2007ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی اس فلم میں ایشا فردین خان کی ایک ایسی معشوقہ کے رول میں نظر آئی جو فلم کے نصف میں موت کے بعد بھوت بن کر اس سے اپنا بدلہ لینا چاہتی ہے گو کہ یہ فلم فلاپ ہو گئی لیکن ایشا نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ زبردست انداز سے مافوق الفطرت کردار بھی ادا کر سکتی ہے۔

بالی ووڈ میں ارمیلا ماتونڈکر کی آمد دھما کے دار انداز میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے کیریئر کے ابتدائی دور میں فلم ''رنگیلا'' میں مختصر لباس زیب تن کر کے خاصے عرصے تک فلم انڈسٹری اور میڈیا میں زیر بحث رہی تھی۔ اس نے اکثر فلموں میں ہلکے پھلکے اور رومانوی کردار کیے لیکن ناقدین نے 2003ء میں سامنے آنے والی فلم میں جو رام گوپال ورما کی تھی اور اس کا نام ''بھوت'' تھا، اس اداکارہ کی اداکاری کا لوہا مان لیا۔ ''بھوت'' میں ارمیلا نے ایک گھریلو عورت کی روح کا رول بے حد متاثر کن انداز میں کیا تھا جس پر اسے فلم فیئر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

''کرشنا کاٹیج'' وہ فلم تھی جس میں دل کش اداکارہ ایشا کوپیکر ایک بھوت کے روپ میں نظر آئی تھی لیکن یہ بھوت ایک بہت ہی بے باک بھوت تھا۔ اس فلم ''کرشنا کاٹیج'' میں اس بھوت کی جوڑی سہیل خان کے ساتھ تھی۔ اس قاتل ادا بھوت نے تماشائیوں کی راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

سینئر اداکار شریش اوبرائے کے ہونہار بیٹے ویویک اوبرائے نے بہت کم وقت میں خود کو ایک باصلاحیت اداکار ثابت کیا۔ اس کی ابتدائی کامیاب فلموں میں سے ایک ''ڈرنا مرنا ہے'' تھی۔ اس غیر روایتی تھرلر فلم میں ویویک اوبرائے کو پہلی بار ایک بھوت کے کردار میں سائن کیا گیا۔ چھ مختلف کہانیوں پر مشتمل اس فلم میں ویویک اور نانا پاٹیکر والا حصہ ہی زیادہ پسند کیا گیا۔ خاص طور پر وہ سین آج تک فلم بینوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے جب ایک سڑک کے کنارے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نانا پاٹیکر سے باتیں کرتے ہوئے ویویک اپنا چشمہ اتارتا ہے تو اس کی آنکھوں کی جگہ دو گڑھے دکھائی دیتے ہیں۔

آج سے کوئی بیس بائیس سال پہلے جیکی شیروف نے ''کنگ انکل'' کے ذریعے بچوں کے دل جیت لیے تھے اور پھر 2006ء میں بھی اس نے ایک انکل کے روپ میں بچوں کو اپنا دیوانہ بنا لیا لیکن یہ انکل ماضی کے انکل سے ذرا مختلف تھا۔ ''بھوت انکل'' کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس فلم میں جیکی نے بھوت کا رول ادا کیا تھا۔ اگرچہ یہ فلم کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس فلم سے جیکی نئی نسل میں مقبول ضرور ہو گیا۔

ان فلموں کے علاوہ بھی بہت سی فلمیں بھوت پریت اور مافوق الفطرت کرداروں پر بنائی گئی ہیں۔ جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ممبئی کے کئی فلمی ادارے جن میں سرفہرست تلسی راما ہے صرف ہارر فلمیں بناتے ہیں مگر ٹی وی چینلز بھی ناظرین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے سسپنس اور خوف میں مبتلا کرنے والی کہانیوں پر مبنی ڈرامے دکھانے لگے ہیں۔ بھارتی چینلز کی طرح اب تو کئی پاکستانی ٹی وی بھی خوف و ہراس میں مبتلا کرنے والے پروگرام بڑی پابندی کے ساتھ دکھانے لگے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی جبلت ڈر اور خوف کی کیفیت کو بھی ایک طرح سے انجوائے کرتی ہے۔ اگرچہ بھارتی ٹی وی چینلوں کے عام ڈرامے اور ان کے ولن بھی کچھ کم پُراسرار اور خوف ناک نہیں ہوتے مگر ناظرین کی سنسنی خیزی کی خواہش کے پیشِ نظر ''ہارر شو'' کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ جس طرح سوپس کے معاملے میں چینل کی کہانیوں کو طول دینے اور الجھانے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں معروف نظر آتے ہیں اسی طرح ان کے

نصاریٰ

نصرانی کی جمع، حضرت عیسیٰ کو ماننے والے، خاص طور پر ان کو کہا جاتا ہے جو شرقی ممالک میں آباد مسلمان حکومتوں کے ماتحت آباد تھے۔ قرآن پاک میں عیسائیوں کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اسی لیے مسلمان بھی اکثر و بیشتر انہیں اسی نام سے پکارتے ہیں۔ نبی آخرالزماںؐ کے زمانہ میں عیسائی منتشر طور پر مختلف علاقوں میں آباد تھے۔ مدینہ سے کوفہ کے درمیان مختلف قبائل میں آباد تھے۔ اسی طرح بنو تغلب، نجران میں بنو عبدالقیس اور بنو حارث وغیرہ۔ ان مسلم ریاستوں میں نصرانی ذمیتوں کے طور پر رہتے تھے اور خراج ادا کرتے تھے۔ ان کو حضور اکرمؐ نے بہت سے حقوق دے رکھے تھے۔ انہیں گرجا گھروں کی مرمت اور عبادات اور تمام رسومات کی ادائیگی کی اجازت تھی۔ تاہم انہیں مسلمانوں جیسے لباس پہننے کی اجازت نہ تھی۔ سڑکوں اور بازاروں میں بھی ذمی عورتوں کو مسلمان عورتوں سے الگ رکھا جاتا تھا۔ آخری کلام اللہ میں عیسائی برادری کو اسی لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔

مرسلہ: صاحب خان، کوئٹہ

درمیان ڈراؤنے ڈرامے پیش کرنے کی بھی دوڑ جاری ہے۔ سونی کا ڈراما ''خوف ناک'' بھی اسی دوڑ کا حصہ تھا۔ لگے بندھے فارمولے پر بنائے جانے والے ڈرامے میں ناظرین کے لیے کچھ نیا نہیں تھا۔ دیگر چینلوں پر بھی ڈراؤنے ڈرامے ناظرین کو خوف زدہ کرنے اور ان کے جسموں میں سنسنی خیزی کی لہر دوڑانے کی اپنی سی کوشش ہوتی رہی۔ جب کہ اس کے بعد کے دنوں میں بھی اسی طرح کے مزید ڈرامے منی اسکرین پر آئے۔

زی ٹی وی کا ہارر شو اپنی نوعیت کے ڈراموں میں اس لحاظ سے مختلف اور منفرد رہا کہ اس میں ڈراؤنی صورتِ حال جسمانی اعضا کی قطع و برید اور خونی مناظر بڑے اہتمام کے ساتھ دکھائے گئے۔ یہ شو اس لحاظ سے بھی منفرد تھے کہ اس میں کام کرنے والے اداکار عموماً وہ ہوتے تھے جنہیں ڈراموں میں بہت مختصر کردار ملتے ہیں اور ناظرین ان کے چہروں سے ذرا کم ہی آشنا ہوتے ہیں۔ شو میں نامانوس کاسٹ سے کام لینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ناظرین کو ڈرامے میں حقیقت نظر آئے۔

زی کے ہارر شو کے مقابلے میں سونی انٹرٹین منٹ چینل اپنی ڈراؤنی کاوش ''آہٹ'' میدان میں لایا۔ یہ سیریز ابتداء میں پرتجسس کہانیوں کے ساتھ سسپنس ڈرامے کے طور سے شروع ہوئی مگر کچھ ہی عرصے بعد سیریز کی کہانیوں کو ڈراؤنے واقعات کے ساتھ ایک نیا رخ دے دیا گیا۔ اب یہ ڈراما مافوق الفطرت کرداروں اور جادوگری کی کہانیوں کے ساتھ اپنی ڈگر سے ہٹ چکا ہے۔ ''آہٹ'' اور ''آہٹ ٹو'' کی طرح ڈراما سیریز ''اچانک'' 37 سال بعد بھی ڈراؤنے ڈراموں کے سلسلے کی ایک کڑی رہی۔ یکسانیت سے بھرپور ان تمام ڈراموں میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ ڈراموں کی ہر قسط میں کوئی نیا چہرہ خون مل کر اسکرین پر نمودار ہو جاتا ہے۔

اگرچہ ڈراؤنے ڈراموں میں اب بھی کچھ زیادہ فرق نہیں نظر آتا تاہم ماضی کے مقابلے میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ اب وہ پٹی پٹائی کہانی تو کم کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے جس میں برسوں یا صدیوں پہلے ظلم کا شکار ہونے والے کسی شخص کی روح اپنا انتقام لینے کے لیے بھوت یا بدروح بن کر زمین پر آجاتی ہے، نہ ہی برگد کے پیڑ پر مقیم کوئی بدروح انسانوں کی جان لینے اور انہیں دہشت زدہ کرنے کے مشن پر کمربستہ نظر آتی ہے۔ حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب ڈراؤنے ڈرامے سیدھے سادے خون آشام بھوتوں چڑیلوں اور پچھل پیریوں کی سیدھی سادی خونی کارروائیوں کو دکھانے کی بجائے خاصے پیچیدہ کرداروں کی الجھی ہوئی کہانیاں پیش کرتے ہیں۔

ڈراؤنے ڈراموں اور شوز کے نئے اور جدت آمیز انداز کے طور پر زی ٹی وی کی پیشکش ''کون ہے؟'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ شو اپنی نوعیت کے ڈراموں کا چربہ ہونے کی بجائے خاصے مختلف فارمیٹ پر مبنی ہے۔ ''کون ہے؟'' دراصل ایک ایسا شو ہے جس کی بنیاد مافوق الفطرت قوتیں اور ان کی محیر العقول صلاحیتیں اور کارگزاریوں پر محیط ہے۔ یہ شو اس لحاظ سے توہم پرستی کو ہوا دینے کی کوشش قرار پاتا ہے کہ اس میں غیر فطرتی اور غیر حقیقی کہانیوں اور کرداروں کو فکشن کے بجائے واقعے اور حقیقت کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ اس توہم پرستانہ مزاج کی وجہ سے ''کون ہے؟'' کو سنجیدہ حلقوں کی کڑی نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسری طرف ''کون ہے؟'' کے پروڈیوسر گریش ملک کا کہنا ہے کہ یہ شو ٹیلی ویژن پر آنے والا دلچسپ ترین پروگرام ہے۔ گریش کہتے ہیں۔ ہم نے پُراسرار واقعات کا شکار ہونے والے افراد اور جگہوں پر تحقیق کی۔ ہمارے پاس ایسی بے شمار شہادتیں موجود ہیں جن کی مدد سے ہم اپنے شو میں پیش کیے جانے والے واقعات کو صحیح ثابت کر سکتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ''کون ہے؟'' کے لیے جن پُراسرار یا بھوتوں کا مسکن قرار پانے والی عمارتوں کی عکس بندی کی جاتی ہے وہاں نہایت جدید قسم کے آلات نصب کیے جاتے ہیں۔ گریش کے مطابق۔ ''ہم نے حساس آلات کی مدد سے نہایت ناقابلِ یقین مناظر اور آوازیں ریکارڈ کی ہیں۔''

''کون ہے؟'' کی طرح ایک اور ڈراؤنا شو ٹی وی اسکرین پر آیا جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ شو اپنی نوعیت کا واحد پروگرام ہوگا۔ ''اکیلا'' کے عنوان سے شروع ہونے والے اس شو کے سپروائزنگ پروڈیوسر سریش پٹنانک کہتے ہیں۔ ''اس فارمیٹ پر آج تک کوئی شو پیش نہیں کیا گیا۔''

یہ صورتِ حال بتا رہی ہے کہ ٹیلی ویژن کی اسکرین روز بروز ڈراؤنی ہوتی جارہی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ٹی وی اسکرین کسی آسیبی مکان کی کھڑکی بن چکی ہے۔ کیونکہ نہ صرف آسیب زدہ پروگراموں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے بلکہ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ان پروگراموں کو مزید خوف ناک اور دہشت انگیز بنانے کا بھی پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں بعد ٹی وی پر نظر آنے والے شوز اس لحاظ سے کہیں زیادہ دہشت ناک ہوں گے کہ ان میں ساؤنڈ ایفیکٹس، جدید ترین کیمرے اور کمپیوٹرائز سافٹ ویئر اہم ترین کردار ادا کریں گے۔ اگرچہ ڈراؤنے پروگرام اپنی یکسانیت کی وجہ سے ناظرین کے دلوں سے اتر چکے ہیں اور حال ہی میں پیش کیے جانے والے ایسے شو مثلاً ''عرفان خان کا مانو یا نہ مانو'' یا ''ڈرنا منع ہے'' اور ''کیا کہیں'' ناظرین میں کوئی تاثر قائم نہیں کر سکے مگر ٹی وی چینلز ناظرین کو کسی نہ کسی طور ڈرانے کی دھن میں ایک کے بعد ایک خوف ناک سے خوف ناک شو تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

پاکستان ٹی وی چینلز نے بھی اس دوڑ میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ ڈان نیوز پر دکھائی جانے والی ہارر سیریز ''مانو یا نہ مانو'' اپنی نوعیت کی سب سے کامیاب سیریز تھی۔ اسے سینئر پروڈیوسر شاہد بھٹی پیش کررہے تھے اور رائٹر تھے

پرویز بلگرامی۔اس شو نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی تھی۔ کیپیٹل ٹی وی سے ''وحشت'' پیش کیا گیا اس کی بھی زیادہ تر قسطیں پرویز بلگرامی نے لکھیں۔ جیو تیز پر قیصر نظامانی کی سیریز چلی ''شش کوئی ہے'' اس کی قسطیں بھی پرویز بلگرامی کے قلم کا شاہکار تھیں۔ ٹی وی ون سے ایک سیریز چلی تھی ''سراغ'' یہ ذرا مختلف انداز کی تھی اور اس کی بھی ابتدائی قسطیں پرویز بلگرامی نے لکھی تھیں۔ ''ایکسپریس'' اور بعد میں ''اب تک'' پر بھی ہارر شو پیش کیے جاتے رہے ہیں۔

اس انسانی جبلت کی پروموشن کے لیے بین الاقوامی سطح پر بھی بہت کام کیا گیا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ یورپ اور امریکی ممالک میں جہاں ریڈر شپ کا تناسب برصغیر کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے جہاں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ وہاں دیگر موضوعات کے علاوہ پُراسرار کہانیوں اور خوف اور دہشت میں مبتلا کردینے والے ناول بھی بہت بڑی تعداد میں چھپتے اور بکتے ہیں۔ ایسی کہانیاں اور ناول لکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے جن میں سے کئی کو اساطیری حیثیت حاصل ہے جن میں اسٹیفن کنگ کے نام سے پُراسرار کہانیاں اور ناول پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں۔

اسٹیفین کنگ کو دنیا کا مقبول ترین ہارر ناولسٹ کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کی کہانیوں اور ناولوں پر بہت سی فلمیں بنائی گئیں جنہوں نے پوری دنیا میں فقید المثال کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے۔

بے شمار ناول اسٹیفین کنگ کے زرخیز قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر ابھر چکے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر قاری کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں۔ کنگ کو انگریزی فکشن کا بے تاج بادشاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کے تحریر کردہ ناول لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ برام اسٹوکر کے بعد وہی واحد مصنف ہے جس نے عام ڈگر سے ہٹ کر ہارر فکشن کا انتخاب کیا اور اس میں ایسا رنگ جمایا کہ اس موضوع کا تصور کرتے ہی کنگ کا نام خود بخود ذہن میں آجاتا ہے۔ کنگ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اس کے ناول The Gren mile کے چھ حصوں کو سب سے زیادہ فروخت ہونے والے ناولوں میں پہلی چھ پوزیشن پر فائز کیا۔ جن کی اشاعت 1996ء میں ہوئی تھی۔

فلم والے کہیں کے بھی ہوں۔ پاپولر فکشن کو اپنی کمائی کا بہترین ذریعہ سمجھ کر اس پر فلم بنانے کا موقع بھی جانے نہیں دیتے۔ کنگ کے بیشتر ناولوں پر بھی مختلف فلم سازوں نے کامیاب ہارر فلمیں بنا کر اس کی پُراسرار کہانیوں کو دوام بخشا ہے۔

پُراسرار اور ہارر فلموں کے ضمن میں اگر الفریڈ ہچ کاک کا ذکر نہ کیا جائے تو ایسی فلموں کی بات کبھی مکمل نہیں ہو گی۔ ہچ کاک ایسا فلم میکر تھا جس نے اپنی پہلی فلم سے لے کر آخری فلم تک خوف، دہشت اور سنسنی خیزی کا منفرد ریکارڈ قائم رکھا۔ اس کی فلمیں دیکھنے والے ہمہ تن گوش و ہوش ہو کر فلم دیکھتے تھے۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ کی سوچ میں گھرا تماشائی اس وقت ایک دم اس طرح چونک اٹھتے تھے جیسے انہیں بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ جب کوئی منظر خوف اور دہشت سے بھرپور سامنے آتا تو تماشائیوں کی سانسیں رک جاتیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتیں، ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ بعض کی تو چیخیں تک نکل جاتی تھیں۔ دہشت اور خوف ناک مناظر سے مزین فلمیں بنانے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس جیسی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا فلم میکر شاید کوئی دوسرا پیدا نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ اس حوالے سے ایک لیجنڈ تھا۔ اس سے پہلے بھی دہشت اور خوف سے بھرپور فلمیں بنائی جاتی تھیں اور اس کے بعد بھی بنتی رہیں گی مگر جو فلمیں ہچ کاک بنا گیا اس جیسی اعلیٰ وارفع معیار کی ہارر فلمیں کوئی نہیں بنا سکے گا۔ ایسی فلموں کی تاریخ میں الفریڈ ہچ کاک کا نام ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں ہسٹیریا اور مرگی تو کیا چھوٹی موٹی بیماریوں کو بھی آسیب کا سایہ اور جن کا قبضہ سمجھا جاتا ہو، پرانے درخت اور خالی مکان بھوتوں کے ٹھکانے کے لیے مختص کردیے جائیں۔ جادو ٹونے، طریقۂ علاج تصور کیے جائیں یہاں تک کہ انسانی بھینٹ کے واقعات بھی کبھی کبھی اور کہیں کہیں رونما ہوتے رہیں۔ وہاں تفریح کے نام پر واہموں کو حقیقت کا روپ دے کر پیش کرنا جہالت کو فروغ دینے کے مترادف ہے مگر ٹی وی چینلوں کے ذمہ داروں کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان کے پروگرام سماج پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں کیونکہ ان کے سروں پر دولت کی ہوس آسیب بن کر مسلط ہے۔

خون آشام

صداقت حسین ساجد

بعض اوقات ایسے واقعات جنم لے لیتے ہیں جنہیں عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا۔ مغربی بنگال کے ضلع ندیا میں بھی ایک ایسا ہی عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا تھا جس پر عقل حیران ہے۔ ایک ناممکن سی بات نظر آئی تھی۔ ایسا واقعہ نہ ماضی میں رونما ہوا اور نہ کبھی رونما ہونے کی اُمید ہے کیوں کہ بھیڑیوں کی خصلت میں خون آشامی ہے۔

ماضی قریب کا ایک اسرار بھرا واقعہ

''ہر وہ چیز جو سمجھ میں نہ آئے وہ پُراسرار یعنی اسرار بھرا کہلاتا ہے اور اسرار ہی ڈر و خوف پیدا کرتا ہے۔ ڈر بھی انوکھا ہوتا ہے، لیکن اس کے اثر سے انکار نہیں ہوسکتا۔'' ولسن نے عینک کے شیشے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''شاید آپ میری بات نہیں سمجھے، خوف کا مطلب آپ کے لیے کچھ اور ہے اور میرے لیے کچھ اور، یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔''

''وہ کیسے......؟'' ہم میں سے ایک بولا۔

''وہ ایسے کہ کوئی بلندیوں سے ڈرتا ہے، تو کسی کو پستیوں سے خوف آتا ہے۔ ایسے لوگ بھی کم نہیں ہیں جو

صرف اندھیرے کا احساس ہوتے ہی دھک سے رہ جاتے ہیں اور کچھ سر پھرے ایسے ہوتے ہیں جو حقیقت سے ذرا دور ہوتے ہی دہشت زدہ ہوجاتے ہیں۔''

ہوٹل میں بیٹھے لوگوں کے لیے یہ بات پُراسرار تھی۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سرگوشیاں کرنے لگے۔ پھر ایسے خاموش ہوئے، جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

ولسن نے جب یہ دیکھا، تو بولنے لگا۔ ''قصے کہانی میں عام طور پر پُراسرار یا ہولناک مقام کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے جس کے پس منظر میں گہرا اندھیرا، گرجتے کڑکتے بادل اور سیاہ ہیولے ضرور ہوتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت میں ایسا ممکن نہیں...... سچ پوچھو! خوف عام طور پر دوپہر کی خاموشی میں پیدا ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت ہی وحشت ناک ہوتا ہے۔''

اب سب توجہ سے اس کی باتیں سننے لگے۔

''دوپہر کا خوف؟ وہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے کہا۔

مجھے ایک ایسا واقعہ یاد ہے، جس کو عقل نہیں مانتی لیکن دوپہر کی دہشت ناکی کا دیکھا ہوا واقعہ ہے۔ فرانس کے ایک گاؤں میں بالکل دوپہر کو ایک کسان، گائیلو سنورشے اپنے کھیت میں اچانک پاگل ہوگیا۔

''ہوسکتا ہے کہ اسے لو لگ گئی ہو۔''

''نہیں...... ایسا کچھ نہیں تھا۔''

''پھر کیا تھا؟''

''ان دنوں ٹھنڈا میٹھا موسم تھا، اس لیے لو لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کھیت بھی صاف ستھرا تھا، ہوسکتا ہے کہ اس بدقسمت کا یہ پاگل ہونا ایک راز بن کر رہ جاتا، اگر تین موقع کے گواہ موجود نہ ہوتے۔ ان تینوں نے بتایا کہ انھوں نے خود گندم کی بالیوں میں گھرے کسان کے گرد تین آتشیں ہیولوں کو ناچتے ہوئے دیکھا، حالاں کہ اس دن ہوا کا دباؤ بھی بہت کم تھا۔''

''آخر وہ کیا تھا جس نے پلک جھپکنے میں گائیلو کو اپنے ہوش وحواس سے محروم کردیا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں کے لوگوں کا کہنا ہے وہ کوئی بدروح تھی، جو بگولا بنی دندناتی اور غراتی ہوئی اپنے شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ یہ باتیں اس کے ذہن میں بھی تھیں اس لیے تیز ہوا کا تھپیڑا لگتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس لیے کہ جو چیز عقل سے ماورا ہو وہ خوف کا باعث ہے۔''

''ممکن ہے۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔

''اسی طرح موپساں نے بھی اپنے ایک افسانے میں انسان کے ذہن پر خوف کے گہرے اثرات کی حالت بیان کی ہے۔ یہ واقعہ ایک پہاڑ پر بنی جھونپڑی کا ہے، جس میں رہنے والا کھڑکی سے باہر دکھائی دینے والے بھیانک چہرے سے دہشت زدہ ہوکر پسینے میں ڈوب کر ساری رات کروٹیں بدلتا رہا، حالاں کہ وہ مکروہ صورت والا چہرہ اس کے کتے کا تھا، لیکن رات کی تاریکی میں تنہا ہونے کے احساس اور طوفانی ہواؤں کی سائیں سائیں نے اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے خوف کو جگا دیا تھا۔'' اتنا کہہ کر ولسن کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''میں اپنی جوانی میں اس افسانے سے بہت متاثر تھا۔ میں نے کئی بار اسے پڑھا تاکہ میری عقل کو وسعت ملے۔ مجھے کوہ پیمائی کے دوران میں کچھ ایسے واقعات سے سامنا کرنا پڑا جو دہشت سے بھرپور تھے۔ میرے اس تجربے کی بنیاد اس دہشت سے بھرپور تماشے پر ہے جو میرے سامنے پیش آیا اور جس کا میرے لاشعور کے احساسات سے گہرا تعلق ہے۔'' جسے پُراسرار ہی کہا جاسکتا ہے۔

کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ انگیٹھی سے کوئلوں کے بار بار چٹخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب لوگ ولسن کی باتوں میں کھوئے ہوئے تھے جو آگ کو تکے جارہا تھا۔

''تماشا...... کون سا اور کیسا تماشا؟''

میں فطرت کی رنگینیوں کو دیکھنے کا بہت شیدائی ہوں۔ اس لیے میرا زیادہ تر وقت گھوم پھر کر ہی گزرتا ہے۔ اس بار میں انڈیا کی سیر کرنے کے لیے چل پڑا تھا۔ اس وقت میں انتیس تیس سال کا تھا۔ میں مکمل طور پر صحت مند تھا اور کسی قسم کے واہموں کا شکار نہیں تھا۔ میرا ارادہ انڈیا کے صوبہ بنگال کے اس صحت افزا ماحول میں دو مہینے قیام کرنے کا تھا۔ ان وادیوں میں گھوم پھر کر قدرت کی خوب صورتیوں کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ میں پورا دن ڈھلوانوں پر پھسلتا ہوا گھنے جنگلات میں اِدھر سے اُدھر گھومتا پھرتا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں راستہ بھول گیا۔ جس وادی میں مجھے شام تک پہنچنا چاہیے تھا، اس کا دور دور تک کوئی نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اب میں یہی کرسکتا تھا کہ یا تو میں وہیں رک جاؤں یا اس علاقے کی تلاش میں لگا رہوں۔ میرے پاس کھانے پینے کی اشیا کی کمی تھی۔ اس کے علاوہ صرف دو چادریں

تھیں۔ مگر جیب میں ہاتھ ڈالا، تو چاکلیٹ کا پورا پیکٹ ملا۔ میں خوشی سے سیٹی بجاتے ہوئے اور ساتھ ہی گنگناتے ہوئے آگے کی طرف چل پڑا۔

ایک میل کے فاصلے پر سڑک نظر آئی اور گرتا پڑتا ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ وہاں تیس چالیس گھر آباد تھے۔ ملائم گھاس اور جگہ جگہ رنگ برنگے پھولوں سے بھری ہوئی کیاریاں تھیں۔ میں نے مزید آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک دروازے پر دستک دی۔

ایک موٹا تازہ بندہ باہر نکلا اور مسکرا کر کہنے لگا۔

''آپ زمیندار جی کے ہاں چلے جائیں۔''

میں ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان بول لیتا تھا۔ اسی کی زبان میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے کی طرف چل دیا۔ زمیندار کی حویلی نہایت پرانی لیکن اعلیٰ شان کی تھی جس کے پچھلے حصے میں دو بوڑھے میاں بیوی رہتے تھے۔ یہ ان ہی کی ملکیت تھی۔

انہوں نے جس طرح خوشی سے میرا استقبال کیا، اس سے واضح تھا کہ وہ بہت مہمان نواز ہیں۔ زمیندار کیدار ناتھ کو اخبار پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کلکتہ سے اخبار منگواتا اور باورچی خانے میں آگ کے پاس بیٹھ کر کافی دیر اخبار پڑھتا رہتا۔ اس کی بیوی ممتا اس سے عمر میں بڑی تھی۔ وہ بہت چپ چپ سی رہتی تھی اور کم ہی بولتی تھی۔ مہمان خانہ بہت صاف ستھرا تھا اور اسپائسی کھانا بڑی باقاعدگی سے پیش کیا جاتا تھا۔

مجھے کیدار کے مہمان خانے میں قیام کیے ہوئے ابھی تین ہی دن ہوئے تھے۔ اس کے اچھے سلوک کی وجہ سے میں اس کا گرویدہ ہو چکا تھا مگر مجھے اس کی آنکھوں میں بہت تکلیف اور بے چینی دکھائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ عجیب طرح سے بیٹھا ہوا نظر آتا۔ اخبار اس کی گود میں پڑا ہوتا اور سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوتا۔ یوں لگتا کہ جیسے وہ کچھ غور سے سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا مہمان خانہ ہر طرف سے جنگل سے گھرا ہوا تھا۔ آبادی سے الگ ہونے کی وجہ سے اکثر یہاں بہت اداسی اور افسردگی کا راج رہتا۔

ایک صبح ناشتا کرنے کے بعد وہ آس پاس کے علاقوں کی سیر کے لیے نکلا۔ قدرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جب میں واپس ہونے لگا تو مجھے سرخ رنگ کی کوئی چیز دکھائی دی۔ ایک ایسی جگہ پر جہاں ہر طرف سبز گھاس ہو اور درختوں کی کثرت ہو، وہاں یہ سرخی کچھ عجیب سی لگی۔

میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچ کر دیکھا تو میں دھک سے رہ گیا کہ ہر طرف خون بکھرا پڑا تھا۔ پاس والی چٹان خون سے سرخ تھی۔ میں دیکھنے کے لیے چند قدم آگے بڑھا۔ مجھے ایک موٹی تازی بکری کی لاش نظر آئی جسے کچھ ہی دیر پہلے مارا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ بکری چٹان سے گر کر ہلاک ہوئی ہے لیکن غور کرنے پر پتا چلا کہ بکری کا گلا کاٹا گیا تھا۔ سینہ بھی وحشت ناک انداز میں چاک کیا گیا تھا۔ یہ یقیناً کسی بہت خطرناک درندے کا کام تھا۔

میں نے اپنی حفاظت کے لیے درخت سے ایک بڑی شاخ توڑی اور اسے لہراتا ہوا مہمان خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں مجھے ایک چرواہا ملا۔ جب میں نے اسے بکری کے بارے میں بتایا تو وہ پریشان ہو کر کہنے لگا۔

''یہ بلا ہمیں بہت دنوں سے تنگ کر رہی ہے۔ گلے سے بھیڑ بکریاں اٹھا کر لے جاتی ہے اور گائے بھینس کو بھی نہیں چھوڑتی۔''

مہمان خانے میں جا کر میں نے کیدار کو اس واقعے کے بارے میں بتایا، تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے تکتے ہوئے ہکلا کر بولا۔ ''کسی خوف ناک درندے نے پچھلے کئی ہفتوں سے اس علاقے میں تباہی مچا رکھی ہے۔ بھیڑ بکریوں اور گائے بھینسوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اسے گردنیں چبانے کا بہت شوق ہے۔ مقامی شکاریوں نے اسے مارنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکے کیوں کہ اس طویل تلاش میں اس کی شکل تک دکھائی نہیں دی، اللہ جانے! وہ کوئی جنگلی جانور ہے یا وحشی درندہ مجھے تو خطرہ ہے کہ وہ بکری میرے گلے کی نہ ہو حالاں کہ میں نے اپنی چراگاہ کے اطراف میں باڑ لگا رکھی ہے۔''

میں نے کیدار کی یہ بات بظاہر تو مان لی لیکن میرا دل مان نہیں رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، کیوں کہ اس کا چہرہ دہشت زدہ تھا۔ ممتا کا بھی یہی حال تھا۔ یہ ان کا ذاتی مسئلہ تھا، اس لیے میں نے اسے جوں کا توں رہنے دیا۔ تاہم یہ واقعہ میرے ذہن پر ایک بھوت کی طرح سوار ہو گیا۔ میں اب وہاں سے، جہاں بکری کی لاش پڑی ہوئی تھی اپنی واپسی پر نادم تھا۔ میں نے کھانے سے فارغ ہو کر مزید کھوج لگانے کے لیے ایک دفعہ پھر اس جگہ کا رخ کیا تاکہ پتا چل سکے کہ اصل معاملہ کیا تھا۔

راستے میں ایک لکڑ ہارا درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا۔ میں نے چپکے سے اس کی چھوٹی کلہاڑی اٹھالی اور اسے اپنی حفاظت کے لیے رکھ لیا۔

اس مضبوط ہتھیار کے ملنے سے میرا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا۔ میں بڑی تیزی سے چلتا ہوا اس جگہ پر پہنچا۔ سورج کی گرمی کی وجہ سے خون کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا۔ بکری کی لاش وہاں سے غائب تھی۔ شاید اسے جنگلی اٹھا کر لے گئے تھے یا وہ درندہ اپنی کھوہ میں کھینچ کر لے گیا تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ میں نے کلہاڑی دائیں ہاتھ میں پکڑی اور بہت حوصلے سے کام لیتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر لاش ڈھونڈنے لگا۔

چند گز کے فاصلے پر خون کے نشان ختم ہو گئے تھے لیکن زمین پر بکری کی پچھلی ٹانگوں کے گھسٹنے کے صاف نشان موجود تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ درندہ کچھ زیادہ طاقت ور نہیں ورنہ وہ اسے گھسیٹنے کے بجائے منہ میں اٹھا کر لے جاتا۔ مجھے پتا تھا کہ ایک طاقت ور شیر مردہ بیل کی کمر میں اپنے دانت مضبوطی سے گاڑ کر اسے آسانی سے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس وقت وہاں مکمل سناٹا تھا اور سورج کی چمکیلی کرنوں میں پتوں کی سرسراہٹ واضح سنائی دے رہی تھی۔ زمین پر نشان مدھم ہوتے جا رہے تھے اور لمبی لمبی گھاس کے پاس پہنچ کر بالکل ختم ہو گئے تھے۔

میں اندازے سے اس چٹان کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ دو میل کا سفر طے کرنے کے بعد جب میں وہاں پہنچا تو دن ڈھل رہا تھا۔ مجھے کوئی فکر نہ تھی، کیوں کہ سورج کے ڈوبنے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہاں ایک گھنٹا اور رک کر جاننے کی کوشش کروں اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے مہمان خانے واپس پہنچ جاؤں۔

میں نے پہاڑی چوٹی سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن بکری نہ ملی۔ میں کلہاڑی مضبوطی سے پکڑے پاس والی گھاٹی میں اتر گیا لیکن وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ مایوس ہو کر میں واپس چل پڑا۔ ابھی کچھ ہی دور چلا تھا کہ ایک غار کا منہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا دکھائی دیا۔ وہ پتھروں اور کنکریوں سے چھپا ہوا تھا۔

پاس جا کر پتا چلا کہ وہ ایک بہت بڑا غار تھا۔ غار کے منہ کے پاس بکری کی لاش پڑی تھی۔ اس کا سر غائب تھا اور باقی جسم ویسے ہی پڑا ہوا تھا۔ پاس ہی دوسرے جانوروں کی ہڈیاں اور گلا سڑا گوشت بھی موجود تھا۔

یہ دیکھ کر پہلے تو میں ڈرا، لیکن پھر ہمت کر کے اندر داخل ہو گیا۔ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا اور اندھیرا بہت زیادہ تھا۔ اس دہشت ناک ماحول نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ مجھے یوں لگا کہ یہ غار میلوں تک زمین کے اندر دھنسا ہوا ہے۔ میں اپنی زندگی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گرتا پڑتا غار سے باہر آ گیا۔

تبھی مجھے غار کے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی اپنا جسم کھجا رہا ہے۔ کوئی بہت جارحانہ انداز سے اپنا جسم دیوار سے رگڑ رہا ہو۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہاں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کلہاڑی کو مضبوطی سے تھام لیا کیوں کہ دہشت سے نجات کا ذریعہ یہی تھا۔ میں آہستہ آہستہ الٹے پاؤں چلتے ہوئے اس مکروہ جگہ سے کچھ دور ہو گیا جہاں چٹانوں کے پاس لمبی لمبی گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ تبھی میں نے کسی کی بڑی ناگوار آواز سنی، جیسے کوئی کھوں کھوں کر رہا ہو۔ یہ کسی بن مانس کی آواز لگ رہی تھی۔

جیسے ہی یہ آواز میں نے دوبارہ سنی، تو میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھا۔

میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں مڑ کر پیچھے دیکھ سکتا اور تیزی سے چلتا ہوا مہمان خانے پہنچ گیا۔

میرے دیر سے آنے کی وجہ سے رات کے کھانے میں بھی دیر ہو گئی۔ میں بار بار یہی سوچتا رہا کہ اس واقعے کے بارے میں کیدارے بات کرنا کیسا رہے گا؟ مجھے پچھلے واقعہ کے ردِعمل کا اچھی طرح احساس تھا۔ بہر حال جب میں نے ذکر کیا، تو اس کا رنگ اڑ گیا لیکن وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ”اگر درندگی کا یہی حال رہا تو مقامی انتظامیہ کو اس کے بارے میں اطلاع دینا مناسب رہے گا کہ وہ اس کی ہلاکت کا بندوبست کریں۔“

میں نے اس مسئلے کی دہشت ناکی کا ذکر نہ کیا۔ صرف اتنا کہا۔ ”میں نے وہ غار ڈھونڈ لیا ہے، جو شاید اس کا ٹھکانا ہے اس لیے اپنا بچاؤ کرنا بہت ضروری ہے۔“

میاں بیوی کی باتوں سے صاف لگتا تھا کہ وہ بہت خوف زدہ تھے، اس لیے اس کے خلاف کسی قسم کی خطرناک کارروائی سے جان بوجھ کر کترا رہے تھے۔ اس غار کے واقعے اور جنگل کے سنسان اور دہشت ناک ماحول کی وجہ

سے ان کا یہ رویہ درست ہی لگتا تھا۔ بہرحال اس معاملے پر میں نے زیادہ سر کھپانے کا ارادہ ختم کر دیا، کیوں کہ میں تو چند دن کا مہمان تھا۔ پھر میں سو گیا۔

صبح اٹھا تو میری طبیعت بوجھل سی تھی ۔ غار والے واقعے نے مجھ پر بہت اثر ڈالا تھا۔ میں اس بوجھ کو اتارنے کے لیے پولیس چوکی کی طرف چل دیا۔ میں نے ان سے غار اور بکری کا سارا قصہ بیان کیا لیکن آفیسر نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس نے کہا۔ ''اس علاقے میں بھیڑ بکریوں کی ہلاکت کوئی نئی بات نہیں۔''

''اور غار؟''

''یہ صرف آپ کا وہم ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔''

وہاں سے مایوس ہو کر میں واپس چل پڑا۔ راستے میں ایک مندر دکھائی دیا۔ میں نے اپنے کیمرے سے اس کی دیواروں پر بنی ہوئی شان دار مصوری کے نمونوں کی تصاویر اتاریں۔ ایک تصویر دیکھ کر تو میں دھک سے رہ گیا۔ وہ تصویر مصور کے فن کا کمال تھی لیکن خباثت سے لتھڑا ہوا منظر سخت نفرت انگیز اور کریہہ تھا۔

ممکن ہے کہ اس کی وجہ مندر میں اندھیرا، پُراسرار ماحول اور سناٹا بھی ہو، لیکن جانے کیوں اس کی تصویر بناتے ہوئے میں خوف کے بارے کپکپانے لگا۔ بل کھاتی ہوئی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی۔ بے ڈول سر مینار کی طرح تنا ہوا۔ اس کا باقی سارا جسم سرکنڈوں اور گھاس پھوس سے چھپا ہوا تھا۔ وہ عورت تھی جس کے دانت مڑے ہوئے بہت تیز اور چمکیلے نظر آرہے تھے۔ دونوں آنکھیں سانپ کی طرح کی تھیں۔ وہ بلا اپنے دونوں پنجوں جیسے ہاتھوں میں انسانی سر کو تھامے ہوئے تھی۔ مصور نے اس تصویر کو اتنی مہارت سے بنایا تھا کہ وہ تصویر حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ ابھی نکل کر باہر آجائے گی۔

سچ پوچھیں، تو میں اس تصویر کے بارے میں اپنے درست تاثرات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ لندن واپس پہنچ کر اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کروں گا۔ جیسے ہی میں نے کیمرے سے اس ہولناک منظر کی تصویر کھینچی، گرجا گھر کے پیچھے عجیب سا شور سنائی دیا۔ میں سمجھا کہ ممکن ہے کہ پجاری کے آنے پر اس کا استقبال کیا جا رہا ہے۔ میں بھاگ کر باہر صحن میں آیا، تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے کچھ ایسا دکھائی نہ دیا جس سے اس

شور کا سبب پتا چل جاتا۔ مندر میں میرے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ مجھے اس شور کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

اس لیے میں اپنا کیمرا سنبھال کر تیزی سے لوٹ آیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں پورا دن اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ جب میں جاگا، تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ وقت دیکھا، تو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ میں کھڑکی میں کھڑا ہو کر نیچے وادی کا نظارہ کرنے لگا۔ ہر طرف چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف املی اور آم کے درخت قطاروں میں کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ہی کیدار کا محافظ کتا بے اختیار بھونکنے لگا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ کتا بری طرح سے غرا رہا تھا اور نیچے جھاڑیوں سے لگا تار کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آرہی تھی۔

اچانک کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ کیدار بھاگتا ہوا آیا اور کتے کو ڈانٹ پھٹکار کر زنجیر سے صحن میں باندھ دیا۔ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سے ایسے لگتا تھا کہ جیسے کوئی درندہ یا بھاری بھر کم شے جھاڑیوں سے اپنا کریہہ جسم بار بار رگڑتے ہوئے کسی مقصد سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہی ہے۔ چند لمحوں کے بعد وہ ان دیکھی بلا پہاڑ کی ڈھلان سے ہوتی مہمان خانے سے دور کہیں جنگل میں چلی گئی۔ میں نے اس بات کو ذہن سے جھٹکا اور رات کا مزے دار کھانا جی بھر کر کھایا۔ پھر میں اپنے نقشے اور کاغذات نکال کر اپنے تحقیقی کام میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

ٹھنڈی رات میں باورچی خانے کا گرم ماحول بہت خوش گوار تھا۔ کیدار کی عادت تھی کہ وہ رات سوتے ہوئے باورچی خانہ بند نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر اسے لکڑی کا شہتیر دروازے پر لگا کر بند کر دیتا تھا لیکن وہ بہت بھاری تھا، اس لیے عام طور پر ویسے ہی کھلا رہتا۔ میں رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ انگیٹھی میں آگ کم ہوئی تو اسے بھڑکانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ میں نے پھر وہی کھڑ کھڑاہٹ سنی۔ میں توجہ سے سننے لگا۔ یہ آواز باہر سے آرہی تھی اور ہوا کی سرسراہٹ، بہتے پانی کی مدھم آواز یا کسی پیدل چلتے ہوئے انسان کے قدموں کی آواز سے بالکل مختلف تھی۔

میں پنجوں کے زور پر آہستہ سے چلتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا۔ وہی آواز دوبارہ آئی۔ وہ بالکل اس ناگوار کھڑ کھڑاہٹ سے ملتی تھی، جو میں نے رات کو سنی تھی۔ کبھی یہ کھڑ کھڑاہٹ کھر کھچنے میں بدل جاتی۔ ایسے لگتا تھا کہ کوئی اپنا جسم آہستہ سے دیوار سے رگڑ رہا ہو۔ یہ آواز یقیناً غیر ارادی لیکن بہت پُر اسرار تھی۔ جیسے کوئی معذور اپنی دونوں بیساکھیوں کو زمین پر گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا ہو۔ اچانک ایک بار پھر کتا بھونکنے اور غرّانے لگا۔ لگتا تھا کہ کتے کو کچھ غیر معمولی شے دکھائی دے رہی ہے، جو مہمان خانے میں گھسنے کی کوشش میں ہے۔

یہ خیال آتے ہی میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا تاکہ اسے کسی نہ کسی طرح سے بند کر سکوں۔ میں ڈرپوک یا بزدل انسان نہیں ہوں لیکن جانے اس رات مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ لکڑی کے اس وزنی شہتیر کو اٹھا کر باورچی خانے کا دروازہ بند کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے میں روشنی سے ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا کہ اس درندے کو میرا سایہ دکھائی نہ دے سکے۔ میں روشنی نہیں بجھانا چاہتا تھا، کیوں کہ اس طرح میں اپنے آپ سے بھی ڈر جاتا۔

کھڑ کھڑاہٹ اب بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کسی ہتھیار کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن کچھ نہ ملا۔ کچھ دیر سناٹا چھایا رہا اور پھر وہی اچانک مکروہ آواز آئی، جو میں نے پہلے غار کے پاس سنی تھی۔ کتا ایک بار پھر زور سے بھونکا اور پھر غرّانے لگا۔ میں خوف زدہ ہو کر رہ گیا۔ پھر اچانک چر چراہٹ ہوئی۔ کوئی باہر دروازے کے تختے زبردستی اوپر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔

میرے لیے یہ جاننا بہت کٹھن تھا کہ باہر دروازے پر کوئی وحشی درندہ ہے یا بھٹکی ہوئی روح؟ لیکن اتنا پتا تھا کہ اس کا سامنا میں نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اس کی مکروہ شکل دیکھ کر ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھوں۔ میں نے پوری قوت سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن باہر سے دباؤ بہت زیادہ تھا۔ اس کش مکش میں دروازے کا تختہ کوئی دو انچ کے قریب اوپر اٹھ گیا۔ خوف سے جان نکلی جا رہی تھی لیکن میں نے اپنی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے دروازہ بند کر ہی دیا۔ پھر میں کھٹکے کے ساتھ چٹ گیا۔ میری اس کوشش کے باوجود تختہ پھر اوپر ہونے لگا۔

میں کیدار کو بلانا چاہتا تھا لیکن میری آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے ایک اینٹ کے سہارے دونوں پاؤں جما کر اپنی پوری قوت لگا کر دروازے پر دباؤ ڈالا تاکہ درندہ

اندر نہ آسکے۔ میرا جسم کانپ رہا تھا اور حوصلہ پست ہوتا جارہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے، جو میں اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کرسکوں۔ مجھ سے چھ فٹ دور لکڑی کا شہتیر پڑا ہوا تھا۔ میں اپنی دونوں ایڑیاں دروازے کے ساتھ لگا کر الٹا لیٹ گیا اور لرزتے ہاتھوں سے شہتیر کا سرا اٹھا کر اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

باہر سے دباؤ کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جیسے ہی میں نے تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کی، میرا پاؤں پھسل گیا اور شہتیر ایک خوف ناک آواز کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ ساتھ ہی انگیٹھی کے اوپر رکھی ہوئی چائے دانی بھی فرش پر جاگری۔ یہ شور سن کر کتا زور زور سے بھونکنے اور غرانے لگا۔ کیدار جاگ گیا اور کتے کو اونچی آواز میں ڈانٹتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ممتا نے اوپر والی منزل پر لیمپ جلا دیے۔ اس وقت باہر سے دباؤ رک چکا تھا۔ میں نے اپنا حوصلہ جمع کیا اور شہتیر کو دروازے کے ساتھ مضبوطی سے لگا دیا۔

اس کے بعد جو ہوا، وہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ کیدار کا حیرت اور خوف سے گنگ چہرہ، کتے کا پاگلوں کی طرح بھونکنا اور غرانا، میری پاگلوں جیسی حالت اور اٹک اٹک کر بولنا۔ یہ سب سنا کر میں آپ کو اکتاہٹ میں جتلا نہیں کرنا چاہتا۔ ہم پوری رات جاگتے رہے۔ اس سے پہلے میں بھی ایسی خوف ناک صورتِ حال سے دو چار نہیں ہوا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا جسم ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور ساری قوت نچڑ گئی ہے۔

یوں لگتا تھا کہ میری جان کسی وقت بھی نکل جائے گی۔ اس کے باوجود میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کیدار سے مل کر تمام دروازوں کو محفوظ بنا دیا۔ ہم سارے لیمپ جلا کر اوپر والی منزل پر چلے گئے۔ کیدار کو ایک عجیب خیال سوجھا۔ اس نے زینے کے نیچے اور ابتدائی سیڑھیوں پر بہت سے برتن رکھ دیے تا کہ ان کے بجنے سے درندے کے آنے کا فوراً پتا چل جائے۔ ہم تینوں کے پاس ایک رائفل تھی اور سونے والے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ اجالا ہونے میں بھی پورے چار گھنٹے باقی تھے۔ رات کا سناٹا طاری تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ اور پتوں کے معمولی سے کھڑکنے سے ہم چونک جاتے۔ ہم نے اپنے حساب سے اس دہشت ناک واقعے کے بارے میں بات کی۔ ان میاں بیوی کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں اس واقعے کی دہشت اور اہمیت کا پورا پورا احساس ہے، لیکن جانے کیوں وہ اس کے بارے میں بات کرنے سے ڈر رہے تھے۔ اچانک میں نے ممتا کی سرگوشی سنی۔ ''وہ بھی اتنا قریب تو نہیں آئے تھے۔''

یہ سنتے ہی کیدار نے اس کا کندھا دبا دیا اور وہ اچانک خاموش ہوگئی۔ میں چونک اٹھا۔

''کک...... کک..... کون وہ کبھی اتنا قریب نہیں آئے تھے؟''

''کک...... کک...... کچھ نہیں۔''

مجھے پتا تھا کہ وہ اب اس بارے میں مزید نہیں بتائیں گے۔ میں دوبارہ اس بارے میں سوچنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایسا کون سا حیوان ہے جو انسان کی طرح دروازے کے تختے اوپر اٹھا سکے۔ ہوسکتا ہے کہ بندر یا لنگور ایسا کر لیتے ہوں یا پھر کسی ہرن یا بارہ سنگھے کے سینگ دروازے کے تختے میں پھنس جائیں تو وہ انھیں چھڑانے کی کوشش میں اپنے سر کے زور سے تختے کو اوپر اٹھا لے لیکن دروازے کے باہر موجود اس درندے یا بدروح نے بہت آسانی سے ایک انسان کی طرح اس تختے کو اوپر اٹھا لیا تھا۔ وہ کون ہوسکتا ہے کافی سوچنے کے بعد بھی ذہن ماؤف رہا اور تنگ آ کر اس کے بارے میں مزید سوچنا چھوڑ دیا۔ کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے سیدھے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اسی خوف کی حالت میں سو گیا۔ صبح جاگا، تو چھ بج رہے تھے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جنگ کے دنوں میں بھی مجھے ایسے حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ باہر پرندے چہچہا رہے تھے۔ کیدار کا مرغ اذان دے رہا تھا۔ مرغیاں کٹ کٹ کرتی پھر رہی تھیں۔ کتا بھونک بھونک کر رات کے واقعے کو یاد کر رہا تھا۔ ہم اتنے خوف زدہ تھے کہ سات بجے سے پہلے نیچے اترنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔ ہم نے سب سے پہلے چاروں طرف کی کھڑکیاں کھول کر دور دور تک دیکھا لیکن وہ درندہ کہیں دکھائی نہ دیا۔

پاس ہی ایک ریڑھا چرچراتا جارہا تھا۔ اس پر ایک آدمی سوار تھا اور دوسرا اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ممتا یوں نظر آرہی تھی جیسے رات کو کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ یہ دیکھ کر میں نے ہمت سے کام لیا اور بھاری شہتیر ایک طرف ہٹا

دیا۔ پھر باہر دھوپ میں نکل آیا۔ میں اس دروازے کو تکنے لگا جس کے ساتھ رات کو میری اور اس مکروہ صورت مخلوق کی زور آزمائی ہوئی تھی۔

دروازے کے بالکل باہر کچھ عجیب سے قدموں کے نشان تھے۔ انھیں پنجوں اور پاؤں کے نشان کہا جا سکتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے پاؤں جیسے۔ میں حیرت سے انھیں تکتا رہا۔

کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ ولسن اپنی بات ختم کر کے بہت سنجیدگی سے انگیٹھی میں بھڑکتے شعلوں کو تکے جا رہا تھا۔

”ممکن ہے کہ وہ کسی بندر کے پاؤں کے نشان ہوں؟“ پینڈر نے ہچکچا کر کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ ولسن نے مڑ کر جواب دیا۔ ”میں بندر کے پاؤں کے نشانات اچھی طرح جانتا ہوں۔ مہمان خانے اور پورے راستے اس درندے کے پاؤں کے نشان جوڑی کی شکل میں موجود تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بدروح یا درندہ اپنی پچھلی ٹانگوں کے سہارے چل رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی صرف دو ٹانگیں ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ غار سے واپسی پر میں نے اکثر جگہوں سے غصے میں آ کر وہ نشان مٹا ڈالے تھے، حالاں کہ یہ میری بے وقوفی تھی۔ میں نے کیدار کو بہت سمجھایا۔

”آپ میری بات مانیں اور کچھ دنوں کے لیے یہاں سے دور چلے جائیں۔“

لیکن وہ دونوں میاں بیوی نہ مانے۔ ”ہم ایسا نہیں کر سکتے۔“

مجھے ان کے بارے میں بہت پریشانی تھی، اس لیے انھیں مشورہ دیا۔ ”چلیں! یوں کریں کہ کم سے کم دو چار خون خوار کتے اپنی حفاظت کے لیے ضرور رکھ لیں اور تمام دروازوں پر لوہے کی چٹخنیاں لگوا لیں۔“

اچانک کیدار کے لبوں میں حرکت پیدا ہوئی لیکن وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔ ”اس سے وہ بلائیں رک جائیں گی کیا۔“

”کیا مطلب؟“

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی بیوی ممتا کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا۔ ان دونوں کے اچھے سلوک نے چند ہی دنوں میں مجھے ان کا شیدائی بنا ڈالا تھا۔

میری ہمت نہیں تھی کہ اتنے بڑے واقعے کے بعد میں وہاں رکتا۔ میں نے تیاری کی اور ان سے اجازت چاہی۔

میں نے جاتے جاتے انھیں سخت تاکید کی۔

”اچھا! یہ کام تو کر سکتے ہیں...... آپ؟“

”کون سا؟“

”یہی کہ شکاریوں کو بھیج کر غار کے اندر چھپی اس بلا کو تلاش کریں۔“

”ٹھیک ہے۔“

مجھے خطرہ تھا کہ ایک دن وہ بلا ان کے لیے جان کا خطرہ بن جائے گی۔ کیدار نے بہت اداسی سے مجھے دیکھا اور شکریہ ادا کرتا ہوا دروازے تک چھوڑنے آیا۔ میں اپنے منصوبے کے مطابق اس غار سے میلوں دور ایک اور گاؤں کی طرف چل دیا۔ مجھے بار بار ان جرمن میاں بیوی کا خیال آتا رہا، جو اصل میں موت کے شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے لیکن مجبور تھے کہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے تھے۔ کبھی مجھے اس مہمان خانے کی ویرانی کا خیال آتا، تو بے قرار ہو کر رہ جاتا۔ ساتھ ہی اس مکروہ غار کا خیال آتا اور رات کو بدروح کا حملہ یاد آتا، تو دہشت سے کانپ اٹھتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ لندن واپسی سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے کیدار سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ پھر ایک دن میں سفر کی تکلیفیں برداشت کرتا ہوا اس علاقے میں پہنچ گیا۔

میں یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ پورا علاقہ خوف کی لپیٹ میں تھا۔ حویلی کے باہر پولیس والے موجود تھے۔ میں نے ایک پولیس والے سے پوچھا۔ ”جناب! یہ لوگ اتنے سہمے سہمے کیوں ہیں؟“

”اس لیے کہ کسی درندے نے کل رات کیدار اور ممتا کو ہلاک کر دیا ہے۔“

”کیا؟“

”جی ہاں...... یہ سچ ہے۔“

میں جلدی سے مہمان خانے کی طرف بھاگا۔ [illegible]ے میں ان کے جسم کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ دیواریں خون سے ایسے سرخ ہو رہی تھیں جیسے ہلاک [illegible]تے وقت ان کے جسموں سے خون کے فوارے چھوٹے [illegible]ں۔ یقیناً انھیں بہت وحشیانہ طریقے سے ہلاک کیا گیا تھا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں کے سر غائب تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے مندر کی وہی مکروہ تصویر یاد آ[illegible] اور

میں سخت افسردہ ہوگیا۔ مجھے اس بات کا بہت دکھ تھا کہ میری بہت کوششوں کے باوجود وہ مکان کو کچھ دنوں کے لیے چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئے تھے۔ اگر وہ مان جاتے، تو ان کی جان بچ سکتی تھی۔ یہ صرف قسمت کی بات تھی کہ میں اس بلا سے بچا رہا۔

مجھے اس بات کا بھی بہت دکھ تھا کہ میری بروقت رپورٹ پر بھی پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی ورنہ اس غار میں بسنے والے مکروہ درندے کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

اب میں نے تفصیل سے پولیس آفیسر سے بات کی۔ میری یہ باتیں جان کر پولیس سارجنٹ کا رنگ اڑ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کیدار اور ممتا کی موت کی وجہ اس کی غفلت تھی۔ اس نے فوراً ہی ردِعمل ظاہر کیا اور چند گھنٹوں کے اندر ماہر شکاریوں کی ایک جماعت کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ غار میں گھس کر اس مکروہ درندے کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیں۔ میں بھی اس جماعت کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن ہمت جواب دے گئی۔

جب شام کو وہ لوگ واپس آئے، تو سارجنٹ کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ''وہ جگہ بہت خطرناک ہے اور ٹارچ کی مدد سے بھی وہاں کسی درندے کا شکار کرنا بہت مشکل ہے۔''

وہ لوگ غار کے بھیانک ماحول سے بہت ڈرے ہوئے تھے۔ اگرچہ اندھیرے میں انہوں نے اندھا دھند گولیاں چلائی تھیں لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کچھ سوچ کر اگلے دن پر بات ٹل گئی تھی۔

اگلے دن جب ہم روانہ ہوئی تو میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ میدناپور سے بھی نفری آگئی تھی۔ پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ ہم نے غار کو گھیر لیا۔ اندر کون سا درندہ ہے کسی کو معلوم نہ تھا۔ درندے کو باہر نکالنے کے لیے مٹی کے تیل میں بھیگے کپڑے کے گولے آگ لگا کر اندر پھینکے جارہے تھے۔ غار میں دھواں بھرتا جارہا تھا کہ پہلے ایک قدآور بھیڑیا غراتا ہوا نکلا۔

پھر اس کے پیچھے دو اور بھیڑیے نکلے۔ انہیں دیکھتے ہی گولیوں کا نشانہ بنادیا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد باہر نکلنے والے کو دیکھ کر ہر کوئی حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ دو انسانی بچے تھے جو چاروں ہاتھ پیروں سے چلتے ہوئے باہر آئے تھے۔ بھیڑیوں کے غار میں کسی انسانی بچے کا پایا جانا حیران کن بات تھی۔ اسے پکڑنے کے لیے ایک سپاہی نے کوشش کی تو اس نے بالکل بھیڑیئے کی طرح سے اس پر حملہ کردیا۔ بڑی مشکل سے ان دونوں پر مچھلی پکڑنے کا جال ڈال کر پکڑا گیا۔ انہیں میدناپور لے جایا گیا۔ انگریز کلکٹر نے انہیں حکومتی تحویل میں لے لیا۔ اس کے بارے میں تحقیق شروع ہوئی تو ایک نئی کہانی ابھر کر سامنے آگئی۔ تقریباً دس سال قبل ڈیڑھ سال اور چھ ماہ کے دو بچے گاؤں سے غائب ہوئے تھے۔ یہ دونوں بچے کیدار کے تھے۔ ہندوؤں کی ایک پوجا ندی کنارے سرانجام دی جاتی ہے۔ ممتا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ پوجا کرنے گئی تھی کہ بچے غائب ہوگئے۔ اندازہ کیا گیا کہ وہ یہی دونوں بچے ہوں گے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں بھیڑیئے کے بھٹ میں کیسے پہنچے۔ بچوں کی حالت سے اندازہ ہورہا تھا کہ انہیں بھیڑیے نے اپنے دودھ پر پالا۔ یہ بچے لندن تک لائے گئے لیکن زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے۔ ان کی تصویروں سے اخبارات بھرے رہے لیکن یہ راز آج تک کھل نہ سکا کہ بھیڑیے اپنی فطرت کے مخالف انسانی بچے کو کیسے پالتے رہے۔

''عجیب قصہ ہے!''

ہم میں سے ایک سرگوشی میں بولا، تو ولسن نے کہا۔

''اور سب سے حیران کن بات تو یہ ہے کہ جب لندن واپس پہنچ کر میں نے مندر کی تصویریں بنوائیں، تو ایک تصویر بالکل کوری نکلی۔ اس کا پورا عکس غائب تھا اور وہی تصویر میرے لیے سب سے زیادہ اہم اور تحقیق کے لائق تھی۔ آپ ضرور سمجھ گئے ہوں کہ میں کس تصویر کی بات کررہا ہوں؟''

کمرے میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ولسن کی بات سن کر اچانک سب کی نگاہوں میں اس مخلوق کی تصویر گھومنے لگی۔ جس کی بل کھاتی ہوئی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور بے ڈول سر کھمبے کی طرح تنا ہوا تھا۔ انہیں اچانک یوں لگا کہ جیسے وہ اپنے دونوں پنجے نما ہاتھوں سے کیدار اور ممتا کے جسم مضبوطی سے تھامے ان کے سر چبانے کی کوشش کررہی ہے لیکن نہیں، وہ تصویر کسی درندے کی نہیں ہندوؤں کی ایک دیوی کالی کی تھی۔ جسے ہم عفریت سمجھے۔ ایسا لگتا ہے کہ کیدار اور ممتا کا قتل ہوا تھا کیونکہ وہ اپنے بچوں کو واپس لینا چاہتے ہوں گے اور مادہ بھیڑیا بچے واپسی کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ ہے ناں ایک پُراسرار بات؟

نانگا پربت کا عقاب

ندیم اقبال

ارض پاک کو خدا نے بے شمار نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ قدرتی حسن سے اس طرح مالا مال کر رکھا ہے کہ اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملتی جو لوگ سوئٹزر لینڈ کے قدرتی حسن پر رطب اللسان رہتے ہیں انہیں سوات و مری و نتھیا گلی دیکھنا چاہیے جو سہارا ڈیزرٹ کی خاموشی کی تعریف کیا کرتے ہیں انہیں چولستان دیکھنا چاہیے جو نیپال کے ہمالیائی حسن کے گن گاتے ہیں انہیں بلتستان کی سیر ضرور کرنا چاہیے۔ اسی خیال کے تحت ”سیرِ پاکستان“ کے سلسلے کو شروع کیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں اَب تک جتنی بھی تحریر شامل ہوئیں یہ تحریر ان سے ذرا مختلف ہے کیونکہ ندیم اقبال عالمی پیمانے کے عکاس ہیں۔ قدرتی حسن کی فوٹو گرافی میں ان کی شہرت بہت زیادہ ہے لیکن اب جب انہوں نے اپنے سیر کی روداد قلمبند کی تو ایک اور خوبی سامنے آئی کہ وہ منجھے ہوئے قلمکار بھی ہیں۔ نہایت پُرلطف انداز میں لفظوں سے عکاسی کرتے ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ فوٹوگرافر کے قلم کا شاہکار ایک پر اثر رودادِ سفر کا دوسرا حصہ

میں بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کشش ایک ایسی قوت ہے جو ہر چیز کو بے چین کر دیتی ہے۔ مقناطیس کی کشش لوہے کو، حسن کی کشش عاشق کو، قدرتی حسن کی کشش صاحبِ دل کو بے چین کر دیتی ہے۔ مجھے نانگا پربت کی کشش نے بے چین کر رکھا تھا۔ میں بار بار ابراہیم سے پوچھتا کہ کتنا دور ہے رائے کوٹ کا پل! اور وہ آدھے گھنٹے سے یہی جواب دے رہا تھا کہ بس آنے والا ہے۔ پل دو الگ الگ حصوں کو جوڑتا ہے۔ میرے لیے بھی یہ پل انتہائی اہم تھا، اس مہم میں

رائے کوٹ کے اس پل کی اس لیے اہمیت تھی کہ یہیں سے مجھے آسمان تک بلند ہوتے ایک وحشت ناک راستے سے، بذریعہ جیپ ناتو گاؤں پہنچنا تھا اور وہاں سے تقریباً چار گھنٹے کی ایک ٹریک مجھے فیری میڈو، لے جاتی۔ گویا میرے خواب کی تعبیر کو مجھ سے جوڑتا۔

عام آدمی کے لیے رائے کوٹ کے پل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ ہر ایک کی پسند الگ ہوتی ہے۔ اگر کوئی اور اسے دیکھے تو یہی کہے کہ یہ تو ایک سنگلاخ، ویران، اجاڑ چٹانوں میں گھرا، ایک عام سا برج ہے مگر میرے لیے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے بس جب گزرتی ہے تو کسی کی شاید نظر بھی نہ پڑتی ہو۔ ایسے لاتعداد پل راستے میں آتے ہیں۔ کون ان کی خبر رکھتا ہے۔

یہ تنہا اور بنجر چٹانیں، جو اس پر سایہ فگن ہیں، ان میں کوئی کشش نہیں، کوئی جذبات نہیں بلکہ ایک خوف ہے۔ اس پُراسرار جگہ سے ایک وحشت ٹپکتی ہے۔ ایک ہیبت چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ ہماری بس جب یہاں سے گزری تو اترنے کو کوئی سواری نہیں تھی اور کوئی اس پر یہاں سے سوار بھی نہ ہوا۔ اس ویرانے میں کوئی کیوں آئے؟

شاہ جی اونگھ رہے تھے۔ میں نے ایک نظر ان پر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا، اونگھ لو بچو! ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ شاہ جی کی عزت و تکریم سر آنکھوں پر۔ میں انہیں اپنا بڑا بھائی زیادہ سمجھتا تھا مگر دل لگی کے لیے کبھی کبھی جملہ بھی پھینک مارتا۔ ایسی باغ و بہار شخصیت کے ساتھ خاموش رہا بھی نہیں جاتا انہیں ساتھ لانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ ان پر سے نظریں ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دائیں جانب ایک بلند چٹان سے لپٹی ایک پتلی لکیر کی مانند نظر آنے والے اس رستے پر نظریں جما دیں، جو زمین سے بلند ہو کر آسمانوں کی جانب اٹھ رہا تھا اور جس پر براستہ جیپ ہم ناتو پہنچ سکتے تھے۔

اس مقام میں ایک کسک تھی، ایک درد تھا، کوئی ہجر تھا یا کوئی الم۔ پہاڑوں پر ایک ہولناک تنہائی چھائی تھی۔ شاید دیو مالائی کہانیوں کے دیو شہزادیوں کو اٹھا کر جب لاتے ہوں گے تو انہیں یہیں قید کرتے ہوں گے کیونکہ کوئی شہزادہ اتنا دلیر نہیں ہو سکتا کہ اس بیابان سے اپنی شہزادی کو واپس لے جائے۔

پل کے نیچے رائے کوٹ کا نالہ بہتا چلا جا رہا تھا جو دور پرے جتے دریائے سندھ میں اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ یہ نالہ رائے کوٹ گلیشیئر کے منبوں سے پھوٹتا ہے اور آس پاس کے چھوٹے موٹے گلیشیئروں کے پانی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری بس جس تیزی سے یہاں آئی، اسی برق رفتاری سے پل پر سے گزر کر آگے نکل گئی۔ میرے سوا کسی نے نظر اٹھا کر بھی اس پہاڑ کی طرف نہ دیکھا جس کے پیچھے نانگا پربت کی چوٹیاں پوشیدہ تھیں۔

آگے کچھ فاصلے کے بعد ایک موڑ آیا جہاں سے نانگا پربت اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ میں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو پورے افق پر برفانی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ سنہری چوٹیوں سے بادل لپٹے ہوئے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ منظر غائب ہو گیا۔ شاہراہ ریشم سے نانگا پربت صرف یہیں سے اپنا نظارہ دکھاتا ہے۔ کیونکہ وہ ذرا شرمیلا ہے، راکاپوشی کی طرح بے باک نہیں جو سڑک کنارے، آتے جاتے لوگوں کے سامنے اپنے جوبن کھولے عریاں ہے۔

کچھ دیر میں جگلوٹ آیا تو ہم کھانے کے لیے رکے۔ تازہ تازہ آبشار کا پانی جو لکڑ ہضم پتھر ہضم کا آزمودہ نسخہ۔ بھنا ہوا پہاڑی مرغ جس پر چھڑکے ہوئے مقامی مسالے جس کی خوشبو بھوک میں 440 والٹ کی قوت بھر دے۔ ہم سب کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ شاہ جی کا کمال بھی عروج پر تھا۔ وہ تعریف کر کر کے لقمہ نگل رہے تھے اور مجھے ہنسی آرہی تھی کہ نانگا پربت اب زیادہ دور نہیں رہا، قریب سے قریب آرہا ہے۔ جس نے مری اور نتھیا گلی کی پہاڑیوں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، اب اس کے مقابل نانگا پربت ہوگا۔ تب یہ ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی شکل کس قدر مزاحیہ خیز ہوگی۔ وہاں کی صعوبتیں ان کی زبان پر کیسے کیسے نئے جملے جنم دیں گی جس کا مزہ عرصہ تک قائم رہے گا۔

کھانے سے فارغ ہو کر چائے کا دور چلا اور پھر سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ گلگت قریب آرہا تھا اور میرا جوش اور ولولہ میری تھکاوٹ پر غالب آرہا تھا۔ جگلوٹ سے نکلے تو دریائے سندھ دائیں جانب تھا۔ دریا کا پاٹ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ سورج زوال کی جانب تھا۔ دھوپ کی شدت کم پڑ چکی تھی۔ شاہ جی بھی اب چہک رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے، دریائے سندھ نے اپنا راستہ بدلا اور اسکردو کی جانب مڑتا چلا گیا اور یہیں پر دریائے گلگت یعنی دریائے یاسین اپنے ساتھ دریائے ہنزہ کا پانی لیے دریائے سندھ میں شامل ہو رہا تھا۔ ایک شاندار منظر جلوہ افروز تھا۔ کیونکہ یہیں پر دنیائے

زمین کے تین سب سے بڑے سلسلہ کوہ آپس میں ٹکراتے ٹکراتے رہ جاتے ہیں۔ بائیں جانب چترال کی وادیوں سے اٹھتا ہندوکش کا سرمائی پہاڑ، دائیں جانب ہمالیہ اور اس کے ساتھ گڈمڈ ہوتا قراقرم۔

شام ہونے میں کافی وقت تھا کہ ہماری بس گلگت کے بس اسٹینڈ پر رکی۔ شیر باز اور اشفاق اپنے چہروں پر مسکراہٹ سجائے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ سب بڑے تپاک سے ملے۔ شیر باز کے ڈرائیور اسماعیل نے ہمارا سامان شیر باز کی نئی نکور ڈبل کیبن ٹویوٹا میں رکھا۔ ہم ان سب کو اپنے سفر کی روئیداد سناتے مگر وہ سننے پر تیار نہ تھے اور مسلسل ہمیں گلگت میں خوش آمدید کہے جا رہے تھے۔ ان کے لیے شاید یہ صعوبتیں کوئی معنی ہی نہیں رکھتی تھیں۔ روز کا معمول ہے زندگی کا حصہ ہے۔

کچھ دیر میں ہم شیر باز کے "لاہور ہوٹل" میں داخل ہوئے۔ یہ گلگت میں ہمارا پہلا دن اور پہلا قدم تھا۔

لاہور ہوٹل کے دو حصے تھے اور دونوں کے درمیان میں ایک دیوار تھی، اس دیوار میں آنے جانے کے لیے ایک دروازہ تھا۔ دائیں حصے میں پہلے ہوٹل کا ریسیپشن اور ڈائننگ ہال تھا۔ پچھلی جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے دوسرے حصے میں دیوار کی دوسری جانب ایک بڑا وسیع لان تھا۔ متعدد درخت اور کناروں پر پھول تھے۔ اگر آپ کیمپنگ کرنا چاہیں تو اپنا خیمہ وہاں لگا سکتے ہیں۔ وہ ایک آرام دہ جگہ تھی، جہاں آپ کسی شور شرابے سے دور، سکون سے اپنا وقت گزار سکتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہاں خیمہ لگا کر اپنی کیمپنگ کا آغاز کیا جائے، جھٹ اس تجویز کو شاہ جی نے رد کر دیا کہ آئندہ کے دن تو ویسے ہی خیموں میں بسر ہوں گے۔ اتنی بے صبری ٹھیک نہیں۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا...... مگر ایک بات تھی۔ شاہ جی اب اردگرد نظر آتے آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں سے خاصے متاثر نظر آرہے تھے۔

میں اور شاہ جی جس کمرے میں تھے، اس میں دو بیڈ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں لکڑی کی میز اور اس پر پانی سے بھرا شیشے کا جگ اور ساتھ میں صاف وشفاف دو عدد شیشے کے گلاس رکھے تھے۔ پچھلی دیوار کی کھڑکی کیمپنگ سائٹ میں کھلتی تھی اور اس میں شہتوت اور خوبانیوں کے درخت گھاس پر سایہ کر رہے تھے۔ بادل پھر سے امڈ آئے تھے۔ شاہ جی نے انگڑائی لی اور خود کو بستر پر گرالیا لیکن میں لیٹا کھڑکی سے باہر بادلوں کے جھنڈ کی جھلک دیکھتا رہا اور شاہ جی کے خراٹوں کو بلند سے بلند ہوتا ہوا سنتا رہا۔ پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

باتھ روم صاف ستھرا تھا۔ ٹھنڈے پانیوں سے غسل کے بعد میں تروتازہ ہوگیا۔ کسلمندی ہوا ہوگئی۔ جب باہر آیا تو اسماعیل ہمارے رک سیک اور دوسرا سامان کمرے میں رکھ رہا تھا۔

دن ڈھل رہا تھا اور اسماعیل ہمیں کہہ گیا تھا کہ شیر باز ڈائننگ روم میں کھانے کے لیے ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ شاہ جی کچھ دیر کی نیند کے بعد آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ جب کھڑکی کے باہر نظر پڑی، کچھ دیر غور سے باہر دیکھتے رہے۔ مخمل کی طرح بچھی گھاس، درختوں پر چڑیوں کا شور، اوپر آسمان پر سیر کرتے آوارہ بادلوں کی ٹولیاں اور اردگرد جم کر کھڑے، پتھریلے اور ویران آسمان سے باتیں کرتے پہاڑ۔

"ماراوے" یہ شاہ جی کا تکیہ کلام تھا۔ جب بھی وہ کسی پہاڑ، کسی جھیل یا کسی بھی مقام سے مرعوب ہوتے یا کسی ٹریک پر پہنچتے، تو پہلے کافی دیر اس کو بغور دیکھتے اور پھر اپنی پی کیپ اتار کر کہتے "ماراوے" اس کا یہ مطلب ہوتا کہ وہ بہت خوش ہیں۔ اس بار ان کی زبان سے پہلی مرتبہ میں نے کوئی تعریفی بات سنی۔

"شاہ جی! گلگت تو زیرو پوائنٹ ہے، جنگلوں اور وادیوں کے راستے یہاں سے نکلتے ہیں۔ ابھی تو ایک جہان دیکھنا باقی ہے۔"

میں آگے کے سفر کے لیے ذہن بنا رہا تھا۔ شاہ جی پر شادمانی کے دورے پڑ رہے تھے اور اس وقت وہ اسی کیفیت میں تھے۔

"یہاں لے آئے ہو تو اب کہیں بھی لے چلو۔ اب یہ دنیا بھی دیکھ لیں۔" وہ اب باقاعدہ خوش نظر آرہے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "بچو! اجل میں کتنا تیل ہے آگے پتا چلے گا۔" مگر چہرے پر مسکراہٹ طاری رکھی۔

کھانے پر شیر باز نے پوری میز بھر دی تھی۔ وہ ہم سے سب پلیٹیں خالی کرانے پر تلا ہوا تھا۔ توے سے گرم گرم روٹیاں اتر رہی تھیں اور ہم ان پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

بلتی خدوخال والا شیر باز ایک گہری مسکراہٹ لیے

ہمارے آگے بچھا جا رہا تھا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا، ہم نے کیمپنگ سائٹ میں خوبانی کے درخت تلے بچھی کرسیوں پر بیٹھ کر گرم چائے سے لطف اندوز ہونا پسند کیا۔ اسماعیل شیر باز کا ملازم کم اور دوست زیادہ تھا۔ چھ فٹ لمبا، گھنے بال، گھنی بھویں اور چھوٹی سی سیاہ داڑھی اس پر خوب جچتی تھی۔ وہ ہمارے لیے چائے بنا تا تھا اور ہم ہلکی ہلکی بوندا باندی میں بیٹھے گرم چائے پیتے جا رہے تھے۔ ایک اجنبی اور نئے ماحول میں ہمیں اجنبیت کا احساس نہ تھا۔ شاہد، اشفاق، شیر باز اور اسماعیل ہمارا خیال رکھ رہے تھے۔ میری نظریں اردگرد، گلگت کو چاروں جانب سے گھیرے بلند و بالا ان پہاڑوں پر تھیں جن کی چوٹیوں پر کہیں کہیں برف کی سفید لکیریں تھیں۔

"ندیم صاحب!" شیر باز نے بلند چوٹیوں سے میری توجہ اپنی طرف کھینچی۔ "کیا خیال ہے۔ آپ کو گلگت دکھاتے ہیں۔"

چائے پینے کے بعد میں تر و تازہ تھا۔ فوراً تیار ہو گیا مگر اِدھر اُدھر دیکھا تو شاہ جی کو غائب پایا۔ کمرے میں دیکھا، باتھ روم میں بھی نہیں تھے۔ چھوٹا بچہ تو نہیں تھے کہ کہیں کھو جاتے۔ کچھ دیر میں تشویش میں رہا مگر اتنے میں شاہ جی کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا وہ اپنے ہاتھوں میں دو چھڑیاں اور دو پی کیپ تھامے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک میرے لیے اور ایک اپنے لیے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک کسی پہاڑی مقام پر ہونے کا احساس ان دو اشیا کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

ہماری گاڑی جماعت خانہ بازار سے نکل رہی تھی اور سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ سورج اور بادلوں میں اپنا کھیل جاری تھا۔ تازہ اور خوشگوار ہوا کے جھونکے ہمیں سرمست کر رہے تھے۔ شیر باز کا دوست اسماعیل گلگتی خاموشی اور انہماک سے گاڑی چلا رہا تھا۔ میں گلگت کے بازاروں اور اردگرد سر اٹھائے پہاڑوں کو تکتا ہوا سوچ رہا تھا کہ گلگت کی تاریخ ذرا مختلف ہے۔ انگریز اس پر قابض ہوئے کیونکہ روس کو لگام دینی تھی۔ مغل تو پہلے سے آتے جاتے رہے۔ کشمیری ڈوگرے اس پر قابض رہے۔ ہر ایک چھوٹے، بڑے علاقے کا اپنا راجا ہوتا تھا۔ وہ علاقے میں اہم فیصلے کرتا اور بدلے میں علاقے کے لوگوں سے لگان وصول کرتا۔ کئی راجے اپنی طاقت بڑھا چکے تھے۔ ڈوگرے اور انگریز بھی ان سے بنا کر رکھنے میں عافیت محسوس کرتے۔ وادی یاسین کا گوہر امان ان میں ایک تھا۔ بہادر اور جواں مرد۔ اس پر کئی حوالوں سے تنقید بھی ہوتی ہے مگر جب اس نے ڈوگرہ راجا بھوپ سنگھ کو شکست دی تو پورے پہاڑوں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ جہاں جنگ ہوئی وہ مقام اب بھوپ سنگھ کی پڑی کے نام سے منسوب ہے۔

سترہ ہزار مربع میل میں پھیلے اس خطے میں قدرت کے کرشمے چاروں جانب پھیلے ہیں۔ کہیں بنجر بیابان، ریتیلے اور ویران پہاڑوں کی گود میں سرسبز وادیاں اور نیلی جھیلیں ہیں تو کہیں برف سے ڈھکے آسمانوں کو چھوتے پہاڑوں کے دامن میں گلیشیئر نکل کر میلوں کا سفر کرتے پھولوں سے بھری وادیوں میں آجاتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کے قریب مارخور اور سنو ٹائیگر اپنی بستیاں بسائے ہوئے ہیں۔ ان علاقوں کی باغوں کی وجہ سے خوبصورتی، پہاڑوں کے باعث دبدبہ، دلکش نظارے، تند و تیز ندی نالے، شفاف جھیلیں اور نرم مزاج لوگ......! وہاں کا حسن الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ایسا نہیں کہ میں صرف ان علاقوں میں گیا ہوں اس لیے تعریف کے قلابے ملا رہا ہوں۔ میں نے دنیا کا ایک بڑا حصہ دیکھا ہوا ہے مگر جو کشش مجھے یہاں محسوس ہوتی ہے وہ دنیا کے کسی خطے میں نہیں ہوتی۔ دنیا کے مشہور **Resorts** اور ہوٹلوں میں قیام ہوا مگر میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو سواد قراقرم اور ہمالیہ کی دور افتادہ، بیابان وادیوں میں خیمہ لگا کر ابلے چاول کھانے میں ہے وہ دنیا کے کسی مہنگے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے میں کبھی مل ہی نہیں سکتا۔ جو لطف اپنے خیمے میں سخت زمین پر سلیپنگ بیگ پر سونے میں ہے وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں نرم بیڈ پر سوتے میں حاصل نہیں ہوسکتا۔ گلگت اور بلتستان کی یہ خوبی ہے کہ دنیا سے کٹ کر اس کے تیز رفتار شور سے پرے ہو کر، آپ آبشاروں کی جھنکار اور ندیوں کی موسیقی کو چاندنی راتوں میں تنہائی کے لمحوں میں سنتے ہیں۔ اس لیے جو بھی ایک بار یہاں کی تنہائی میں اترا، وہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

اور ہم بھی اس حسن کے لامحدود سمندر میں ڈوبنے کے لیے تیار تھے۔ ہم ائرپورٹ روڈ پر آئے تو سڑک کی دونوں جانب چیڑ کے اونچے اونچے پیڑ ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔ جیل روڈ سے ہوتے ہوئے چنار باغ آئے تو یہاں شہیدوں کی یادگاروں کو دیکھتے ہوئے دریا گلگت کے

سامنے آکھڑے ہوئے۔

دریا کے پار ''سرکوئی'' نامی گاؤں ہے جو میدانوں سے ہوتا ہوا بلند چٹانوں کے قدموں تک پھیلا ہوا ہے۔ دریا کے شور مچاتے پانیوں کے پس منظر میں قراقرم کے دیومالائی، بھورے، مٹیالے پہاڑ ماحول کو پُروقار بنا رہے تھے۔ ہم سرمستی میں اس پل پر پیدل چلتے چلے گئے جو کبھی گلگت اور ہنزہ کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ پل کے درمیان پہنچے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی دوبارہ شروع ہوگئی۔ لہروں کا شور ہمارے کان بہرے کررہا تھا اور ہم چیخ چیخ کر باتیں کررہے تھے۔ لکڑی کے پل کے درمیان شاہ جی پھنسے، مدد طالب نظروں سے شیر باز کی طرف دیکھ رہے تھے مگر شیر باز ایک پوز بنائے، جس میں اس کی نگاہیں آسمان میں کہیں کھو رہی تھیں، فوٹو کھنچوا رہا تھا۔ شیر باز کہتا تھا کہ ہم روز یہاں سے گزرتے ہیں اور ہمیں کوئی اندازہ بھی نہیں تھا کہ گلگت اتنا خوبصورت ہے۔

شاہ جی کو سہارا دے کر دوسری طرف لائے پھر کچھ دیر بعد وہاں سے روانہ ہوئے تو ہر ایک سرور تھا۔ وہاں سے نکلے تو ایک شور مچاتی ندی، جو پہاڑوں سے لڑھکتی چلی آتی تھی، نے ہمیں روک لیا۔ ہم اس کے یخ پانیوں سے منہ پر چھینٹے مارتے اور اپنے آپ کو زیادہ تروتازہ کرتے رہے۔ یہاں بسیں نامی کسی گاؤں کے کھیت کھلیان تھے۔ گندم کے سنہری کھیت، اترتے .... سورج کی کرنوں میں اور زیادہ چمکتے تھے۔ خنک ہوا بے لگام چلتی تھی اور ہم بے تحاشا خوشی محسوس کررہے تھے۔ ندی کا پانی ایک گرج کے ساتھ بہتا چلا آرہا تھا۔

یہ ندی ''کارغاہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس ندی کے ساتھ ساتھ جب آپ تنگ درے میں آگے بڑھتے جاتے ہیں تو آگے اس پر بجلی پیدا کرنے کے لیے لگائے گئے ٹربائن نظر آتے ہیں، جہاں سے گلگت کو بجلی ملتی ہے۔ یہیں ٹراؤٹ مچھلیوں کا فارم بھی ہے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ کل اس درے میں دور تک جائیں گے۔

اب ہماری گاڑی بلند ہوتے ایک خستہ راستے پر چل رہی تھی۔ ٹوٹا پھوٹا پتھریلا راستہ جگہ جگہ ابھرے ہوئے اور کہیں کہیں اوپر پہاڑی سے پھسل کر گرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر جب وہ ٹائر کے نیچے آتے تو ہم سیٹ سے اچھل جاتے اور ہمارا سر رومانویت کی انتہا کو پہنچ کر گاڑی کی چھت کا بوسہ لے لیتا۔ سر کی یہ بے حجابی پر شاہ جی بار بار تلملا رہے تھے لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ ڈرائیور مشاق تھا مگر کیا ایک ٹائر کے نیچے آجانے والے پتھروں سے چاہ کر بھی بچ نہیں پا رہا تھا۔ کچھ آگے بڑھے تو شوگوئی کا ایک گاؤں آیا اور پھر لکڑی کے ایک بوسیدہ پل کو عبور کرکے ہم نوکورہ گاؤں پہنچے تو شام کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ نوکورہ میں ہم چٹانوں پر تراشے بدھ مت کے مجسمے دیکھتے رہے۔

بدھ مذہب یہاں دو سو پچاس قبل مسیح میں آیا۔ اس مذہب کی نشانیاں چٹانوں پر بدھا کے تراشے مجسموں، خط کاری اور تصویروں کی صورت میں موجود ہیں۔ بدھ مت یہیں سے ہوتا ہوا چین میں داخل ہوا اور بعد میں اسی راستے سے اسلام بھی چین پہنچا۔

ہم ایک بلند پہاڑی پر تھے اور نیچے بہت نیچے دور تک گلگت شہر کی روشنیاں جگ مگ کررہی تھیں اور آنکھوں کو سیراب کررہی تھیں۔ شیر باز نے وہیں سے اپنے ہوٹل کے چمکتے سائن بورڈ کو فوکس کیا اور خوشی سے جھومنے لگا اس کے چہرے سے پھوٹتی خوشی کو میں نے بھی محسوس کیا اور اس کی خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے کہا۔ ''یہاں سے تمہارا ہوٹل بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔''

''جی سر! اسی لیے تو اس وادی کو جنت نظیر کہتے ہیں۔'' وہ فخر سے سینہ تان کر بولا۔

''لاریب...... بے شک یہ زمین کی جنت کہلا سکتی ہے۔''

''سر آپ کے علم میں یہ بات تو ہوگی کہ پاکستان کی ایک ایک انچ زمین بٹوارے میں ملی۔ تقسیم کے ذریعے حاصل ہوئی لیکن ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس سرزمین کو غاصبوں سے چھینا پھر پاکستان میں شامل ہوئے۔ یعنی بزور قوت حاصل کردہ ہے یہ سرزمین لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سرزمین اب تک بے آئین ہے۔''

سیاست میرا شعبہ نہیں اس لیے جلدی سے باتوں کا رخ موڑ دیا۔

''یار کتنی عجیب بات ہے کل اس وقت ہم اپنے سفر میں مانسہرہ سے گزررہے تھے اور ابھی نوکورہ گاؤں کی بلندیوں سے گلگت کا نظارہ کررہے ہیں۔''

''سر! اسی کا نام زندگی ہے۔ جو مسلسل سفر میں رکھتی ہے۔ کل ہم کہاں ہوں گے کسے پتا۔''

''اس لیے میرا مشورہ ہے...... آ...... آہ...... آں۔''

ایک طویل کراہ نے شاہ جی کا جملہ ادھورا کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ اسماعیل گلگتی نے گاڑی چلائی اور ایک پتھر وہیل کے نیچے آ گیا۔ گاڑی اچھلی اور شاہ جی کا سر چھت سے ٹکرا گیا۔ وہ سر کو سہلاتے ہوئے بولے۔ ''میرا مشورہ ہے کہ ہوٹل پہنچ کر بھرپور نیند لی جائے۔''

واپس ہوٹل آئے اور کھانا کھانے کے بعد شہر یار اور اسماعیل کل آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ ہم اپنے بستروں پر تھکاوٹ سے چُور لیٹے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ تھکاوٹ سے نیند کوسوں دور تھی۔ تبھی شاہ جی کا مہم جو انسان بیدار ہو گیا تھا۔

''ہم سونے کے لیے تو اتنی دور نہیں آئے، باہر نکل کر گلگت کو پیدل چل کر دیکھتے ہیں۔'' شاہ جی نے جوتے کستے ہوئے اپنی کمر بھی کس لی۔ شاہ جی کی سیماب فطرت نے پھر انگڑائی لے لی۔ سونے کا مشورہ انہی کا تھا اور اب باہر جانے پر بضد تھے۔ میں نے بھی کوئی تردد نہیں کیا اور تیار ہو گیا۔

جب ہم اپنے ہوٹل سے باہر آئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے سینما ہال میں فلم کا آخری شو ابھی ختم ہوا تھا۔ منچلے فلم پر تبصرہ کرتے سینما ہال سے باہر نکل کر اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ پولیس کی موبائل گاڑیاں ہر کونے میں کھڑی نظر آئیں۔ آسمان ابر آلود تھا۔ شاہ جی تشویش سے آسمان کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے بولے۔ ''لگتا ہے پھر بارش ہو گی، بہت گھنے بادل ہیں۔''

میں نے آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی تو سیاہ بادلوں کو دوبارہ دیکھ کر پریشان ہوا کہ کہیں ہم ہوٹل میں قید نہ ہو جائیں؟ مگر جب غور سے دیکھا تو وہ بادل نہیں تھے۔ گلگت کے چاروں طرف پھیلے سیاہ ہوتے پہاڑوں نے آسمان کا ایک بڑا حصہ اپنے قبضے میں لیا ہوا تھا۔ ہم حیرت اور خوف سے یہ منظر دیکھتے تھے اور ایک خوف میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتا محسوس ہوتا تھا کہ پہاڑ اتنے بلند بھی ہو سکتے ہیں؟ میں یہ سوال اپنے آپ سے ایک ڈر اور خوف کے عالم میں کر رہا تھا۔

''یار! یہ کیسی جگہ ہے؟ یہاں سے کوئی واپسی کا راستہ بھی ہے یا نہیں۔'' اب شاہ جی بھی خوف زدہ ہو کر منمنائے۔

''یہ کوئی اور سیارہ ہے جہاں ہم راستہ بھول کر آ نکلے ہیں۔'' میں نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی غرض سے اپنی طرف سے ان سے مذاق کیا، ورنہ مجھے خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی اور سیارے میں پھنس چکے ہیں اور ہماری خلائی شٹل کہیں خلا برد ہو چکی ہے۔ ایک خوف اس وقت میرے اندر بھی آ بیٹھا تھا۔

ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک قہوہ خانے میں آ کر بیٹھے، گرم قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے پُراسرار علاقے پر باتیں کرنے لگے۔

قہوہ خانے میں چند لوگ بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے اور باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دیو قامت پہاڑوں کا رعب آہستہ آہستہ ختم ہو کر مرعوبیت میں بدلتا جا رہا تھا۔

''اب ایسا کرتے ہیں کہ واپس ہوٹل چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں کیوں؟'' شاہ جی نے چونک کر پوچھا۔

''سنا ہے گلگت کے اکثر علاقوں میں پریاں اترتی ہیں اور اپنے پسند کے آدمی کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔''

یہ بات گلگت و بلتستان میں بہت زیادہ مشہور ہے اور بے حساب لوگوں کا دعویٰ بھی ہے کہ انہوں نے پریوں کے جھنڈ کو دیکھا ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے یہاں امریکا میں اخبارات میں پڑھا کہ گلگت میں ایک بچے کی لاش ملی۔ پولیس تفتیش کرنے کی بجائے اسے پریوں کی کارستانی قرار دینے لگی۔ ستم بالا ستم یہ کہ ایک وزیر مملکت نے بھی تائید کر دی کہ بچے کو کسی پری نے قتل کیا ہے۔ ایسے قصے گلگت آنے سے پہلے بھی سن رکھے تھے اسی لیے میں شاہ جی کو چھیڑ رہا تھا۔ ''شاہ جی میری تو خیر ہے۔ پریاں آپ جیسے مردوں پر فدا رہتی ہیں، کہیں......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شاہ جی کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں بولے۔ ''پریاں اغوا بھی کرتی ہیں؟''

''تو کیا وہ شادی کے بغیر زندگی گزاریں۔ ہر پری دیو کو پسند نہیں کرتی، کچھ شوخ طبیعت کی بھی ہوتی ہیں۔ وہ پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گھر گرہستی کرنا چاہتی ہیں۔''

''لوگ ان کے ساتھ خوش رہتے ہیں؟''

''کون شوہر بیوی سے خوش رہتا ہے پھر بھی تاعمر ساتھ نبھایا جاتا ہے۔ ویسے آپ جیسے مردوں کو وہ بڑی محبت سے رکھتی ہیں۔''

''لاحول......'' انہوں نے اتنی بلند آواز میں لاحول پڑھی کہ وہاں بیٹھے تمام لوگ چونک گئے پھر وہ کھڑے ہو کر بولے۔ ''چلو اب چلتے ہیں۔''

☆......☆

میں دوسرے دن صبح اٹھا تو کھڑکی اور روشن دان کی درزوں سے آتی سورج کی کرنوں نے پورے کمرے کو منور کیا ہوا تھا۔ شاہ جی کمرے میں فرش پر بیٹھے، سامنے شیشہ رکھے شیو کررہے تھے۔ چھت کا پنکھا جس آہستگی سے چلتا رہا تھا، وہی آہستگی اور ٹھہراؤ پورے ماحول پر طاری تھا۔ وقت تھما تھما سا محسوس ہوتا تھا۔ میں اسی ماحول میں آنکھیں بند کیے کچھ دیر اور لیٹا رہتا مگر اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا اور حواس باختہ شاہد، زرد چہرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ شاہ جی شیو کرتے کرتے رک گئے تھے۔ میں نے بھی آنکھیں کھول دیں۔

''یا اللہ خیر! اب کیا ہوا ہے؟'' شاہ جی دائیں ہاتھ میں ریزر تھامے اسے دیکھ رہے تھے۔

''کل رائے کوٹ سے نانو جاتے ہوئے ایک جیپ مسافروں سمیت، ایک کلومیٹر نیچے بہتے تاتو نالے میں جا گری ہے اور ڈرائیور سمیت چار دوسرے افراد جو حیدرآباد سے فیری میڈو دیکھنے آئے تھے، وہ ہلاک ہو گئے ہیں۔'' شاہد نے ایک ہی سانس میں یہ بری خبر ہمیں سنائی۔

یہ اطلاع میرے لیے کوئی نیک شگون نہیں رکھتی تھی۔ مجھے اپنا فیری میڈو کا پروگرام ڈانواڈول ہوتا نظر آرہا تھا۔ کیونکہ شاہ جی، ایک سائیڈ کی شیو چھوڑ کر کے اپنی جگہ پر کھڑے ہو چکے تھے۔ ریزر ان کے دائیں ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ شاہد اضطراب اور بوکھلاہٹ کے عالم میں کرسی پر بیٹھا اور شاہ جی کو رحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ان دونوں کو پریشان حال چھوڑ کر میں سیدھا غسل خانے میں جا گھسا۔ میں ان سب کی پریشانی میں اپنا اضطراب شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اندر سے میں بھی ہل کر رہ گیا تھا کیونکہ میں کل ہی تاتو والا پل صراط دیکھ کر آیا تھا۔

میں باتھ روم میں ان کی چہ میگوئیاں سن رہا تھا۔ کچھ دیر بعد باہر نکلا تو دونوں خاموشی سے میری جانب دیکھ رہے تھے اور میں نظریں چرا رہا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا میں ان کے ساتھ اس فکرمندی میں شامل ہو جاؤں یا ان کو تسلی دوں؟ میں نے شاہد سے کہا۔ ''گلگت سے اسکردو جانے والے پل پر ایک سال میں کتنے حادثے ہوتے ہیں۔''

''سال میں دو تین۔''

''تو کیا لوگوں نے اسکردو جانا چھوڑ دیا ہے؟''

شاہد نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''ایک حادثے سے راستے بند نہیں ہو جاتے۔ سفر جاری رہتا ہے۔''

شاہد خاموش نظروں سے مجھے تکتا رہا اور شاہ جی کچھ رنجیدہ اور گم صم نظر آرہے تھے۔ میں نے دیکھا انہوں نے دوسری سائیڈ کی شیو ابھی بنائی نہیں تھی اور وہ ایک خوف اور سکتے کے عالم میں تھے۔ یہ سفر صرف میرا تھا اور میں نے زبردستی ہر ایک کو اپنے ساتھ گھسیٹا ہوا تھا۔ سفر میں سنگی کی خاطر ایسے اللہ لوک جیسے معصوم بندے کو کھینچ لایا تھا جس پر ذمے داریوں کا بھاری بوجھ بھی تھا۔

کچھ دیر تک میں ان کی طرف دیکھتا رہا پھر ہنس کر بولا۔ ''کیا ناشتا نہیں کرنا ہے؟''

شاہ جی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر جلدی جلدی شیو بنانے لگے۔

ہم ناشتا کرنے ڈائننگ ہال میں آئے۔ ہوٹل میں شاید ایک دو اور مسافر ہوں گے۔ مگر اس وقت ڈائننگ ہال بھی عاشق کے دل کی طرح خالی تھا۔ عجیب سی ویرانی محسوس ہورہی تھی پورا ڈائننگ ہال خاموش اور سہما سا لگ رہا تھا۔ اتنے میں اشفاق آگیا۔ اس کو بھی شاہد نے جیپ حادثے کا بتایا مگر وہ اس حادثے سے بے پروا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی کیونکہ اب ہم دو ہو گئے تھے جو اس خوف سے قدرے بے پروا تھے۔ اشفاق ہمیشہ ساتھ دینے والا بہترین ساتھی ثابت ہوا۔ آگے جو ہم نے خطرناک سفر کیے، ان میں اشفاق ہمیشہ ثابت قدم رہا۔ فکرمندی اس کے قریب سے بھی نہیں گزری۔ کئی ایک بار میں نے راستے کی خطرناکیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے مگر اشفاق کی جرأت مندی نے مجھے حوصلہ دیے رکھا۔

آج شیر باز کو کہیں ضروری کام سے جانا تھا ہمیں کارغہ نالہ دکھلانے، اس کا کزن سجاد اپنی سوزوکی کیری کے ساتھ آپہنچا اور آتے ہی مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ جیسے ہم پہلے سے ایک دوسرے کے واقف ہوں۔ خوش شکل اور مسکراتے چہرے والا ساجد، دوسرے ہی لمحے ہمارا دوست بن چکا تھا۔ ہم ساجد سے مل کر جیپ حادثے کو وقتی طور پر فراموش کر بیٹھے تھے۔

آج دوبارہ ہماری منزل کارغہ نالہ تھی جہاں ہم کل ہو آئے تھے مگر اب ہمیں اس نالے کے ساتھ ساتھ اندر جانا تھا۔ نالے کے بائیں جانب ایک کچی سی سڑک تھی اور سڑک کی

دائیں جانب کھیتوں کے مختصر سرسبز ٹکڑے تھے۔ دونوں جانب بلند و بالا پہاڑ تھے مگر اس بار چوٹیاں ویران نہیں بلکہ جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ موسم بھی کل کی طرح ابر آلود اور خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا اٹھکیلیاں کرتی ہوئی ہم میں تازگی بھر رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی، تھمتی اور پھر دوبارہ شروع ہو جاتی۔ وہ کہنے کو کارغہ ایک نالہ ہے مگر حقیقتاً ایک تند و تیز، یخ پانیوں کی شور مچاتی، جھاگیں اڑاتی پُرزور ندی ہے۔

اس کا پاٹ تیس فٹ سے زیادہ ہوگا۔ نالے میں جہازی سائز کے پتھر تھے جن سے ٹکرا کر پانی انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اودھم مچا رہا تھا۔ بلند چوٹیوں پر درختوں کے ساتھ پگڈنڈیاں تھیں جہاں سے مقامی لوگ اپنے جانور کے ساتھ چراگاہوں کی جانب سفر کرتے تھے۔ میں ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ دور بہت دور مجھے کچھ لوگ نظر آئے شاید وہاں کوئی گاؤں تھا یا کوئی چراگاہ۔ ادھر دیکھتے پا کر ساجد نے کہا۔

”وہاں اوپر ایک خوب صورت جھیل ہے۔“

جھیل کا ذکر سن کر میں ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا مگر شاہ جی نے شاید میری نیت بھانپ لی تھی۔ مجھے مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ اس لیے میں نے دل کی بات زبان پر نہ لاتے میں ہی عافیت سمجھی مگر دور بہت دور ایک پتلی لکیر کی طرح نظر آنے والے راستے مجھے پکار رہے تھے۔ میری دلچسپی اس لیے بھی تھی میں کوئی ایک ہلکا ٹریک کر کے، اپنے آرام پسند جسم کو اس پہاڑی اور سخت ماحول سے آشنا کرنا چاہتا تھا، اپنے شہری معمول کو یہاں کے طور طریق سے ہم آہنگ کرنا چاہتا تھا، کیونکہ آگے بڑے کٹھن مراحل آنے والے تھے۔

ہم ایک تنگ درے میں چلے جا رہے تھے۔ گاڑی مسلسل ہچکولے کھا رہی تھی۔ کچھ دیر میں وہ درہ وسیع ہو گیا اور اب ہمارے سامنے کارغہ نالے کے کنارے ٹراؤٹ مچھلی کا ایک خوبصورت فارم تھا۔ ہم فارم میں داخل ہوئے۔ دو تین کمروں میں تالاب بنے تھے اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اس میں تیر رہی تھیں۔ میں گھوم کر پچھلے دروازے سے باہر نکلا تو ایک خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہاں جاپانی باغ کی طرز کا ایک باغیچہ تھا۔ یہ باغیچہ سڑک سے نظر نہیں آتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے، عمدگی سے تراشے دیدہ زیب ٹھگنے پودے، کاسنی، دھانی اور پیلے رنگ کے خوشنما پھول، زمین پر مخمل کی طرح بچھی شوخ سبز رنگ کی گھاس، جہاں بارش کے قطرے اس کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔ بارش کی نمی سے بھیگتی ہوا جب میرے بدن کو چھو کر گزرتی تو میرے اندر ایک انجانی خوشی کا احساس بھر جاتی۔ اس باغ میں ہواؤں اور نالے کے پانیوں کا شور تھا اور چاہتے ہوئے بھی میں اس خوش نظر باغ میں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔

میں جاپانی باغ سے نکل کر کارغہ نالے کی طرف آیا اور وہاں دھوم مچاتا پانی ایک جھنکار کی طرح کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ وہیں نالے میں جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر پڑے تھے ... جو شوریدہ پانی لپٹتے جاتے تھے۔ میں ایک سے دوسرے پتھر پر قلانچیں بھرتا، پھدکتا رہا۔

میں بار بار اسے نالہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ گلگت میں کارغہ نالے کے نام سے مشہور ہے۔ ورنہ ذہن میں نالے کے نام سے کسی گندے نالے کا تاثر ابھرتا ہے۔ یہ ایک پہاڑی دریا کی مانند، ایک شوریدہ اور منہ زور ندی ہے۔ اس کے قریب جانے سے دل دہل جاتا ہے۔ شفاف اور تیز رفتار پانی بے پناہ شور لیے بہتے ہیں۔

وہاں سے جانے کو جی نہیں کر رہا تھا مگر بوندا باندی پھر سے تیز ہو گئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے اور ذرا آگے بڑھے تو دو ٹربائن نظر آئے۔ یہاں بجلی بنتی ہے اور گلگت کے کافی حصے کو فراہم کی جاتی ہے۔ وہاں کام کرنے والے افراد نے بتایا کہ یہ کارغہ کے یخ بستہ پانی اوپر، چلیلی اور روم ڈر گلیشیئر سے آ رہے ہیں۔ شام کو پانی کا بہاؤ اور تیز ہو جاتا ہے، جس سے بجلی کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔

وہاں زیادہ رکنا فضول تھا اور ہم آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ اب درہ تنگ ہو رہا تھا پھر آگے جانے کا راستہ ختم ہو گیا۔ ہمارے سامنے ایک پہاڑ ۔۔۔ راستہ روکے کھڑا تھا۔ ہم گاڑی سے باہر نکلے۔ میں نے پہاڑ کے چاروں طرف نظر دوڑائی تو بائیں جانب پہاڑ کی چوٹی کے قریب، ایک وسیع دہانے والا غار کسی عفریت کی مانند نظر آیا، جیسے کوئی دیوہیکل وہیل مچھلی منہ پھاڑے اپنے شکار کو دبوچنے کے لیے مستعد کھڑی ہے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا اور وقفے وقفے سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا بلا جھجک چوٹیوں سے اتر کر وادی میں چل رہی تھی۔

ہمیں آگے ایک لمبے ٹریک پر جانا تھا میں نے خود سے سوال کیا، میرا جسم کیا اس ٹریک کی مصیبت مول لے سکتا ہے؟ پھر یہ آزمانے کے لیے میں نے اس غار کے دہانے تک جانے

کا ارادہ کرلیا۔ سجاد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ شاہد بھی تردد کر رہا تھا مگر اشفاق نے میرے قدم اٹھانے سے پہلے اوپر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ شاہ جی نے اپنی پی کیپ کو سر سے اتارا، ہمیشہ کی طرح کچھ دیر اس راستے اور غار کو غور سے دیکھا اور پھر بار بار دیکھا اور پھر زوردار نعرہ مارا۔ ''ماراوے'' مطلب یہ تھا کہ ہے تو خواری مگر جانا ہی پڑے گا۔

سنگریزے ڈگمگاتے قدموں کے نیچے سے پھسلتے تھے۔ گھٹنے اس چڑھائی پر قدم اٹھاتے وقت، چہرے کو چھوتے تھے۔ مگر ہم آگے بڑھتے جاتے تھے۔ پینتالیس منٹ سے ہم غار کی جانب بڑھ رہے تھے اور وہ مسلسل پیچھے کو سرکتا جا رہا تھا۔ یعنی اب بھی وہ اتنا ہی دور تھا جتنا نیچے سڑک سے نظر آیا تھا پھر بھی ہم اسے نزدیک سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ آئی واٹر بوتلز بھی خالی ہو رہی تھیں۔ اس سہانے موسم میں بھی میں پسینے سے شرابور تھا۔ میں ہونک رہا تھا، کانپ رہا تھا اور اب ہر پانچ قدم بعد ستا رہا تھا۔ شاہ جی مجھ سے دور ہو کر ہونکتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

پیچھے مڑ کر نیچے دیکھا تو کارغہ نالہ ایک سفید پٹی کی مانند نظر آیا۔ اس کا شور معدوم ہو چکا تھا۔ ساجد کی سفید سوزوکی ایک ڈبیا کی مانند دکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھیانک دہانہ ہم پر ترس کھاتے ہوئے اپنی جگہ رک گیا۔ گویا ہم نے منزل مار لی اس غار کے قریب پہنچتے ہی میں غش کھا کر اس کے تاریک منہ کے پاس بکھرے سنگریزوں پر گر پڑا۔

کچھ دیر بعد ہوش آیا تو سب میری طرح لاغر پڑے گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔ نیچے سے غار جتنا قریب نظر آتا تھا، وہ اس سے کوسوں دور تھا۔ کارغہ کے پانی سکوت میں تھے۔ یہاں صرف ہواؤں کا شور تھا۔ میرے پسینے سے تر جسم کو ہوا کے جھونکے آسودہ کرتے اور میری سانسوں کی ترتیب بحال کرتے رہے۔ میں دیکھتا رہا کہ کارغہ نالے کے پار پہاڑوں کی چوٹیاں میرے آمنے سامنے تھیں۔ اس کے جنگل صاف دکھتے تھے۔ کوئی چیز حرکت کرتی نظر آتی تھی۔ شاہد نے کہا۔ ''مار خور لگتا ہے۔''

تبھی شاہ جی بولے۔ ''نہیں۔ کوئی گدھا ہے۔''

اشفاق نے پی کیپ اپنے چہرے پر رکھ کر شاہ جی کی نقل اتاری۔ ''ماراوے''

اور میں اپنی ہنسی ضبط کرنے لگا۔ سب جب زور سے ہنسے تو شاہ جی برا منا گئے اور ایک دو منٹ تک خفا رہے۔

کچھ دیر میں ہم اپنی تھکاوٹ کو بھول کر خوشی خوشی تصویریں بنوانے لگے۔ غار کے اندر اندھیرا تھا۔ چھت اور دیواروں سے پانی رس رہا تھا۔ غار کی چھت بیس فٹ سے زیادہ بلند تھی۔ زمین پر چھوٹے، بڑے پتھر بکھرے تھے۔ کوئی اس کو جنگلی جانوروں کا مسکن کہہ رہا تھا اور کوئی مجرموں کی پناہ گاہ! کارغہ نالے کے آس پاس کی پوری وادی میری نگاہوں تلے تھی۔ ہم اس منظر میں مست ہو چکے تھے۔

اب نیچے اترنا مشکل ہو رہا تھا۔ بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے نیچے پہنچے تو ساجد گاڑی کے اندر سو رہا تھا۔ اس کے لیے یہاں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

واپس ہوٹل آئے تو ساجد واپس چلا گیا۔ ہم سب نے کھانا کھایا۔ تندور کی گرم روٹیوں کے ساتھ۔ دال کے ذائقے میں کوئی خاص بات تھی جو ہم نے کافی مقدار میں کھانا اپنے معدے میں منتقل کر دیا۔

کھانے کے بعد شاہد اور اشفاق اپنے گھروں کو چلے گئے اور ہم دونوں کچھ دیر آرام کر کے، غسل سے تازہ دم ہونے کے بعد کیمپنگ سائٹ میں بچھی کرسیوں پہ آبیٹھے، لاہور ہوٹل کی گرم گرم چائے پیتے اور ان پھولوں کو دیکھتے رہے جو جگہ جگہ گھاس میں سے سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ چلتے وقت ہم قدم احتیاط سے رکھتے کہ کہیں کوئی پھول پاؤں تلے آ کر کچلا نہ جائے۔ درختوں پر چھوٹے چھوٹے پرندے اپنی بولی بول رہے تھے۔

ابھی ہم اس سحر زدہ ماحول کی کیفیت سے باہر بھی نہ آئے تھے کہ اتنے میں شیرباز اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ باغ کے ایک کونے سے نمودار ہوا۔

''چلیے آپ کو گلگت کے دوسری طرف جٹیال لے چلتے ہیں۔'' شیرباز نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

ہم بھی تازہ دم ہو چکے تھے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

کچھ دیر میں ہماری گاڑی گلگت کے پوش علاقے جٹیال سے گزر رہی تھی۔ جٹیال کو نیا گلگت کہا جاتا ہے۔ یہاں سے راکا پوشی کا نظارہ بہت دلکش لگتا ہے۔ ساتھ میں درن پیک بھی راکا پوشی کے ساتھ کندھا ملائے کھڑی نظر آتی ہے۔

چاروں جانب سربلند پہاڑ، گلگت کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان پہاڑوں کی چوٹیاں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ہم جٹیال سے نکل کر شاہراہ ریشم پر اسکردو کی جانب جا رہے

تھے۔ دریائے گلگت سڑک کے ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا۔ ایک وسیع لینڈ اسکیپ میرے سامنے تھی۔ ایک مقام پر دریائے گلگت، دریائے سندھ میں گر رہا تھا اور وہیں اسماعیل نے گاڑی روک لی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ایک سڑک اسکردو کو جاتی ہے اور اس مقام پر کرہ ارض کے تین عظیم پہاڑی سلسلے ایک دوسرے کے سامنے تن کر کھڑے نظر آتے ہیں۔ میرے پیچھے ہندوکش کا سلسلہ تھا جو چترال سے لے کر کوہ سلیمان تک پھیلا تھا۔ سامنے ہمالیہ تھا جو نیپال سے نکلتا تبت اور کشمیر سے گزرتا ہوا آتا ہے اور اس مقام پر جیسے ہندوکش اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیتا ہے۔

بائیں جانب قراقرم ہے جو یہاں سے چین تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ شاندار، عظیم، رعب اور دبدبے والا منظر آپ کو دنیا میں کہیں نہیں مل سکتا، جو میں آج شاہراہ ریشم سے قدرے بلند مقام پر بنی اس مشاہدہ گاہ سے دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے والے کو یہاں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ آپ گھنٹوں یہاں بیٹھے بادلوں سے لپٹیں، برف سے ڈھکی، آسمانوں میں چھید کرتی چوٹیوں کو دیکھتے رہیں۔ آپ پہاڑ کی عظمت کو پہچان ہی نہیں سکتے جب تک آپ گلگت یا بلتستان کا سفر نہیں کرتے۔ بخدا یہ جاہ و جلال، یہ شان و شوکت، یہ دبدبہ، یہ طلسماتی ماحول آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا۔ دنیا بھر سے سیاح، بڑے چاؤ سے پاکستان میں یہ نظارہ دیکھنے آتے ہیں۔ اس دن بھی کئی یورپین، امریکی، جاپانی سیاح اس منظر کو ایک حیرت اور خوشی سے دیکھ رہے تھے۔

ان سیاحوں کو دیکھ کر میرا سینہ فخر سے بلند ہو گیا۔ اگر ہمارا محکمۂ سیاحت پوری طرح کام کرے تو ہمارے ہاں سیاحوں کی بھیڑ لگی رہے کیونکہ ہمارے ہاں تاریخی ورثے کی کمی نہیں۔ ہڑپہ موئن جوڈرو یہیں ہے، یہیں زندہ تاریخ وادی کیلاش ہے، یہیں دنیا کا قدیم زندہ شہر ملتان ہے تو یہیں کئی معنوں میں دنیا کی تاریخ کا انوکھا قبرستان مکلی ہے۔ گنوانا شروع کروں تو ایک دفتر درکار ہے جس کی کشش سیاح کو کھینچ لائے۔ سیاح آئیں گے تو زرمبادلہ آئے گا۔ ملک کی معیشت بڑھے گی لیکن کچھ لوگوں کی بے پرداہی نے تمام کام چوپٹ کر رکھا ہے۔

ان سیاحوں کو دیکھتے اور اس حیرت کدہ کے اسیر سے خاموشی سے گاڑی میں آبیٹھے واپس گلگت کو آئے تو بازاروں میں روشنیوں کی جگمگ، انسانی آوازوں اور گاڑیوں کے شور نے ہمیں جیسے اچانک بیدار کر دیا۔ شاہ جی، میں اور شیر باز، این۔ایل۔آئی مارکیٹ میں گاڑی سے اتر آئے۔ سوچا کہ اگلے دن تو کوہ نوردی میں گزریں گے، کیوں نہ گلگت کے بازار دیکھ لیے جائیں۔ ہم اِدھر اُدھر بے مقصد چائنا کے سامان سے بھری دکانوں میں تانک جھانک کرتے رہے۔ ہمیں کوئی چیز خریدنی تو نہیں تھی بس ایک بے فکری، آزادی اور آوارگی کی کیفیت میں موج میلہ کر رہے تھے۔ وہیں کچھ کھا پی لیا اور جب لاہور ہوٹل میں اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو خوبانیوں کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ شاہ جی بھی ایک دم سیدھے ہو گئے۔ دیکھا تو کونے میں خوبانیوں کی ایک پیٹی پڑی ہے اور اس پر ایک چٹ لگی ہے۔ ”شاہد بگروٹی کی جانب سے اپنے معزز مہمانوں کے لیے۔“

☆......☆

اس رات ہم کیمپنگ سائٹ کی خاموشی، تنہائی، آسودگی اور چاندنی میں لوہے کی بنی کرسیوں پر بیٹھے، خوش ذائقہ، شیریں، نرم اور لذیذ خوبانیوں پر ندیدوں کی طرح ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ بلند پہاڑوں اور چٹانوں میں گھری وہ ایک تنہا اور خاموش شام مجھے مطمئن رکھے ہوئے تھی۔

ہم ایک درخت تلے بیٹھے تھے۔ میرے پاؤں سامنے میز پر تھے اور سر لوہے کی آرام دہ کرسی کی پشت پر تھا۔

گلگت بلتستان میں خوبانی کے پیڑ اس طرح ملتے ہیں جس طرح دامان اور روہی میں پیلو یا کیکر۔ ایک ایک درخت پر ٹنوں کے حساب سے لدی خوبانیوں نے شاخوں کو جھکا رکھا ہوتا ہے۔ آپ جتنی کھاتے جائیں پر درخت کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنے سفر میں کئی مقام پر بچے اور بچیاں، سڑک کنارے خوبانی کے پیکٹ بیچتے نظر آتے رہے۔ ہم نے ایک دو بار تو خرید لیں مگر اتنی کون ہضم کر سکتا ہے۔ بعد میں ہم نے خریدنے سے انکار کر دیا تو بچوں نے ہمیں مفت میں دینا شروع کر دیں۔ ان کے لیے مفت میں خوبانیوں کو بانٹ دینا یا سڑک کنارے پھینک دینا، واپس لے جانے سے سستا تھا۔ شاہ جی سے خوبانیوں کی یہ بے حرمتی دیکھی نہ گئی اور وہ سستی خرید کر پورے سفر میں خود بھی کھاتے رہے اور مجھے بھی نوازتے رہے۔ (اس کا اثر شکر ہے دوران سفر تو نہیں ہوا مگر جب واپس اپنے تپتے شہر کی تپتی زمین پر قدم رکھا تو خوبانیوں کی بسیار خوری نے اپنا رنگ دکھایا اور میں دو ماہ پیٹ کی شدید بیماری میں مبتلا رہا۔ میرا وزن پچاس پاؤنڈ کم ہو گیا اور میں ایک

بارتواپنی زندگی سے بھی مایوس نظر آنے لگا تھا۔)

سوکراٹھے توصبح کل کی طرح حسین اور رنگین تھی، کمرے کی کھڑکی سے کیمپنگ سائٹ کی وہ کرسیاں نظر آتی تھیں جہاں کل رات بیٹھ کر میں نے ایک خوبصورت شام بیٹھے گزاری تھی۔ کیمپنگ سائٹ کی گھاس سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی مگر جہاں جہاں پیڑ تھے، ان کے نیچے سایہ تھا۔ نہا دھوکر... تازہ دم ہوئے، پراٹھوں اور آملیٹ، آلوفرائی اور چنوں سے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ اسی اثناء میں شیر باز وہی مسکراہٹ لیے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔

''آج آپ لوگ ہنزہ جارہے ہیں۔'' شیر باز نے ایک طرح سے ہمیں اطلاع دی۔

''مگر ہمیں تو فیری میڈو جانا ہے۔'' میرے کہنے پر شیر باز نے جو کہا وہ مجھے درست لگا کہ فیری میڈو جانے سے پہلے آپ یہاں کے ماحول سے انسیت پیدا کرلیں۔ یہاں کی آب وہوا میں اپنے آپ کو عادی کرلیں۔ اتنے دن آپ گلگت میں بور ہوجائیں گے۔ علی آباد اور کریم آباد خوبصورت مقام ہیں۔ سینکڑوں سال پرانے میر آف ہنزہ کے قلعے موجود ہیں۔ آپ گلگت آکر، ہنزہ وادی دیکھے بغیر واپس چلے جائیں تو یہ ہنزہ کے ساتھ بھی زیادتی ہے اور آپ اپنے ساتھ بھی ظلم کریں گے۔

شیر باز کی اس رہنمائی نے مجھے دنیا کے وہ حیرت کدے دکھلائے کہ میں آج بھی ان نظاروں کا اسیر ہوں جو میں نے کریم آباد میں اپنے ہوٹل کی چھت پر رات گئے آسمان اور زمین پر دیکھے۔

اسماعیل وہی ڈبل کیبن لے آیا جو پچھلے دو دن سے ہمارے استعمال میں تھی اور وہ اس پر ٹاکی مار کر اسے چمکاتا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے بیگ کو کچھ ضروری سامان سے بھرا۔ شاہ جی بھی تیار ہوئے اور کچھ دیر میں ہم شاہد اور اشفاق کے ہمراہ جٹیال سے گزر کر ہنزہ کی طرف رواں دواں تھے۔

جٹیال میں گاڑی روک کر ہم نے P.C.O سے اپنے گھروں کو فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ وہیں سے میں نے کولڈ ڈرنکس، سویٹس، بسکٹس اور چپس کے پیکٹ خریدے اور اسماعیل نے ہنزہ کی طرف گاڑی موڑی۔ اسماعیل ہمارا ایک اچھا ساتھی اور رہبر ثابت ہوا۔ اس نے ہنزہ تک آتے ہوئے ہر مقام کی تاریخ سے لے کر جغرافیہ اور ثقافت تک ہمیں بتائی۔ ہم ہر موڑ، ہر نئے منظر پر گاڑی رکواتے اور اسماعیل مسکرا کر خوشی سے ہماری فرمائش پر گاڑی روک لیتا۔ وہ اپنے آپ کو پُرسکون رکھ کر، ہماری حرکتیں برداشت کرتا تھا۔ اسی دوران ہم آس پاس کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے، تصویریں بنواتے پھر آگے بڑھتے۔

گلگت سے نکلے تو سامنے ہراموش کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو شاہد کے گاؤں بگروٹ سے گزرتا، گلگت تک چلا آتا ہے۔ شاہد بضد تھا کہ ہم اس کے گاؤں بگروٹ کو چلیں۔ بگروٹ، برفانی چوٹیوں اور بلند سنگلاخ پہاڑوں میں گھری، سرسبز اور نہایت ہی خوبصورت وادی ہے۔ ندیاں نالے، جھیلیں، شوخ ہرے رنگ کے میدان، لہلہاتے کھیت، چٹیل بلند اور برفوں سے ڈھکی چوٹیوں سے گھرا بگروٹ۔ پر میرا فیری میڈو اب تو مجھے جنت میں بھی جانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ شاہد سے میں نے وعدہ کیا کہ فیری میڈو سے واپسی پر اگر کچھ ہمت باقی رہی تو بگروٹ ضرور چلیں گے مگر فیری میڈو سے جب واپس آئے تو ہم باتیں کم کرتے تھے اور سوچوں میں تھے کہ جو کچھ ہم کر کے آئے ہیں یا جو کچھ ہم سے سرزد ہوا ہے، وہ کیا خواب تھا یا کوئی حقیقت تھی۔ اس ذہنی حالت میں ہم صرف واپسی کے راستے ڈھونڈتے تھے۔

ہم نے ایک پل کراس کیا تو پتھر سے سنگ میل نظر آیا تھا، ہنزہ 266 کلومیٹر۔ ایک سڑک یہاں آگے سے بگروٹ کو جاتی تھی جس پر شاہد کی نظریں گڑی تھیں۔ وہ ہمارے بگروٹ نہ جانے پر خاموش سا ہوگیا تھا۔ انسان زندگی کے ہر دور میں کسی نہ کسی عشق یا جنون میں مبتلا رہتا ہے۔ بچپن میں کھلونوں اور کھیل سے، لڑکپن میں دوستوں کی دوستی سے، جوانی کسی لڑکی کے چکر میں گزار دیتا ہے، آگے بڑھتا ہے تو اولاد کی محبت غالب آجاتی ہے اور بڑھاپے میں اللہ سے عشق لگانے کا جتن کرنے لگتا ہے۔ کوئی ذرا مختلف شوق رکھتا ہے، کتابوں سے اور کوئی نظاروں سے لگاؤ رکھتا ہے۔ کوئی پہاڑوں اور جھیلوں سے۔ عشق پر کوئی زور نہیں! لگ گیا تو کسی کے کہنے پر ختم نہیں ہوسکتا اور نہ لگے تو پیغمبر کے کہنے پر بھی ابوجہل، عشق کے راستے پر نہ چل سکا۔ پہاڑوں، جھیلوں اور سبزہ زاروں سے عشق آپ کو کسی عمر میں بھی ہوسکتا ہے۔ اس عشق کو جوانی کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ یہ عشق انسان کو ہمیشہ جوان رکھتا ہے۔

کچھ آگے بڑھے تو دینور کا رنگ برنگا گاؤں آگیا۔ دور دور تک پھیلے سرسبز کھلیان اور کھیتوں میں پھیلے چنار کے درخت

پس منظر میں روکھی سوکھی چٹانیں اور ان سے لپٹے بادل جو دروں کے درمیان سے نمودار ہو کر نیچے اتر رہے تھے۔ یہاں کے علاقوں کی شناخت بقیہ علاقوں سے مختلف ہے۔ وادیاں ہری بھری اور پہاڑ برفوں یا بادلوں سے لپٹے پتھریلے اور ویران۔ کہیں وادیاں سنگریزوں سے بھری ہوئیں مگر پہاڑ چوٹیوں سے دامن تک سبز اور سیاہ جنگلوں سے ڈھکے ہوئے۔ پہاڑ بھی ہمالیہ اور قراقرم کے جو آسمان کی بیکراں وسعتوں میں ایک رعب اور دبدبے سے کسی شیر دل نگہبان کی طرح سینہ تانے پُرعزم کھڑے تھے۔

اسماعیل نے گاڑی ایک عمارت کے گیٹ کے آگے روکی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو پختہ راستے کے دونوں جانب چنار کے بلند درخت اپنے پتے زمین پر گرا رہے تھے۔ ایک خاموشی اور سنجیدگی ماحول پر چھائی تھی۔ صرف چڑیوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ راستے کے دونوں جانب چنار کے درختوں کے پیچھے، قطاروں میں ان چینی دوستوں کی قبریں تھیں جو ساٹھ کی دہائی میں شاہراہ ریشم بناتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ایک سفید یادگار بھی تعمیر کی گئی ہے۔ ہم مکمل طور پر خاموش تھے۔ کچھ پاکستانی شہیدوں کی قبریں بھی ہیں۔ ہم نے فاتحہ پڑھی اور خاموشی سے باہر نکل آئے۔ مجھے بلتستان کی ایک چیز بہت عجیب محسوس ہوئی۔

آپ کسی مصروف شاہراہ پر چلتے ہیں۔ دونوں اطراف میں گاڑیاں رواں دواں ہیں۔ زندگی اور روانی کا احساس ہے۔ مگر جب آپ اپنی گاڑی روک لیتے ہیں اور سڑک سے ہٹ کر کسی ایک بلندی، کسی ایک تنہائی میں ایک سو گز تک چلے جاتے ہیں تو یکایک آپ کسی گہری تنہائی میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ وہ روانی اور زندگی کا احساس معدوم ہو کر ایک خوفناک ٹھہراؤ میں بدل جاتا ہے۔ ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایک دہشت اتر آتی ہے۔ آپ اپنے اطراف سے کاٹ دیے جاتے ہیں۔ یہی احساس مجھے اس قبرستان میں جا کر ہوا۔ میں سو گز کی دوری پر ایک دنیا میں بہتا تھا اور اب ایک مختلف زمانے میں آنکلا تھا۔

یہاں سے ہماری گاڑی نکلی تو آگے سلطان آباد کے سبزہ زار، چنار کے درخت اور پس منظر میں بادلوں سے لپٹے سرمئی پہاڑ تھے۔ سلطان آباد میں اشفاق کے ماموں کا چنار کے درختوں میں گھرا لکڑی کا بنا ایک خوبصورت گھر ہے۔ اس سفر کے تقریباً دو سال بعد میں وہاں گیا تھا اور میں نے چاندنی سے

ڈھلی ایک شام یہاں گزاری تھی۔ ایک پُرتکلف ڈنر کے بعد ہم نے مقامی طور پر کشید کیا ہوا مشروب اس چھلکتی چاندنی میں نوش کیا تھا۔ ہوا کے خنک جھونکوں کے ہمراہ اس کمرے میں جہاں صرف دو موم بتیاں جل رہی تھیں۔ اشفاق کا ماموں اپنے تپتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ مجھے تُرش مشروب کے گلاس بھر بھر کر پیش کرتا رہا تھا۔

اس وقت ہماری گاڑی ہوا کے مخالف دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اسماعیل کی نظریں سڑک کے خطرناک موڑوں پر تھیں۔ شاہ جی اونگھ رہے تھے۔ اشفاق اور شاہد شینا زبان میں متواتر بولے چلے جا رہے تھے، جیسے کوئی کیسٹ لگی ہو۔ میں نے شاہ جی پر بھرپور نظر ڈالی تو چونک گیا۔ وہ رہ رہ کر اپنے کانوں پر ہاتھ مار رہے تھے۔ جیسے مکھی یا مچھر اڑا رہے ہوں۔ پہلے تو کچھ سمجھ نہ آیا مگر جب اندازہ ہوا تو مسکراہٹ خود بخود ہونٹوں پر آ گئی۔ کوئی بھی سمجھ میں نہ آنے والی زبان بولی جائے اور وہ بھی بہت تیزی سے تو نیند میں ڈوبے ہوئے شخص کو بھنبھناہٹ سی لگے گی۔ شاہ جی کو غنودگی میں شینے بھنبھناہٹ لگ رہی ہوگی اس لیے وہ بار بار کانوں پر ہاتھ مار رہے تھے۔

میں نے نظریں موڑ کر کھڑکی کے پار دیکھا۔ دریائے ہنزہ کے پھیلے پاٹ بہت بھلے لگ رہے تھے۔ پانی ایک بہاؤ میں نہیں بلکہ کئی ایک نالیوں کی صورت بہتے چلے آ رہے تھے۔ دریا کے پاٹ میں پانی کم اور چھوٹے چھوٹے پتھر زیادہ تھے۔ دریا کی وسعت میں ان پتھروں پر چلتا ایک ٹریکٹر اپنی حیثیت کھوئے ایک معمولی چیونٹی کی صورت نظر آ رہا تھا۔ دریا کے پار ایک سڑک دور واقع دروں میں گم ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں بادلوں سے ڈھکی تھیں اور پورے منظر میں بادل تیر رہے تھے۔ یہ سڑک نلتر کی جانب جاتی ہے۔ نلتر ایک مشہور اسکینگ اسپاٹ ہے۔ اس سے آگے چند گھنٹوں کی پیدل مسافت پر نلتر جھیل ہے جس کے چرچے میں سن چکا تھا۔ جس کے پانی شوخ سبز رنگ کے ہیں۔ اتنے شفاف کہ تہہ میں چلتی چھوٹی ٹراؤٹ مچھلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ایکورم میں دوڑ رہی ہوں۔

ایسی سحر آمیز فضا میں انسان بے ساختہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تم کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے۔

میں بھی خدائے لم یزل کی صناعی پر مسحور آگے بڑھتا رہا اور اب دریا کے پار وادی نوئل میں آ چکا تھا تو کسی صحرا میں ایک نخلستان، چٹیل پہاڑوں کے پس منظر میں لشکتی بہار۔ چیری،

خوبانی اور شہتوت کے باغات سے بھری وادی نول کی اپنی خوب صورتی ہے۔

دریا کے پار ہم سے بہت دور نول کے باغات مجھے بلا رہے تھے مگر مجھے بلتست جانا تھا۔ جو آج کل کریم آباد کہلاتا ہے۔ میرے ساتھی بلتست کے نشے میں راکاپوشی کو بھول چکے تھے جو کچھ ہی دور کھڑی اپنے جلوے عیاں کیے سلک روڈ پر ہر آتے جاتے کو اشارے کرتی ہے اور کبھی کسی باحیا دوشیزہ کی طرح حیاء کے بادلوں سے جھانکتی ہے۔

جہاں جہاں دریائے ہنزہ کا پاٹ چھوٹا ہوتا جاتا ہے اور پار کوئی آبادی ہے تو مقامی لوگ سلک روڈ سے رابطے کے لیے اپنی مدد آپ کے تحت کوئی پل بنا لیتے ہیں۔ ایسا ایک پل گواچی گاؤں کے رہنے والوں نے دریا کے اوپر بنایا ہے۔ لکڑی کے ہوا کے زوروں سے جھولتے تختے جن کا فاصلہ ایک دوسرے سے ایک سے ڈیڑھ فٹ تھا۔ ان پر چل کر اور رسوں کو تھامے یہ لوگ اتنی بپھرتی ہوا میں کیسے پار جاتے ہوں گے؟

اشفاق بتا رہا تھا کہ جب بھی ہوا کی رفتار بہت زیادہ ہو تو یہ پل الٹ بھی جاتا ہے۔ ماضی قریب میں ایسا حادثہ ہو چکا ہے جب گواچی کا ایک باشندہ پل پار کرتے ہوئے سیدھا دریا ہنزہ کے چنگھاڑتے پانیوں میں جا گرا تھا اور اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔

مجھے کیا سوجھی تھی کہ میں پل پر پہنچ گیا اور اب پل کے درمیان کھڑا نہ واپس آنے کے قابل تھا اور نہ آگے جانے کے۔ پل ایک اڑن قالین کی طرح دریا کی موجوں پر اڑ رہا تھا یعنی زور زور سے ہل رہا تھا اور میں اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے مختلف اور عجیب زاویے بنائے کھڑا کسی مدد کا منتظر تھا۔

اسماعیل گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اس نے میری بے بسی کو بھانپ لیا۔ وہ ڈولتا ہوا آیا اور پہلے مجھے پار لے گیا اور پھر میں اس کے سہارے واپس شاہراہ ریشم پر آیا۔ اس دن پتا چلا کہ اس کہاوت کی قیمت کتنی ہے۔ ”جان بچی سو لاکھوں پائے۔“

اب ہم بلندی کی جانب جا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی زیادہ ہو رہی تھی۔ عظیم اور بلند پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی تھیں۔ ان کے گرد بادل لپٹے جاتے تھے۔ جہاں جہاں بادل پہاڑ کے ماتھے پر بوسہ دے سکتے وہاں وہ اس کا بدن چومتے تھے۔ اس جگہ سے اٹھتی ہوائیں، سنسناتی ہوئی، پوری وادی میں پھیلتی جاتی تھیں۔ ہم جگلوٹ میں رکے۔

سڑک کی بائیں جانب ایک پرانا سا ہوٹل تھا اور اس کے پیچھے کہیں دریا ہنزہ بہتا تھا۔ دریا کہیں نظر نہیں آتا تھا، بیچ میں سبز کھیت تھے۔ کھیتوں سے کہیں دور برف پوش بلندیاں تھیں۔ جہاں فضاؤں میں برف کے ارد گرد بادل اڑتے تھے اور چوٹیوں کے قریب دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اس ہوٹل کے کمرے پیچھے کی جانب تھے۔ میں ایک کمرے میں چارپائی پر لیٹا ان دلکش سینریوں کو دیکھ رہا تھا جو کمرے کی دو کھڑکیوں سے باہر نظر آتی تھیں۔ چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے، ٹانگیں سیدھی کیے ان مناظر کو متواتر دیکھتا جا رہا تھا۔ دونوں مناظر ایک دوسرے کے عکس تھے۔ سبز، لہلہاتے کھیت مگر ان سے پرے برفانی چوٹیاں اور بل کھاتے، تیرتے بادل۔ پورا ماحول شوخ رنگوں میں رنگ چکا تھا۔ کمرے میں خاموشی آکر ٹھہر گئی تھی۔ دونوں کھڑکیوں کے پٹ کھلے تھے اور ہوا کھلے عام اندر آ رہی تھی۔

اتنے میں شاہ جی کمرے میں وارد ہوئے۔ ان کے آنے کا پتا ایسے چلا جب میں نے ”مار اوے“ کا وردسنا۔ یہ ورد اس سفر میں بار بار سن رہا تھا۔ وہ حیرت سے کھڑکیوں کے پار مناظر کو دیکھ رہے تھے۔ ایک مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ انگڑائی لے کر وہ بھی تکیے سے ٹیک لگا کر محو نظارہ ہو گئے۔

اسماعیل آنکھیں بند کیے آرام کر رہا تھا اور ہمارے دونوں شہزادے شاہد اور اشفاق باہر کہیں میموں کے گائیڈ بنے، انہیں انجانی راہوں کے نشان بتا رہے تھے۔ گرم پکوڑوں کے ساتھ گرما گرم چائے کا ذائقہ آج پہلے سے کہیں زیادہ پُرلذت تھا۔ سرد فضا میں گرم چائے، خوب مزہ ہی نہیں دیتی خواب بھی جگاتی ہے۔ میں بھی خوابوں میں ڈوب گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں کہیں اور ہوں۔ نہ یہ جگلوٹ ہے اور نہ نگر کی وادی۔ یہ کوئی جنت کا ٹکڑا تھا جو میری کسی ایک نیکی کے بدلے اللہ نے مجھے انعام میں دیا ہے۔ یا یہ میری فنتاسی تھی جو حقیقت کا روپ دھارے میرے سامنے حقیقت بن کر آ گئی تھی۔ یہ پُرشکوہ منظر آہستہ آہستہ مجھ پر غالب ہوتا گیا اور میں اس کے سحر میں گرفتار ہوتا گیا۔ جب کہ شاہ جی خاموشی سے ان لمحات سے محظوظ ہو رہے تھے۔

آج پہلی بار ان کی آنکھوں میں، میں نے اپنے لیے شکریے کے جذبات دیکھے۔ شاہ جی کو روڈ سے جتنا دور لے جائیں وہ اتنا ہی روٹھ جاتے ہیں۔ سڑک کے ساتھ ساتھ کا سفر ہو تو وہ بہت خوش رہتے ہیں۔ جیسے ہی آپ ان کو سڑک سے

دور لے جائیں۔ ان پر ایک طرح کا لرزہ طاری ہو جاتا۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ شاہ جی دل کے کمزور ہیں۔ بلندیوں اور کٹھن راستوں سے ان کو وحشت ہوتی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ ایک بار ہم فیری میڈو کے راستے پر تھے۔ راستوں کی تختی اور ایک لرزش ہمیں سیدھا موت کے منہ میں لے جاسکتی تھی۔ ہم قدم اٹھاتے، خوف سے لرز رہے تھے۔ اتنے میں شاہ جی ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ میرے پاس آئے۔ ان کی بات سن کر میں بہت شرمندہ ہوا۔ شاہ جی کو اپنی موت کا ڈر نہیں تھا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی بیٹیاں گھر میں اپنے شفیق باپ کا انتظار کر رہی تھیں، جوان کا واحد کفیل تھا۔ "تم تو ایک سالہ بیٹی کے باپ ہو اور میری ذمہ داریاں ان پہاڑوں سے بھی کہیں بڑی ہیں۔" انہوں نے تاتو گاؤں کے خشک اور بلند پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"جب ہم انشاء اللہ واپس گھر پہنچیں گے تو آپ اپنی بچیوں کو یہی قصے سناؤ گے اور وہ اپنے باپ پر فخر کریں گی۔" میں نے شاہ جی کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے جھوٹا دلاسا دیا تھا۔ وہ میرے دلاسے میں تو نہ آئے مگر خاموشی سے آگے بڑھ گئے تھے۔

پچھلے سال میں پاکستان گیا تو شاہ جی کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ اپنا مکان بیچ کر کہیں کرائے پر رہتے ہیں۔ چھ بیٹیاں بیاہ دی ہیں۔ خود دل کے عارضے میں مبتلا تھے مگر خوش تھے اور مطمئن تھے مگر میرے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں نانگا پربت، فیری میڈو، ہنزہ اور نلتر کو یاد کرتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ اگر میں تمہارے ساتھ اس وقت نہ جاتا تو آج میں خالی ہاتھ ہوتا۔ آج میرے پاس ان سنہرے دنوں کی سنہری یادیں تو ہیں۔ وہ ساری تصویریں البم سے نکال لائے اور خوشی و حسرت سے میں انہیں دیکھتا رہا۔

اسماعیل نے ذرا سی نیند لے لی تھی اور چائے پی کر اب وہ تروتازہ تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "بادل بھی اکٹھے ہو رہے ہیں اور سفر بھی بہت ہے۔"

شاہ جی پر کاہلی چھا رہی تھی۔ مشکل سے ان کو اٹھایا۔ مجھے ان کھڑکیوں سے نظر آتے مناظر کے بچھڑنے کا ملال بھی تھا۔ باہر نکلے تو اشفاق اور شاہد، ایک دو گوریوں کو گھیرے کھڑے تھے۔ غیر ملکی سیاح جب پاکستان آتے ہیں تو جلد ہی مقامی لوگوں سے گھل مل جاتے ہیں۔ یہ میں ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب پاکستان غیر ملکوں کے لیے چھٹیاں گزارنے کا سستا اور خوبصورت مقام تھا۔ یہ مغربی سیاح پاکستان اور یہاں کے رہنے والوں کو پُراسرار سمجھتے ہیں۔ یہی اسرار پانے کے لیے پاکستانیوں کے ساتھ جلدی گھل مل جاتے ہیں اور واپس جا کر سردیوں میں اپنے آتش دان کے قریب بیٹھ کر مزے لے لے کر اپنے سفر کے قصے سناتے ہیں۔

وہاں سے روانہ ہوئے تو ہوا میں خنکی بڑھتی چلی گئی۔ ہم نے اپنے بیگوں سے جیکٹیں نکال کر پہن لیں۔ خنک ہوا میں برف کا لمس تھا، جس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ راکاپوشی قریب ہے۔ اتنے میں اسماعیل نے گاڑی اتنی کا زاویہ بناتی بلند چٹان کے نیچے روکی۔ چٹان پر پچیس تیس فٹ اونچائی پر ایک تختی لگی تھی، جو یہ بیان کرتی تھی کہ لاکھوں، کروڑوں سال پہلے زمین کے دو خطے اسی مقام پر آپس میں آٹکرائے تھے جس کے باعث یہ پہاڑ ظہور پذیر ہوا۔ شاہد اور اشفاق، مارخور کی مانند چھلانگیں لگاتے اس تختی تک پہنچ گئے۔ میں نے جھٹ سے ایک تصویر اتار لی۔

ابھی میں اپنے لیپ ٹاپ پر یہ سب لکھ رہا ہوں اور وہ تصویر میرے سامنے پڑی میری حسین یادوں کو تازہ کر رہی ہے۔ ہمارے بائیں جانب دریا ایک شور کے ساتھ بہہ رہا تھا اور دریا کے پار "چھل" نام کا گاؤں تھا۔ رات کی بارش کی وجہ سے چھل کے کھیتوں کی سنہری گندم زمین سے لگی تھی اور پوری وادی میں سنہری، مخمل کی مانند بچھی نظر آتی تھی۔ جب بلند پہاڑوں سے اترتی تیز ہوا، وادی میں پھیلتی تو گندم کے خوشوں کی بچھی، سنہری مخمل میں ایک ہلچل پیدا ہوتی اور سنہری لہروں کی طرح دور تک پھیلتی جاتیں۔ اسماعیل کہنے لگا کہ اگر کل سورج نکل آیا تو یہ خوشے پھر سے سر اٹھالیں گے۔

ہم آگے بڑھتے گئے اور ہوا سرد سے سرد تر ہوتی گئی۔ راکاپوشی قریب آرہی تھی۔ میں ونڈ شیلڈ سے اس منظر کا منتظر تھا جس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ راکاپوشی کا معبد! سر سے لے کر پاؤں تک برف میں لدی راکاپوشی ہمیشہ سے کوہ پیماؤں کی دلچسپی کا مرکز رہی ہے۔ اس سے بلند چوٹیاں ایورسٹ، کے ٹو، نانگا پربت پہلے سے سر ہو چکی تھیں مگر پچیس ہزار فٹ بلند راکاپوشی ساٹھ سال تک کوہ پیماؤں کے لیے سر درد بنی رہی۔ ہلاکتیں تو نانگا پربت سے کم ہوئیں مگر کوہ پیماؤں کو اسے سر کرنے میں ناکامیاں زیادہ ملیں۔ آخر کار ایک پاکستانی اور انگلستانی مشترکہ ٹیم نے 1958ء میں اسے سر کر لیا۔

میں نے اپنی جیکٹ کی زپ گلے تک کھینچ لی۔ ایک موڑ مڑے اور ساتھ ہی برفانی جھونکا کھڑکی سے اندر آیا اور دوسرے لمحے زمین سے آسمان تک برف میں لدی، آسمان کی وسعتوں کو چیرتی راکاپوشی میرے سامنے تھی۔ ایک ہیجان تھا جو اس کی چوٹیوں پر برپا تھا۔ اس کی چوٹی مکمل طور پر دھند میں غائب تھی۔ بادل ہالا بنائے اس کا طواف کررہے تھے۔ اس کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ہوا جھکڑوں کی طرح وہاں سے اترتی چلی آرہی تھی اور ہم کپکپا رہے تھے۔ جہاں کہیں برف نظر آتی تھیں، وہاں ان کی رنگت سنہری تھی۔

اس دوران ہم غلمت آپہنچے۔ یہ راکاپوشی کا ویو پوائنٹ ہے۔ راکاپوشی کے دامن سے نکلتا، میناپن گلیشیئر یہاں تک آپہنچتا ہے۔ ہم گلیشیئر کے ساتھ بنے ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں نمکین چائے پی رہے تھے۔ ساتھ ہی تندور سے گرم روٹیوں کی مہک ہم تک پہنچ رہی تھی۔ قریب ہی گلیشیئر سے نکلتا ایک نالہ رم جھم کرتے پانیوں کے ساتھ ایک خاص سُر میں بہہ رہا تھا۔ اشفاق بتا رہا تھا کہ شام کو راکاپوشی پر سے دھند ہٹ جاتی ہے اور کریم آباد (بلتت) سے ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس کی سنہری ہوتی چوٹیوں کا نظارہ نہایت خوبصورت ہوتا ہے اور دنیا بھر سے سیاح اسے دیکھنے کریم آباد کے مختلف مقامات پر اور خاص کر بلتت فورٹ پر اکٹھے ہوتے ہیں جو کریم آباد کا سب سے بلند مقام ہیں۔ شاہد کہہ رہا تھا کہ میں نے دو گھوڑوں کا انتظام کیا ہے جو راکاپوشی کے بیس کیمپ تک آپ کو لے جائیں گے۔ خواہش تو میری بہت تھی کہ راکاپوشی کی برفانی تنہائیوں میں میرا کیمپ لگے مگر مجھے یہ اندازہ تھا کہ شاہد کی آفر پر ردعمل نہیں کیا جاسکتا۔ کسی پہاڑ کے بیس کیمپ میں جانا بذاتِ خود ایک علیحدہ سے پوری مہم ہے۔ ایسا نہیں کہ میناپن سے گھوڑے پر بیٹھا کر بیس کیمپ کا چکر لگایا اور پھر وہاں سے ہوا کے گھوڑے پر فراٹے بھرتے واپس غلمت پہنچ گئے۔ اس لیے بہتر یہی سمجھا کہ ہنزہ پہنچا جائے اور بلتت فورٹ کی خطرناک بلندی سے سنہری ہوتی راکاپوشی کا نظارہ کیا جائے۔ راکاپوشی "نگر" میں ہے۔ نگر اور ہنزہ کے بیچ دریا ہنزہ ہے۔ نگر والوں کو گھمنڈ ہے کہ راکاپوشی ان کے علاقے میں ہے۔ ہنزہ والے اس پر اتراتے ہیں کہ راکاپوشی کا بہترین نظارہ کریم آباد سے دیکھا جاسکتا ہے۔ دونوں اپنے دعووں پر ٹھیک ہیں۔

ہمارا سفر پھر سے شروع ہوا۔ کچھ دیر میں ایک پل کراس کرنے کے بعد ہم دریا کی بائیں جانب آگئے۔ دائیں جانب ایک راستہ اٹھتا ہوا نگر کو جاتا ہے۔ یہاں پر ایک بہت پرانے معدوم ہوتے ایک قلعے کے لرزتے، بکھرتے کھنڈرات تھے۔ میں اس قلعے کو دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں اسماعیل کے پاؤں، گاڑی کی بریکوں پر پوری قوت سے پڑے کہ گاڑی کے ٹائر سڑک کے ساتھ دور تک گھستے چلے گئے۔ شاہ جی جو اونگھ رہے تھے ہڑبڑا کر اللہ خیر، اللہ خیر کرتے اٹھ بیٹھے۔ میں نے اپنی نشست مضبوطی سے پکڑلی تھی۔ ہم سڑک کے اس کنارے پر جارکے، جہاں سے دریا بہت نیچے شوخی سے ہمیں بلا رہا تھا۔ شاہ جی لرزتے ہوئے منمنا رہے تھے۔ "کیا ہوا؟"

اسماعیل بولا۔ "پتھر گرنے والے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا تو وہ بولا کہ ہوا کو سونگھ کر معلوم ہوتا ہے کہ لینڈ سلائیڈنگ ہونے والی ہے۔

ہم خاموش خاموش خوف زدہ گاڑی میں دبکے بیٹھے تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ بائیں جانب ایک چٹان کی چوٹی سے تیز ہوا سنسناتی، سیٹیاں بجاتی سڑک تک ایک بگولے کی صورت اتری تھی اور فضا میں گرد کا طوفان اٹھا تھا۔ شور سے زمین کانپ رہی تھی اور گرد کا طوفان آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔

اسماعیل کی چھٹی حس نے اس سلائیڈنگ کو محسوس کرلیا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے پتھروں، کنکروں اور مٹی کا ریلا سڑک سے ٹکرا کر دریا برد ہو رہا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے تشویش بھری نظروں سے اس ملغوبے کو دیکھ رہے تھے جو سڑک پر ایک ناگہانی آفت کی طرح آپڑا تھا۔ کچھ لمحوں کی دوری ہمیں اس آفت سے بچا گئی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کس رفتار سے یہ پتھر اور کنکر آتے ہیں اور کوئی ان کی زد میں آجائے تو اس کا مرنا نہ ہو تو شدید زخمی ہونا تو ٹھہر جاتا ہے۔

ہم ستائش بھری نظروں سے اسماعیل کو دیکھ رہے تھے کہ اس کی چابکدستی نے ہمیں موت کے منہ سے نکال لیا۔ یہ طوفان تھما تو ہم نے کچھ دیر مزید انتظار کیا کہ کہیں گولی کی طرح سنسناتا، ہماری راہ تکتا کوئی پتھر ہم پر نہ آپڑے۔ پھر آگے بڑھے اور اپنی مدد آپ کے تحت سب مل کر پتھروں اور کنکریوں کے ڈھیر کو دریا کی طرف دھکیلنے لگے۔ شاہ جی اس صفائی کے دوران آیت الکرسی کا ورد مسلسل باآواز بلند کرتے جارہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ٹھہر ٹھہر کر چٹان کی بلندی پر

نظریں ڈال رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر ہو کہ پھر کوئی افتاد او پر سے نازل نہ ہو جائے۔ پھر کوئی تو.... اپنی جگہ سے نہ ٹپک جائے۔ لینڈ سلائیڈنگ اتنی رفتار سے ہوئی تھی کہ اس کا بیشتر حصہ پہلے ہی سے اپنے زور پر دریا میں گر چکا تھا۔ باقی کو ہم نے نیچے دھکیل دیا۔

سورج ڈھل رہا تھا اور ہم راستہ صاف کر کے کریم آباد کی طرف پھر سے روانہ ہو گئے۔

آگے بڑھے تو منظر ہمارے سامنے کھلتا چلا گیا۔ سڑک کی دونوں جانب پھل دار درخت تھے۔ اخروٹ کے درخت میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اب ہم ہنزہ میں تھے۔ پہلے حسن آباد آیا اور پھر میرے خوابوں کی دنیا بلتست، جو آج کل کریم آباد کہلاتا ہے میرے سامنے تھا۔

ہم کریم آباد کے بازار میں داخل ہوئے تو سورج اپنے آج کے سفر کی اختتامی کرنیں بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر ڈالتا انہیں سنہری کرتا جا رہا تھا۔ ایک خنک شوخ ہوا اس بازار میں اوپر سے اترتی ہمیں کپکپا رہی تھی۔ دور اوپر کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک پرانے قلعے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میر یہاں ہنزہ کے حکمران تھے اور یہ قلعہ ان کی رہائش گاہ تھا۔ ہنزہ کی ریاست تو ختم کر دی گئی مگر میر کا خاندان اب بھی سب سے معتبر مانا جاتا ہے۔ وہ حکمران نہ ہوتے ہوئے بھی یہاں کے حکمران ہیں۔ وہ پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر کریم آباد کے گرد و نواح میں اپنے شاندار مکانوں میں رہتے ہیں۔

کریم آباد کو ہم ہنزہ کے نام سے پہچانتے ہیں، حالانکہ ہنزہ اس پورے علاقے کا نام ہے جہاں چھوٹے چھوٹے قصبے آباد ہیں۔ کریم آباد، ہنزہ کا صدر مقام ہے۔ میں کریم آباد میں کھڑا کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کسی شخص کو کسی پُرشور میلے سے، جہاں کانوں پڑی آواز نہ سنائی دیتی ہو پکڑ کر کسی ساؤنڈ پروف کمرے میں بند کر دیا جائے۔ بالکل ویسا ہی احساس جاگ اٹھا تھا۔ جیسے آپ کسی بحری جہاز میں اپنے کمرے کی بالکونی سے لہروں کا شور سنتے ہوں اور پھر اٹھ کر کمرے میں آ کر بالکونی کا دروازہ بند کر دیں تو ایکدم سارا شور تھم جاتا ہے۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا کے شور و غل سے ایک دم میں کسی ایسی جگہ پہنچ دیا گیا ہوں جہاں وقت ٹھہر گیا ہے۔ ہر حرکت رک چکی ہے۔ چلتی چیزیں تھم گئی ہیں۔ ایک نئی دنیا کے نئے لوگ نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتے آپ کے آس پاس سے خاموشی سے گزر رہے ہوں۔

خاموش، پرسکون، صاف ستھرا اور حیران کن حد تک بلند پہاڑوں میں گھرا کریم آباد آہستہ آہستہ میرے وجود میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ بازار سے بائیں جانب نیچے ڈھلوانوں میں شام کی اترتی سیاہی میں سرسبز و شاداب کھیت اوپر نیچے، مخمل کے قالینوں کی مانند بچھے تھے۔ سامنے راکا پوشی کی چوٹیاں سونے جیسی ہو گئی تھیں جیسے کوئی پگھلتا سنہرا لاوا راکا پوشی کی آسمانی بلندیوں سے نیچے کو بہہ رہا ہو۔ ہنزہ کی یگانگی میں راکا پوشی کی سنہری چادر مجھے مدہوش کیے ہوئے تھی۔ اشفاق بتا رہا تھا کہ ان کھیتوں کی آبیاری الترگلیشیر کے پانیوں سے ہوتی ہے۔ سامنے کے بلند پہاڑوں پر پگڈنڈیوں کی طرح بہتے نالے نیچے کھیتوں میں پھیل کر انہیں سیراب کرتے ہیں۔ یہ پانی اپنے اندر ایک طاقت رکھتے ہیں اور اپنے اندر مختلف معدنیات کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

بازار سے پرے کھیتوں میں مرد و عورت کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ سائے آہستہ آہستہ لمبے ہو رہے تھے۔ میں اور شاہ جی بولتے کم اور دیکھتے زیادہ تھے۔ اس ماحول نے میرے اندر رگ و پے میں سکون کا احساس دوڑا دیا تھا۔ میرا تنا ہوا جسم بکھر کر ان ہواؤں کے ساتھ اڑ رہا تھا جو درختوں سے ٹکرا کر ان کے پتوں میں موسیقی بھرتی تھیں۔ ہنزہ اور لوگوں کے لیے کتنا حسین ہے، مجھے نہیں معلوم۔ خوبصورتی کا ہر ایک کا اپنا معیار ہے۔ میں جو محسوس کر رہا تھا وہی لکھ رہا ہوں۔ شاید کچھ لوگوں کو اس سے بہتر لگے اور کچھ کو کم...... میں وہی لکھ رہا ہوں جو مجھے محسوس ہوا۔

اشفاق ستائش بھری نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے ہنزہ کا ہونے پر ناز تھا جو بالکل صحیح تھا۔ شاہد کہتا تھا کہ بگروٹ بھی کسی سے کم نہیں، آپ ادھر گئے نہیں ورنہ آپ ہنزہ کو بھول جاتے۔ ہم نے بازار میں ایک دو منزلہ ہوٹل کا کمرا لیا۔ شاہد اور اشفاق کسی ہنزہ واٹر کی تلاش میں نکل گئے جو کوئی سو سالہ مائی، اوپر پہاڑوں پر کشید کرتی ہے۔ انگوروں، شہتوت اور خوبانیوں کا کشید کیا ہوا رس معلوم نہیں کیا نشہ رکھتا تھا۔ جو ان دونوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا، گلگت ہی سے وہ اس کی تعریفیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ میں ویسے ہی مست پھر تا تھا اور کوئی اور نشہ میری اس مستی کو تباہ کر دیتا جو میں نہیں چاہتا تھا۔

ہمارے کمرے کی کھڑکیاں باہر بازار میں کھلتی تھیں۔

صاف ستھرے نرم بستر اور نئی نکور رضائیاں، مجھے ست کر رہی تھیں۔ شاہ جی اس ڈھلتی شام میں راکاپوشی سے پھوٹتی سنہری شعاعوں کو کالے شیشوں والی عینک سے دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے بستر کے تکیے پر سر رکھے، آنکھیں موندھے، اس نایاب ماحول سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شاہ جی کی فرمائش تھی کہ ہوٹل کی چھت پر بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ ہوٹل کے ہال کے اندر سے سیڑھیاں چھت تک جاتی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں ہم چھت پر پڑی کرسیوں پر راکاپوشی کے سامنے آبیٹھے۔

شاہ جی اوپر پہنچتے ہی مجسمے کی طرح ایستادہ ہو گئے۔ کچھ دیر راکاپوشی کو دیکھتے رہے پھر ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ماراوے" یہ کہتے وہ ایک سلوموشن میں کرسی پر گرے پھر اٹھ کر چھت پر لگی لوہے کی ریلنگ کو پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے سامنے والا منظر دیکھنے لگے اور پھر پلکیں جھپکائے ....بغیر کرسی پر اسی رفتار سے آکر بیٹھ گئے۔

راکاپوشی کے ساتھ لیلیٰ پیک، گولڈن اور ورن پیک نمایاں طور پر چمکتی تھیں۔ ہنزہ میں شام ابھی دور تھی مگر راکاپوشی کے برفانی معبد ابھی تک سنہری رنگوں میں رنگے تھے۔ برفوں نے جو شعاعیں پورے دن میں جذب کی تھیں، اب ان کو واپس لوٹا رہی تھیں۔ ایک شاندار منظر ہمارے سامنے تھا اور ہم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

بازار میں آمدورفت بہت کم تھی۔ کچھ غیر ملکی سیاح نیکریں پہنے، کندھوں سے ٹریکنگ شوز لٹکائے، تھکے ہارے اپنے دن بھر کے کسی ٹریک سے واپس آرہے تھے۔ ہماری پیٹھ کے پیچھے التر پیک کی برفانی چوٹی تھی، جہاں سے ٹھنڈی ہوا کریم آباد کی ڈھلوانوں پر بلا روک ٹوک چلتی تھی۔ شاہ جی اب اس نظارے اور ماحول سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ بار بار میرا شکریہ ادا کرتے تھے کہ میں انہیں اس مقام پر لے آیا.... وہ بھی میری طرح نظاروں کے اسیر ہو چکے تھے۔ ہم میں باتیں کم ہوتی تھیں بس ہم اپنی دنیا میں کھوئے رہتے تھے۔ شاہ جی ایک لہر میں بولتے گئے۔ "میں تو نانگا پربت پر چڑھنے کا سوچ کر آیا تھا! مگر یہاں آکر یہ تصور بھی ختم ہو جاتا ہے کہ آپ کسی معمولی سے پہاڑ پر چڑھ سکیں۔" کچھ توقف کے بعد انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جن پہاڑوں پر برف بھی نہ ٹھہر سکتی ہو وہاں انسانی قدم کیسے جمتے ہوں گے؟"

شاہ جی کی نگاہیں بازار میں گھومتے جاپانی کوہ پیماؤں پر تھیں۔

"شاہ جی! ہم یہاں تک آگئے ہیں یہ بھی ہماری ہمت ہے ورنہ ہمارے ڈیرہ اسماعیل خان سے شاید ہی کوئی یہاں آیا ہو۔" میں نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ پہاڑ لاکھوں سال سے ایسے ہی انسان کو دیکھتے آرہے ہوں گے جیسے آج دیکھ رہے ہیں۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے۔" میں اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ "دریاؤں نے اپنے رخ بدل لیے، شہروں نے زمین کی ساخت کو تبدیل کر دیا مگر یہ پہاڑ اپنی جگہ اٹل ہیں۔ نہ ہل سکے اور نہ کوئی انہیں ہلا سکا۔"

راکاپوشی چمکتی دمکتی اپنے سنہرے وجود کے ساتھ ہمارے سامنے تھی۔ یہ پہاڑ صدیوں تک کوہ پیماؤں کے لیے چیلنج رہا۔ ہمیشہ یہی کہا گیا کہ یہ سر نہیں ہو سکتا کیونکہ چوٹی تک کا کوئی راستہ نہیں بن پا رہا تھا۔ کئی ٹیمیں اسے سر کرنے کے لیے آئیں مگر بیس کیمپ سے واپس لوٹ گئیں۔ پھر بھی جنونی لوگ اسے مسخر کرنے پر تلے رہے۔

1892ء میں لارڈ کونوے پہلی بار اس پہاڑ کے قریب پہنچا کہ کوئی راستہ تلاش کیا جا سکے مگر ناکام رہا۔ 1938ء میں ایک بار پھر اس کو قابو میں کرنے کی کوشش ناکامی سے دوچار ہوئی۔ 1947ء میں دو سوئس اور ایک جرمن اسے سر کرنے آئے مگر انیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر ناکام واپس لوٹے۔ 1954ء میں ایک برطانوی کوہ پیما آر اے چورلی اسے سر کرنے آیا۔ میجر جنرل ضیاء دین اس مہم کا حصہ تھے جو بعد میں قاہرہ میں ایک ایئر کریش میں ہلاک ہو گئے۔ یہ ٹیم تیسرے کیمپ پر پہنچی تو موسم بپھر گیا۔ برفانی تودے اپنی جگہ چھوڑنے لگے تو یہ ٹیم بھی ناکام و نامراد واپس لوٹی۔ 1956ء میں ایک برطانوی اور امریکن مشترکہ ٹیم اسے سر کرنے گلگت پہنچی۔ ڈیڑھ ماہ وہ برف میں راستہ تلاش کرتے رہے مگر برفانی طوفان انہیں راستہ نہیں دے رہے تھے۔ آخر کار وہ واپس لوٹے مگر اپنا سامان برف میں دبا کر لوٹے کہ آئندہ کی مہم میں یہ کام آئے گا۔ (یاد رہے کہ اس وقت تک نانگا پربت اور کے ٹو سر ہو چکی تھیں)۔

دوبارہ وہ 1959ء میں راکاپوشی کو نیچا دکھانے کے لیے پہنچے تو اس بار پاکستانی بھی اس ٹیم کا حصہ تھے۔ مائیک بنک اس ٹیم کا سربراہ تھا۔ پاکستانی ممبرز اس ٹیم میں کیپٹن شاہ خان اور راجا اسلم تھے۔ 20 مئی کو یہ ٹیم بھرپور انداز میں راکا

پوشی پر حملہ آور ہوئی اور بیس کیمپ تک پیش قدمی کر لی۔ غیر یقینی موسمی حالات کی وجہ سے دو ہفتے یہ لشکر بیس کیمپ میں دبکا رہا۔ یہ لوگ راکاپوشی کے دیو کے ساتھ جنگ کے لیے ذہنی طور پر مکمل تیار تھے کہ ایک زبردست برفانی طوفان اوپر سے نیچے آیا اور اس کی زد میں دونوں پاکستانیوں سمیت چھ پورٹرز بھی آ گئے۔ پندرہ سو فٹ تک نیچے لڑھکتے چلے آئے مگر معجزانہ طور پر صرف معمولی خراشیں آئیں۔ وہ باہمت لوگ آگے بڑھتے رہے۔ سخت موسموں کا چٹانوں کی طرح مقابلہ کرتے رہے۔ دو ہزار فٹ آگے پہنچے تو ایک برفانی چٹان راستہ روکے کھڑی تھی۔ شاہ خان نے بڑی مہارت سے چٹان پر چڑھ کر رسے نیچے پھینکے اور ٹیم بمعہ پورٹرز کے اوپر پہنچی۔ وہاں سے چوٹی ساڑھے چار ہزار فٹ اوپر تھی۔ ٹیم آگے بڑھتی رہی، ان کا جنون حواس پر غالب آ چکا تھا۔ پانچواں کیمپ 23 ہزار فٹ پر قائم کر لیا۔ پھر صرف تین برطانوی آگے بڑھے اور ایک ہزار فٹ اوپر چھٹا کیمپ قائم کر لیا۔ اگلا دن 25 جون کا تھا جب آدھی رات کے بعد ٹام پیٹی اور کپتان بنک، برفانی ہواؤں کا مقابلہ کرتے کرتے، آہستہ آہستہ آگے خاموشی سے سرکنے لگے۔ چوٹی سامنے نظر آ رہی تھی۔ ان دونوں کی سانسیں چڑھ چکی تھیں۔ ٹانگوں میں جان کم پڑ رہی تھی مگر دوپہر ایک بج کر چالیس منٹ پر ان کے قدم پہلی بار راکاپوشی کی چوٹی پر پڑے۔

میں یہ سب داستان شاہ جی کے آگے تب رکھ رہا تھا جب ان کی نظریں راکاپوشی پر تھیں اور وہ مرعوب ہو کر راکاپوشی کو دیکھ رہے تھے۔

شاہ جی بڑے متاثر نظر آ رہے تھے۔ جوان ہمت لوگوں کی باتیں ہوں تو ہر کوئی متاثر ہو جاتا ہے۔ جب سے جیپ حادثہ ہوا تھا میں نے شاہ جی سے فیری میڈو کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ بھی فیری میڈو کے ذکر سے کنی کتراتے تھے۔ آج اچھا موقع تھا کہ گرم لوہے پر کاری ضرب لگائی جائے کیونکہ آج وہ ہنزہ کی شام میں ہوٹل کی چھت پر تنہا کھلے آسمان تلے، راکاپوشی کے روبرو، التر پیک سے آتی سرد ہوا کے... جھونکوں کو محسوس کرتے ہوئے ایک سرشاری کے عالم میں تھے۔

''اچھا کیا تم مجھے یہاں لے آئے۔ میں تو دنیا کے چکر میں ایک کولہو کا بیل بنا ہوا تھا۔'' شاہ جی بولتے جا رہے تھے اور میں خاموشی سے ان کو سن رہا تھا۔

مجھے اچھا لگ رہا تھا کہ شاہ جی اپنے اندر کا درد نکال رہے ہیں۔ ہر ایک کے دل میں ایک درد ہوتا ہے، ہوک ہوتی ہے، کوئی تڑپ یا کوئی طوفان چھپا ہوتا ہے جو باہر نہیں آتا جب تک آپ ایک خاص ماحول میں داخل نہ ہوں۔ آپ کا ساتھی آپ کو اپنا مسیحا نہ لگے، آپ کے اندر چھپی چنگاری کو کوئی آنچ نہ ملے۔ شاہ جی کی آنکھوں میں اترے آنسو میں اس نیم تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ ''میں اکیلا ایک عرصے سے جدوجہد کرتا آ رہا ہوں۔ مجھ سے آج تک کسی نے نہیں پوچھا کہ میں کیسا ہوں، مجھے کیا چاہیے؟ آج محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں آ کر میں نے اچھا کیا۔ وہ ساری مشقتیں اور دشواریاں اگر ہیں بھی تو آج نہیں ہیں۔''

انسان کو اپنے معمول کے علاوہ بھی کچھ مصروفیات پالنی چاہییں۔ جیسے کتابوں کا شوق، پینٹنگ، تیراکی، پہاڑوں اور جنگلوں میں جانے کا ولولہ، کوئی نظریہ یا کوئی ہدف۔ یہ آپ کے زندہ ہونے کی علامات ہیں۔ میں نے دنیا گھوم لی اور کئی قسم کے لوگوں سے ملا، پر میں نے خوش صرف دو طرح کے لوگوں کو دیکھا۔ ایک وہ جو دوسروں کا خیال کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو قدرت کے حسین تخیلات کو دیکھنے دربدر گھومتے ہیں۔ میں نے اسّی اسّی سالہ لوگوں کو، بلند پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے دیکھا، کسی بیچ پر بنے ڈانسنگ فلور پر اپنی بیوی کے ساتھ جاز پر لہراتے دیکھا، کسی جم میں وہیل چیئر پر بیٹھ کر ورزش کرتے دیکھا۔ ایسے لوگ جو اپنے اندر کسی ولولے کو مرنے نہیں دیتے اور ہمیشہ زندگی بھرپور انداز میں گزارتے ہیں۔ ہمارے ہاں اگر کوئی ریٹائر ہوتا ہے تو وہ دو چار سال بعد اپنے آپ کو بیکار سمجھنے لگتا ہے یا دنیا اسے ناکارہ بنا دیتی ہے۔ امریکا اور مغرب میں لوگ ریٹائر ہونے کے بعد کی منصوبہ بندی کرتے ہیں کہ ہم کسی بیچ پر کسی جنگل یا جھیل کے کنارے کوئی ریچ لے کر بقیہ زندگی مچھلی کا شکار کریں گے، گھر کے سارے کام خود کر کے اپنے آپ کو فٹ رکھیں گے۔ یہ لوگ اپنی ریٹائر زندگی کے بعد اپنی استطاعت کے مطابق دنیا دیکھنے کا پروگرام بناتے ہیں اور پھر اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

شاہ جی کے اندر ایک شعلہ سا لپک اٹھا تھا۔ پھر سے جوان ہو اٹھے تھے اور آج ان کا شوق بھی شعلوں کی مانند بھڑک اٹھا تھا۔ اس لیے گرم لوہے پر میں نے چوٹ کی۔ ''شاہ جی! جب فیری میڈو دیکھو گے تو ایسے مناظر دیکھنے کو ملیں گے کہ باقی کی عمر اسی کی یاد میں آسانی سے بسر ہو جائے گی۔''

وہ ذرا سا خاموش ہوئے اور پھر مسکرا کر

بولے۔ ''تمہیں لگ رہا ہے کہ اس جیپ حادثے کی وجہ سے میں نہیں جاؤں گا؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اس لمبے پہاڑ کے لیے تڑپ رہے ہو۔'' شاہ جی نے قہقہہ بلند کیا۔ ''اب تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور دوستی کے لیے فیری میڈو کیا، نانگا پربت پر بھی چڑھ جاؤں گا۔''

میں نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''تو پکا وعدہ۔''

شاہ جی نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''مردوں والا وعدہ!''

اب میں ذہنی طور پر مطمئن تھا کہ میرے ساتھ اس کٹھن راہ پر کوئی ہمسفر ہوگا۔ ایک قرار میرے دل میں بھر آیا کہ میرا ساتھی، فیری میڈو میرے ہمراہ اب ضرور جائے گا۔ ایک شک کا کانٹا تھا جو وقتی طور پر دل سے نکل چکا تھا۔ شام کا پہر لمبا ہو رہا تھا اور مکمل تاریکی کے ہونے میں کافی وقت تھا۔

شاہد اور اشفاق کو علی آباد میں چھوڑ کر اسماعیل واپس ہوٹل آ گیا۔ کہنے لگا چلیں، آپ کو کریم آباد دکھاتا ہوں۔

بازار ایک پہاڑ کی ڈھلوان پر بنا ہوا ہے اور بلندی سے تیزی کے ساتھ نیچے آتا ہے۔ بلندی کی طرف جانے کے لیے کچھ مشقت چاہیے۔ ہم بلندی کی طرف چلنے لگے۔ آس پاس دکانیں تھیں۔ پی سی او، گرم کپڑوں کی دکانیں، قیمتی پتھروں اور نوادرات کی دکانیں، قہوہ خانے اور ہوٹل اور اسی طرح کی عمارتیں سڑک کی دونوں جانب تھیں۔ کچھ دور جا کر دکانیں ختم ہوئیں اور مٹی سے بنے کریم آباد کے مکانات شروع ہوئے۔ گھروں کے دروازے چھتوں میں تھے اور مکین سیڑھی کے ذریعے گھر میں داخل ہوتے تھے۔ دوسری بار جب ہنزہ آیا تو ایک ایسے گھر میں، میں نے کافی وقت گزارا تھا۔ سیڑھی ایک کمرے میں اترتی ہے اور آپ گھر کے باورچی خانے میں اپنے آپ کو پاتے ہیں۔ درمیان میں مٹی کا بنا چولہا ہوتا ہے اور ٹین سے بنا، ایک فٹ قطر کا پائپ چولہے سے اٹھ کر چھت کے باہر سر نکالتا ہے جس سے دھواں اٹھتا ہے۔ چولہے کے اردگرد کچھ جگہ چھوڑ کر دیواروں کے ساتھ فرش سے کچھ بلند مٹی کے چبوترے بنے ہوتے ہیں جن پر نرم گدے اور رضائیاں رکھی ہوتی ہیں اور جن پر بیٹھ کر گھر والے گرم سوپ پیتے ہیں۔

عورتیں خوبانیاں صاف کرتی ہیں، ان کی گٹھلیاں نکالتی ہیں تاکہ ان کو دھوپ میں سکھایا جائے، جو سردیوں میں ان کی مرغوب غذا بھی ہوتی ہیں اور ہمارے شہروں میں بکتی بھی ہیں۔ وہ فارغ نہیں رہتیں بلکہ اس وقت کشیدہ کاری کرتی ہیں۔ جو جو کام مرد کرتے ہیں، عورتیں بھی پیچھے نہیں رہتیں۔ نہ تو یہاں ان کے حقوق کوئی غضب کرتا ہے اور نہ وہ اپنے حقوق کا رونا روتی ہیں۔ حقوق سے زیادہ یہاں فرائض ادا کرنے کی اہمیت ہوتی ہے۔ حقوق کبھی شور مچانے سے حاصل نہیں ہوتے۔ یہ اپنے فرائض ادا کرنے سے بھی پا لیے جاتے ہیں۔

گھروں سے نہ شور بلند ہو رہا تھا اور نہ کوئی جھگڑا اٹھ رہا تھا۔ ایک خاموشی اور اداسی چھائی تھی۔ ہم آگے بڑھے تو ایک چوک آیا جہاں کچھ نوجوان بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ سوالیہ نظروں سے ہمیں تکنے لگے۔ ہم نے قلعہ کو جانے کا راستہ معلوم کیا تو بڑے ادب سے بولے کہ اب تو قلعہ بند ہو چکا ہے، کل صبح آپ آ جائیے گا۔

ہم بھی بڑی تمیز سے واپس ہو لیے۔ واپسی پر ایک دکان سے ہم نے سرخ چیری خریدیں اور ساتھ بہتے گلیشیئر کے پانیوں سے انہیں دھویا۔ میں اپنی زندگی میں پہلی بار چیری کھا رہا تھا۔ جامن، اسٹرابیری کے بیچ کا ذائقہ تھا۔

بازار سے ایک راستہ ہمارے بائیں جانب ذرا سا اوپر کو اٹھ کر دوسری جانب جاتا تھا۔ اسماعیل ہمیں وہاں سے لے آیا۔ اوپر چڑھے ایک موڑ کے بعد ذرا نیچے اترے تو ایک عجیب نظارہ ہمارا منتظر تھا۔ ہم ایک چوٹی پر کھڑے تھے ایک بہت گہری کھائی میں، ڈھلوانوں پر، تہہ تک بل کھاتا ایک کچا راستہ جاتا تھا اور اس کھائی کی ڈھلوانوں پر مکانات تھے اور ان کے ساتھ سرسبز کھیت، باغات تہہ در تہہ نیچے تک چلے جاتے تھے۔ اس کھائی میں جھانکنا بھی دل گردے کا کام تھا۔ اوپر برفانی پہاڑ بلند ہوتے تھے اور التر پیک کی برف سے لدی بلندیاں تھیں، ساتھ مشہور زمانہ لیڈی فنگر کی آسمانی بلندیوں کو چھوتی، برف سے پاک، کسی پرندے کی چونچ کی مانند نکلتی چوٹی تھی۔ توے کا زاویہ بنائے لیڈی فنگر کی چوٹی پر برف ٹکتی ہی نہ تھی۔ یہ شاندار منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ شاہ جی بھی حیرت کے مارے گنگ تھے۔ اترتی شام میں یہ منظر ہم پر حاوی ہو گیا تھا۔ خوشی اور حیرت سے ہم سرشار تھے۔ چنار کے درخت بھی خاموشی سے یہ نظارہ دیکھتے اور جھوم رہے تھے۔ آج میں وہ دیکھ رہا تھا جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا۔

یہ التر گاؤں تھا۔ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ لیڈی فنگر کی چوٹی پر پریوں کا بسیرا ہے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ پورے التر گاؤں پر، پریوں کے غول اتر رہے ہیں۔ میں وہاں ایک

چٹان سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت ڈیجیٹل کیمرے نہیں تھے، انٹرنیٹ بھی پاکستان میں نہیں آیا تھا۔ لوگ ہنزہ، راکا پوشی کی ایک تصویر حاصل کرنے کے لیے لمبی جدوجہد کرتے تھے۔ اس دور میں اپنے سامنے یہ سب پا کر کوئی بھی مدہوش ہوسکتا ہے۔ اس لمحے شاہ جی کی اتاری ہوئی تصویر میرے سامنے ہے، جس میں شاہ جی التر پیک کو پس منظر میں رکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ وہ حسین لمحے میرے ماضی کا حصہ بن چکے ہیں مگر اکثر تصور میں، میں اپنے آپ کو انہی مقامات پر پاتا ہوں۔

تاریکی ایک سامیِ بلی کی مانند آہستہ آہستہ سامنے پہاڑوں پر چڑھتی جارہی تھی۔ ہم اس راستے پر نیچے اترے اور پھر خوبانیوں کے ایک باغ کے ساتھ، دائیں جانب مڑ کر نیچے اترتے چلے گئے۔ دربار ہوٹل، جو ہنزہ کا سب سے بڑا ہوٹل ہے، کے ساتھ ساتھ نیچے اترے تو ہم شاہراہ ریشم پر تھے۔

ہمارے سامنے گنیش نامی ایک گاؤں تھا ویسا ہی جیسے سلک روڈ پر گلگت سے خنجراب کے راستے پر یا ذرا ہٹ کر دوسرے گاؤں پڑتے ہیں۔ وہی بلند پہاڑوں کا پس منظر، برفانی بلندیاں، دریا ہنزہ کے بہتے پانی۔ دریا گنیش سے دور ہوکر اپنی موج میں بہتا چلا جارہا تھا۔ دریا کے پار نگر کی وادی ہے جہاں سے ہسپر گلیشیئر اسکردو تک پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کا عظیم گلیشیئر جس کی چاہ میں دیوانے آتے ہیں اور سنو لیک کے نظارے کرتے نگر میں دس دن بعد اترتے ہیں۔

جہاں میں کھڑا تھا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی التر پیک اور ساتھ میں کھڑی لیڈی فنگر کی چٹان۔ گنیش کے سبزہ زاروں، باغوں اور سفید پھولوں سے لدی جھاڑیوں اور چنار کے درختوں کے بیچ، سفید چونے سے پینٹ کیے مکانات جیسے کل ہی راج اپنا کام ختم کر کے گئے ہوں۔ سامنے درن پیک پر سنہری رنگت ماند پڑتی اور سیاہی میں تبدیل ہوتی جارہی تھی اور ہم دربار ہوٹل کے برابر سے گزر کر کریم آباد کے بازار میں داخل ہوئے۔ مرد، عورتیں شام کی عبادت کے بعد ٹولیوں کی صورت جماعت خانوں سے باہر آرہی تھیں۔ دکانیں بند تھیں اور چند ایک ہوٹل کھلے تھے۔ ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے گرم سوپ اور کڑہائی سے نکلے گرم پکوڑے کھا رہے تھے۔ ہم نے اونی ٹوپیاں پہن لی تھیں۔ چند مقامی لوگ قہوہ پیتے، ٹی وی کے سامنے کچھ دیکھ رہے تھے۔ خاموشی اور ٹھہراؤ باہر سے ہمارے اندر تک سرائیت کر گیا تھا۔ ہوا کے زور سے چناروں کے پتے، آپس میں ٹکرا کر متواتر شور کیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کسی جنگلی جانور کی آواز دور سے آتی سنائی دیتی۔

ہم وہاں سے اپنے ہوٹل کی طرف آئے تو راستہ سنسان، آسمان صاف اور کوئی روشنی یا نور نہیں تھا۔ ہم اپنے کمروں میں بند ہونے کی بجائے دوبارہ چھت پر کرسیوں پر بیٹھے سیاہ آسمان، سیاہ پہاڑوں کی موجودگی میں چناروں کے پتوں کی موسیقی سنتے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ ہماری ٹانگیں چھت پر لگی لوہے کی ریلنگ پر تھیں جو بازار کی جانب تھی۔ اسماعیل اپنے کمرے میں جا کر سو چکا تھا۔ میں اور شاہ جی سگریٹ کے دھوئیں فضا میں اڑا رہے تھے۔ راکا پوشی کے ہونے کا احساس ہوتا تھا مگر ٹھیک سے نظر نہیں ہوتی تھی۔ میری نظریں درن پیک پر ٹھہری تھیں۔

انسانی زندگی کئی ایک بار کچھ انہونے واقعات یا کسی معجزے سے ہمکنار ہوتی ہے۔ آج میرے لیے ایک ایسا ہی لمحہ آنے والا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے خالی ویران آسمان کی وسعتوں سے، درن پیک کے پیچھے سے ایک ستارہ نمودار ہوا کچھ لمحے وہ چوٹی کے اوپر کچھ دیر کے لیے رکا جھانک رہا ہو پھر شاید اس نے کچھ سوچا اور آسمان کی بلندیوں میں اٹھتا چلا گیا۔ اس کے بعد ایک اور نمودار ہوا اور وہ بھی بلندیوں میں تیرتا چلا گیا۔ پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں اور پھر ان کے پیچھے ایک برات نکلی اور نکلتی چلی گئی۔ کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ آسمان ٹمٹماتی روشنیوں سے بھر گیا۔ تارے مسلسل آتے چلے گئے اور اس برات کا حصہ بنتے گئے۔ اب اس ہجوم کا آنا جانا مکمل ہل گیا تھا۔ ہم حیرانگی اور انبساط سے یہ سب ہوتا دیکھ رہے تھے اور التر گلیشیئر سے اترتی ہوا ہمیں سرد کرتی جاتی تھی۔ شاہ جی نے کمرے سے گرم شالیں اٹھالیں اور ہم ان میں لپٹے وہ کہکشاں دیکھتے رہے جو درن پیک سے التر پیک تک بنتی چلی گئی تھی۔ پورا کریم آباد جگمگا اٹھا۔ گھروں کی روشنیاں اس نور کے آگے مدھم پڑگئیں۔ یہ منظر ہمارے حصے میں آیا کیونکہ ہم نے اس کے لیے بڑے جتن کیے تھے جس طرح ستارے درن پیک سے نمودار ہوکر آسمان پر پھیلتے چلے گئے تھے ہمیں واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ یہ زمین، پہاڑ ایک حرکت میں ہیں، کسی کے تابع ہیں اور اسی کے حکم پر ایک طے شدہ محور میں حرکت کرتے ہیں۔ یہ مشاہدہ ہمیں قدرت کے نئے اور انوکھے رنگ دکھلاتا تھا۔ اس عظیم رب کی تجلیات پر کون کافر انکار کرسکتا

ہے۔ جو ایک بار یہ منظر دیکھ لے تو دل سے لاتعداد بار سبحان اللہ بلند ہوتا ہے۔ آج بھی میں اپنے رب کا شکر بجا لاتا ہوں کہ میں بھی اس رات کے معجزے کا گواہ ٹھہرا تھا۔

ہنزہ اپنی روایتوں، حکایتوں، قدیمی پس منظر اور دلآویز نظاروں کی بدولت پوری دنیا کے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ اس کی اہمیت اور شہرت اپنے دل موہ لینے والے نظاروں اور لوگوں کی لمبی عمروں کی وجہ سے ہے۔ اب شاید لمبی عمر کی داستانیں کم سنائی دیتی ہیں مگر پہلے یہاں کے باسی کافی دراز عمر ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ الترگلیشیئر سے آنے والے وہ پانی بھی تھے جو اپنے ساتھ سونے کے ذرات اور دوسری معدنیات لیے ہوتے۔ یہاں کا حسین ماحول، آلودگی سے مکمل پاک آب و ہوا، سادہ رہن سہن اور خوراک، سگریٹ اور دوسری مہلک منشیات سے اجتناب، اشیا کے ڈھیر لگانے کے حرص سے عدم واقفیت، لالچ اور خودغرضی سے پاک ذہن، یہ سب عوامل ایک لمبی اور تندرست زندگی کی وجہ ہوتے ہیں اور ان میں بیشتر روایتیں اب بھی یہاں پائی جاتی ہیں مگر معاشی ترقی کے پنجے اب آہستہ آہستہ یہاں پر بھی مضبوط ہو رہے ہیں اور عداوتیں بڑھ رہی ہیں۔ فرقہ واریت کا عفریت، اپنی کوتاہیوں اور غیروں کی سازشوں سے پل رہا ہے۔ یہ میں اٹھارہ سال پہلے کا مشاہدہ بتا رہا ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے وہ اب ہم دیکھ رہے ہیں مگر یہ برائیاں اب بھی باقی ملک کی نسبت ہنزہ میں بہت ہی کم ہیں۔

قدرت نے ہنزہ کو ایک جادوئی خوب صورتی سے نوازا ہے۔ سر بہ فلک برفانی چوٹیاں، دلکش پھولوں اور پھلوں کے ہرے بھرے باغات اور سبزہ زار، گنگناتی ندیاں، جھلمل کرتی آبشاریں، بہتے جھرنے، شفاف آب و ہوا، یہ سب اس کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہیں۔ دنیا کی چند بلند ترین چوٹیاں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور صرف کریم آباد تک محدود نہیں۔ اپر ہنزہ یعنی گوجال، اپنی انتہائی دلکش اور برفانی وادیوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے۔ وادی ہنزہ، پاکستان کو چین سے ملاتی ہے۔ پچھلے دور میں وسطی ایشیا سے تجارتی قافلے اور قاصد، یہیں سے ہو کر گزرتے تھے اور یہاں کے حکمران جو "میر" کہلاتے تھے، ان سے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ آنے جانے والوں پر کڑی نگاہ رکھنے کے لیے، التت کا قلعہ ایک انتہائی خطرناک بلندی پر بنایا گیا تھا جو اب بھی بوسیدہ حالت میں موجود ہے۔ قافلے منتکا پاس سے ہو کر آتے جو کریم آباد سے ایک سو میل کی دوری پر ہے۔ یہ تجارتی قافلے سترہ ہزار فٹ بلند، منتکا پاس سے گزر کر زارقند اور کاشغر جاتے اور وہاں سے شمال مغرب کا رخ کرتے فرغانہ سمرقند اور بخارا تک جاتے تھے۔

ہنزہ کو کبھی ہن ڈس، کبھی ہمادیس اور کبھی کنجوت کہا گیا۔

دنیا کے چند بڑے گلیشیئر ہزاروں سالوں سے یہاں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جن میں بتورا، مناپن، خردپن، پسو اور گلمت بہت مشہور ہیں۔ پتھریلی زمین کی وجہ سے جنگلات بہت کم ہیں اور جو تھے وہ بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں کے میر صفدر خان نے جب روس سے تعلقات بڑھائے اور انگریز قاصدوں کو پکڑا تو گورے ہنزہ پر چڑھ دوڑے۔ اٹھارہ سو بانوے میں انہوں نے بلتیت پر قبضہ کر لیا۔ میر صفدر وسطی ایشیا کی جانب نکل گیا اور وہیں وفات پائی۔ اس کے بھائی میر ناظم علی خان کو انگریزوں نے یہاں کا حکمران بنایا۔ پھر جمال خان 1945ء میں یہاں کا میر بنا۔ اب اس کے بیٹے میر غضنفر نے یہاں ایک شاندار ہوٹل بنوایا۔ پہلے گلگت سے ہنزہ کا، ستر میل کا سفر تین دنوں میں خچروں اور گھوڑوں پر ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد شاہراہ ریشم کی وجہ سے یہاں کافی ترقی ہوئی اور یہ سفر سکڑ گیا۔

رات کے دس بج چکے تھے اور شاہ جی کو اچانک خیال آیا کہ انہیں شدید بھوک لگی ہے۔ ہم دوڑے دوڑے بازار پہنچے تاکہ کوئی ہوٹل تلاش کر سکیں۔ ایک ہوٹل میں صرف سالن موجود تھا مگر تندور بند ہو گیا تھا۔ بھاگم بھاگ ایک دوسرے ہوٹل سے روٹیاں لے کر آئے اور ٹمٹماتی روشنی میں پیٹ کی بھوک مٹائی۔ ہوٹل میں پینے کا صاف پانی دیکھ کر حیران ہوئے کیونکہ ہنزہ میں صرف گدلا پانی دستیاب ہوتا ہے۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا کہ وہ سیاحوں کے لیے نیچے چشمے سے پانی بھر کر لاتا ہے مگر شاہ جی نے کہا کہ اسے وہی سونا ملا پانی ہی پینا ہے اور اس کے چکر میں شاہ جی نے گدلے پانی کے دو گلاس چڑھا لیے۔ ہوٹل کے گرم ماحول سے باہر نکلے تو اچانک سرد جھکڑوں نے ہمیں آ دبوچا۔ دور دور تک ہو کا عالم تھا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں ہمیں قریب سے محسوس ہوئیں تو ہم دوڑ کر اپنے ہوٹل میں جا گھسے اور دوبارہ چھت پر بیٹھے ہنزہ کی خاموش وادی کا نظارہ کرتے رہے۔ قصے اور واقعات کا سلسلہ جو چلا تو رات کے ایک بجنے کا ہمیں احساس تک نہ ہوا۔ پھر جو سوئے تو صبح ہونے کی بھی ہمیں خبر نہ ہوئی۔

آنکھ کھلی تو دن چڑھنے کا احساس ان کرنوں سے ہوا جو بند کھڑکی کی درزوں سے چھن چھن کر کمرے میں آرہی تھیں۔ شاہ جی ابھی تک گھوڑے بیچے سو رہے تھے۔ میں نے کھڑکی کھولی تو جیسے ہنزہ کی ساری کی ساری ٹھنڈی ہوا، ہمارے کمرے میں گھس آئی اور اس خوشبو بھری تازہ ہوا کی یلغار نے مجھے ایک دم تر و تازہ اور ہوشیار باش کر دیا۔

مجھے امجد اسلام امجد کے ایک شعر کا مصرع یاد آ گیا۔
''کھڑکی کھول کر باہر دیکھو۔ موسم میرے دل کی باتیں تم سے کہنے آیا ہے۔''

میرے سامنے ایک تازہ منظر کے ساتھ چمکتی ہوئی راکاپوشی، کریم آباد کے تہ در تہ بچھے کھیت، باغات اور بازار میں چہل پہل نظر آتی تھی، جہاں گزشتہ رات کو جنگلی جانور تھے اور ان کی آوازیں تھیں۔

''کیا پوری رات یہیں کھڑے رہے۔'' شاہ جی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے تھے۔

''ہاں! پہلے خواب میں یہاں تھا اور اب حقیقت میں۔'' میری نظریں چاروں طرف طواف کر رہی تھیں۔

شاہ جی نے ایک اور سوال داغا۔ ''راکاپوشی نظر آ رہی ہے۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ ''نہیں! رات کو نانگا پربت سے ملنے گئی تھی اور ابھی واپس نہیں آئی۔ لگتا ہے نانگا پربت کے ہاں ہی سو گئی۔''

شاہ جی نے پہلے مجھے غصے سے گھورا اور کچھ دیر سوچا اور پھر مسکرا کر باتھ روم میں گھس گئے۔

شاہ جی اور میں دونوں خوشگوار موڈ میں تھے۔ ورنہ جیسے پردیس کی شام دیس کی یاد بھلا دیتی ہے ایسے ہی پردیس کی چڑھتی صبح، دیس کی دوری کے احساس کو ابھارتی ہے۔ یہاں ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ ہم اس وقت بھی شاد تھے۔

پہاڑوں پر صبحیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک سورج نکلنے سے گھنٹا بھر پہلے اور دوسری ایک گھنٹا بعد کی۔ ایک گھنٹا پہلے، فطرت کے نظارے عیاں ہوتے ہیں۔ سکون، خاموشی، ہواؤں کے چلنے کی موسیقی، قدرت کے تمام رنگ اپنے جوبن پر ہوتے ہیں اور اس وقت اللہ کو کیا ہوا سجدہ ایک بھرپور لذت لیے ہوتا ہے۔ سورج نکلنے کے بعد قدرت کے تمام رنگ جلوے سمیٹ لیے جاتے ہیں فرشتوں کا نزول تھم جاتا ہے۔ انسانی کردار اپنے تیر و نشتر سنبھالے دنیا کے کاروبار کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔ ایک بے کیفی چھائی ہوتی ہے۔ اصل زندگی سورج ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے شروع ہوتی ہے جب دنیاوی کام پھر سے سست پڑنا شروع ہوتے ہیں۔

دن کے جن لحات میں انسان اپنے رزق کی تلاش میں پھنسا رہتا ہے، ان لحات میں قدرت کے رنگ پھیکے ہوتے ہیں۔ جب یہ تگ و دو کے لحات گزر کر شام میں بدلنا شروع ہوتے ہیں تو رنگ ابھرنے لگتے ہیں، اسرار کھلنے لگتے ہیں۔ فراغت کے لحات جیسے ہی آتے ہیں، غور و فکر کا ماحول اتر آتا ہے۔ اس لیے قدرت نے ہر وقت کو کسی ایک خاص کام کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

نظارے تو وہی تھے جو کل شام میں تھے مگر ایک پھیکا پن تھا۔ کوئی رنگ نہ تھے اگر اس منظر سے راکاپوشی اور کھیت، کھلیان نکال دیے جاتے تو پیچھے دنیا کا صرف کاروبار ہی رہ جاتا۔

غسل خانے کا نل کھولا تو وہی گدلا پانی جیسے مٹی گھول دی گئی ہو۔ استعمال کرنے سے پہلے کچھ دیر غور کرنا پڑتا ہے۔ پانی یخ بستہ تھا اور غسل کے لیے انتہائی ناموزوں! مگر غسل کرنے کے بعد جسم میں ایک پھرتی سی بھر آئی اور چوکڑیاں بھرنے کو جی کرنے لگا۔ ہم تیار ہو کر ڈائننگ روم میں آئے تو اسماعیل پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اتنے میں شاہد اور اشفاق بھی آ پہنچے۔ وہ ہمیشہ کی طرح شینا زبان میں باتیں اور وہ بھی مسلسل کرتے جا رہے تھے۔ گھی کے پراٹھوں، انڈوں کے آملیٹ اور گرم چائے سے ناشتا کیا۔ اشفاق اور شاہد رات میں ہنزہ واٹر، کہیں اوپر سے لائے تھے اور ابھی تک مستی میں تھے۔ شاہ جی بار بار ان کو کہتے۔ ''بادشاہو! اکیلے اکیلے موجیں کر آئے ہو۔ ہم سے پوچھا ہی نہیں۔''

وہ دونوں میرا لحاظ کرتے تھے اور شاہ جی کی باتوں پر صرف مسکرانے پر اکتفا کرتے۔ کیونکہ جانتے تھے شاہ جی دین دار آدمی ہیں۔

پروگرام یہ بنا کہ پہلے بلتت فورٹ دیکھتے ہیں اور پھر التت فورٹ جائیں گے۔ شاہ جی نے بوسکی کی قمیص کے نیچے سفید لٹھے کی شلوار پہن رکھی تھی۔ سر پر نیلے رنگ کی پی کیپ اور ہاتھ میں اسٹک تھامی تھی۔

بڑے خوشگوار موڈ میں تھے کیونکہ انہیں خبر نہ تھی کہ ابھی کچھ دیر بعد محل میں ان پر کون سی افتاد ٹوٹنے والی ہے اور وہ اس کی توجیح کس انداز میں دینے والے ہیں۔

(بقیہ آئندہ ماہ)

انسان نما

آصف ملک

یہ دنیا، ہماری دنیا، اسرار بھری دنیا۔ اس کے سینے پر ہزارہا طرح کی مخلوق سانس لیتی ہیں۔ کچھ تو قریب ہیں اور کچھ نظروں سے اوجھل۔ ایک ایسی ہی مخلوق برف پوش پہاڑوں میں دنیا کی نظروں سے دور اپنی بستی بسائے زندگی گزار رہی ہیں۔ گو کہ اب تک اس کے وجود کی ٹھوس گواہی نہیں ملی ہے پھر بھی بہتوں نے اسے دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ یتی، بگ فٹ، برفیلا آدمی، ہیم منوش کے نام سے مشہور اس پُراسرار جاندار پر بہت کچھ ہر زبان میں لکھا گیا پھر بھی تشنگی رہ گئی اور راز باقی رہ گیا ہے۔

ایک پراسرار انسان نما وجود کا تذکرہ

انسان نما مخلوق ماہرین آثار قدیمہ کا سب سے محبوب سبجیکٹ رہی ہے۔ جدید سائنٹیفک تحقیقات اور ایسی مخلوقات کی ملنے والی ہڈیوں سے اب یہ بات حتمی طور پر ثابت ہوگئی ہے کہ ایک سے پانچ کروڑ سال پہلے کے درمیان زمین پر ایسی مخلوق کا ارتقا ہوا تھا جو انسان سے مشابہہ تھی۔ اسے بیک وقت انسان اور بندر کا جد امجد کہا جاتا ہے۔ (الہامی مذاہب اس کے برعکس انسان کو ایک مکمل اور خاص تخلیق شدہ مخلوق بتاتے ہیں۔ جدید ترین

سائنسی تحقیق بھی اشارہ کرتی ہے کہ انسان الگ مخلوق ہے) اس مخلوق کو بواز نے کا لقب دیا گیا۔ اس کا ارتقا بھی سب سے پہلے افریقا میں ہوا۔ یہاں سے یہ مخلوق ساری دنیا میں پھیلی اور نہ صرف ہر براعظم میں بلکہ ایسی جگہوں پر بھی اس کے آثار ملے جہاں آج بھی انسان نہیں بس سکتا ہے کیونکہ وہاں موسمی حالات بہت شدید اور ذرائع زندگی ناپید ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور مختلف براعظموں اور خطوں میں پھیل جانے کی وجہ سے اس مخلوق میں تبدیلی آتی رہی۔ ان کی ذیلی نسلیں پیدا اور معدوم ہوتی رہیں۔ آج سے کوئی ڈیڑھ لاکھ سال پہلے آخری بواز نے یورپ کی شدید سردی کی تاب نہ لا کر دنیا سے مٹ گئے۔ اس کے بعد صرف بندر ہی ان کی یادگار کے طور پر باقی رہ گئے۔

دو صدیوں کے دوران میں ماہرین آثاریات نے نہ صرف معدوم ہو جانے والے بوازنوں بلکہ ایسی مخلوق کی تلاش کا کام جاری رکھا جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ زندہ فوسل ہیں۔ فوسل معدوم ہو جانے والی مخلوق کے باقی رہ جانے والے ڈھانچے یا ہڈیوں کو کہتے ہیں اور زندہ فوسل ایسی مخلوق کو کہتے ہیں جو معدوم سمجھی جاتی ہے اور اچانک ہی زندہ سامنے آجائے۔ زندہ فوسل کوئی بہت عجوبہ چیز نہیں ہے۔ تقریباً ہر سال ہی ایسی مخلوق دریافت ہوتی ہیں۔ جن کے بارے میں پہلے ماہرین کا خیال ہوتا ہے کہ وہ معدوم ہو چکی ہیں۔ ایسی دریافت تقریباً ہر بار قطعی اتفاق سے ہوتی ہیں۔ یعنی یہ بنا کسی تلاش کے خود سامنے آجاتی ہیں۔ مگر کچھ مخلوقات ایسی ہیں جن کے بارے میں ماہرین آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ زندہ حالت میں موجود ہیں اور ان میں سب سے مشہور مخلوق بگ فٹ، برفانی آدمی یا ''یتی'' ہے۔

برفانی آدمی یا یتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہمالیہ اس کا مسکن ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ اس برفانی سلسلے کے دونوں اطراف یعنی انڈو پاک اور تبت میں پایا جاتا تھا۔ اس کا نام یتی بھی اصل میں تبتی زبان سے نکلا ہے۔ اسے تبتی اور نیپالی زبان میں یے ری تیہ کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہمالیائی انسان یا برف کا آدمی ہے۔ تبتی اور نیپالی زبان میں مفہوم مختلف ہے۔ نیپالی مفہوم زیادہ موزوں ہے۔ انگریزوں نے اسے یتی کا نام دیا جو ممکنہ طور پر اسی یے ری تیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اس نام کی ایک اور وجہ تبتی زبان میں ریچھ یا بھالو کے لیے استعمال کیا جانے والا لفظ میٹی بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مگر یتی ایک بالکل واضح لفظ ہے۔ اس کے مقابلے میں یے ری تیہ کا لفظ یتی سے کہیں زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ پھر انگریز مقامی زبانوں سے بالکل ہی نا آشنا نہیں تھے جو میٹی کو یتی سمجھ لیتے۔ غلط فہمی ایک دو بار ہو سکتی ہے اسے مستقل لفظ کا درجہ نہیں مل سکتا تھا۔

بیرونی دنیا کو اس افسانوی مخلوق سے انگریزوں نے ہی متعارف کرایا اور اپنے ادب میں اس کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے ایک انگریز ایس ٹی جوئل نے اپنے کتابچے ''ہمالین مین'' میں اس کا ذکر کیا۔ اس کے بعد یہ انگریزی اعلیٰ ادب میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہا۔ مزے کی بات ہے کہ برصغیر سے پہلے دو خطے جہاں یورپ والوں کے قدم پہنچ گئے تھے وہاں اس انسان نما مخلوق کی موجودگی کے شواہد بعد میں سامنے آئے۔ یہ دو خطے شمالی یورپ میں کوہ یورال اور شمالی امریکا میں راکی ماؤنٹین کا سلسلہ ہائے کوہ ہیں۔ جہاں اس مخلوق کی موجودگی کے بے شمار دعوے سامنے آئے۔ فوٹیجز اور ویڈیو بھی موجود ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اس مخلوق کی حتمی موجودگی ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

مضمون کو آگے بڑھانے سے پہلے اس مخلوق کے بارے میں کچھ وضاحت کر دی جائے۔ قدیم ہندو دیو مالا، بدھسٹوں کی کتابوں اور ہمالیہ کے خطے کی لوک داستانوں میں اس مخلوق کا ذکر اتنی کثرت سے ملتا ہے کہ اس کی مثال لانا محال ہے۔ تقریباً تمام کہانیوں اور تذکروں میں اس کا حلیہ بیان کیا گیا ہے۔ انسان سے بڑا، تقریباً ساڑھے چھ سے آٹھ فٹ اونچا، بعض جگہوں پر اسے پانچ فٹ کا بونا بھی دکھایا گیا ہے مگر اس کے باوجود ہر جگہ اسے بہت قوی، وزنی، طاقتور اور پھرتیلا قرار دیا گیا ہے۔ انسان کی طرح سیدھا، لمبی مضبوط ٹانگوں والا، اندر کی طرف دبا ہوا پیٹ اور چوڑا سینہ، واضح گردن اور گول بڑا سر، پورا جسم سفید، سرمئی اور سرخی مائل بالوں سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ موسم کی مناسبت سے رنگ بدلتا رہتا ہے۔ گرمی میں سرمئی ہو جاتا ہے اور سردی میں سفید، جو یتی جنگلوں کے پاس رہتے ہیں ان کے بالوں کا رنگ بھورا مائل سرخ ہوتا ہے۔

چوڑا ڈھلان نما ماتھا، جو بالوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اس کے نیچے کسی قدر اندر دھنسی انسان جتنی بڑی آنکھیں، تقریباً ستواں ناک مگر نتھنے چوڑے ہوتے ہیں۔

با قاعدہ ہونٹ اور ان کے پیچھے انسان جیسے چوڑے ہموار دانت البتہ کچلیاں انسانوں سے کسی قدر بڑی ہوتی ہیں جو اس کے گوشت خور ہونے کی نشانی ہیں۔ بازو طویل اور ہاتھ انسانوں جیسے مگر تمام انگلیاں سوائے انگوٹھے کو چھوڑ کر بڑی اور ایک سائز کی ہوتی ہیں۔ ہتھیلیاں صاف مگر ہاتھ کی پشت بھی گھنے بالوں سے ڈھکی ہوتی ہیں۔ عام حالت میں کندھے جھکا کر کمر کو کمان بنا کر چلتا ہے مگر جب خطرہ محسوس کرے یا حملہ کرنا ہو تو سیدھا اور کمر تان کر چلتا ہے۔ انسان سے پانچ گنا طاقتور، تین گنا تیز اور مشکل ترین چٹانوں اور پہاڑی راستوں پر چڑھنے کا ماہر ہوتا ہے۔ یہ ساری علامات نہ صرف زبانی قصوں میں بلکہ تحریری ادب میں بھی موجود ہیں۔ ایسی ہی ایک تحریر جو مہامیرست نامی ایک بدھ راہب نے آج سے کوئی تین سو سال پہلے لکھی تھی اور لہاسہ کے دلائی لاما میوزیم میں آج بھی محفوظ ہے۔ پیش خدمت ہے۔

آج میں نے یے ری تیہ (یتی) دیکھا۔ اس کے بارے میں اپنے پرکھوں سے سنتے آئے ہیں۔ میں مہامیر ست جو چالیس سال کی زندگی دیکھ چکا ہوں اور بے شمار بار اس کا تذکرہ سن چکا ہوں۔ آج تک اسے دیکھنے سے محروم تھا۔ مگر مجھے اس کی موجودگی کا اسی طرح یقین تھا جیسے اس کا یقین کہ کل سورج پھر نکلے گا۔ تین دن پہلے میں زی قان لو (ایک گاؤں جو لہاسہ کے جنوب میں دشوار گزار ہمالیہ میں واقع ہے) کے لیے نکلا۔ وہاں ایک وبائی مرض پھیل رہا ہے اور مجھے اس کا علاج کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ یہ وبا اب تک سات افراد کی جان لے چکی ہے۔ گاؤں چھوٹا سا ہے اور اس کے باسی ہراساں ہیں۔ اگر اس بیماری کا علاج نہ کیا گیا تو جلد پورا گاؤں انسانوں سے خالی ہو جائے گا۔ میں نے دلائی لاما سے اجازت لی اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

زی قان لو بہت دشوار جگہ پر آباد ہے اور اس کی آبادی دو سو سے بھی کم افراد پر مشتمل ہے۔ میرے پرکھے کہتے آئے ہیں کہ جنوب کی طرف یہ آخری گاؤں ہے۔ جو ہمالیہ کے آر پار جانے والے تاجروں کی وجہ سے آباد تھا۔ یہاں سال کے سات مہینے برف جمی رہتی ہے اور کاشت کاری کے لیے زمین نایاب ہے۔ لوگوں کا روزگار مویشی پروری اور تاجروں کی خدمت سے تھا۔ دو دن کے مشکل سفر کے بعد میں زی قان لو پہنچا اور اپنے یاک سے اترا تو میرے سامنے ہمالیہ کی دشوار ترین ڈھلانوں سے چمٹا ہوا یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ اب تک قائم کیسے ہے۔ عظیم ہمالیہ نے اسے اپنے پہلو سے جھٹک کیوں نہیں دیا۔ چھوٹے چھوٹے کھلونے نما مکانات اور ان میں رہنے والے مختصر قد کے لوگ جن کی جلد سورج کی روشنی نے جھلسا دی تھی۔ وہ سب دلائی لاما کے بھیجے بھکشو کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ مگر وہ خوش نہیں بلکہ خوف زدہ تھے اور ان کی خوف زدگی کی وجہ مجھے رات میں معلوم ہوئی جب میرے میزبان نے مجھ سے درخواست کی۔

''رات اگر باہر سے کوئی آواز آئے تو مقدس بھکشو باہر جانے سے گریز کریں۔''

میں نے وجہ دریافت کی۔ ''کیوں؟''

''کیونکہ ان دنوں یہاں یے ری تیہ آرہا ہے۔'' اس نے یوں سرگوشی میں کہا جیسے یے ری تیہ باہر دروازے سے کان لگائے کھڑا ہو۔ اس کے لہجے میں اتنا خوف تھا کہ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ مگر فوراً میرے خوف پر تجسس اور شوق غالب آ گیا۔ میں جس مخلوق کے بارے میں بچپن سے سنتا آیا تھا اور میں نے آج تک صرف اس کی ران کی ہڈی کی زیارت کی تھی جو دلائی لاما کے محل میں محفوظ ہے اور یہ کسی بھی انسان کی ران کی ہڈی سے ڈیڑھ گنا زیادہ بڑی ہے۔ میرا میزبان بتا رہا تھا کہ وہ آج کل یہاں آرہا ہے۔ میں نے پوچھا۔

''وہ یہاں کیوں آرہا ہے؟''

''خوراک کے لیے۔'' میزبان نے بجھے لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ ہر سال یہاں سے بہت سے مویشی لے جاتا ہے۔ انہیں مار کر محفوظ کر لیتا ہے اور سرما میں انہیں کھاتا ہے۔''

''وہ ایک ہے؟''

''نہیں کئی ہیں مگر ہمارے گاؤں میں ایک ہی آتا ہے۔ ابھی سردی شروع نہیں ہوئی ہے مگر وہ آ گیا ہے۔ کل رات ایک باڑے سے دو بھیڑیں لے گیا۔''

''کیا وہ قبل از وقت آ گیا ہے؟''

''ہاں وہ وقت سے پہلے آ گیا ہے۔'' میرے میزبان کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''ورنہ آج تک وہ ہمیشہ پہلی برف باری کے بعد گاؤں میں آتا رہا ہے۔''

مجھے دلائی لاما کی پیش گوئی یاد آئی کہ اس بار سرما ذرا

دیر سے آئے گا مگر یہ معمول سے زیادہ عرصے جاری رہے گا۔ شاید اسی وجہ سے یے ری تیہ قبل از وقت خوراک جمع کر رہا تھا۔ وہ ہمالیہ کا قدیم باسی ہے اور انسانوں سے زیادہ موسم کے تیور پہچانتا ہے۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر مجھے باہر آہٹ محسوس ہوگی تو میں ضرور باہر نکلوں گا۔ یے ری تیہ انسانوں کے لیے براہِ راست خطرہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی انسان اس کے راستے میں آئے تو وہ اس کا دشمن ہو جاتا ہے اور اسے مار دیتا ہے۔ ایسا بارہا ہوا کہ یے ری تیہ کے ہاتھوں انسان مارے گئے۔ میرے میزبان کے مطابق زی فان لو کا ایک نوجوان چرواہا اپنی بھیڑوں کو بچاتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا۔ اس نے اتنی قوت سے نوجوان چرواہے کو اٹھا کر چٹان پر مارا تھا کہ اس کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ دو دن تک بہت اذیت میں زندہ رہنے کے بعد مر گیا تھا۔

میزبان کے مطابق جب یے ری تیہ یہاں آتا ہے گاؤں کے لوگ چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت تک کوئی گھر سے باہر نہیں نکلتا ہے جب تک وہ واپس نہ چلا جائے۔ اپنے مویشی بچانے کے لیے لوگوں نے باڑے مضبوط کیے ہوئے تھے اور کتے پالے ہوئے تھے مگر کتے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ صرف بھونکتے تھے اور مزاحمت نہیں کرتے تھے۔ طاقتور یے ری تیہ کسی نہ کسی باڑے میں گھسنے میں کامیاب ہو جاتا تھا اور اپنی خوراک لے کر چلا جاتا۔ وہ جانور کو گردن توڑ کر مار دیتا تھا۔ وزنی بھیڑوں کو بھی با آسانی اٹھا کر لے جاتا۔ ویسے میزبان پُر اُمید تھا کہ وہ گزشتہ رات دو بھیڑیں لے جا چکا ہے اس لیے اب نہیں آئے گا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ آئے گا اور اس لیے آئے گا کہ میں اسے دیکھ سکوں۔ میں بہت دشوار اور مشکل سفر کر کے یہاں پہنچا تھا جس میں مجھے آرام کا موقع کم ملا تھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں کسی صورت نہ جاگتا مگر اس رات سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جب میرا میزبان چلا گیا تو میں بستر پر اٹھ بیٹھا اور میں نے اپنا چراغ پاس رکھ لیا تھا۔ نصف رات کے قریب کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ان کی آواز میں خوف اور اضطراب نمایاں تھا۔ مگر آوازیں دور سے آرہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ شور قریب آنے لگا اور مجھے خطرہ ہوا کہ میرا میزبان نہ آجائے اور میرے باہر جانے میں رکاوٹ بن جائے۔ اس لیے میں پہلے ہی باہر نکل آیا۔ سردی بے پناہ تھی اور اوپر سے گرتی اوس زمین پر برف کی طرح جم رہی تھی۔ اس پر پاؤں آتا تو یہ کرچ کی آواز کے ساتھ تڑخ جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے ہوا رکی ہوئی تھی ورنہ اس میں چراغ مشکل سے جلتا۔ میرے میزبان کا گھر گاؤں کے نچلے حصے میں تھا اور آوازیں اوپر سے آرہی تھیں۔ گلیوں میں مکمل سناٹا اور تاریکی تھی۔ جن گھروں میں تھوڑی بہت روشنی تھی انہوں نے وہ بھی بجھا دی تھی۔ میں ایک گلی سے اوپر جانے لگا۔ میری کوشش تھی کہ چراغ کی روشنی نمایاں نہ ہو اس لیے اسے اپنی صدری کی اوٹ میں لیا ہوا تھا۔

ابھی میں گاؤں کے درمیان میں پہنچا ہی تھا کہ اوپر سے کتوں کے شور میں کسی کے غرّانے کی آواز آئی۔ مگر غرانے والا مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ اوپر ایک درجن گھر تھے اور اگر یے ری تیہ آگیا تھا تو وہ ان میں سے کسی گھر میں تھا۔ یہاں سارے گھر الگ الگ تھے اور ان کے درمیان میں گلیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس لیے میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس گلی سے آگے جاؤں۔ اب تک مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ آگیا تھا یا کتے کسی اور وجہ سے بھونک رہے تھے۔ غرّانے کی آواز بھی ایسی نہیں تھی کہ میں اسے یے ری تیہ سمجھتا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد میں ایک گلی کی طرف بڑھا تھا کہ ایک گھر سے ایک طویل قامت سایہ نکلا۔ اس نے چھوٹی سی دیوار یوں پھلانگی تھی کہ ہاتھوں کو استعمال نہیں کیا۔ وہ تقریباً ساڑھے سات فٹ کا تھا اور اس کا پورا جسم ٹیالے سفید بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ انسانوں کی طرح دونوں پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔ میں دم بہ خود سا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کے شانے پر ایک مردہ بھیڑ تھی۔ اس نے اپنا آج کا شکار بھی حاصل کر لیا تھا اور وہ کتوں کے بھونکنے سے بے پروا نظر آرہا تھا جو اب گلی سے گھوم کر اس طرف جمع ہو رہے تھے اور فاصلہ رکھ کر اس پر بھونک رہے تھے۔ اس نے میری موجودگی محسوس کر لی تھی۔ وہ میری طرف گھوما، اس کے چہرے پر لمبے بال آرہے تھے اور ان کے پیچھے سے اس کی سرخ انگاروں جیسی دہکتی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کا چوڑا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ ہانپنے کے انداز میں سانس لے رہا تھا۔ اس کی بھاپ کئی فٹ دور تک جا رہی تھی۔ میں اس سے مشکل سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا اور وہ اتنا طویل قامت تھا کہ دو قدم میں مجھ تک آجاتا۔ مگر

وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شاید اسے تعجب تھا کہ کس نے اس کے سامنے آنے کی جرأت کی ہے وہ اس کا عادی نہیں تھا کہ انسان اس کا سامنا کریں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ میں بالکل ساکت ہوگیا تھا کہ اسے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ حملہ کرنے میں ہچکچائے گا نہیں۔ بالآخر اس نے فیصلہ کرلیا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور گاؤں کے اوپری حصے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے آخری گھر کے بعد پلٹ کر ایک بار میری طرف دیکھا اور تاریکی میں غائب ہوگیا۔"

☆☆☆

اس بدھ بھکشو کے علاوہ بھی ہمالیہ کے علاقے میں لاتعداد ایسی شہادتیں موجود ہیں جب لوگوں نے اس پُر اسرار مخلوق کو دیکھا۔ یتی کے علاوہ بھی کئی نام ہیں جو ہمالیہ کے مختلف علاقوں میں رائج ہیں۔ جیسے میٹی جو تبتی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی "ریچھ" ہے۔ زوتیہ اس کا معنی "جانور" ہے۔ یہ بھی تبتی زبان کا لفظ ہے۔ می گوئی یا می گو، اس تبتی لفظ کے معنی "جنگلی آدمی" ہے۔ نیپالی زبان میں بن میچی (جنگل کا آدمی) میکرا (جنگلی آدمی) اور کانگ آدمی (برفانی آدمی) کے نام یتی کے لیے مخصوص ہیں۔ کشمیر، بلتستان اور پامیر کے علاقوں میں بھی اسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے بن بندر، بن بنکو اور کوگیشو وغیرہ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انتہائی مغرب میں پامیر کی سطح مرتفع سے لے کر انتہائی مشرق میں برما سے متصل ہمالیائی علاقوں میں یتی کو یکساں طور پر ایک پُراسرار مخلوق کا درجہ حاصل ہے جو سامنے آتی ہے مگر آج تک اس کی موجودگی کا کوئی جسمانی ثبوت دنیا کے سامنے نہیں آیا ہے۔ حد یہ کہ ہمالیہ سے دور کوکیرتھر اور کوہ سلیمان کے علاقوں میں ایسے ہی ایک جانور کی موجودگی کی کہانیاں ہیں جسے مقامی لوگ "مم" کہتے ہیں۔ یہ انسانوں کی طرح دو پیروں پر چلتا ہے اور اس کا پورا جسم گھنے لمبے بالوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں اس کے بارے میں عجیب کہانیاں مشہور ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آج تک لاتعداد تصاویر اور ویڈیو میں اس مخلوق کی جھلکیاں موجود ہیں اور یہ ریکارڈ کا حصہ ہیں لیکن عملی طور پر ایک بھی جسم ہمارے سامنے نہیں آیا۔ ہاں دنیا کے کئی علاقے اور میوزیمز میں ایسی ہڈیاں موجود ہیں جو انسان سے مشابہہ لیکن سائز میں بہت بڑی ہیں اور اس وجہ سے انہیں یتی کی ہڈیاں قرار دیا جاتا ہے، ان میں سے مشہور ہڈی دلائی لاما کے محل کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ جو ساخت میں بالکل انسان کی ران کی ہڈی جیسی ہے مگر سائز میں اس سے ڈیڑھ گنا بڑی ہے۔ معبد کے حکام کا دعویٰ ہے کہ یہ ہڈیاں یتی یا برفانی آدمی کی ہیں۔ کاربن ٹیسٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فوسل اصل میں ایک ہزار سے گیارہ سو سال پرانا ہے اور یہ کسی انسان نما جاندار کی ہڈی ہے۔ بد قسمتی سے بہت پرانا ہونے کی وجہ سے اس کی نامیاتی ساخت تباہ ہو چکی ہے اور اس سے ڈی این اے کا حصول ممکن نہیں رہا ہے جس سے یقینی طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہڈی کس جاندار کی ہے۔

ماہرین آثاریات یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ کس بوازنے کی ہڈیاں ہیں کیونکہ اکثر بوازنے قد و قامت میں موجودہ انسان سے کم تر ہوتے تھے۔ کسی بھی جگہ جہاں قدیم انسان کے آثار ملے ہیں اتنی بڑی ہڈیاں نہیں ملی ہیں۔ ماہرین کے خیال میں یہ کسی عام فرد کی ہڈی ہے جو غدود کی خرابی سے غیر معمولی طور پر بڑھ گیا تھا اور اسی وجہ سے اس کی ہڈیاں عام انسان سے بڑی ہوگئیں۔ یہ خیال اس لیے بھی قائم کرنا پڑا کہ چین میں ملنے والے قدیم پیکنگ مین نسل کے انسان بھی قد و قامت میں چھوٹے اور خمیدہ ٹانگوں والے ہوتے تھے۔ جب کہ معبد میں موجود ران کی ہڈی سیدھی اور جدید انسان سے ملتی جلتی ہے۔ اسے بوازنے کی ہڈی قرار دینے والے ماہرین اس کی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر ہیں کہ اگر وہ غدود کی خرابی کا شکار طویل قامت فرد بھی تھا تو اس کی ران کی ہڈی خمیدہ کیوں نہیں ہے۔

واضح رہے کہ تبت دنیا کے ان چند خطوں میں سے ہے جہاں آدم نما بوازنوں کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ یعنی قدیم انسانوں نے اس انتہائی خشک، سرد اور زندگی سے عاری جگہ کو اپنا مسکن بنانے سے گریز کیا تھا۔ وہ ایسی جگہوں پر آباد ہوتے تھے جہاں پانی میسر ہو اور موسم سخت نہ ہو۔ پھر بوازنے بہت عرصے پہلے معدوم ہو چکے ہیں اور معبد میں رکھی ہڈیاں ہزار سال کے آس پاس پرانی ہیں۔ اگر کسی بوازنے کے بجائے انہیں کسی ایسے انسان کی ہڈیاں قرار دیا جائے جو غدود کی خرابی کی وجہ سے غیر معمولی قد و قامت رکھتا تھا تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی

ہے۔ کچھ چینی ماہرین آثاریات اب ان ہڈیوں پر اس حوالے سے تحقیق کر رہے ہیں کہ کیا یہ اس پُراسرار مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں جس کے ہمالیہ کی وادیوں میں عام چرچے ہیں۔

انگریز شمالی انڈیا میں خاصی دیر سے آئے تھے اور اس کے بہت سے علاقوں تک وہ اپنے راج کے دوران پہنچ ہی نہیں سکے تھے جیسے انڈیا کا صوبہ ہماچل پردیش اور لداخ کے علاقے ہیں۔ جہاں انگریز نہیں پہنچے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز ان علاقوں سے اتنا واقف نہیں تھے۔ شاید اسی لیے یتی یا برفانی آدمی سے ان کا تعلق 1921 میں پڑا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل چارلس ہوورڈ بری کی قیادت میں ایک مہم ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف گئی۔ اس کا مقصد اس علاقے میں راستے تلاش کرنا اور یہاں کے نقشے بنانا تھا۔ کیونکہ اب تک متمدن دنیا کے لوگ یہاں نہیں پہنچے تھے۔ ہوورڈ بری نے اس کامیاب مہم کی روداد اپنی کتاب ''ماؤنٹ ایورسٹ دی ری کونیسنس'' میں بیان کی۔ اس میں اس نے بتایا کہ لاکپالا کے علاقے میں اکیس ہزار فٹ کی بلندی پر اس نے نرم برف پر ایک فٹ پرنٹ دیکھا۔ اس کے خیال میں یہ نشان کسی بہت بڑے سرمئی بھیڑیے کے پاؤں کا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ رضا کارانہ جانے والے ایک مقامی شرپا نے اسے بتایا کہ یہ نشان یہاں پائے جانے والے برف کے جنگلی آدمی کا تھا۔ جسے وہ اپنی زبان میں ''میتوہ اور کانگمی'' کہتے ہیں۔ میتو کا مطلب ریچھ آدمی اور کانگمی کے معنے برفانی آدمی کے تھے۔ ہوورڈ بری کی کتاب میں اس واقع پر کوئی حاشیہ آرائی نہیں ہوئی ہے کیونکہ اس کے خیال میں اس نے جو بیان کیا ہے وہی درست ہے اور ایک جاہل شرپا کی بتائی ہوئی بات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مگر ماہرین نے اسے اہمیت دی تھی ان کا کہنا تھا کہ اوّل تو بھیڑیے چاہے وہ کسی بھی نسل کے ہوں اتنی بلندی پر نہیں جاتے ہیں اور وہ بھی ایسے علاقے میں جوان کی گزرگاہ نہیں تھا۔ صرف بھیڑیے ہی نہیں بلکہ کوئی بھی جانور سوائے برفانی چیتے کے اس بلندی پر نہیں جاتا ہے۔ تب ایک اکیلا بھیڑیا وہاں کیا کر رہا تھا۔ دوسرے شرپا اسی علاقے کے رہنے والے ہیں اور وہ صدیوں سے بھیڑیوں کے وجود اور ان کے پیروں کے نشانات سے واقف ہیں۔ اس لیے اگر وہ سچ مچ بھیڑیے کے پاؤں کا نشان تھا تو شرپا کو اس کی تردید کرنے اور اسے برفانی آدمی کے پاؤں کا نشان بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

البتہ چارلس ہوورڈ بری نے اپنی کتاب میں میتوہ کا لفظ درست طور پر درج کیا اس کے بعد 1938ء میں ایک اور مہم جو اور ماہر آثاریات بل تھمان نے اپنی کتاب ''ماؤنٹ ایورسٹ'' میں اس پُراسرار مخلوق کو ''میچ'' کا نام دیا۔ یہ دونوں لفظ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ مگر درست لفظ ہوورڈ بری کا بتایا ہوا ہے کیونکہ تبتی یا نیپالی زبان میں ''میچ'' کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس لیے امکان یہی ہے کہ یہ ہوورڈ بری کا بیان کردہ لفظ ''میتوہ'' ہی ہے۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار ''دی اسٹیٹ مین'' کے صحافی ہنری نیومین نے بھی اس لفظ کو مہمل قرار دیا اور لفظ میتوہ کو ہی درست لفظ قرار دیا۔

ہمالیہ میں یتی کی تاریخ بدھ مت سے زیادہ پرانی ہے۔ اس سے پہلے یہاں رہنے والے پہاڑی باشندے ایک برفانی مخلوق کی عبادت کرتے تھے اور اسے دنیا کا سب سے بڑا شکاری قرار دیتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ان کے لیے شکاری خدا تھا۔ قدیم باشندے اسے ''مائی رگاڈ'' یا شکاری آدمی قرار دیتے تھے۔ وہ صرف اس کی عبادت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ مرنے یا پکڑے جانے والے برفانی آدمیوں کے خون اور جسم کے دوسرے حصے ٹوٹکوں اور جادوئی رسومات میں استعمال کرتے تھے مگر اس کا کوئی ثبوت دنیا کے سامنے نہیں آیا اور نہ ہی ہمیں برفانی آدمی کے جسم کا کوئی حصہ ملتا ہے۔ قدیم باشندے کیونکہ لکھنے یا تصویر کشی کے فن سے ناآشنا تھے اس لیے انہوں نے اس مخلوق کے بارے میں صرف زبانی تبصرے چھوڑے ہیں۔ ان روایتوں کے مطابق یہ مخلوق شکار کے لیے پتھر کا ایک طویل (گرز نما) ہتھیار استعمال کرتی تھی اور آپس میں بات کرنے کے لیے گونجتی ہوئی چیخ نما آواز نکالتی تھی۔

جب بدھ مت ہمالیہ کے دونوں طرف پھیلا تو اس کے پروکاروں نے ان روایات کو اپنا لیا تھا۔ لیکن انہوں نے اسے عام نہیں کیا۔ انگریزوں کے قدم سب سے پہلے نیپال تک پہنچے تھے کیونکہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اوّلین دارالخلافہ کلکتہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ دریاؤں اور ندیوں کی مدد سے مشکل سفر کا بہت سا حصہ آسانی سے طے ہوجاتا تھا۔ ایک انگریز جیمس پرنسپ نے 1832ء میں

نیپال کا سفر کیا۔ وہ کلکتہ کی لٹریری سوسائٹی کا ممبر تھا اور اس نے واپسی اپنے سفر کی یادداشتیں شائع کیں۔ پرنسپ نے شمالی نیپال کا سفر کیا تھا اور وہاں اس کے گائیڈ نے اسے ایک جانور دکھایا جو لمبے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ طویل قامت اور انسانوں کی طرح سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں انسانی پاؤں سے دوگنے بڑے تھے۔ پرنسپ نے اسے ''اورنگوٹن'' قرار دیا۔ یہ ایک قسم کا بندا ہے جو بہت جسیم اور اس کا پورا جسم سرخ یا گہرے بھورے بالوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اورنگوٹن انڈیا، نیپال اور بھوٹان میں عام پائے جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی یتی کی کہانیاں زیادہ تواتر سے سامنے آنے لگیں کیونکہ مغربی مہم جو باقاعدگی سے ہمالیہ کی مختلف چوٹیوں اور دور دراز علاقوں تک پہنچ رہے تھے اور انہوں نے اپنے سفر کے دوران میں ایسی جانوروں کی جھلک یا ان کے پیروں کے نشان دیکھے جو یتی کے بیان کردہ حلیے پر پورا اترتے ہیں۔ سب سے پہلے مستند خبر رائل جیوگرافر سوسائٹی کے ممبر اور فوٹوگرافر این اے ٹوم بازی کی طرف سے آئی۔ 1925ء میں ہمالیہ کی مہم کے دوران اس نے زیمو گلیشیر کے پاس پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر اس جاندار کو دیکھا۔ اس نے بعد میں اپنی کتاب میں اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھا۔ ''جب ہم نے اسے دیکھا تو وہ ہم سے کوئی دو سو میٹرز کے فاصلے پر تھا۔ وہ برف اور جھاڑیوں کے درمیان چل رہا تھا اور بالکل انسانی فگر رکھتا تھا۔ البتہ اس کا پورا جسم گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور اس کے جسم پر کسی قسم کا کوئی لباس نہیں تھا۔ بالوں کا رنگ برف کے مقابلے میں کسی قدر گہرا تھا۔ وہ انسانوں کی طرح دو پیروں پر چل رہا تھا اور جہاں ضرورت پیش آتی انسانوں کی طرح ہی چھلانگ لگاتا تھا۔ وہ پورے ایک منٹ تک ہماری نگاہوں کے سامنے رہا اور پھر ایک ٹیلے کے عقب میں چلا گیا۔''

اس کے دو گھنٹے بعد ٹوم بازی اور اس کی ٹیم کے ارکان جب اس جگہ پہنچے جہاں سے وہ جانور گزرا تھا تو انہوں نے برف پر انسانی پیروں سے از حد مشابہہ فٹ پرنٹ پائے۔ مگر یہ صرف سات انچ لمبے اور چار انچ چوڑے تھے۔ اس لحاظ سے وہ بگ فٹ کے الٹ ثابت ہوا تھا کیونکہ یہ عام انسان کے پیروں سے بھی چھوٹے پاؤں تھے۔ ٹوم بازی نے ان نشانات کے فوٹوگراف لیے تھے۔ جب یہ سوسائٹی کے میگزین میں شائع ہوئے تو اس دریافت نے دھوم مچادی تھی اور سارا یورپ اس پُراسرار ہمالیائی مخلوق کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اس دل چسپی میں ڈرامائی اضافہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا جب اہل یورپ آپس میں قتل و غارت گری سے فارغ ہو گئے تھے۔

1951ء میں کوہ پیما ایرک شپٹن ماؤنٹ ایورسٹ کی نقشہ گری میں مصروف تھا کہ اس نے بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک بہت بڑا فٹ پرنٹ دیکھا جو ننانوے فیصد انسانی پاؤں کے نشان سے ملتا جلتا تھا۔

بعض ماہرین کے خیال میں سترہ انچ لمبے اور چھ سے سات انچ چوڑے اس فٹ پرنٹ سے یتی کے وجود کی بہترین شہادت ملتی ہے لیکن بعض دوسرے ماہرین کا خیال تھا کہ وہ نشان اصل میں کسی قدیم جانور کا تھا جو برف میں محفوظ ہوگیا تھا اور جب برف پگھلی تو یہ نشان سامنے آگیا۔ ایسی ہی ایک رپورٹ رائل ایئرفورس کے ایک ملازم پیٹر بائیرن نے 1948ء میں سکم کے ایک سفر کے دوران دی۔ اس نے ایک پاؤں کا نشان دیکھا جو کسی بھی انسان کے پیر سے ڈیڑھ گنا بڑا اور برف میں بالکل واضح تھا۔ اس کی اتاری تصویر بہت واضح اور آج تک یتی کے فٹ پرنٹ کی اتنی واضح تصاویر نہیں لی گئی تھیں۔ 1953ء میں سر ایڈمنڈ ہلاری اور اس کے ساتھی شرپا تن زنگ نورگے نے ایک بہت بڑا فٹ پرنٹ دیکھا جب وہ ماؤنٹ ایورسٹ سر کررہے تھے۔ سر ہلاری کو یتی کے وجود پر یقین نہیں تھا اور اس نے اسے کسی بہت بڑے بندر کے پاؤں کا نشان قرار دیا تھا۔

تن زنگ نورگے کے پہلے بایوگرافر نے لکھا کہ نورگے کو یتی کے وجود پر شک تھا۔ اس نے اس کے فٹ پرنٹ کئی بار دیکھے تھے مگر کبھی اس مخلوق کو نہیں دیکھا تھا البتہ اس کے باپ نے جو خود بہترین گائیڈ تھا دو بار اس مخلوق کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ دوسری بایوگرافی کے موقع پر نورگے کو یتی کے وجود پر کسی قدر یقین ہو چلا تھا۔ 1954ء میں اخبار ڈیلی میل نے ہمالیہ میں یتی کی تلاش کے لیے ایک مہم ترتیب دی جس کی قیادت مشہور کوہ پیما جان اینجلو جیکسن کررہا تھا۔ اس نے اسی مہم کے دوران میں پہلی بار ایورسٹ سے کنچن جنگا تک کے ٹریک پر سفر کیا۔ اس سفر کے دوران اس نے

لاتعداد فٹ پرنٹ دیکھے اور ان کی تصاویر لیں۔ ان میں بہت سے نمایاں تھے تو بہت سے بڑے ہونے کے باوجود غیر نمایاں تھے اور ان کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ برف کے پگھلنے اور ہواؤں کی وجہ سے وجود میں آئے تھے۔ اسی نے پہلی بار ٹنگ بوچے گومبا میں چٹان پر بنی یتی کی علامتی تصویر کے فوٹوگرافس لیے تھے اور یہ ڈیلی میل میں شائع ہوئے تھے۔

اسی سفر کے دوران جیکسن کی ٹیم نے پینگ بوچے کی بدھ خانقاہ میں رکھے یتی کے آثار دیکھے۔ یہ کھال کا ایک ٹکڑا تھا جس پر بالوں کے گچھے تھے جن کے بارے میں خانقاہ کے لوگوں کا دعویٰ تھا کہ بال یتی کے ہیں۔ بالوں کی تصاویر ڈیلی میل میں شائع ہوئیں اور بعد میں معروف ماہر ایناٹومی پروفیسر فیڈرک ووڈ جون نے ان بالوں کا تجزیہ کیا اور اس نے بتایا کہ یہ بال نہ تو کسی ریچھ کے تھے اور نہ ہی کسی معلوم بندر کے۔ اس کے خیال میں یہ بال جن کا رنگ سرمئی، سفید اور سرخی مائل تھا کسی ایسے جانور کے تھے جو جسم کے اوپری حصے میں سردی سے بچاؤ کے لیے گھنے بال رکھتا تھا۔ مگر وہ نشاندہی نہیں کرسکا تھا کہ یہ بال آخر کس جانور کے تھے۔ حیرت انگیز طور پر آج کے جدید دور میں کسی نے کھال میں پائے جانے والے ڈی این اے کا تجزیہ نہیں کیا جس سے معلوم ہوسکتا کہ یہ کون سا جانور ہے؟

ایک طرف سنجیدہ شہادتیں سامنے آرہی تھیں اور دوسری طرف ہمالیہ میں آنے والا تقریباً ہر یورپی باشندہ یتی کو یا اس کے آثار دیکھنے کا دعوے دار ہو رہا تھا۔ سلومیر راوکز نامی جرمن باشندے نے دعویٰ کیا کہ 1940ء میں ہمالیہ کے پارٹریک کے دوران میں اس نے اور اس کے چند ساتھیوں نے دو یتی نما جانوروں کو دیکھا۔ ان جانوروں نے ان کا راستہ روک لیا تھا اور وہ پورے چار گھنٹے تک ان کے راستے میں براجمان رہے۔ کبھی کبھی وہ برف میں ٹہلنے لگتے تھے۔ چار گھنٹے بعد وہ راستے سے ہٹے تو ٹیم کی جان میں جان آئی تھی۔ راوکز نے بعد میں اپنی کتاب "دی لانگ واک" میں اس واقعے کو تفصیل سے بیان کیا مگر وہ کوئی ثبوت نہیں دے سکا۔ ٹیم کے پاس کیمرے تھے اور یہ قول اس کے وہ جانور چار گھنٹے تک ان کے سامنے رہے مگر کسی نے ایک تصویر بھی نہیں لی۔

پہلی بار امریکی یتی کی تلاش میں شامل ہوئے اور ایک امریکی ٹام سلیک نے یتی کی تلاش کے لیے اسپانسر شپ کا اعلان کیا۔ اس کا مقصد یتی کی موجودگی کی جسمانی شہادت حاصل کرنا تھا۔ اس کی ایک مہم کے دوران ہمالیہ کی برف میں ایک اجنبی پیرا سائٹ کیڑا ملا۔ یہ کسی جاندار کے ساتھ رہنے والا کیڑا تھا اور آج تک ہمالیہ کے کسی دوسرے جانور کے جسم سے نہیں ملا تھا اور تمام جانوروں کے اپنے طفیلیے تھے۔ اس لیے یہ طفیلیہ کسی ایسے جانور کا تھا جو آج تک نظر میں نہیں آیا تھا۔ معروف برطانوی اداکار جیمس اسٹیورٹ انڈیا کے دورے پر آیا تو اس نے چھپ کر سکم کا سفر کیا اور وہاں سے پینگ بوچے کی خانقاہ سے کھال کا ایک ٹکڑا چھپا کر لے آیا اور اسے اسمگل کر کے برطانیہ لے گیا۔ مگر اس کا مقصد تحقیق نہیں بلکہ اسے ایک نادر چیز کے طور پر اپنے پاس رکھنا تھا۔

یتی کی ہڈیوں کے علاوہ اس کی کھال اور بال کے ٹکڑے بھی کئی جگہوں پر موجود ہیں یا ان کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ یتی کی کھال اور بال ہیں۔ سکم کی بدھ خانقاہ کھم جنگ میں ایک بالوں سے بھری کھال موجود ہے۔ 1960ء میں ایڈمنڈ ہلاری نے یتی کی تلاش میں ایک مہم شروع کی اور اس نے کھم جنگ کی خانقاہ میں موجود کھال سے ریشے حاصل کر کے جب ان کا سائنسی تجزیہ کرایا تو پتا چلا کہ یہ یتی کی جعلی کھال تھی۔ اصل میں یہ ایک قسم کی پہاڑی بھیڑ کی کھال تھی جو نیپال اور ہمالیہ میں عام پائی جاتی ہے اور اسے رنگ اور بعض دوسری چیزوں سے یتی کی کھال بنایا گیا تھا۔ اس ناکامی نے ایڈمنڈ ہلاری کو یتی کے وجود سے ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا اور اس نے اس کے بعد اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں پُراسرار خیالی جانوروں کی روایتیں موجود ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یتی بھی ان میں سے ایک ہے۔

اس وقت یتی کے وجود پر یقین کرنے والے یورپی افراد کا تناسب ستر فیصد تھا مگر اکیسویں صدی میں یہ تناسب گھٹ کر صرف پندرہ فیصد رہ گیا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس قدر کوشش اور تلاش کے باوجود یتی کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکا ہے مگر اس سے اس خطے کے مقامی لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑا وہ آج بھی یتی کے وجود پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ نیپال اور انڈیا میں یتی کو سرکاری سطح پر اہمیت حاصل

نہیں ہے لیکن بھوٹان میں نہ صرف عوام یتی کے وجود پر یقین رکھتے ہیں بلکہ ان کی حکومت بھی اس معاملے میں عوام کی ہمنوا ہے۔ 1966ء میں بھوٹان نے یتی کو قومی جاندار قرار دیتے ہوئے ڈاک ٹکٹوں پر اس کی تصویر شائع کی۔ شمالی انڈیا، بھوٹان، نیپال اور سکم میں ایسے قبائل پائے جاتے ہیں جو یتی کو دیوتا کی طرح پوجتے ہیں۔ انہوں نے اس کے باقاعدہ معبد بنائے ہوئے ہیں جہاں اس کے مجسمے ہیں۔

برطانوی کوہ پیما ڈون ویلانز نے 1970ء میں ہمالیہ کی چوٹی اناپورنا کو سر کرنے کے دوران ایک جانور دیکھا جو مفروضہ یتی سے از حد مل رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ جب وہ ایک سائٹ کیمپ کی طرف جا رہے تھے تو انہیں گونجتی اور کانوں کو چبھتی چیخیں سنائی دیں۔ ڈون کے گائیڈ شرپا نے اسے بتایا کہ یہ یتی کی آواز ہے۔ اسی رات ڈون اور اس کے ساتھیوں نے کیمپ سائٹ کے پاس ایک بڑا اور تاریک وجود منڈلاتے دیکھا۔ اگلی صبح اس نے دوربین سے دو میل کے فاصلے پر ایک جانور کو خوراک کی تلاش میں دیکھا اور وہ بیس منٹ تک اس کا مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بالکل انسانوں کی طرح چل رہا تھا اور اس کا جسم عام انسان سے خاصا بڑا اور گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس دوران میں وہ ان کے کیمپ کے پاس بھی آیا تھا مگر اس نے کیمپ میں آنے کی کوشش نہیں کی اور بیس منٹ بعد وہ برف زاروں میں غائب ہو گیا تھا۔ تعجب انگیز بات ہے کہ ڈون یا اس کے ساتھیوں کو اس جانور کی تصاویر اتارنے کا خیال نہیں آیا حالانکہ ان کے پاس کیمروں کی موجودگی لازمی تھی۔

1983ء میں ہمالیہ کے ماہر ڈینیل سی ٹیلر اور فطری حیات کے ماہر روبرٹ ایل فلیمنگ جونیئر نے یتی کی تلاش میں ایک مہم کا آغاز کیا جو نیپال کی وادی بارن کی طرف گئی تھی۔ اسی وادی میں کوہ پیماؤں کورنن اور ٹک نیلی نے 1972ء میں یتی کے فٹ پرنٹ کی تصاویر لی تھیں۔ اس مہم کے دوران بارن کی وادی میں ویسے ہی فٹ پرنٹ پائے مگر ان کا سائز چھوٹا تھا۔ انہیں جنگل میں ایسے ٹھکانے ملے جن کے بارے میں شبہ ہوا کہ وہاں یتی رہائش رکھتے ہیں وہاں سے کھال اور بالوں کے بے شمار نمونے ملے لیکن جب امریکا اور برطانیہ میں ان کا تجزیہ ہوا تو یہ سیاہ ریچھ کی کھال اور بال ثابت ہوئے تھے۔

اس صدی میں بھی یتی کی دریافت کی کوشش جاری رہی۔ دسمبر 2007ء میں امریکی ٹی وی میزبان جوشوا گیٹس اور اس کی ٹیم نے ایک ڈاکومینٹری بنائی اور اس میں ہمالیہ میں ایورسٹ کے علاقے میں پائے جانے والے فٹ پرنٹس کی نشان دہی کی۔ جوشوا کو شبہ تھا کہ تقریباً دس انچ لمبے اس فٹ پرنٹ کو کسی انسانی ہاتھ نے بنایا ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنا شبہ ختم کرتا اسے ہمالیہ سے ملنے والے بالوں کا ڈی این اے تجزیہ کرانے کا موقع ملا اور اس سے ثابت ہوا کہ یہ کسی نامعلوم مخلوق کے بال تھے۔ ڈی این اے اجنبی ثابت ہوا اور اس کا موازنہ کسی دوسرے جانور کے ڈی این اے سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس دریافت نے یتی کی دریافت سے کسی قدر مایوس ہو جانے والے ماہرین اور مہم جوؤں کو پھر سے پرجوش کر دیا تھا۔ اگرچہ ہمالیہ، جانوروں کا ایک بہت بڑا خزانہ رکھتا ہے اور یہاں ہر سال ہی جانوروں اور پودوں کی سینکڑوں نئی اقسام دریافت ہوتی ہیں۔ جن میں خاصے بڑے جاندار بھی شامل ہیں۔ اس لیے یتی کے وجود پر یقین رکھنے والے اب بھی پرامید ہیں کہ بالآخر وہ اس تک پہنچ جائیں گے۔

جولائی 2008ء میں بی بی سی نے رپورٹ دی کہ شمال مشرقی انڈیا میں گیرو ہلز سے بالوں کے گچھے ملے ہیں۔ ان کے دریافت کنندہ دیپو مارک نے انہیں تجزیے کے لیے آکسفورڈ بروکس یونیورسٹی بھیجا جہاں پروفیسر اینا اور اس کے ساتھی جان والر نے ان بالوں کا تجزیہ کیا۔ کیمیائی تجزیے سے کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا لیکن جب ان کا ڈی این اے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ہمالیائی پہاڑی ہرن کے ہیں۔ جو بہت بلندی پر بھی پایا جاتا ہے اور سردی سے بچاؤ کے لیے اس کے جسم پر بہت گھنے سرخی مائل اور سرمئی بال ہوتے ہیں۔

نئی صدی میں مغربی ماہرین اور مہم جوؤں کے ساتھ ایشیائی ماہرین اور مہم جو بھی اس میدان میں آ گئے اور انہوں نے ہمالیہ میں یتی کی تلاش شروع کر دی۔ 2010ء میں چینی سائنس دانوں اور مہم جوؤں پر مشتمل ایک ٹیم نے تبت کے ان علاقوں کا دورہ کیا جہاں یتی سے متعلق آثار ملے تھے۔ چینی یہاں ستر اور اسی کے عشرے میں بھی سرگرم رہے تھے لیکن انہوں نے اپنی سرگرمیاں خفیہ رکھی تھیں۔ چینی اب بھی اپنی تحقیقات کے نتائج سامنے لانے کے لیے تیار نہیں ہیں

کیونکہ اس سے بہت سے سیاسی مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اتفاق سے چین ان تمام علاقوں پر اپنا دعویٰ رکھتا ہے جہاں یتی کے پائے جانے کا امکان ہے۔

بارن وادی میں ملنے والے فٹ پرنٹس کے بارے میں ٹیلر، فلیمنگ اور جان کریگ ہیڈ نے تین سال تک مسلسل تحقیق کی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ نشانات اصل میں سرخ ہمالیائی ریچھ کے اگلے پیروں کے ہیں۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی کہ جب نر ریچھ بلوغت کے نزدیک پہنچتے ہیں تو وہ دو سال کا عرصہ بڑے نر ریچھوں سے چھپ کر جنگل میں گزارتے ہیں کیونکہ بڑے ریچھ ان کو دیکھتے ہی مار ڈالتے ہیں۔ اس لیے وہ درختوں میں رہتے ہیں اور اگلے پنجوں میں چھپے ناخن درختوں پر رگڑ کر تیز اور بڑے کرتے ہیں اور مسلسل مشق سے ان کے ہاتھ کھل جاتے ہیں اور جب وہ باہر جاتے ہیں تو برف پر ان کے اگلے پیروں کے نشانات انسانی پیروں سے مشابہ بنتے ہیں۔ بہ ظاہر یہ جاندار تصویری ہے لیکن نیشنل جیوگرافک رسالے کے ایڈیٹر بل گیرٹ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ یتی کی تلاش کے لیے اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور سائنٹیفک تحقیق کی ضرورت ہے جو اب تک کی گئی ہے۔

☆☆☆

مادی شہادتوں اور گواہیوں سے قطع نظر آثاریات کے ماہرین فوسل کی مدد سے ایسی مخلوق کی موجودگی کا پتا چلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر بدقسمتی سے کوئی بھی ایسی نوع جو انسان نما ہو اور معدوم ہو چکی ہو۔ برصغیر اور تبت میں ایسی کسی نوع کی موجودگی کا ثبوت نہیں ملا ہے جو یتی سے مشابہ ہو اور وہ اب تک برقرار رہی ہو۔ انڈیا کے قدیم انسان آج سے ایک لاکھ سال پہلے دنیا سے مٹ چکے تھے جب یہاں بڑے پیمانے پر زلزلے آئے اور آتش فشاں پھٹے جن کی راکھ نے برسوں تک سورج کی روشنی کو زمین تک آنے نہیں دیا جس سے ننانوے فیصد جاندار اور پودے مر گئے تھے۔

تبت میں بوازنوں کے آثار آج بھی ناپید ہیں اور ماہرین کا خیال ہے کہ یہ زمین شروع سے انسانی آبادی کے لیے نہایت غیر موزوں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر سے بڑا رقبہ رکھنے کے باوجود تبت کی آبادی ایک کروڑ بھی نہیں ہے اور دوسری طرف برصغیر کی آبادی دو ارب ہونے والی ہے۔ اس لیے انسانوں نے اس زمین کا رخ کرنے سے گریز کیا تھا اور یہاں ان کے آثار نہیں پائے جاتے ہیں۔ ایسے میں کسی تبدیل شدہ بوازنے کی موجودگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں ان کے پرانے آثار بھی ملنا چاہیے تھے۔ برصغیر میں آدم نما بوازنوں کی کئی نسلیں پھیلی اور مٹ گئیں مگر یہ ساری نسلیں جنوب میں گرم علاقوں تک محدود رہی تھیں اور ہمالیہ کا خطہ پرانے آثار سے خالی ہے۔ یہاں صرف جدید انسانی آبادی کے آثار ملتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر یتی کوئی تبدیل شدہ بوازنہ ہے تب بھی اس کی موجودگی کا سابق ثبوت کیوں نہیں ہے اور آخر کیا وجہ ہے کہ انسانی آبادیوں سے بہت دور نہ ہونے کے باوجود اب تک اس کی جسمانی شہادت حاصل نہیں کی جا سکی ہے۔ جتنی کثرت سے اس کے فٹ پرنٹ اور بال ملتے ہیں اس لحاظ سے اسے لازمی اب تک سامنے آ جانا چاہیے تھا۔ ہمالیہ کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں موسم گرما میں ملکی اور غیر ملکی، سیاح، کوہ پیما اور مہم جو ہزاروں کی تعداد میں نہ جاتے ہوں۔ بہت ہی دشوار اور بلند علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً پورا ہمالیہ چھانا جا چکا ہے۔ اس کی فضا سے خلا سے ہر طرح کی نقشہ کشی ہو چکی ہے۔ اس کی ہر چوٹی اور درہ انسانوں کے علم میں آ چکا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے یتی اب تک معما بنا ہوا ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ آدم نما بوازنے بہت محدود سی عقل رکھتے تھے اسے آپ آج کے بندر کے آس پاس ہی سمجھیں۔ ان میں چالاکی اور حالات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی بھی قدرتی تبدیلی کی صورت میں فنا ہو جاتے تھے اور ان کی جگہ کوئی نئی نسل وجود میں آ جاتی تھی۔ جدید ترین بوازنوں کا یہ حال تھا کہ وہ آگ کے استعمال سے نا آشنا تھے۔ لکڑی اور پتھر کے بے معمولی ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ وہ کھیتی باڑی اور مکان سازی کے فن سے بھی نا آشنا تھے۔ کسی قسم کے لباس سے عاری ہوتے تھے۔ کسی بھی آدم نما مخلوق کی تاریخ میں پالتو جانور کا نشان نہیں ملتا ہے۔ حالانکہ جدید انسانوں کے مقابلے میں وہ بہت زیادہ عرصے تک زمین پر رہے۔ حد یہ کہ ایک نسل جسے نینڈرتھال کہتے ہیں اس کا زمین پر رہنے کا دورانیہ پندرہ لاکھ سال بنتا ہے جو جدید انسان سے بیس سے چالیس گنا زیادہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں وہ عقل و چالاکی سے محروم تھے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ یتی یا بگ فٹ نامی یہ مخلوق نہایت ہوشیاری سے خود کو چھپائے ہوئے ہے۔ وہ آبادیوں کے پاس رہتی ہے کیونکہ اس کی خوراک گوشت ہے اور وہ جس بلندی پر رہتی ہے وہاں بہت کم جانور پائے جاتے ہیں جو اس کی خوراک بن سکتے ہیں البتہ انسانی آبادیاں ہیں جن میں مویشی پائے جاتے ہیں اور یہ مویشی ان کا آسان شکار ہوتے ہیں۔ وہ بلند چراگاہوں اور ان کے باڑوں سے انہیں اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ تبتی بھکشو کی داستان سے ثابت ہوتا ہے۔ انیسویں صدی تک اس مخلوق کے لیے چھپے رہنا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ مقامی لوگ خود ان کے خوف سے پاس نہیں جاتے تھے اور نہ ہی ان کے دشمن ہوئے تھے حالانکہ وہ ان کی دولت یعنی مویشی لے جاتے ہیں۔

لیکن جب مغربی باشندے یہاں آئے اور انہیں اس مخلوق کے بارے میں پتا چلا تو اپنے فطری تجسس اور سائنسی تحقیق کے خیال سے انہوں نے اسے تلاش کرنے کے لیے باقاعدہ مہمات تشکیل دیں مگر وہ سوائے قدموں کے نشانات اور کچھ بالوں و کھال کے کچھ حاصل نہ کر سکے۔ بال اور کھالیں اکثر جعلی یا کسی دوسرے جانور کی ثابت ہوئیں یا ان پر نامعلوم جانور کا لیبل لگ گیا۔ یتی کی طرف واضح اشارہ نہیں گیا۔ اسی طرح کثرت سے ملنے والے فٹ پرنٹس کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ انہیں جان بوجھ کر بنایا گیا اور مقصد شہرت حاصل کرنا تھا۔ اسی طرح جن لوگوں نے یتی کو دیکھنے کا دعویٰ کیا وہ بھی اپنے دعوے کے حق میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہے۔

پچھلی ایک صدی میں یتی کی تلاش کی بڑے پیمانے پر کوشش کی گئی اور بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے کسی مخلوق کی دریافت میں اتنی سرگرمی نہیں دکھائی جتنی کہ یتی کی تلاش میں دکھائی۔ مگر تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور کوئی ایک بھی ایسا ثبوت نہیں ملا جس سے اس مخلوق کے وجود کی موجودگی کو تقویت ملتی۔ ملنے والے فٹ پرنٹس کے بارے میں خود ان کی دریافت کرنے والوں کا خیال تھا کہ وہ یتی کے بجائے کسی اور جانور کے ہیں۔ جنھوں نے دعویٰ کیا کہ یہ یتی کے فٹ پرنٹ ہیں ان کے دعوے پر خود دوسروں نے شک کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود یتی کے وجود پر یقین رکھنے اور اسے تلاش کرنے کی کوشش کرنے والوں کا حوصلہ کم نہیں ہوا اور وہ آج بھی اپنی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔

پُر اُمید ماہرین اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ ہمالیہ کا سلسلہ دنیا کے سب سے بڑے اور دشوار ترین پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ یہ کم و بیش پانچ لاکھ مربع کلومیٹرز کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے اس میں کم سے کم ڈیڑھ لاکھ مربع کلومیٹرز علاقہ ایسا ہے جسے زندگی کے لحاظ سے انتہائی دشوار اور خطرناک تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں نہ تو آبادی ہے اور نہ ہی وہاں عام لوگ جاتے ہیں۔ محدود تعداد میں چرواہے اور شکاری اس علاقے میں گرمی کے چند مہینوں کے دوران جاتے ہیں جب برف پگھل جاتی ہے اور طوفان تھم جاتے ہیں۔ یہ چند مہینے جون سے لے کر اگست تک ہوتے ہیں باقی آٹھ مہینے موسم انتہائی خراب ہوتا ہے۔ یہاں بلندی اتنی زیادہ ہے کہ سپر فٹ کوہ پیما اور مہم جو ہی وہاں جا سکتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق خراب علاقوں میں بعض جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں شدید سرما میں بھی درجۂ حرارت بہت زیادہ نہیں گرتا اور یہ منفی دس کے آس پاس رہتا ہے۔ ایسی جگہوں پر یتی جیسے جاندار کی موجودگی کا امکان ہے۔

کیونکہ یہ علاقے تقریباً ناقابل رسائی ہیں اس لیے ابھی تک انسان یتی کے رہنے کے مقامات تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ جب گرما میں یتی اپنی کمین گاہوں سے نکل کر انسانی آبادیوں اور کم بلندیوں تک آتے ہیں تاکہ آنے والے سرما کے لیے خوراک جمع کر سکیں تب انسانوں کا ان سے سامنا ہوتا ہے اور وہ اپنے نشانات فٹ پرنٹ اور کھال یا بالوں کی صورت میں چھوڑ جاتے ہیں۔ مشکل چٹانی سلسلوں میں یہ انسان کی نسبت کہیں تیز ثابت ہوتے ہیں اس لیے انسان سے سامنا ہوتے ہی یہ برق رفتاری سے وہاں سے نکل جاتے ہیں اور انسان بہ مشکل ان کی ایک آدھ جھلک ہی دیکھ پاتا ہے۔ سال کا طویل حصہ یہ اپنی کمین گاہوں میں گزارتے ہیں جو بہت دور دراز اور ناقابلِ رسائی مقامات پر ہیں۔ خوراک کی محدود دستیابی، کم شرح پیدائش اور بلند شرح اموات کی وجہ سے یتی بہت کم تعداد میں ہیں۔ ماہرین کے نزدیک یہی وجوہات ہیں کہ اب تک یتی کی موجودگی کا جسمانی ثبوت حاصل نہیں کیا جا سکا ہے۔

یتی کے وجود پر یقین رکھنے والے افراد کا خیال ہے کہ وہ ذہانت میں انسان کے آس پاس ہیں۔ یہی وجہ ہے

وہ انسانوں سے خطرہ محسوس کرتے ہیں اور اس سے دور رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ انسان کے ہاتھ آنے کی صورت میں وہ نہ صرف اپنی آزادی کھو دیں گے بلکہ ان کی بقا بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ انسانوں سے دور رہنے کے لیے قدرت نے انہیں ایسی کمین گاہیں دی ہیں جہاں انسان کی رسائی ناممکن حد تک دشوار ہے۔ وہ جس بلندی اور درجۂ حرارت پر آرام سے رہتے ہیں اس میں انسان صرف خاص انتظامات کے ساتھ محدود وقت کے لیے رہ سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یتی کے نشانات دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپری مقامات پر ہی ملے ہیں۔ بعض نشانات بیس ہزار فٹ یا اس سے بھی زیادہ بلندی پر ملے ہیں۔ جب کہ دس ہزار فٹ انسانی آبادی کے لیے آخری حد ہے اور اس کے اوپر شاذ ہی انسانی آبادیاں ملتی ہیں۔ گویا دونوں انواع کی ملاقات صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان یتی کے علاقے میں جائے یا یتی انسانوں کے علاقے میں آئے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ پھر یتی اس معاملے میں احتیاط پسند ہوسکتا ہے کہ وہ انسانوں سے دور رہنے کی شعوری کوشش کرتا ہے اور اگر سامنا ہو جائے تو فوری پسپائی اختیار کرتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کے علاقے میں انسان اس کا پیچھا نہیں کرسکتا ہے۔

جہاں تک ان کے نسلی ارتقا کی بات ہے جس کا اب تک کہیں سے کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ آج تک نہ تو اس کا کوئی فوسل، ہڈی یا جسم کا کوئی حصہ ملا ہے۔ کچھ بال اور کھال کے ٹکڑے ملے ہیں مگر ان کے ڈی این اے کسی نامعلوم جاندار کے ہیں۔ وہ انسان یا کسی بھی انسان نما مخلوق سے میچ نہیں کر رہے ہیں۔ پُرامید ماہرین کہتے ہیں کہ یتی ممکنہ طور پر جدید انسان کی ارتقا شدہ صورت ہے۔ وہ اس کی توجیہہ یوں پیش کرتے ہیں کہ آخری برفانی دور میں جب پورا یورپ شمالی امریکا اور ایشیا برف سے ڈھک گئے اور یہاں بسنے والے انسان جزیرہ نما عرب اور افریقا تک محدود ہو گئے تھے تب ہمالیہ کے قریب رہنے والے کچھ انسان اس سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے نسلی طور پر تبدیل ہوئے۔ ان کے جسم گھنے بالوں سے ڈھک گئے۔ جسم بڑے اور مضبوط ہو گئے۔ یوں وہ سخت موسم کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ کیونکہ اس دور میں نباتات باقی نہیں رہی تھیں اس لیے وہ گوشت پر زندہ رہے اور مستقل گوشت خور بن گئے۔

ممکنہ طور پر اس وقت وہ میدانوں میں بھی رہتے تھے، اس کی کئی ایک وجوہات ہوسکتی تھیں۔ اوّل اس وقت انسان صرف میدانی علاقوں میں رہتے تھے اور برفانی دور کی آمد کے بعد بھی یہیں رہے۔ دوسرے بڑی تعداد میں جانداروں کے مارے جانے سے ان کے لیے خوراک کا بہت بڑا ذخیرہ برف میں محفوظ ہو گیا اور وہ اسے کھا کر گزارا کرتے رہے لیکن جب برفانی دور ختم ہوا اور موسم بدلنے لگا تب وہ گرمی سے بچنے کے لیے ہمالیہ کے پہاڑوں کی طرف چلے گئے۔ پہاڑوں پر جانے کے بعد ان کے جسم طویل اور دبلے ہو گئے تا کہ وہ آسانی سے مشکل راستوں پر سفر کر سکیں۔ کھائیاں اور چٹانیں پھلانگ سکیں اور شکار کے پیچھے برق رفتاری سے دوڑ سکیں۔ سب سے بڑھ کر وہ یہاں محفوظ رہ سکتے تھے کیونکہ عام انسان برفانی دور ختم ہوتے ہی اپنے علاقوں میں واپس آگئے تھے اور وہ ان سے زیادہ متمدن اور چالاک تھے۔ یتی انسانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اس لیے اس نے ان سے دور رہنا مناسب سمجھا اور یہ دوری وہ اب تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔

جن مشہور افراد نے یتی کو سامنے سے دیکھنے کا دعویٰ کیا ان میں سب سے مشہور افسانوی شہرت رکھنے والا کوہ پیما رین ہولڈ میسنر ہے۔ اس نے دنیا کی تمام چوٹیاں جو سات ہزار میٹرز سے زیادہ بلند ہیں اکیلے سر کیں اور اس نے دعویٰ کیا کہ 1986ء میں اس نے ہمالیہ میں یتی کا سامنا کیا اور اس سے دست بدست لڑائی کی اور اسے ہلاک کر دیا۔ اس نے اپنی کتاب "مائی کویسٹ فار دی یتی" میں اس نے یہ ساری کہانی بیان کی اور اس کا کہنا تھا کہ مفروضہ یتی اصل میں ہمالیہ کا بھورا ریچھ یا تبت کا نیلا ریچھ ہے۔ دونوں جانور طویل قامت چھریرے جسم کے اور یہ چاروں پیروں یا پچھلے دو پیروں پر چل سکتے ہیں۔ میسنر کا دعویٰ تھا کہ اس جانور نے اس پر حملہ کیا اور انجام کار اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ مگر وہ اس کی لاش دنیا کے سامنے نہ پیش کرسکا کیونکہ وہ جس جگہ تھا وہاں سے اسے تن تنہا لانا ناممکن نہیں تھا۔ البتہ میسنر کوئی اور ثبوت بھی پیش نہیں کرسکا جیسے اس کی کھال یا جسم کا کوئی حصہ لے آتا یا اس کی تصویر لیتا۔ میسنر کا کہنا تھا کہ اگر وہ ریچھ کے بجائے یتی ہوتا تو وہ ایسا ضرور کرتا۔

نادیدہ عفریت

مریم کے خان

یورپ کے کئی علاقوں میں بالخصوص روسی علاقے میں ایک عجیب و غریب جاندار کے نشانات ملے ہیں۔ وہاں کے مکینوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کے جانور اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس کے قد و قامت کے بارے میں بھی عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نو فٹ لمبا اور انسانی جسم رکھتا ہے۔

ایک پراسرار مخلوق کا تذکرۂ خاص

2 فروری 1959ء میں روس کے انتہائی شمال میں کوہ یورال کے دور دراز اور انسانی آبادی سے تقریباً خالی علاقے میں ہولناک واقعہ پیش آیا۔ نو عدد نوجوان روسی ماہر کوہ پیماؤں اور مہم جوؤں کی ایک ٹیم کوہ یورال میں درہ ڈیاٹلوف کی طرف روانہ ہوئی اور لاپتا ہوگئی۔ اس وقت یہ جگہ کھولات سیاکھل کہلاتی تھی۔ جو اس علاقے کا قدیمی نام ہے اور مقامی باشندے اسے آج بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ مگر اس حادثے کے بعد اس جگہ کا نام ٹیم لیڈر آئیگور ڈیا

ٹلوف کے نام پر درہ ڈیاٹلوف رکھ دیا۔

غیر متوقع طور پر نہایت سرد موسم میں جب کہ شمالی یورپ اور خاص طور سے کوہ یورال کا سلسلہ مسلسل طوفانوں اور برف باری کی زد میں رہتا ہے یہ مہم روانہ ہوئی اور دو فروری کی رات اس کے ساتھ کیا ہوا یہ آج تک پُراسراریت کی لپیٹ میں ہے۔ آئیکور ڈیاٹلوف اور اس کے ساتھیوں نے اس رات اندر سے اپنے خیمے چاقوؤں سے کاٹ کر کھولے اور وہ عام لباس میں تھے جب کہ باہر درجہ حرارت منفی بیس ڈگری سینٹی گریڈ تھے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ ڈیاٹلوف اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں کیمپنگ سائٹ سے خاصی دور اس حالت میں ملیں کہ وہ عام لباس میں اور بغیر جوتوں کے تھے۔ ان کے خیمے بری طرح تباہ شدہ تھے اور ان میں جابہ جا چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ وہ کئی فٹ موٹی برف کی تہہ تلے اس طرح غائب تھے کہ ان کا کچھ ہی حصہ برف سے باہر رہ گیا تھا۔ خیموں سے باہر آنے کے بعد ڈیاٹلوف اور اس کے ساتھی افراتفری میں کیمپ سے نکل کر بھاگے تھے اور سب ہی ننگے پاؤں تھے۔ انہوں نے صرف موزے پہنے ہوئے تھے۔ دو لاشیں کیمپ سے ایک کلومیٹر دور جنگل میں اس حالت میں ملیں کہ ان کے جسموں سے لباس پھاڑ کر اتار دیا گیا تھا ان کی کھوپڑیاں اور پسلیاں ٹوٹی حالت میں تھیں۔ تین لاشیں جنگل اور کیمپنگ سائٹ کے درمیان میں ملیں ان کی ہلاکت سردی سے ہوئی تھی اور چار لاشیں خاصی تاخیر سے ملیں اور ان کی حالت سب سے زیادہ بری تھی۔

اس مہم کا مقصد کوہ یورال میں واقع اوٹورٹن کی سات ہزار دو سو فٹ بلند چوٹی سر کرنا تھا جو حادثے والی جگہ سے دس کلومیٹرز شمال میں تھی۔ فروری کے مہینے میں اس مہم کو تیسرے درجے میں رکھا گیا تھا اس کا مطلب تھا نہایت ہی مشکل کوہ پیمائی۔ کیونکہ موسم حد سے زیادہ خراب تھا۔ لیکن ٹیم کے تمام ارکان نہایت تربیت یافتہ اور متعدد مہمات کا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کے پاس تمام ضروری حفاظتی سامان تھا۔ ان میں سے اکثر یورال پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ (موجودہ یورال فیڈرل یونیورسٹی) کے طالب علم تھے۔ آٹھ مرد اور دو عورتوں پر مشتمل یہ ٹیم 25 جنوری کے دن ٹرین سے شمالی صوبے اوبلاسٹ کے شہر ویڈیل پہنچی اور یہاں انہوں نے ایک ٹرک حاصل کیا جو انہیں شمال کی آخری آبادی ویزائی تک لے گیا۔ ویزائی سے اگلے دن ٹیم کے ایک ممبر یوری یوڈن کو واپس بھیج دیا گیا کیونکہ اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور وہ آگے سفر کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یوں اب ٹیم نو افراد پر مشتمل تھی۔

وہ یہاں سے آگے بڑھے اور ان کی ڈائریوں و کیمروں سے واضح ہے کہ حادثے کے وقت تک مہم مکمل طور پر درست طریقے سے جاری تھی۔ وہ تین دن بعد 31 جنوری کے دن پہاڑوں میں داخل ہوئے اور اوپر چڑھنے لگے تھے۔ اس دوران ایک وادی میں انہوں نے اپنی اضافی خوراک اور دوسرا سامان محفوظ کیا۔ تاکہ واپسی میں اسے استعمال کرسکیں۔ خود کو ہلکا رکھنے کے لیے وہ صرف اتنا سامان لے کر جا رہے تھے جو اس مہم میں آگے کام آتا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ درہ کھولات عبور کر کے رات تک اس کے پار کیمپ لگائیں گے۔ مگر جب انہوں نے پہلی فروری کو اپنے سفر کا آغاز کیا تو خراب موسم، مسلسل برفانی طوفان اور حد نگاہ محدود ہونے کی وجہ سے وہ راستہ کھو بیٹھے اور بجائے درہ عبور کرنے کے وہ اس کے سب سے بلند مقام پر جا پہنچے۔ اس جگہ کو مانسی کہا جاتا تھا جس کا مطلب ہے "مردہ پہاڑ"

نیچے جانے اور ڈیڑھ کلومیٹر دور اصل جگہ کیمپ لگانے کے بجائے انہوں نے چوٹی کی ڈھلان پر ہی کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا۔ یہ جگہ خاصی حد تک ہموار اور ایوالانچ کے خطرے سے دور تھی۔ بچنے والے واحد فرد یوڈن نے کہا کہ ممکنہ طور پر ڈیاٹلوف وہ بلندی نہیں کھونا چاہتا تھا جو وہ اپنی غلطی کی وجہ سے حاصل کر چکے تھے اور اس نے اسی مقام سے اوٹورٹن کی چوٹی کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر پہاڑ کے اوپر انہیں برفانی تودوں کا خطرہ کم تھا جب کہ نیچے ان کا خطرہ یقیناً زیادہ ہوتا اس لیے انہوں نے اسی جگہ کیمپ لگا لیا۔ شاید یہی غلطی ان کی المناک موت کی وجہ بن گئی تھی۔ مہم پر روانگی سے پہلے ڈیاٹلوف نے اپنے اسپورٹس کلب کو ٹیلی گرام بھیجا تھا کہ وہ جلد ہی اپنی مہم سے واپس آجائیں گے۔ مگر 12 فروری کی تاریخ ہو گئی اور ان کی واپسی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ ڈیاٹلوف نے یوڈن سے کہا تھا کہ آخری حد 12 فروری ہو گی۔

یوڈن نے حکام کو آگاہ کیا مگر تلاش اور امداد کے لیے کوئی کارروائی نہیں شروع ہوئی جیسا کہ مہمات میں ہوتا ہے کہ وہ تاخیر کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اس مہم کے بارے

میں بھی یہی فرض کرلیا گیا کہ وہ موسم کی وجہ سے تاخیر کا شکار ہوئی ہے۔ مگر جب ایک ہفتہ اور گزر گیا اور ٹیم کی واپسی نہیں ہوئی تو 20 فروری کو پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ نے ایک امدادی پارٹی روانہ کی جو رضا کار طالب علموں اور ٹیچرز پر مشتمل تھی۔ اس کے فوراً بعد روسی فوج اور ملیشیا بھی اس کام میں شامل ہوگئی اور انہیں ہیلی کاپٹر استعمال کرنے کا حکم ملا۔ وسیع پیمانے پر ٹیم کی تلاش شروع ہو گئی۔ چھ دن کی مسلسل تلاش کے بعد انہیں 26 فروری کو درہ کھولات کے اوپری حصے میں ٹیم کا بری طرح تباہ شدہ کیمپ مل گیا۔ مسلسل برف باری کی وجہ سے کیمپ تقریباً برف میں دفن ہو گیا تھا۔

تمام خیمے اندر سے خالی تھے مگر لباس اور جوتوں سمیت کوہ پیماؤں کا مکمل سامان وہاں موجود تھا۔ تحقیقات سے پتا چلا کہ تمام ہی خیمے اندر سے کاٹ کر کھولے گئے تھے۔ تمام افراد اپنے جوتے چھوڑ کر صرف موزوں میں کیمپ سے نکل کر بھاگے تھے۔ ان میں سے شاید ایک ہی فرد کو جوتے پہننے کا موقع ملا تھا۔ دب جانے والے خیموں تلے برف پر جا بہ جا ان نو افراد کے ننگے پیروں کے نشانات نمایاں تھے۔ وہ صرف خیموں سے ہی نہیں نکلے بلکہ کیمپنگ سائٹ سے ہی نکل بھاگے اور ان کا رخ نزدیکی جنگل کی طرف تھا جو کیمپ سائٹ سے ڈیڑھ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا۔ لیکن اس وقت تلاش کرنے والے اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ کوہ پیما کس طرف گئے تھے۔ اس لیے امدادی پارٹی کے افراد درے کے ہر سمت پھیل کر انہیں تلاش کرنے لگے۔

مسئلہ یہ تھا کہ برف نے تمام نشانات مٹا دیے تھے اور انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کیمپ کے لوگ کس طرف گئے تھے۔ وہ تلاش کرتے ہوئے جنگل کے ساتھ ایک بڑی شیڈ نما چٹان کے تلے پہنچے تو وہاں انہیں بجھ جانے والی آگ کے پاس دو اولین لاشیں ملیں۔ یہ لاشیں کری وونی چینکوف اور ڈورو شینکوف کی تھیں۔ وہ بنا جوتوں اور لباس کے صرف انڈرویرز میں تھے۔ مگر یہاں تک بنا لباس کے نہیں آئے تھے۔ بلکہ ان کے لباس جسم سے پھاڑ کر اتار دیے گئے تھے۔ ان کی کھوپڑیاں اور پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور یہی ان کی موت کی وجہ تھی ایک نزدیکی درخت کی شاخیں پانچ میٹرز کی بلندی تک ٹوٹی ہوئی تھیں ایسا لگ رہا تھا کہ ان میں سے کوئی جان بچانے کے لیے اس پر چڑھا تھا مگر اس کی

اگر آپ ہمالیہ پر نہیں گئے ہیں تو کم از کم اس کی تصویریں اور ویڈیوز تو ضرور دیکھی ہوں گی۔ یہ پہاڑی سلسلہ فطرت کا شاہکار ہے۔ حد نگاہ تک برف ہی برف اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چوٹیاں۔ ہر سال ہزاروں لوگ کوہ پیمائی کے شوق میں ہمالیہ کی چڑھائی چڑھتے ہیں اگر آپ کو بھی ایسا شوق ہو رہا ہے تو اس بات کی پرواہ نہ کریں کہ وہاں کھانے پینے کا کیا ہوگا۔ قدرت نے ان برف پوش پہاڑوں میں بھی آپ کے لیے انتظام کر رکھا ہے۔ وہاں دو سو کے قریب ایسی فصلیں پائی جاتی ہیں جن کو آپ استعمال کر سکتے ہیں۔ دو سو کے قریب فصلیں جو یہ بتاتی ہیں کہ قدرت آپ کو کہیں بھی بھوکا نہیں رہنے دیتی۔ ایک ایسے آدمی کا حال سنیں جسے تاریخ کا سب سے دولت مند انسان قرار دیا گیا ہے۔ آپ نے قارون کے خزانے وغیرہ کی کہانیاں تو ضرور سنی ہوں گی لیکن وہ بہت پہلے کی بات ہے۔ موجودہ زمانے میں راک فیلر ایک ایسا آدمی تھا جس کے پاس بل گیٹس سے دس گنا زیادہ دولت تھی۔ چونکہ یہ معلوم تاریخ کا سب سے دولت مند شخص تھا اس لیے اسے تاریخ کا سب سے دولت مند شخص قرار دیا گیا ہے۔

مرسلہ: نعیم الدین۔ کراچی

☆☆☆

آپ جب جاگتے رہتے ہیں تب تک کچھ نہ کچھ تو کھاتے رہتے ہوں گے لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ سو جانے کے بعد بھی کھاتے رہتے ہیں۔ ہیں نا حیرت کی بات۔ چلیں آپ کو بتا دیں کہ آپ کیا کھاتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ آئندہ سے سونا نہ چھوڑ دیں۔ ستر سے زائد کیڑے مکوڑے اور جرثومے آپ کے منہ کے ذریعے آپ کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کو احساس نہ ہو۔ اگر احساس ہو جائے تو آپ تو شاید سونا ہی چھوڑ دیں۔

مرسلہ: نیلوفر احسن۔ لاہور

جان پھر بھی نہ بچ سکی تھی۔

اس کے بعد متلاشیوں کو اس چٹان اور کیمپ کے درمیان میں مزید تین لاشیں ملیں۔ یہ ڈیاٹلوف، کولموگوروا اور سلوبوڈون کی لاشیں تھیں جو برف میں دبی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہوں نے جنگل سے کیمپ تک جانے کی کوشش کی تھی تا کہ وہ وہاں سے لباس اور جوتے حاصل کر سکیں اور اسی کوشش میں وہ مر گئے۔ ان کی لاشیں آپس میں تیس سے پچاس میٹرز کے فاصلے پر اور جنگل سے کوئی چار میٹرز کی دوری سے ملی تھیں۔ باقی چار افراد کی لاشیں تلاش کرنے میں مہینوں لگ گئے تھے اور وہ 4 مئی کو برف کے ایک گڑھے میں ملی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سب سے آخر میں مرے تھے کیونکہ ان کے پاس دوسرے مر جانے والے مہم جوؤں کی چیزیں تھیں۔ وہ سب سے بہتر لباس میں تھے اور انہوں نے اپنے پاؤں بھی ڈھک لیے تھے۔

روسی پولیس نے پہلی پانچ لاشیں ملنے کے فوری بعد تفتیش کا کام شروع کر دیا تھا۔ ایک میڈیکل ایگزامنر نے ان پانچ لاشوں کا معائنہ کیا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق کری وونی چینکوف اور ڈوروشینکوف کی موت کھوپڑیاں اور پسلیاں ٹوٹنے سے واقع ہوئی تھیں۔ ان کے زخم ناقابلِ یقین حد تک گہرے اور جان لیوا تھے۔ البتہ ڈیاٹلوف، کولموگوروا اور سلوبوڈون شدید سردی میں ہائپوتھرمیا کا شکار ہوئے تھے اور ان کی لاشیں کسی قسم کے زخم سے محفوظ پائی گئی تھیں۔ کری وونی چینکوف اور ڈوروشینکوف کے بارے میں ایگزامنر کا کہنا تھا کہ ان کی موت میں ملوث قوت بہت زیادہ تھی اس کا موازنہ کسی جاندار کی قوت سے نہیں کیا جا سکتا ہے یہ قوت کار کریش کے مساوی تھی۔ جو عام طور سے پندرہ کلوگرام سے پانچ ہزار کلوگرام کے مساوی قوت رکھتی ہے۔ یعنی جب کار کسی آدمی کو ٹکر مارتی ہے تو وہ اس کے جسم پر اتنے وزن کے مساوی دباؤ ڈالتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ویران پہاڑی مقام پر جہاں چند گز ہموار زمین نہیں ہے کوئی مشینی قوت کیسے پہنچ سکتی ہے۔ ریسکیو ٹیموں کے ہمراہ وہاں آنے والی واحد مشین ہیلی کاپٹرز تھے۔ ورنہ زمین اس قابل بھی نہیں تھی کہ اس پر سنو بائیک چل سکتیں۔ میڈیکل ایگزامنر کے مطابق دونوں لاشوں کے زخم کسی بہت بھاری لیکن نرم اور نشان نہ چھوڑنے والی چیز سے وجود میں آئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے کسی جانور کی کارروائی قرار دے رہا تھا کیونکہ زخم نہ تو کسی دھاتی شے سے لگے تھے اور نہ ہی کسی لکڑی یا پتھر سے آئے تھے۔ ورنہ ان چیزوں کے باریک نشانات ضرور رہ جاتے۔ سرخ روسی ریچھ اتنی قوت رکھتا ہے مگر وہ حملہ کرتے ہوئے اپنے کئی انچ لمبے ناخن لازمی استعمال کرتا ہے جب کہ ان لاشوں پر ناخن کا کوئی نشان نہیں تھا۔ نہ ہی چٹان تلے ریچھ کے پیروں کے نشانات پائے گئے اور نہ ہی نزدیکی درخت جس کی شاخیں بری طرح ٹوٹی ہوئی تھیں وہاں ریچھ کے بال ملے۔ کسی ریچھ کے حملے میں یہ سب چیزیں لازمی سامنے آتیں۔

مئی میں ملنے والی لاشوں نے اس معمے کو مزید الجھا دیا تھا کیونکہ ان چاروں کی موت اسی طرح کے شدید زخموں سے واقع ہوئی تھی جس طرح کے زخم اولین دو لاشوں پر ملے تھے۔ یہ چاروں لاشیں کیمپنگ سائٹ سے مخالف سمت میں جنگل کے کنارے واقع اس چٹان سے کوئی پچھتر میٹرز دور ایک گڑھے سے ملی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں باقاعدہ اس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے ان پر برف ڈالی گئی تھی کیونکہ اس جنگل میں کسی جگہ بھی دو فٹ سے زیادہ برف نہیں پڑی تھی لیکن اس گڑھے میں چھ فٹ سے زیادہ برف تھی اور اس نے گڑھے کو اوپر تک بھر دیا تھا۔ تھائی بیکس برگنولیس کے سر پر ایک گہرا زخم تھا اور ہڈی کا مضبوط ترین حصہ کسی ناقابلِ بیان قوت نے ایک ہی وار میں توڑ دیا تھا۔

ڈوبی نینا اور زولوٹریف دونوں کے سینے پر شدید ضربیں لگی تھیں اور ان کی پسلیاں ٹوٹی حالت میں پائی گئی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ سوائے ڈوبی نینا کے کسی لاش پر کوئی بیرونی زخم نہیں تھا۔ نہ تو کھال پھٹی تھی اور نہ ہی کہیں سے گوشت ادھڑا تھا۔ اگر یہ ریچھ یا کسی اور جانور کا کارنامہ ہوتا تو لازمی بیرونی زخم بھی پائے جاتے۔ ریچھ اور برفانی بھیڑیوں سمیت تمام ہی خطرناک جانور گوشت خور ہوتے ہیں مگر اس حوالے سے کسی لاش کو معمولی سا بھی نہیں چھیڑا گیا تھا۔ ڈوبی نینا کی لاش گڑھے میں اوندھے منہ پڑی پائی گئی تھی اور اس کی آنکھیں، زبان، ہونٹ اور چہرے پر کھال و گوشت کا بڑا حصہ غائب پایا گیا۔ مگر میڈیکل ایگزامنر ڈاکٹر بورس کے مطابق چہرے کے غائب اجزا کسی جبر کا نتیجہ نہیں تھے کیونکہ ان کے اندرونی حصے درست حالت میں پائے گئے تھے اگر انہیں جبراً نکالا جاتا تو اندرونی حصے بھی

متاثر ہوتے۔ ڈوبی نینا کے چہرے کی اس حالت کی ایک ممکنہ وجہ اس کا اوندھے منہ تین مہینے سے زیادہ گڑھے کے نیچے برف تلے پہنے والا یخ بستہ پانی تھا۔ یہ پانی رفتہ رفتہ ڈوبی نینا کے چہرے کے اجزا بہا کر لے گیا تھا۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تینوں کی لاشوں کے نزدیک ایک لفظ زمین پر لکھا ملا جو برف کی وجہ سے ابھر کر جامد ہو گیا تھا وہ لفظ تھا ''مقدس''۔

پتا نہیں انہوں نے ایسا کیا دیکھا جسے مقدس کہنے لگے۔

جانوروں کا نظریہ مسترد ہونے کے بعد تفتیش کاروں نے مانسی کے پہاڑوں کے پاس بسنے والے قدیم قبائل کو اس حملے کا ذمے دار قرار دیا مگر میڈیکل رپورٹ نے اس کی بھی تردید کر دی۔ اوّل تو خیموں اور جنگل میں مہم جوؤں کے ننگے پیروں کے نشانات ملے لیکن اس کے علاوہ کسی جوتے کا نشان نہیں ملا۔ دوسرے کسی بھی موت میں دست بدست لڑائی کا معمولی سا شائبہ بھی نہیں تھا۔ کسی نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ سب سے اہم بات کہ کوئی انسان اپنے ہاتھوں یا جسم کے کسی حصے سے اتنی طاقتور ضربیں نہیں لگا سکتا ہے جو یوں موت کی وجہ بنیں۔ پھر مانسی قبائل پُرامن لوگ تھے اور وہ سرما کا یہ حصہ اپنے زیرزمین گھروں میں مقید رہ کر گزارتے ہیں۔ درجۂ حرارت منفی پچیس سے تیس ڈگری سینٹی گریڈ میں وہ گھروں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

یہ ساری باتیں آف دی ریکارڈ تھیں جب کہ ریکارڈ کے مطابق کوہ پیماؤں کی موت اور کیمپنگ سائٹ کی تباہی کی وجہ ایوالانچ کو قرار دیا گیا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ رات کسی وقت اوپر سے برف کا تودا کیمپنگ سائٹ پر آ گرا اور اس نے کوہ پیماؤں کے خیموں سے باہر آنے کا راستہ مسدود کر دیا اور انہیں چاقوؤں سے اپنے خیمے کاٹ کر باہر نکلنا پڑا تھا۔

مگر بوڈن نے اس نظریئے کو مسترد کر دیا تھا اس کا کہنا تھا کہ ڈیاٹلوف اور دوسرے کوہ پیما تجربے کار تھے اور وہ کسی ایسی جگہ کیمپ نہیں لگا سکتے تھے جہاں برفانی تودہ گرنے کا امکان ہو۔ فرض کیا جائے کہ وہاں ایسا کوئی امکان تھا تو وہ سب بے فکری سے اس سردی میں بھی اپنے گرم کپڑے اور جوتے اتار کر لیٹ گئے تھے۔ واضح رہے اگر درجۂ حرارت منفی دس ڈگری سینٹی گریڈ ہو تو رات کسی وقت ہنگامی صورت حال میں باہر نکلنے کے لیے کوہ پیما اور ٹریکرز مکمل لباس معہ جوتوں کے پہن کر سوتے ہیں۔ جب کہ یہاں ایسا نہیں تھا۔ پھر یہ کیسا ایوالانچ تھا جو خیموں کے آس پاس تو گرا مگر اس نے خیموں کو نہیں دبایا اور وہ سب خیموں سے باہر نکل آئے۔ ایوالانچ کی صورت میں انہیں یوں اتنی دور تک بھاگے جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایسا صرف اس صورت میں ممکن تھا جب انہیں خیموں سے باہر آنے کے باوجود خطرے کا سامنا ہو۔ جس سے بچنے کے لیے وہ ڈیڑھ کلومیٹر دور جنگل تک چلے گئے۔ مگر ان تمام سوالوں کو نظرانداز کر کے کیس کو ناقابلِ حل قرار دے کر داخلِ دفتر کر دیا گیا۔

سوویت یونین کے خاتمے کے بعد جہاں بہت سے دوسرے خفیہ راز اور کیسز سامنے آئے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا۔ ڈیاٹلوف پاس اسی ڈینٹ کے نام سے مشہور یہ پُراسرار کیس اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک زیادہ توجہ نہیں حاصل کر سکا تھا کیونکہ اس وقت تک مغربی دنیا اسے ایک حادثہ سمجھ رہی تھی لیکن 2014ء میں ڈسکوری چینل نے ''رشین ییتی'' کے نام سے ایک خصوصی ڈاکومینٹری بنائی جس میں انکشاف کیا گیا کہ یہ حادثہ نہیں تھا بلکہ کسی نامعلوم اور نہایت طاقتور جاندار نے کیمپنگ سائٹ کو تباہ کر کے زخموں سے مرنے والے کوہ پیماؤں کو ہلاک کیا تھا۔ اس ڈاکومینٹری کے تفتیش کار بنجامن ریڈفورڈ نے ایک تفصیلی مضمون لکھا جس میں اس نے بتایا کہ کوہ پیما جس قسم کے زخموں سے ہلاک ہوئے تھے وہ کسی بہت ہی طاقتور غیر انسانی قوت نے لگائے تھے۔ خاص طور سے کوہ پیماؤں کے سر اور پسلی کی ہڈیاں جس طرح ٹوٹی تھیں وہ کسی جانور کے بس کی بات بھی نہیں ہے جو ان خطوں میں پائے جاتے۔

ڈسکوری چینل کی اس ڈاکومینٹری کی اصل بنیاد وہ پُراسرار بہت بڑا فٹ پرنٹ تھا جو چٹان تلے ملنے والی اوّلین دو لاشوں کے نزدیک پایا گیا تھا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ اس فٹ پرنٹ کی نہ تو کوئی تصویر لی گئی اور نہ ہی اسے شہادت کے طور پر محفوظ کیا گیا۔ بلکہ روسی پولیس اور فورس کے تفتیش کاروں نے اسے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا تھا۔ روسی طبی تفتیش کار ماتک لیبا کی جائے وقوع پر پہنچنے والے اوّلین افراد میں سے ایک تھا اور اس نے وہاں لاشوں کے پاس فٹ پرنٹ دیکھا۔ اس کا بیان ہے کہ وہ کم سے کم تیرہ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا تھا۔ کسی انسان کا پاؤں اتنا بڑا نہیں ہو سکتا اور خاص بات یہ ہے کہ وہ ننگے پاؤں کا فٹ پرنٹ تھا۔

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 105

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروتگی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر وتھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروتگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگادیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروتگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی ننی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ پانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ''شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔'' ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ''کنور ہوشیار'' سادی کو لے کر چھپ...... '' مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا جیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنادیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا ''پاپا'' تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کررکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم..... چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک

غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا ”اعلانِ جنگ“ میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا ابھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے ربیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ایک ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ ہم نے سپاہیوں سے نمٹنے کے بعد اپنے حامیوں کو جمع کیا اور گودام پر قبضہ کر لیا پھر ہم نے فصیل کے نزدیک دشمنوں کے ایک دستے کو گھیر لیا۔ اس کے سربراہ نے کہا کہ ہمیں روک کر تم نے اچھا نہیں کیا کیونکہ فوج کسی بھی وقت سامیرا کے قلعہ پر حملہ کرنے والی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

حملے کا سن کر میرے جسم میں لمحاتی سنسنی پھیلی تھی مگر یہ ایسی خبر نہیں تھی جو غیر متوقع ہو۔ ریناٹ کی فوج اگرچہ محاصرے کے لیے گئی تھی مگر بالآخر وہ وہاں حملہ ہی کرتی۔ اصل بات یہ تھی کہ ریناٹ نے فوج کو واپسی کا حکم دیا تھا اور ظاہر ہے یہ حکم ہماری وجہ سے دیا گیا تھا۔ ریناٹ اور اس کے ساتھی جان گئے تھے کہ باغی نہ صرف آزاد ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے قلعے کی فصیل اور دروازے پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ باغی کم تعداد میں تھے اور اب بھی ریناٹ کے خصوصی سپاہیوں کی تعداد ان سے زیادہ تھی مگر مسلسل ناکامیوں اور خاص سپاہ کے مارے جانے والے سپاہیوں کی بڑھتی تعداد نے اس کے حوصلے پست کر دیئے تھے اور اس نے اسی میں عافیت سمجھی تھی کہ اپنی فوج کو واپس بلا کر پہلے شہر میں موجود باغیوں کا خاتمہ کرے اور آرگون پر اپنی گرفت مضبوط کرے اس کے بعد سامیرا کے خلاف کارروائی کرے۔ کسی وقت بھی شروع ہونے والے حملے کی تشویش ناک خبر کے باوجود مجھے خوشی ہوئی تھی کہ ریناٹ دفاع پر اتر آیا تھا۔ جب حملہ آور دفاع پر آ جائے تو سمجھ لیں کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا ہے۔ میں نے کمانڈر سے پوچھا۔

”تمہیں کیسے علم ہوا کہ سپاہ عنقریب سامیرا کے قلعوں پر حملہ کرنے والی ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں جانتا، لیکن مجھے بتایا یہی گیا ہے کہ فوج جلد حملہ کرنے والی ہے اور اس سے پہلے اسے روک کر واپسی کا حکم دینا ہے۔“

”فرض کرو کہ تم فوج تک پہنچ جاتے اور پیغام پہنچا دیتے اس کے بعد تم کیا کرتے؟“

”میں واپس آتا۔“

”اسی جگہ؟“

”ہاں۔“

”اور اسی خفیہ راستے سے قلعے میں جاتے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ظاہر ہے۔“

”لیکن خفیہ راستہ تو اندر سے بند ہے تم اسے کیسے کھولتے؟“

میرے ابتدائی سوالات کا مقصد یہی تھا کہ اگر میں براہ

راست پوچھ لیتا تو شاید وہ اس طرف آنے کا اقرار ہی نہ کرتا۔ مگر اب وہ اقرار کر چکا تھا اور ظاہر ہے جب اسے اسی راستے سے واپس جانا تھا تو کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہوتا خفیہ دروازہ کھولنے کا۔ وہ چپ رہا تھا تو ریک نے سنگی خنجر کی نوک اس کی گردن سے لگادی "جواب دو۔"

وہ کانپ اٹھا تھا۔ "یہ شاہی راز ہے اگر میں نے فاش کیا تو......"

"فی الحال ریناٹ کو بھول جاؤ۔" ریک نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تمہاری زندگی و موت کا انحصار ہم پر ہے۔ اس لیے زندہ رہنا چاہتے ہو تو جواب دو۔"

وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اس لیے بادل ناخواستہ اس نے کہا۔ "خفیہ دروازہ صرف اندر سے کھل سکتا ہے۔ باہر سے اسے کھلوانے کے لیے قلعے کی دیوار کے رکھے ایک پتھر کو ہٹا کر آواز دی جاتی ہے جسے سن کر اندر موجود محافظ دروازہ کھول دیتے ہیں۔"

کیونکہ مجھے ایسا کوئی پتھر دکھائی نہیں دیا تھا اس لیے میں اور ریک اسے قلعے کی فصیل تک لائے اور اس نے وہاں جڑ میں لگے ایک پتھر کی نشان دہی کی۔ "یہ نکل جاتا ہے۔"

میں نے ٹٹول کر پتھر کا جائزہ لیا اور پھر اس کے تین طرف موجود خلا میں انگلیاں پھنسا کر اسے کھینچا تو وہ فصیل سے نکل آیا۔ بہ ظاہر وہ فصیل کا ہی حصہ تھا۔ پتھر کے عقب میں خلا تھا اور میں نے اس میں تیر ڈال کر دیکھا۔ یہ تقریباً ایک فٹ قطر کی سرنگ تھی جو آگے جا کر مڑ رہی تھی۔ احتیاطاً میں نے کوئی آواز نہیں نکالی اور پتھر کو بھی بنا آواز کے واپس اسی جگہ لگا دیا۔ کمانڈر کی یہ بات درست ثابت ہوئی تھی اس لیے اس کے جواب پر بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ مجھے شاہی علاقے تک جانے والا قلعے کا خفیہ راستہ مل گیا تھا اور اسے کھلوانے کی سبیل بھی نظر آگئی تھی۔ مگر یہ بعد کا مرحلہ تھا ابھی تو ہمیں قلعوں پر ہونے والا حملہ رکوانا تھا۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا تھا مگر میں پہلے ایزارٹ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس آدمی نے اپنی ذہانت سے مختصر وقت میں مجھے متاثر کیا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے آرگو جیسا گدھا سربراہ کیسے بن گیا تھا۔ واپس آکر میں نے سپاہیوں کو قلعے کی طرف روانگی کا حکم دیا۔ ایزارٹ نے زخمی سپاہیوں کے بارے میں پوچھا۔

"ان کا کیا ہوگا جناب؟"

"ان کے جو ساتھی ٹھیک ہیں وہ دوسروں کو سہارا دیں۔"

زخمی ہونے والے سپاہیوں نے اپنے زخموں سے تیر خود ہی نکال لیے تھے اور اپنے کرتوں سے کپڑا پھاڑ کر پٹی بھی کرلی تھی۔ البتہ جس کے کولہے میں تیر لگا تھا اس کی مدد دوسروں نے کی تھی۔ آٹھ زخمیوں میں سے دو اس قابل تھے کہ از خود چل سکتے تھے باقیوں کو ان کے ساتھی سہارا دیئے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور میرے ساتھیوں کے تیر کمانوں پر تھے۔ انہیں خبردار کر دیا کہ ان کی طرف سے ذرا سی غلط حرکت ان کی فوری موت کا سبب بن جائے گی۔ کیونکہ اس لاؤ لشکر کے ساتھ فصیل سے واپسی ممکن نہیں تھی اس لیے ہم دیوار کے ساتھ ساتھ دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ البتہ روانگی سے پہلے میں نے ایک ساتھی کو اوپر بھیج دیا کہ وہ سیڑھیاں سمیٹ لے اور تیزی سے واپس پہنچ کر ہمارے لیے پہلے سے چھوٹا دروازہ کھلوا دے۔ اس دوران میں بارش رک گئی تھی۔ زخمی قیدیوں کی وجہ سے ہماری رفتار خاصی سست تھی اور بعض اوقات ان لوگوں کو مہمیز دینا پڑتی تھی کہ وہ تیز چلیں۔ آگے جانے والا سپاہی نہ صرف ہم سے پہلے پہنچ گیا بلکہ اس نے ایزارٹ کو سب بتا بھی دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا بلکہ ایزارٹ باہر ہی موجود تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے آیا۔

"کیا واقعی قلعوں پر حملہ ہونے والا ہے؟"

"اطلاع تو یہی ہے۔" میں نے کہا اور اسے ریناٹ کی خاص چھڑی دکھائی۔ "کسی عام سے کام کے لیے اس شاہی نشانی کو استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے؟"

"تم نے درست کہا۔" وہ مضطرب لہجے میں بولا۔ "ہمیں اس حملے کو روکنا ہوگا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے ان لوگوں کو بھی قید خانے میں ڈلوا دو۔"

ایزارٹ نے آواز دے کر اپنے ایک نائب کو طلب کیا اور اسے آنے والے قیدیوں کے بارے میں ہدایت دینے لگا۔ ہم اندر آئے زخمی اور ٹھیک سپاہیوں کو قید خانے میں ڈلوا دیا۔ ہمارے پاس قیدیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اگرچہ ان کی وجہ سے ہماری کچھ افرادی قوت پہرے

پر لگ گئی تھی اور ہمیں ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ مگر مجبوری تھی ان کو بلا وجہ قتل بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں، ایزارٹ، ایرٹ اور ربیک میٹنگ روم میں آئے۔ یہ کمرا اب اسی کام کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے ایزارٹ کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا تو وہ کچھ مضطرب ہو گیا۔ ''آپ نہیں یہ بہت بڑا خطرہ ہوگا۔''

''تب کون جائے گا۔ یہ کام بہت ہوشیاری سے کرنا ہے۔''

ایزارٹ نے سوچا اور پھر بولا۔ ''میں خود جاؤں گا۔''

''خطرہ تو تمہارے لیے بھی ہے۔''

''نہیں تمہارے لیے بہت زیادہ ہے۔'' ایزارٹ نے کہا۔ ''تم ہماری زبان نہیں بول سکتے اور تمہارے ساتھی اس طرح نہیں بول سکتے جیسا کہ آرگون والے بولتے ہیں اس لیے تم لوگ فوراً پہچان لیے جاؤ گے۔ میں یہیں کا آدمی ہوں اور یہاں کی زبان یہیں کے لہجے میں بول سکتا ہوں۔ دوسرے مجھے یہاں سے جانے والے عام سپاہی دیکھ چکے ہیں کہ میں ریناٹ کا کمانڈر رہوں اس لیے میں جاؤں گا اور اگر کسی کو شک ہوا تو وہ میرے حق میں گواہی دیں گے۔''

ایزارٹ نے بہت مدلل انداز میں وضاحت کی۔ میں نے سوچ کر کہا۔ ''مگر سامیرا کے قلعوں میں موجود غداروں نے یہاں موجود حریت پسندوں کے بارے میں بتایا ہوگا اور ان میں تمہارا نام بھی شامل ہوگا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب سے پہلے میں ایک عام سا فرد تھا یہ تو تم ہو جس نے مجھے اتنی حیثیت دی اور مجھے حریت پسندوں کا سربراہ بنا دیا ورنہ میرے بارے میں تو بڑوں میں سے کوئی نہیں جانتا۔''

میں اجازت دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ میرے نزدیک ایزارٹ اب ایک قیمتی فرد بن گیا تھا اور ایسے آدمی کو خطرات میں جھونکنا مناسب نہیں تھا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ لیڈر ہمیشہ فرنٹ پر ہوتے ہیں اور تب ہی وہ لیڈر بنتے ہیں۔ اللہ جس سے کام لینا چاہتا ہے اس کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم جاؤ مگر کوشش کرنا کہ یہ کام کر کے جلد از جلد واپس آجاؤ۔ ہمارے پاس وقت کم رہ گیا ہے اور ہمیں اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

میرا اشارہ خفیہ راستے کی طرف تھا۔ ایزارٹ نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں۔''

''میں بھی ایزارٹ کے ساتھ جاؤں گا۔'' ایرٹ نے کہا۔

''نہیں تم یہیں رکو گے۔'' میں نے انکار کیا۔ ''اس کے ساتھ میں جاؤں گا۔''

''آپ۔'' ربیک مضطرب ہو گیا۔ ''آپ کو دشمن پہچان سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''آپ بھول رہے ہیں آپ یہاں ریناٹ کی قید میں رہ چکے ہیں اگر فوج میں کوئی ایسا سپاہی نکل آیا جو آپ کا صورت آشنا ہوا تو آپ بہت بڑے خطرے میں پڑ جائیں گے۔''

ایرٹ ٹھیک کہہ رہا تھا میں نے اس پر غور کیا نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں چاہتا تھا کہ پڑاؤ تک جاؤں اور وہاں کا احوال دیکھوں۔ ضروری نہیں تھا کہ میں فوج میں جاتا میں دور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے یہ بات کہی تو ایزارٹ راضی نظر آنے لگا۔ ''ہاں یہ ہو سکتا ہے تم پاس رہو گے تو مجھے بھی حوصلہ رہے گا۔''

بس تو روانگی کی تیاری کرو۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ایزارٹ نے دو درجن سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کیا۔ اس نے تمام افراد کی وردیوں پر ضروری نشانات لگوائے۔ میں اور ایرٹ پیچھے ہوتے۔ طے پایا کہ ہم راستے میں الگ ہو کر باغات میں چلے جائیں گے اور وہاں سے فوج کا جائزہ لیں گے۔ جب سب تیار ہوئے تو قلعے کا چھوٹا دروازہ کھول دیا گیا اور ہم باہر آئے۔ دو قطاروں میں آگے بڑھنے لگے۔ بارش کی وجہ سے راستہ کیچڑ زدہ اور خراب ہو رہا تھا اس لیے ترتیب رکھنا ممکن نہیں تھا۔۔۔ سب پانی اور کیچڑ سے بچ بچا کر چل رہے تھے۔ کھیت جل کر راکھ ہو چکے تھے اور ظاہر ہے ان میں لگی فصل جو تقریباً پک چکی تھی وہ بھی جل گئی اور آنے والے سرما میں اس بحران سے بچنے والے افراد کو خوراک کے بحران کا سامنا کرنا پڑتا۔ مگر یہ بعد کی بات تھی ابھی تو اس بحران سے نمٹنا تھا جو جاری تھا۔ جب ہم باغات کے نزدیک پہنچے تو میں اور ایرٹ باقیوں سے الگ ہو گئے اور درختوں میں داخل ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ ایرٹ نے کہا۔

''کیا خیال ہے اس چٹان تک نہ چلیں جہاں سے سارا منظر صاف نظر آتا ہے؟''

میں نے انکار کیا۔''نہیں وہ بہت دور ہے اور ہمیں جلد از جلد واپس جانا ہے۔''

ایک گھنٹے میں ایزارٹ اور اس کا دستہ فوج کے پڑاؤ میں داخل ہو گیا تھا اور اس وقت ہم اس سے کوئی پون میل کے فاصلے پر تھے۔ یہاں سے فوج اور اس سے ذرا دور قلعوں کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ساری دنیا میں رواج ہے کہ پھلدار درختوں کا قد کم رکھا جاتا ہے تاکہ پھل اتارنے میں دشواری نہ ہو۔ اس کے لیے درختوں کی اوپر سے چھٹائی کی جاتی ہے اور نیچے سے ان کو پھیلنے دیا جاتا ہے۔ یہی طریقہ یہاں بھی رائج تھا۔ اس لیے درختوں کی شاخیں زمین تک پھیلی تھیں مگر ان کی بلندی نو دس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر یہ ذرا بلند درخت ہوتے تو ان پر چڑھ کر فوج اور قلعوں کو بہتر طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ ایزارٹ کو گئے ہوئے نصف گھنٹا ہونے کو آیا تھا اور ابھی تک اس کی واپسی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے اور ایرٹ نے عام سپاہ والی سرخ وردی پہن لی تھی تاکہ ہم تاریکی میں نمایاں نہ ہوں۔ سفید مائل سرمئی وردی میں دور سے نظر آتے۔ کچھ دیر اور گزری تو میں فکر مند ہو گیا۔

''ایزارٹ کو اب تک آ جانا چاہیے۔''

ایرٹ بھی پریشان تھا اس نے کہا۔''اس کے پاس شاہی مہر ہے اور فوج کے سالار کی جرأت بھی نہیں ہو گی کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف روک سکے۔''

''تب کوئی گڑبڑ ہے۔'' میں نے کہا۔''کچھ اور انتظار کرتے ہیں اس کے بعد ہم پڑاؤ کی طرف چلیں گے۔''

''ہم وہاں جا کر کیا کریں گے؟''

''یہ تو وہاں پہنچ کر ہی علم ہو گا۔'' میں نے کہا۔''ہم حالات دیکھیں گے۔ اگر ایزارٹ اور اس کے ساتھی کسی مشکل میں ہوئے تو ہم دیکھ بھال کر ان کی مدد کریں گے۔''

ایرٹ نے سر ہلایا۔''اگر وہ پکڑا جا چکا ہے تو ہم شاید ہی اس کی کوئی مدد کر سکیں۔''

میں اندازہ کر رہا تھا اور جب میرے حساب سے ایزارٹ اور اس کے ساتھیوں کو گئے ہوئے پون گھنٹا ہونے کو آیا تو میں نے ایرٹ سے کہا۔''چلو مگر ہم پڑاؤ میں ایسے جائیں گے جیسے اسی کا ایک حصہ ہوں۔ کوشش کرنا کہ نمایاں نہ ہو۔''

''میں سمجھ گیا جناب۔''

''کسی ایک کے پھنسنے کی صورت میں دوسرا الگ رہے اور پڑاؤ سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔'' میں نے آگے کی حکمت عملی واضح کی اور پڑاؤ کی طرف بڑھا۔''بہتر ہو گا کہ پڑاؤ میں داخل ہونے کے بعد ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں مگر نظروں میں رہیں۔ آگے بھی ہمیں ایک دوسرے کو نظروں میں رکھنا ہو گا۔''

ہم باری باری ایک دوسرے سے ذرا فاصلہ رکھ کر پڑاؤ میں داخل ہوئے۔ یہاں تیز روشنی تھی اور خیموں کے درمیان جگہ جگہ لکڑی کے کھمبے نصب کر کے ان پر مشعلیں لگائی گئی تھیں۔ پڑاؤ میں ضرورت سے زیادہ روشنی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آرگون کی فوج خوفزدہ تھی اور چھاپہ مار کارروائی کے خوف سے اس نے اتنی زیادہ روشنی کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ زیادہ تر سپاہی خیموں میں آرام کر رہے تھے اور اس وقت وہی باہر تھے جن کی ڈیوٹی تھی اور ان کی بھی ڈیوٹی پڑاؤ کے بیرونی حصوں پر تھی۔ اندر بہت کم سپاہی نظر آ رہے تھے۔ میں اور ایرٹ ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہوئے پڑاؤ میں گھوم رہے تھے اور ہمیں ایزارٹ اور اس کے ساتھیوں کی تلاش تھی۔ ان کی تعداد دو درجن سے زیادہ تھی اور وردیاں سرمئی تھیں اس لیے ہمیں تلاش میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔

ایک چھوٹے سے میدان میں ایزارٹ کے آدمی دائرے میں زمین پر بیٹھے تھے اور ان کے چاروں طرف مسلح تیر انداز یوں کھڑے تھے کہ ان کے کمانوں پر چڑھے تیروں کا رخ ہمارے ساتھیوں کی طرف تھا۔ یہ زیادہ ہی تشویش ناک منظر تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ایزارٹ کا راز فاش ہو گیا تھا اور وہ سب پکڑے گئے تھے۔ میں نے نزدیک جاتے ہوئے جائزہ لیا مگر مجھے ان میں ایزارٹ نظر نہیں آیا۔ ایرٹ نے بھی یہ منظر دیکھ لیا تھا اور اس نے غیر محسوس انداز میں مجھے اشارہ کیا۔ میں نے جوابی اشارے سے بتایا کہ میں بھی دیکھ چکا ہوں اور اسے ذرا پیچھے آنے کو کہا۔ ایرٹ واپس ہوا اور ہم ایک ایسے خیمے کی آڑ میں آ گئے جس میں اندر کوئی نہیں تھا۔ ایرٹ نے آتے ہی کہا۔''وہ پکڑے گئے ہیں اب ہم کیا کریں؟''

''سرخ سپاہیوں نے جس طرح انہیں گھیر رکھا ہے ان

کو چھڑانا ممکن نہیں ہے۔ ہمیں ایزارٹ کو تلاش کرنا ہوگا اگر اسے کسی الگ جگہ رکھا گیا ہے تو ہم شاید اسے چھڑا سکیں۔''

جہاں ہمارے ساتھی قیدی بن کر بیٹھے تھے اس سے ذرا آگے فوج کے افسران اور کمانڈرز کے خیمے تھے۔ اس کا اندازہ خیموں کی وسعت اور آرائش سے ہو رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر ایزارٹ کو الگ رکھا گیا تھا تو امکان یہی تھا کہ وہ ان خیموں کے آس پاس کہیں ہوگا۔ میں اور ایرٹ چکر لگا کر میدان سے بچتے ہوئے ان خیموں تک پہنچے یہاں خیموں کے باہر پہرہ بھی تھا۔ ایرٹ سامنے کی طرف سے خیموں کی قطار میں داخل ہوا اور میں عقبی سمت آیا۔ جیسے ہی میں ایک بڑے خیمے کے پاس پہنچا مجھے اندر سے ایزارٹ کی بلند آواز سنائی دی۔ ''تم لوگ شاہ معظم کے غضب کو آواز دے رہے ہو۔ شاہی نشانی کے باوجود میرے ساتھ یہ سلوک شاہ معظم کی توہین کے مترادف ہے۔''

''ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔'' دوسری آواز آئی۔ میں اس وقت خیمے کے عقبی حصے میں تھا اور یہ کوئی پہریدار نہیں تھا مگر عقب میں جلتی مشعلوں کی وجہ سے میرا سایا خیمے پر آرہا تھا اس لیے میں رکنے کے بجائے آگے بڑھا اور آس پاس دیکھا۔ اتفاق سے یہ جگہ تمام ہی خیموں کا عقبی حصہ تھی اس لیے یہاں پہریدار نہیں تھے۔ مگر میں مطمئن نہیں تھا۔ میں نے ایرٹ کو بھی اسی جگہ بلایا اور اسے پہریداری پر لگا کر خود زمین پر لیٹ کر اس خیمے تک آیا اور بس اتنا دیکھا کہ اس کی چادر پر میرا سایا نہ آئے۔ میرا کام اس سے بھی چل رہا تھا کیونکہ اندر کی آوازیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ایزارٹ کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر شک ہوا ہے اور اسے روک لیا گیا ہے۔ مگر شک کی وجہ سامنے نہیں آئی تھی۔ جب میں دوبارہ آیا تو کوئی تیسرا فرد کہہ رہا تھا۔

''میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ باغیوں میں شامل تھا۔''

''یہ غلط ہے اور اگر تمہیں شک ہے تو بے شک میرے ساتھ چلو۔ شاہ معظم کے سامنے اپنا شک رکھنا۔ وہ خود تمہیں بتائیں گے کہ میں ان کا کتنا بڑا وفادار ہوں۔ قلعے کی فصیل اور دروازے کا انتظام مجھے ایسے نہیں سونپا گیا ہے۔'' ایزارٹ نے جواب دیا مگر میرا ذہن اس تیسرے فرد کی آواز میں الجھا ہوا تھا۔ جب وہ بولا تو ایسا لگا جیسے وہ آواز بدل کر بول رہا ہے۔ اس کے باوجود مجھے اس کی آواز جانی پہچانی لگی تھی۔ ایزارٹ نے اب پہلے شخص سے کہا۔ ''تم اس شخص کے کہنے پر مجھے روک رہے ہو جس میں اتنی جرات نہیں ہے کہ اپنا چہرہ دکھا سکے۔''

''مجبوری ہے باغیوں کے خلاف یہ ہمارا سب سے اہم مہرہ ہے اور درحقیقت ہم بھی اسے صورت سے نہیں پہچانتے۔'' دوسرا فرد بولا وہ شاید آرگون کی فوج کا سالار یا اس کا کوئی نائب تھا۔ اس سے نیچے لیول کا آدمی ایزارٹ کو گرفتار کر کے تفتیش کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ ''شاہ معظم کی طرف سے اس کے بارے میں خصوصی ہدایات ہیں۔''

''تمہارے اپنے آدمی میرے بارے میں بتا چکے ہیں جن سے میں نے فصیل اور دروازے کی ذمے داری لی تھی۔'' ایزارٹ نے کہا اور تیسرے شخص سے بولا۔ ''سنو اگر میں باغیوں میں ہوتا تو لازمی کسی بڑی حیثیت کا مالک ہوتا مگر تم میرا نام تک نہیں جانتے ہو۔ شاید تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ میری صورت کسی باغی سے ملتی ہوگی۔''

''شاید یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' سالار یا نائب سالار نے ایزارٹ کی تائید کی۔ اب بات سمجھ میں آنے لگی تھی ایزارٹ کو کسی ایسے شخص نے شناخت کیا تھا جو سامیرا کے قلعوں میں آرگون کا جاسوس تھا اور وہ حریت پسندوں سے بھی واقف تھا۔ وہ یقیناً قلعے سے یہاں آیا تھا تبھی صورت چھپا رہا تھا۔ ایزارٹ نے زور دے کر کہا۔

''میں سو فیصد ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اب بھی وقت ہے مجھے واپس جانے دو میں اس بات کو بھول جاؤں گا۔ وہ بھی صرف آرگون اور شاہ معظم کی خاطر۔ اس وقت ہم بہت مشکل میں ہیں اور آپس کا اختلاف سامیرا اور اس کے ساتھیوں کے لیے ہی سودمند ہوگا اور ہم جنگ ہار بھی سکتے ہیں۔ اگر عام حالات میں کسی نے میری ایسی توہین کی ہوتی تو میں عزت کی خاطر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم باغیوں میں شامل تھے۔'' تیسرے شخص نے کہا اور میں نے بہت غور سے اس کی آواز سنی تھی مگر اس بار بھی میں صرف جانی پہچانی محسوس کر سکا۔ وہ کامیابی سے اپنی اصل آواز چھپا رہا تھا۔ ایزارٹ نے کہا۔

''تب ایک ہی صورت ہے ہم سب شاہ معظم کے

سامنے پیش ہوں اور وہ فیصلہ کریں۔ تمہیں بھی ساتھ چلنا ہوگا۔''

''میں ساتھ نہیں جا سکتا۔'' تیسرے شخص نے فوراً انکار کردیا۔'' مجھے فوری واپس جانا ہے۔ میں صرف اسی لیے آیا تھا کہ جلدی حملے کا کہہ سکوں۔ جتنی تاخیر ہوگی آرگون کی فوج کی ناکامی کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ جو شخص یہاں سے آرگون کی طرف گیا ہے تم لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو۔ وہ بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے آرگون میں کوئی بڑی تبدیلی آگئی ہے۔''

''پچھلے چند دنوں میں ہم نے آرگون میں ہزار سے زیادہ آدمیوں کو گرفتار کیا ہے ان میں باہر سے آنے والے کچھ لوگ بھی شامل ہیں۔ کئی سو افراد مزاحمت کرنے پر مارے جاچکے ہیں۔''

''ان میں شہباز بھی ہے۔'' تیسرے شخص نے پوچھا۔

''میں قیدیوں کے معاملات سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ مگر سنا ہے کہ عنقریب گرفتار کیے جانے والے تمام افراد کو سزائے موت دے دی جائے گی۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے گا۔ اس کے بعد شاہ معظم سامیرا اور اس کے ساتھیوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کریں گے۔ حملہ روکنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ ابھی آرگون میں کچھ باغی چھپے ہوئے ہیں اور ان کی تلاش جاری ہے۔ ایک بار باغیوں کا خاتمہ ہوجائے تو پھر پوری یکسوئی سے یہاں قلعوں پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔''

''مگر یہاں رسد کم رہ گئی ہے۔'' سالار یا نائب سالار نے کہا۔ ''ہمیں فوری رسد کی ضرورت ہے۔''

''میں واپس جا کر شاہ معظم سے سفارش کروں گا کہ فوج کو فوری رسد مہیا کی جائے ورنہ اس میں بددلی پھیلے گی۔''

''بددلی پھیل رہی ہے۔'' سالار یا نائب سالار نے زور دے کر کہا۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایزارٹ سے متفق ہو چکا ہے اور اس پر اب شک نہیں رہا ہے۔ مگر مسئلہ تیسرے فرد کا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' ایزارٹ نے تشویش سے کہا۔ ''مگر میں واپس جاؤں گا تو کچھ کروں گا اور اگر میں نے دیر کی تو مجھ سے جواب طلبی ہوگی کیونکہ میرے پاس شاہی نشانی ہے اور یہ میرے پاس امانت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' سالار یا نائب سالار نے جواب دیا۔

''تب کیا فیصلہ کیا ہے؟''

ایزارٹ کے ساتھ ساتھ میری سانس بھی رک گئی تھی اور میں جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ سالار یا نائب سالار نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔ امید ہے تم بات آگے نہیں بڑھاؤ گے۔''

''لیکن ......'' تیسرے فرد نے کہنا چاہا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' سالار یا نائب سالار نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''جہاں تک حملے کی بات ہے شاہ معظم کا حکم ہمارے لیے سب سے اہم ہے۔''

''جلد ہم آرگون کے باغیوں سے مکمل طور پر نمٹ لیں گے اور تب ہم بھی یہاں حملے میں شامل ہونے آئیں گے۔'' ایزارٹ نے کہا۔ ''وادی کی یہ تقسیم ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' سالار یا نائب سالار نے کہا۔

''اب میں چلوں گا۔ مجھے بہت پہلے واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔'' ایزارٹ نے کہا تو میں پیچھے سرکا اور پھر زمین سے اٹھ گیا۔ ایرٹ کچھ فاصلے پر پہرہ دے رہا تھا میں نے اس کے پاس جا کر آہستہ سے کہا۔

''مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ایزارٹ کو قلعے کی طرف سے آنے والے ایک شخص کی شناخت کے بعد روک لیا گیا تھا مگر اس نے اتنے اعتماد سے بات کی کہ اس فوج کا سالار یا نائب سالار متاثر ہو گیا اور اس نے ایزارٹ کو جانے کی اجازت دے دی ہے۔''

ایرٹ فکر مند ہو گیا۔ ''قلعے سے آنے والا فرد، مگر وہ آیا کیسے؟''

''یہ سوال اہم ہے وہ نقاب پوش ہے اور یہاں کے فوجی افسران بھی اس کی شناخت سے بے خبر ہیں۔ میرا خیال ہے وہ بھی واپس جائے گا اور ہم اسے شناخت کرنے کی کوشش کریں گے۔''

میں اور ایرٹ پڑاؤ کے اس طرف آئے جو قلعوں سے زیادہ نزدیک تھا اور ایک مناسب جگہ چھپ گئے۔ چند منٹ بعد تین افراد اس طرف آئے۔ ان میں سے ایک نے

منہ چھپایا ہوا تھا اور باقی دو لباس سے عام سپاہی لگ رہے تھے۔ کیونکہ اس کا منہ چھپا ہوا تھا اس لیے میں اس کے جسم پر غور کر رہا تھا۔ وہ چھریرے جسم کا مگر مضبوط آدمی تھا اور اس کا تعلق شاید فوج سے تھا کیونکہ اس کی چال مخصوص انداز لیے ہوئے تھی۔ ایرٹ بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور وہ ہم سے کوئی دس گز کی دوری سے گزرا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ایرٹ نے کہا۔ ''یہ مجھے بھی جانا پہچانا لگ رہا ہے مگر یاد نہیں آرہا کہ ایسا کون سا فرد میں نے دیکھا ہے۔''

میں نے تائید کی۔ ''یہ قلعوں میں یقیناً کسی اہم پوزیشن پر ہوگا اور یقیناً اس کے ساتھی بھی ہوں گے ورنہ یہ چھپ کر کسی طرح قلعے سے باہر نہیں آسکتا تھا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ایرٹ نے سر ہلایا۔ ''ہمیں واپس جانا چاہیے۔''

جب ہم اس میدان تک پہنچے جہاں ایزارٹ کے دستے کو قیدی بنایا ہوا تھا تو وہ جگہ اب خالی تھی۔ ایزارٹ اپنے آدمیوں کو لے کر جا چکا تھا۔ میں اور ایرٹ بھی ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر پڑاؤ سے باہر آئے اور عین اس وقت جب میں پڑاؤ کے آخری حصے میں تھا کسی نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ ''اے کون ہو تم اور کہاں جا رہے ہو؟''

میں زبان سے جواب نہیں دے سکتا اس لیے مڑا اور کچھ دور موجود پہریدار کی طرف دیکھ کر دانت نکالتے ہوئے پیٹ پر ہاتھ مارا۔ ساتھ ہی میں یوں جھکا ہوا تھا جیسے پیٹ میں سخت مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ پہریدار نے سر ہلایا۔ ''اچھا اچھا پیٹ خراب ہے۔ یہاں کھانے کو راشن کم ہو رہا ہے اور لوگ زیادہ کھانے لگے ہیں۔''

اس نے درست کہا جب انسان کو قلت خوراک کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ خطرہ اجتماعی ہو تو انسان ہوس میں زیادہ کھانے لگتا ہے۔ ہاں خوراک اس کے اپنے قبضے میں ہو تو وہ اسے سوچ سمجھ کر احتیاط سے استعمال کرتا ہے۔ اس کی طرف سے اعتراض ختم ہوتے ہی میں یوں تیزی سے بھاگا جیسے میرا ضبط جواب دے رہا ہو اور درختوں میں گھستے ہی میں رک گیا۔ مجھے ایرٹ کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر بعد نمودار ہوا کیونکہ وہ چکر کاٹ کر آیا تھا اور ہم تیزی سے آرگون کی طرف روانہ ہو گئے۔ نصف رات کا وقت تھا۔ شاید بارہ بج رہے تھے یا بجنے والے تھے۔ میرے ذہن میں تھا کہ شاید ہمارے پاس آج کا وقت تھا اور ہمیں صبح سے پہلے شاہی محل میں گھسنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اگر یہ موقع نکل جاتا تو پھر شاید دوبارہ موقع نہیں ملتا۔ ایک گھنٹے بعد ہم آرگون میں تھے۔ ایزارٹ اور اس کا دستہ آ گیا اور وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ایزارٹ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''تم کہاں رہ گئے تھے میں پریشان ہو گیا تھا اور خود ہم بھی پھنس گئے تھے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت وہیں ٹھہرا تھا جب تم بہت ذہانت سے اس معاملے کو نمٹا رہے تھے۔ جب تم دیر تک واپس نہیں آئے تو ہم پڑاؤ میں داخل ہوئے اور تمہارے دستے کو گرفتار دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔''

''پریشان تو میں بھی تھا۔ مگر مایوس نہیں تھا۔ میرے پاس اہم ترین چیز ریناٹ کی دی ہوئی چھڑی تھی۔ اس نے اصل میں کام دکھایا۔''

''وہ شخص کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بالکل اندازہ نہیں لگا سکا۔'' ایزارٹ نے تشویش سے کہا۔ ''یہ تو ہمارے آدمیوں کی گرفتاری سے ظاہر ہے کہ سامیرا کے قلعوں میں آرگون کے جاسوس ہیں مگر وہ اتنے بڑے پیمانے پر کام کر رہے ہیں یہ میرا خیال نہیں تھا۔''

''مجھے بھی شبہ ہے کہ وہ شخص قلعوں میں اہم پوزیشن کا مالک ہے ورنہ اس طرح وہاں سے نکل کر باہر نہیں آسکتا تھا اور وہ صرف باہر نہیں آیا بلکہ واپس بھی گیا۔ اس کا مطلب ہے اس کا گروہ وہاں مضبوط اور بڑا ہے جو اس کے یوں آنے جانے کا انتظام کر سکتا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ایزارٹ نے سر ہلایا۔ ''بہرحال ایک بحران تو ٹل گیا اور اب فوری جنگ کا خطرہ نہیں ہے۔''

''ہمیں آج رات ہی شاہی محل پر حملہ کرنا چاہیے۔''

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' ایزارٹ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی ہمارے پاس تیار افرادی قوت نہیں ہے۔ ہمارے دو سو کے قریب ساتھیوں کو سنبھلنے میں دو دن کا وقت درکار ہے اور تب ہی ہم کسی بڑی کارروائی کے قابل ہوں گے۔''

اس وقت ہمارے پاس لڑنے کے قابل صحت مند

افراد کی تعداد ساڑھے تین سو کے لگ بھگ تھی اور اتنے ہی افراد کا اسلحہ بھی تھا۔ باقی تین سو افراد کی صحت درست نہیں تھی اور نہ ہی ہمارے پاس ان کے لیے اسلحہ تھا۔ وہ خالی ہاتھ سے نہیں لڑ سکتے تھے۔ میں نے ایزارٹ سے کہا۔ ''اگر وہ صحت مند ہو جاتے ہیں تب بھی ان کے پاس ہتھیار نہیں ہوں گے۔''

''ہم اس دوران میں ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''خفیہ راستہ اتفاق سے ملا ہے اور اگر جلد کارروائی نہ کی گئی تو اندر والے مشکوک ہو جائیں گے کیونکہ جانے والا دستہ ابھی تک واپس نہیں گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ دوسرا دستہ روانہ کر دیا جائے۔''

''یہ بات میرے ذہن میں تھی اس لیے میں نے آتے ہی دو درجن سپاہیوں پر مشتمل دستہ اس طرف روانہ کر دیا ہے۔ وہ اس کی نگرانی کریں گے اور اگر وہاں سے مزید کوئی دستہ نکلا تو اسے فوج کی طرف جانے سے روکیں گے۔''

''یہ تم نے اچھا کام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اندر والے مشکوک تو ہوں گے اور پھر ممکن ہے کہ راستہ نہ کھلے۔ راستہ صرف اندر سے کھل سکتا۔''

''اور باہر سے؟''

''میرا خیال ہے کہ کوشش کی جائے تو اسے توڑا جا سکتا ہے مگر یہ کام بھی آسان نہیں ہوگا۔ اول تو پتھر کا دروازہ کوئی ایک ہاتھ موٹا ہے اور یہاں ایسا کوئی اوزار نہیں ہے جو اسے توڑ سکے اور کوشش کی جائے تو اس میں اتنا وقت لگے گا شاہی محل کا بچہ بچہ ہوشیار ہو جائے گا۔ اس کے حملے سے حیرانگی کا عنصر ختم ہو جائے گا۔''

ایزارٹ میری بات غور سے سن رہا تھا اور یقیناً اپنے ذہن میں اس کا تجزیہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ریناٹ کی خاص فوج میں اب بھی آٹھ سو کے قریب افراد موجود ہیں۔ ہمارے پاس کل ساڑھے تین سو افراد ہیں ان میں سے کم سے کم سو افراد کو یہاں چھوڑنا ہوگا۔ صرف ڈھائی سو افراد کے ساتھ یہ حملہ بہت زیادہ خطرہ مول لینے والا نہیں ہوگا؟''

''ہاں مگر ہم اچانک ہی ان کے سر پر پہنچیں گے۔ ہمارا ہدف شاہی محل اور وہاں موجود ریناٹ اور اس کا ٹولہ ہو گا۔ ساری فوج یقیناً شاہی محل میں نہیں لگی ہوگی۔ اس کا احاطہ بہت بڑا ہے اور زیادہ تر فوج شاہی محل سے باہر ہو گی۔ ہم خاص سپاہ کی وردیوں میں جائیں گے اس لیے وہاں موجود پہریدار بدحواس ہوں گے۔ ان کے لیے دوست دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے ہم صبح کے قریب حملہ کریں گے جب ابھی تاریکی ہوگی اور اس کا فائدہ اٹھا کر ہم ان پر قابو پالیں گے تب تک روشنی ہو جائے گی۔''

''شناخت کا مسئلہ تو ہمارے آدمیوں کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔''

''نہیں ہم اس کے لیے مخصوص نشانی رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے آدمی ایک دوسرے کو شکلوں سے بھی پہچانتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں تھوڑی بہت غلط فہمی ہو جائے مگر وہ ریناٹ کے آدمیوں کی طرح بدحواس نہیں ہوں گے۔ ان کے لیے سب سے خوفناک بات اندر سے حملہ ہوگا۔''

''شہباز ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ربیک نے کہا۔ ''اگر ہم نے دیر کی تو ریناٹ ہوشیار ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ سرے سے یہ راستہ ہی بند کر دیں۔''

ایزارٹ کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ متفق نہیں ہے۔ وہ فوری حملے کے حق میں نہیں تھا اور یہ تقریباً وہی صورت حال تھی جو آرگیو نے پیدا کی تھی۔ اب ایزارٹ بھی وہی کام کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اختیار آیا تو وہ اپنی سوچ کے مطابق فیصلے کرنے لگا تھا۔ مگر بہر حال وہ آرگیو سے مختلف آدمی تھا اور میں پُر امید تھا کہ اس سے اپنی بات منوا لوں گا۔ اس لیے میں نے کچھ دیر بعد اس سے کہا۔ ایزارٹ میرے ساتھ آؤ، ہم باہر چل کر تنہائی میں بات کرتے ہیں۔

اس بار اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور میرے ساتھ فصیل کے ساتھ والے میدان میں آیا۔ یہاں چند ایک سپاہی کھلی جگہوں پر پہرہ دے رہے تھے مگر زیادہ تر سپاہ چھپی ہوئی تھی اور ایسی جگہوں پر تھی جہاں سے وہ آس پاس نظر رکھ سکتی تھی مگر کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم ایک ایسی جگہ آئے جہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ ترجمان کے طور پر ربیک ساتھ تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے قائل کرنے کے لیے باہر لایا ہوں۔ میں نے کہنا شروع کیا۔ ''تم جانتے ہو میرا اس وادی سے تعلق نہیں ہے اور نہ ہی مجھے ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔ جب میرا کام مکمل ہو جائے گا تو میں یہاں سے

چلا جاؤں گا۔ میرے کہنے کا مقصد ہے کہ یہاں سے میرا کوئی مفاد نہیں ہے اور نہ ہی مجھے یہاں کا حکمران بننا ہے۔ اس لیے میں جو کر رہا ہوں پورے خلوص سے اور بنا کسی غرض کے کر رہا ہوں۔"

"اس کا تو ہم سب اعتراف کرتے ہیں کہ تم جو کر رہے ہو بنا کسی لالچ کے کر رہے ہو۔"

"اب آتے ہیں اس طرف کہ سامیرا اور برف والے نے مجھے اس ساری جدوجہد کا سربراہ مقرر کیا۔ کیا تمہیں اس پر شک ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"تیسری بات یہ ہے کہ میں جو حکمتِ عملی بناتا ہوں وہ ٹھیک یا غلط ہو سکتی ہے لیکن اب تک کی ساری حکمتِ عملی میری ترتیب دی ہوئی ہے۔ اس پر شروع سے عمل ہو رہا ہے گویا تحریکِ مزاحمت کے تمام گوشوں سے اگر کوئی شخص سب سے زیادہ آگاہ ہو سکتا ہے تو وہ میں ہوں کیونکہ میری ہر چیز پر نظر ہے۔ کیا تم اس سے اختلاف کرو گے؟"

"نہیں۔"

"اگر میں چاہوں تو تحریکِ مزاحمت کے سربراہ کی حیثیت سے تمہیں حکم دے سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں تم دل و جان سے میری بات مانو اور اس پر عمل کرو۔ اب میں تمہارے سامنے ایک مجموعی صورتِ حال رکھ رہا ہوں۔ اسے ذہن میں رکھو اور پھر فیصلہ کرو۔ ایک طرف سامیرا کے قلعوں کو آرگون کی فوج نے محاصرے میں لے رکھا ہے۔ سامیرا کے آدمیوں کی تربیت میں نے کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ کھلی جنگ میں آرگون کی سپاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہاں وہ دفاع کر سکتے ہیں۔ اس جنگ میں سامیرا کا دوسرا بازو تم آرگون کے حریت پسند ہو۔ مگر تم میں سے بھی اکثر افراد تربیت یافتہ سپاہی نہیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کھلی جنگ میں آرگون کی سپاہ یا ریناٹ کی خاص فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔"

"لیکن ان ہی لوگوں نے خاص فوج کے کئی دستوں کو شکست دی ہے اور انہیں کو ختم کیا ہے یا ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا ہے۔"

"بالکل مگر وہ کھلی جنگ نہیں تھی انہیں خاص انداز میں شکست دی گئی جب وہ جنگ کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب میں جو کہوں گا وہ شاید تمہیں برا لگے۔ اگر یہی لوگ ریناٹ کی سپاہ کو شکست دے سکتے تھے تو یہ کام انہوں نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ جب ریناٹ کی سپاہ پوری تیاری سے اچانک آئی تو سارے حریت پسند گرفتار ہو گئے کچھ مقابلے میں مارے گئے دوسرے لفظوں میں تم لوگوں نے شکست کھائی۔ پہلے اور اب میں کیا فرق ہے جو پہلے شکست اور اب تمہیں فتح ہو رہی ہے؟"

ایزارٹ کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئی تھیں اور یہ شکنیں ناگواری کی نہیں تھیں۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ میری بات کا تجزیہ کر رہا ہے۔ میں نے کچھ وقفے کے ساتھ بات جاری رکھی۔ "اب صورتِ حال کو یوں دیکھو کہ ایک طرف ریناٹ شاہی محل میں محصور ہو گیا ہے اور عملاً شہر ہمارے قبضے میں ہے۔ مگر وہ کمزور نہیں ہے اس کے پاس لڑنے کے قابل آٹھ سو سے اوپر افرادی قوت اب بھی موجود ہے۔ پھر میں تمہیں ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ جو اکیلے ہی ساری فوج پر بھاری ہیں۔ ان لوگوں سے کھلی جنگ ممکن ہی نہیں ہے۔ دوسری طرف آرگون کی فوج کو ہم نے واپس آنے سے روک دیا ہے۔ یعنی ریناٹ کی ایک چال ناکام بنا دی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ریناٹ اور فوج کا رابطہ کاٹنے میں کامیاب رہے ہیں۔ صرف خفیہ راستہ ہی نہیں ہے وہ اپنے آدمیوں کو فصیل کے عقبی حصے سے اتار کر فوج کے پاس بھیج سکتا ہے اور ایک بار آرگون کی فوج واپس آ گئی۔ تو کیا ہم اس قابل ہیں کہ اس سے لڑ سکیں یا اسے شہر میں داخلے سے روک سکیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اس کا جواب نفی میں ہے۔"

"اب میں کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔" ایزارٹ نے پہلی بار مثبت اشارہ کیا۔

"ریناٹ اس خیال میں ہے کہ اس کا روانہ کیا ہوا دستہ فوج تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن جب صبح تک وہ دستہ واپس نہیں جائے گا اور نہ ہی فوج کی واپسی کے آثار نظر آئیں گے تو کیا ریناٹ اس کے بعد خاموش بیٹھے گا۔ اگر تم اس کی جگہ ہوتے تو اس صورت میں کیا کرتے۔"

"فوری دوسرا دستہ روانہ کرتا اور اس بات کو یقینی بناتا کہ فوج تک میرا پیغام پہنچ جائے۔"

"تب یقین رکھو اگر ہم نے آج ہی رات شاہی محل پر حملہ نہیں کیا تو کل صبح کا دن ہمارے لیے ناکامی لے کر طلوع

ہوگا۔زیادہ سے زیادہ شام تک آرگون کی فوج واپس آنا شروع ہو جائے گی اور اندر سے ریناٹ کی خاص سپاہ حملہ آور ہو گی ۔ ہم دو طرف سے پس کر رہ جائیں گے۔ اس وقت اگر ہمارے سارے ساتھی بھی لڑنے کے قابل ہو گئے تب بھی وہ اتنی بڑی فوج کا کسی صورت مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔''

ایزارٹ نے فوری جواب نہیں دیا اس نے کچھ دیر بعد کہا۔''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔میں شاید غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں ساری صورتِ حال کو سمجھ رہا ہوں، تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ واقعی ہمارے پاس وقت نہیں رہا ہے۔''

''تم ایک بہترین کمانڈر ہو۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔''اچھا کمانڈر وہی ہوتا ہے جو تیزی سے اپنی غلطی پکڑ لے اور پھر اس کا مداوا کرے۔''

''ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' ایزارٹ اب بے تاب تھا۔''ہمیں جلد از جلد روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''ابھی ہمارے پاس صبح تک کا وقت ہے۔'' میں نے کہا۔''میں چاہتا ہوں کہ جب ہم شاہی محل میں گھسیں تو صبح کا پہلا پہر ہو اور ہم پہریداروں کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر ان پر قابو پالیں اور جب حالات ہمارے قابو میں ہوں تو دن کی روشنی نمودار ہو چکی ہو تاکہ ریناٹ اور اس کے ساتھی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر فرار کے قابل نہ ہوں۔''

''اس کے باوجود ہمیں اپنے آدمیوں کو ذہنی طور پر اس بڑی جنگ کے لیے تیار کرنا ہوگا۔'' ایزارٹ نے کہا۔

''سب سے پہلے تم دیکھو کہ کتنے آدمی ساتھ چلنے کے قابل ہیں۔''

ایزارٹ نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو بلایا اور انہیں معمور کر دیا کہ وہ جنگ کے قابل تمام افراد کو لے کر میدان میں آجائیں۔ ایزارٹ کو اس کام پر چھوڑ کر میں ربیک اور ایرٹ کے اس فوجی بیرک میں آیا جس میں عورتیں اور بچے تھے۔ ہمارے جانے کے بعد ریناٹ کی طرف سے فوجی کارروائی کی صورت میں وہ قطعی غیر محفوظ تھے۔ میں نے ایرٹ سے کہا۔''ان عورتوں اور بچوں کو عام آبادی میں منتقل کرنا ہوگا اور یہ کام ابھی کرنا ہے۔''

ایرٹ اور ربیک نے ان حریت پسندوں سے بات کی جو فی الحال جنگ کے قابل نہیں تھے۔ ان کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی۔ ان میں سے بعض تو ایسے زخمی تھے کہ خود دوسروں کے محتاج تھے۔ کیونکہ عورتوں اور بچوں میں سے تقریباً سارے ہی حریت پسندوں سے تعلق رکھتے تھے اور صرف وہی مرد نہیں تھے جو مارے جا چکے تھے۔ سب سے کہا گیا کہ وہ اپنے رشتے داروں کو الگ کر لیں۔ ایسا کرنے کے بعد بھی بچ جانے والی عورتوں اور بچوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی۔ ایرٹ نے انہیں بھی دوسرے خاندانوں میں بانٹ دیا اور ان سے کہا کہ وہ خاموشی سے اپنے گھروں کو یا جہاں وہ پناہ لے سکتے ہیں وہاں چلے جائیں۔ یہاں جنگ ہونے والی تھی جس کی وجہ سے یہ جگہ محفوظ نہیں تھی۔ وہ بے سروسامانی میں تھے اس لیے روانگی کے لیے چند منٹ میں تیار ہو گئے۔ چھ سے دس افراد کی ٹولیوں میں یہ افراد بیرک سے نکل کر میدان کے تاریک حصوں سے گزرتے ہوئے عام آبادی کی طرف جانے لگے۔ وہ آبادی میں پھیل جاتے اور اگر ریناٹ کی سپاہ اس بات سے واقف بھی ہو جاتی ۔ تب بھی وہ اتنا بڑا آپریشن کرنے کے قابل نہیں تھی۔ بیرک کے مقابلے میں وہ عام آبادی میں زیادہ محفوظ ہوتے۔

حریت پسندوں میں سو افراد ایسے تھے جن کی حالت بہتر ہوئی تھی مگر ان کی صحت بہتر نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ جنگ نہیں لڑ سکتے تھے۔ ان کے لیے میرے ذہن میں ایک پلان تھا۔ میں نے انہیں روک کر ان سے تیر اندازی کے بارے میں سوال کیا تو تقریباً سب ہی تیر چلانا جانتے تھے۔ ہم نے انہیں باقاعدہ معائنہ اور کسی قدر جسمانی فٹنس کے ٹیسٹ کے ساتھ منتخب کیا تھا کیونکہ لڑنے کے نام پر وہ بھی تیار ہو گئے تھے جو اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے ان میں سے قابل افراد کو چننا پڑا تھا اور باقی کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ جانے کا حکم دیا تھا۔ جب وہ سب عام آبادی کی طرف چلے گئے تو میں واپس آیا اور ایزارٹ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ وہ خوش ہو گیا۔''یہ تم نے بالکل ٹھیک کیا، میرے ذہن میں بھی ان کا خیال تھا کہ ہمارے جانے کے بعد یہ بالکل غیر محفوظ ہو جائیں گے۔''

''میں نے سب کو نہیں بھیجا ہے۔'' میں نے روک لیے جانے والوں کے بارے میں اپنا پلان بتایا۔''انہیں تیر کمان دے کر فصیل پر تعینات کر دیا جائے تاکہ یہ اندر اور باہر سے کسی کو گیٹ کے پاس نہ آنے دیں۔ یہ وہ کام ہے جو یہ کر سکتے ہیں، ہمارے لیے سب سے اہم فصیل اور گیٹ پر

قبضہ ہے۔ یہ ہر صورت برقرار رہنا چاہیے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' ایزارٹ نے کہا اور اس کے حکم پر ان افراد کو فصیل پر منتقل کیا جانے لگا۔ وہ وہاں لگی بھاری تیر پھینکنے والی مشینیں بھی استعمال کر سکتے تھے۔ قلعے میں آگ لگانے والے روغن کا ذخیرہ تھا۔ ایرٹ اور ربیک انہیں آتشیں تیروں کا استعمال سکھانے لگے۔ اس دوران میں میدان میں لڑنے کے قابل تمام سپاہی جمع ہو چکے تھے۔ وہ باقاعدہ قطار بنا کر کھڑے تھے اور ان کے کمانڈروں نے انہیں پچیس پچیس افراد کے دستوں میں بانٹ دیا تھا۔ ہر دستے میں دس تیر انداز، دس نیزہ بردار اور پانچ لاٹھی بردار تھے جو بھاری ڈھالوں سے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کرتے کیونکہ تیر انداز اور نیزہ بردار یہ بھاری ڈھالیں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس ہلکی ڈھالیں تھیں۔ میں نے گنا تو دستوں کی کل تعداد تیرہ نکلی تھی۔ یعنی تین سو پچیس افراد تھے۔

میں اور میرے ساتھی الگ تھے جب کہ ایزارٹ اور اس کے قریبی ساتھی الگ تھے اور ہماری کل تعداد بھی پچیس کے لگ بھگ تھی یعنی ساڑھے تین سو افراد تھے جو اس حملے میں شامل ہوتے۔ اس کے علاوہ دو درجن افراد وہ تھے جو ایزارٹ نے خفیہ راستے کی نگرانی کے لیے بھیجے تھے۔ مگر ان کا اس حملے میں حصہ لینا شاید ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے سب کا معائنہ کیا اور مجھے دستوں کی یہ تقسیم پسند آئی۔ ایزارٹ ایک کسی قدر بلند جگہ کھڑا ہوا ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اتفاق سے ہمارے پاس ایک بھی فرد ایسا نہیں تھا جو شاہی محل کی اندرونی ساخت سے واقف ہو۔ اس لیے طے ہوا تھا کہ اندر گھسنے کے بعد غیر مسلح خدام اور خاص طور سے عورتوں کو قابو کیا جائے گا کیونکہ وہ محل کے تمام حصوں سے اچھی طرح واقف ہوں گی اور ان کی مدد سے ہم ریناٹ کے خاص حصے تک پہنچیں گے۔ میں نے ایزارٹ سے کہا۔ ''تم تقریر کا فن جانتے ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''لیکن آج تمہیں تقریر کرنی ہے، اپنے آدمیوں کو اس حملے کے مقاصد اور کامیابی اور ناکامی کی صورت میں اس کے نتائج سے آگاہ کرنا ہے اور ان کو اکسانا ہے کہ وہ ہر صورت آج کی مہم کو کامیاب بنائیں، چاہے اس کے لیے سب کو اپنی جان دینی پڑے۔''

ایزارٹ ہچکچایا۔ ''کیا میں ایسا کر سکوں گا؟''

میں مسکرایا۔ ''تم نے جب دشمنوں کو اتنے اچھے انداز میں قائل کیا ہے۔ یہ تو پھر بھی تمہارے ساتھی اور جانثار ہیں۔ یہ کیوں نہیں قائل ہوں گے؟''

ایزارٹ نے سر ہلایا اور دوبارہ بلند جگہ چڑھا۔ اس نے ہاتھ بلند کیا تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میرے ساتھیو اور میرے دوستو میں جانے سے پہلے تم لوگوں سے آخری بات کرنا چاہتا ہوں ہو سکتا ہے آج کے بعد مجھے یہ موقع نہ ملے۔ میرے ساتھیو آج ہم اس وادی کی قسمت کا فیصلہ کرنے جا رہے ہیں۔ کل کا دن یا تو ہمیں آزاد دیکھے گا یا ہماری قوم ہمیشہ کے لیے غلامی کی بندشوں میں جکڑ دی جائے گی اور ہم یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں ہوں۔ ہماری عورتیں اور ہمارے بچے ریناٹ اور اس کے ٹولے کے غلام بن جائیں گے۔ وہ ان کی زندگی اور موت کے فیصلے کیا کریں گے۔ وہ ان سے ایسے کھیلیں گے جیسے بچے مٹی کے کھلونوں سے کھیلتے ہیں اور جب کھیلتے کھیلتے دل بھر جاتا ہے تو انہیں توڑ دیتے ہیں۔ یا پھر کل کا دن ریناٹ اور اس کے ٹولے کا آخری دن ہوگا۔ وہ صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے اور وادی کے لوگ ہمیشہ کے لیے غلامی سے آزاد ہو جائیں گے۔''

مشعلوں کی تیز روشنی میں حریت پسندوں کے چہرے چمک رہے تھے۔ مجھے کسی آنکھ میں خوف نظر نہیں آیا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر اس تحریک میں شامل ہوئے تھے اور اپنی آنے والی نسلوں کی آزادی کے لیے اپنا حال قربان کرنے کو تیار تھے۔ ایزارٹ خاموش ہو کر ان کا جائزہ لے رہا تھا اس نے اچانک گرج کر کہا۔ ''یاد رکھو ہمیں ناکام واپس نہیں آنا ہے۔ ریناٹ کو کامیابی اسی وقت ملے گی جب ہم میں سے ہر فرد اپنے لہو میں سرخ ہو چکا ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' سب نے ہاتھ بلند کر کے ایک آواز ہو کر کہا تو ان کے لہجوں کی گرج سے میدان دہل گیا تھا اور میرے دل نے کہا کہ وہ ناکام واپس نہیں آئیں گے۔ جب کوئی قوم اپنے مقصد کے لیے جان دینا سیکھ لیتی ہے تو کامیابی خود اس کے آگے ڈھیر ہو جاتی ہے۔ ایزارٹ نے میری طرف دیکھا۔

''میں شہباز کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے تم جیسے جیالوں کی سربراہی کے قابل سمجھا اور میں وعدہ کرتا ہوں

کہیں بھی تم لوگوں سے پیچھے نہیں رہوں گا تم ہر جگہ مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔''

سپاہی اپنے ہتھیار ہلا کر جوش و جذبے کا اظہار کرنے لگے۔ ایزارٹ نیچے آیا تو میں نے کہا۔ ''ہمیں اب روانہ ہونا ہے۔''

''فصیل سے؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں ہم باہر نکل کر فصیل کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے جائیں گے کیونکہ شاہی محل کی طرف نگرانی کے میناروں سے ہماری حرکت دیکھی جا سکتی ہے اس لیے فصیل سے جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

''اگر باہر آرگون کی فوج کا کوئی دستہ مل گیا تو؟''

''اس سے نمٹا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے اس طرف تاریکی ہے اور اُمید ہے کہ کوئی ہمیں دیکھ نہیں پائے گا۔''

بڑا گیٹ کھولنے کے بجائے چھوٹا گیٹ کھولا گیا اور باہر کی سمت لگی ہوئی تیز روشنی والی مشعلیں وہاں سے ہٹالی گئیں اور ہلکی روشنی والی مشعلوں کو رہنے دیا۔ اب ماحول نیم تاریک تھا اور اسی نیم تاریکی میں سپاہی ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے اور فصیل کے ساتھ چلنے لگے۔ پہلے دستے کے ساتھ ایرٹ تھا جو اس جگہ سے واقف تھا اگرچہ وہاں پہلے ہی ایک دستہ نگرانی کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ایرٹ کو آگے رکھا۔ سپاہیوں کو بھی وقت کی کمی اور موقع کی نزاکت کا احساس تھا اس لیے وہ جلدی کر رہے تھے۔ مشکل سے بیس منٹ میں تمام سپاہی باہر نکل گئے۔ آخری دستے کے ساتھ میں اور ایزارٹ بھی تھے۔ میں نے ایزارٹ کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ وہ پیچھے رہ جائے تاکہ فصیل اور گیٹ کا بہترین دفاع کیا جا سکے مگر اس نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ اس کا کہنا تھا کہ سردار ہی پیچھے رہ جائے تو فوج کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔ اس لیے وہ بہر صورت ساتھ جائے گا۔

ہم پھیلنے کے بجائے فصیل سے لگ کر چل رہے تھے تاکہ دور سے نمایاں نہ ہوں۔ ہمارے باہر آتے ہی دروازہ اندر سے بند ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی رگوں میں سنسنی کا احساس ہوا۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جس کے لیے میں نیچے وادی میں بھیجا گیا تھا یعنی ریناٹ اور اس کے ٹولے کا خاتمہ کرنا۔ ہم ہلکے دوڑنے کے انداز میں چل رہے تھے اور کیونکہ قطار میں تھے اس لیے خود بہ خود رفتار بن گئی تھی۔ کوئی تیز ہوتا تو آگے والے کے قریب ہو جاتا اور وہ رفتار سست کر لیتا اور کوئی سست ہوتا تو پیچھے والا اس کے نزدیک آ جاتا اس لیے اسے رفتار تیز کرنا پڑتی تھی۔ جب ہم پہلے گئے تھے تو یہ فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہوا تھا مگر اس بار ہم پون گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ جو دستہ پہنچ رہا تھا وہ باغات میں جمع ہوتا جا رہا تھا۔ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا اور دوسرا حکم یہ تھا کہ بالکل خاموش رہیں چلنے پھرنے میں بھی آہٹ کا خیال رکھیں۔ ممکن ہے خفیہ راستے کے اندر آس پاس کی جاسوسی کا کوئی نظام ہو۔

جب ہم روانہ ہوئے تو ہمارے ساتھ ایک فرد ایسا بھی تھا جو ہمارا ساتھی نہیں بلکہ قیدی تھا اور یہ فصیل سے باہر آنے والے دستے کا سربراہ تھا۔ اس کا نام ریٹرو تھا اور میں اسے اس مقصد سے ساتھ لے کر آیا تھا کہ وہی فصیل میں موجود خفیہ دروازہ کھلواتا۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کی زندگی کا انحصار ہم سے تعاون کرنے پر ہے۔ اگرچہ ریٹرو نے یقین دلایا تھا کہ اب وہ ہمارے ساتھ ہے مگر میں نے اس پر اعتبار نہیں کیا تھا اس کے دونوں ہاتھ آگے کی طرف رسی سے بندھے تھے اور یہ رسی ایک سپاہی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ بندوبست اسے فرار سے روکنے کے لیے کیا گیا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو میں، ایزارٹ، ایرٹ اور ریبک ایک جگہ جمع ہوئے۔ ہمیں اندر گھسنے کے لیے حکمت عملی تیار کرنی تھی۔ اگرچہ منصوبہ پہلے سے تیار تھا مگر اس کی نوک پلک درست کرنی تھی۔

ریٹرو کے ساتھ میں اور دس دوسرے افراد اندر جاتے۔ آگے ریٹرو ہوتا اس لیے اندر موجود پہریدار فوری شک نہیں کرتے اور جب تک وہ شک کرتے ہم ان پر قابو پا چکے ہوتے۔ میں نے ریٹرو سے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق اندر موجود پہریداروں کی تعداد ایک وقت میں چھ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سرنگ تین میل طویل تھی اور اس میں ہر دس قدم کے بعد ایک مشعل جلتی تھی جو سرنگ کو مکمل روشن رکھتی تھی۔ یہاں ہوا کی آمد و رفت کا ایسا نظام تھا کہ سرنگ میں دم گھٹنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ سرنگ میں تین جگہوں پر چیک پوائنٹ تھے جہاں دو دو سپاہی تعینات ہوتے تھے اور جہاں سرنگ نکلتی تھی وہاں ایک درجن مسلح سپاہی ہمہ وقت پہرے پر رہتے تھے۔ میں حیران ہوا تھا کہ اگر یہ سرنگ خفیہ تھی تو اس پر اتنے آدمی

لگانے کی کیا تک تھی؟ اس صورت میں راز افشا ہونے کا احتمال بہت زیادہ تھا۔ مگر ریٹرو وجہ سے بے خبر تھا۔ میں نے کہا۔

''سب سے پہلے ہمیں ان چھ پہریداروں پر قابو پانا ہے اور کوشش کرنی ہے کہ وہ زیادہ شور نہ کر سکیں ورنہ آگے پہرے پر موجود سپاہی ہوشیار ہو سکتے ہیں۔''

''اس صورت میں جملہ قتل کرنے کے لیے ہوگا۔'' ربیک بولا۔

''بالکل، یہ رازداری کی قیمت ہے جو دشمن کے سپاہی ادا کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں بہر صورت آخر تک رازداری سے جانا ہے اور ہماری آمد کا اس وقت پتا چلے جب ہم شاہی محل میں داخل ہوں۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' ربیک نے عزم سے کہا۔

میرا اندازہ تھا کہ صبح کے پانچ بج رہے تھے اور یہاں دو گھنٹے بعد روشنی ہو جاتی۔ ہم سب خاص سپاہ کی سرمئی وردی میں تھے۔ ریٹرو کو طلب کیا گیا اور میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں خفیہ راستہ کھلوانا ہے اور آگے بھی تم ہو گے۔ مگر یاد رکھنا کسی قسم کی بے وقوفی کی صورت میں سب سے پہلے مارے جانے والے بھی تم ہی ہو گے۔''

''میں پورا تعاون کروں گا۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''اسی میں تمہاری عافیت ہے۔'' میں اسے اس پتھر تک لایا جسے ہٹا کر اندر موجود پہریداروں تک خفیہ راستہ کھولنے کا پیغام بھیجا جا سکتا تھا۔ ریٹرو کے ہاتھ کھول دیئے تھے مگر ربیک نے تیر کمان پر چڑھا کر اس کا رخ ریٹرو کی طرف کر دیا تھا۔ اگر وہ ایک غلط جملہ ادا کرتا تو اسے دوسرا جملہ ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ریٹرو نے جھک کر خلا میں منہ کر کے کہا۔ ''دروازہ کھولو میں کمانڈر ریٹرو ہوں۔''

وہ پیچھے ہٹا تو ہم نے پتھر واپس اپنی جگہ رکھ دیا اور سب مستعد ہو گئے۔ چند لمحے بعد گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور فصیل میں نصب پتھر کا دروازہ کھلنے لگا۔ ابھی تک سب سے آگے ریٹرو تھا اور ہم نے اسے نیزہ دے دیا تھا۔ باقی سب اس کے پیچھے تھے۔ مگر پتھر بس اتنا سرکا کہ اس میں سے ایک سپاہی اندر جا سکتا تھا اور میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے میں جاؤں۔ میں نے ریٹرو کو پیچھے کیا اور سر جھکا کر اندر داخل ہوا۔ ریٹرو اور اس کے دستے کو یہاں سے نکلے چھ سات

گھنٹے ہوئے تھے اور امکان یہی تھا کہ دروازے پر بھی سپاہی تعینات ہوں گے جو ان کے نکلتے وقت تھے۔ اس صورت میں امکان تھا کہ وہ اجنبی چہرہ دیکھ کر چونک جائیں۔ میرے پیچھے ربیک تھا اور اس کے پیچھے ایرٹ، ریٹر دیوں کھڑا ہوا تھا جیسے وہ اپنے سب آدمیوں کے بعد سب سے آخر میں اندر آئے گا۔

میں نے چہرہ نیچے رکھا۔ اندر مختصری جگہ تھی جس میں دو سپاہی کھڑے تھے اور انہوں نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ باقی چار سپاہی اندر کسی قدر کشادہ جگہ تھے۔ میں نے ایک ہاتھ میں نیزہ رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ کمر کے پٹکے میں اڑسے سنگی چاقو کے پاس تھا۔ میں ست روی سے کشادہ جگہ کی طرف بڑھا اور جب تک میں ان چار سپاہیوں تک پہنچا۔ ہمارے چھ ساتھی اندر آچکے تھے۔ اب تک کسی نے شک نہیں کیا تھا مگر جیسے ہی میں کشادہ جگہ داخل ہوا۔ وہاں موجود ایک سپاہی چونکا اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کون ہو تم ......تم جانے والوں میں شامل نہیں تھے۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا جو اس کے سر سے گزر گیا مگر اس کے بعد میں نے لفظ ''حملہ'' کہا جو ربیک اور ایرٹ سمجھ گئے تھے۔ حملے کا آغاز بھی میں نے کیا اور سوال کرنے والے سپاہی کے حلق میں نیزہ اتار دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا بایاں ہاتھ سنگی چاقو نکالتے ہوئے حرکت میں آیا اور برابر میں موجود سپاہی کے پیٹ میں اتر گیا۔ یہ وار نرم جگہ تھا مگر بایاں ہاتھ ہونے کی وجہ سے پُرقوت نہیں تھا۔ چاقو دو انچ اس کے پیٹ میں اترا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا تھا۔ باقی دو کی مجھے فکر نہیں تھی کہ انہیں ربیک اور ایرٹ نے سنبھال لیا تھا۔ دوسرے سپاہی کے لیے بھی میں نے نیزہ استعمال کیا اور اس بار دل کو نشانہ بنایا۔ وہ فوری موت سے ہمکنار ہوا تھا۔ البتہ پہلا والا فرش پر ایڑیاں رگڑتے ہوئے دم توڑ رہا تھا۔

میں واپس سرنگ کے دہانے کی طرف لپکا جہاں باقی دو سپاہی آنے والوں سے نبرد آزما تھے۔ یہاں جگہ تنگ تھی اور دونوں فریقوں کے لیے مشکل ہو رہی تھی ان کی یہ مشکل میں نے آسان کی اور ایک کی کمر میں نیزہ گھونپا۔ وہ کراہ کر گرا تھا کہ آخری بچ جانے والے سپاہی نے لڑنا چھوڑ کر اپنے لباس سے ایک چھوٹی سی چیز نکالی اور اسے منہ کی طرف لے گیا۔ میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا اور میں نے زمین پر بیٹھتے ہوئے لات گھمائی میرا نشانہ عقب سے اس کے گھٹنے تھے۔ ضرب سے اس کے دونوں پاؤں مڑے اور توازن بگڑا تو وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ جو چیز وہ منہ میں لے رہا تھا وہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میں نے چیز اٹھالی اور دو عدد نیزے آکر اس کے سینے پر ٹکے تو وہ ساکت ہو گیا۔ میں نے اس چیز کا معائنہ کیا جس کی صورت سیٹی جیسی تھی اور یہ سیٹی ہی تھی جو خطرے کے موقع پر بجائی جاتی ہے۔ ایک منٹ کی مختصر جنگ میں تین سپاہی جان کی بازی ہار گئے تھے۔ دو شدید زخمی اور کچھ دیر کے مہمان تھے اور ایک زندہ ہاتھ آیا تھا۔ ربیک کو اس سے پوچھ گچھ پر لگا کر میں باہر آیا اور درختوں میں موجود ایز ارٹ کو کامیابی کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ حرکت میں آ گیا اور لپک کر میرے پاس آیا۔ ''کیا رہا؟''

''کامیابی۔'' میں نے مختصراً کہا اور ایز ارٹ کے ساتھ اندر آیا تو ربیک زندہ سپاہی سے پوچھ گچھ کر رہا تھا اور وہ فرفر تمام سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ میں نے ربیک سے کہا۔ ''اس سے پوچھو آگے کوئی خفیہ پھندا تو نہیں ہے جو ناواقف لوگوں کے لیے لگایا گیا ہو۔''

ربیک نے اس سے سوال کیا تو اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ بتایا کہ آگے دو پھندے تھے اور فرش کے ایک مخصوص حصے پر پاؤں رکھتے ہی آگے پیچھے کا خاصا بڑا فرش نیچے موجود خلا میں گر جائے گا۔ اس حصے میں جو بھی ہوتا وہ بھی نیچے گر جاتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ایک زندہ فرد ہاتھ آیا اور اس نے خطرے سے پیشگی باخبر کر دیا۔ عام طور سے اس قسم کے خفیہ راستوں میں ٹریپ لگائے جاتے ہیں تاکہ ناپسندیدہ لوگ جو کسی طرح اندر گھس آئیں وہ ان کا شکار ہو جائیں۔ ربیک نے اس سے خفیہ راستہ کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ بھی جان لیا تھا ویسے یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ فرش پر آٹا پیسنے والی چکی کی طرح پاٹ لگا ہوا تھا اور اس کی مٹھ پکڑ کر اسے چکی کی طرح گھمایا جاتا تو خفیہ دروازہ کھل جاتا تھا۔ اینٹی کلاک وائز گھمانے پر دروازہ کھلتا تھا اور کلاک وائز گھمانے پر بند ہو جاتا تھا۔ اندر زیادہ جگہ نہیں تھی اس لیے فی الحال دو دستے ہی اندر آئے تھے۔ ان کے آنے سے یہ جگہ بھر گئی تھی۔ باہر پہلے سے موجود دستے کے بارے میں فیصلہ کیا تھا کہ اسے خفیہ راستے کے پاس ہی رکھا جائے گا۔ ایک درجن سپاہی باہر ہوں اور ایک درجن اندر ہوں

گے۔
اندر موجود سپاہیوں کی وردی کسی قدر مختلف تھی اس لیے ہم اسے اپنے دستے کا سپاہی ظاہر نہیں کر سکتے تھے اور پھر یہاں پہرہ دینے والے سپاہی ایک دوسرے کے صورت آشنا ہوتے تھے۔ اس لیے اسے کسی ترکیب سے ہی اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ جب ایزارٹ کو پھندوں کے بارے میں پتا چلا تو اس نے کہا۔ ''اتنے لوگوں کو بتانا مشکل ہے اور اگر ایک آدمی کا پاؤں بھی غلط جگہ پڑ گیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

''اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے تمہارے ذہن میں کوئی ترکیب ہے؟'' میں نے پوچھا تو ایزارٹ نے سر ہلایا۔

''تمام سپاہی اسی طرح قطار میں چلیں گے جیسے ہم فصیل کے ساتھ آئے تھے۔ ہر سپاہی اپنے پیچھے آنے والے کو خبردار کرے گا۔''

''مگر ہمیں راستے میں دو جگہ اور سپاہیوں سے واسطہ پڑے گا اور ان کے پاس یہ چیز ہے۔'' میں نے اسے سیٹی دکھائی۔ ''میرا خیال ہے یہ بہت تیز آواز والی سیٹی ہے۔ اسے خطرے کا سگنل دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔''

''قیدی نے یہی بتایا ہے۔'' ربیک بولا۔ ''اگر یہ سیٹی یہاں بجائی جائے تو سرنگ کے آخری سرے تک اس کی آواز جائے گی۔''

''اس لیے ہمیں راستے میں آنے والے تمام نگرانوں پر اسی طرح قابو پانا ہوگا۔ ہمارا خاموشی سے سرنگ کے آخری حصے تک پہنچنا لازمی ہے۔''

ایزارٹ غور کر رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تب پھندوں سے کیسے بچا جائے۔''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہم آگے ہوں گے اور پھندوں والی جگہ یا تو نشان لگا دیں گے یا پھر ایک آدمی چھوڑ دیں گے وہ آنے والوں کو خبردار کرتا رہے گا۔''

''یہ مناسب ہے۔'' ایزارٹ بولا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ دستے کس حساب سے آگے بڑھیں؟''

''اسی طرح جیسے تم نے کہا ہے مگر سب سے آگے میں اور میرے ساتھی ہوں گے جب ہم راستہ صاف کر لیں تب تم لوگ آگے آؤ گے۔''

ایزارٹ نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھ گیا۔ میں اپنے آدمیوں کو سمجھا کر آتا ہوں۔''

ایزارٹ باہر چلا گیا۔ اس دوران میں ہم آگے روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ ایزارٹ اور اس کے ساتھی آتے رہتے۔ وقت کم تھا اور ہمیں فوری روانہ ہونا تھا۔ ہم سب کے اندر آنے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ریٹرو ہمارے ساتھ تھا کیونکہ وہ شاہی محل کے بیرونی حصوں سے واقف تھا۔ ربیک اس سے بات کرتا رہتا تھا اور جو معلومات ملتیں فوراً مجھے آگاہ کرتا تھا۔ اب ہمارے ساتھ بچ جانے والا سپاہی بھی ہوتا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم ہمارے ساتھ ہو گے اور اگر کوئی راستے میں پوچھے تو تم کہو گے کہ تمہاری طبیعت خراب ہے اس لیے تم واپس جا رہے ہو اور واپس جا کر اپنی جگہ کسی دوسرے سپاہی کو بھیجو گے۔''

''میں ایسا ہی کہوں گا۔''

''صرف کہو گے نہیں بیمار بھی بنو گے اگر تم نے ہٹا کٹا نظر آنے کی کوشش کی تو ہمیشہ کے لیے لٹا دیا جائے گا۔'' ربیک نے اس بار خود سے اسے دھمکایا۔ ''تم دیکھ چکے ہو کہ ہم کتنے سفاک ہیں آدمی مارنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے ہیں۔''

کچھ دیر میں ایزارٹ واپس آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم نے پھندوں کے لیے کوئی نشانی سوچی۔''

''کوئی ایسی چیز ہے جس سے پتھر پر نشان لگایا جا سکے۔''

''بالکل ہے یہاں ایسا سفید پتھر ملتا ہے جسے دوسرے پتھر پر رگڑو تو اس پر سفیدی چھوڑ دیتا ہے۔''

''اگر نزدیک دستیاب ہے تو فوراً منگواؤ۔''

''میں اپنے آدمیوں سے کہتا ہوں۔''

ہمیں سرنگ میں داخل ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو آ رہا تھا۔ جیسے ہی ایزارٹ کے آدمی سفید پتھر لائے۔ ہم ان کے ساتھ آگے روانہ ہو گئے۔ سب سے آگے قیدی تھا اس کے پیچھے ریٹرو تھا اور اس کے پیچھے باقی ہم سب تھے۔ ابتدائی کشادہ حصے کے بعد سرنگ پھر تنگ ہو گئی تھی۔ یہ تین فٹ چوڑی اور کوئی سات فٹ اونچی تھی۔ اسے مکمل طور پر پتھروں سے بنایا گیا تھا اور اس میں کہیں مٹی یا خلا نہیں تھا۔ حد یہ کہ اوپر سے گول ہوتی چھت بھی پتھروں کی تھی۔ فرش یوں صاف تھا جیسے اس کی باقاعدگی سے صفائی ہوتی ہو۔ صفائی تو شاید ہی ہوتی ہو گی اصل بات یہ تھی کہ یہاں دھول مٹی نہیں آتی تھی اور سپاہی بھی شاہی محل سے آتے

جاتے تھے جہاں ویسے ہی صفائی کا بہت خیال رکھا جاتا ہوگا۔ ریٹرو اور قیدی نے جو بتایا تھا اس کے مطابق پہلی چیک پوسٹ کوئی ایک میل کے بعد تھی۔ دوسری چیک پوسٹ دوسرے میل پر تھی اور اس کے بعد اتنا اور فاصلہ طے کرنے پر سرنگ کا دوسرا دہانہ آجاتا جو شاہی محل میں کھلتا تھا۔

ریٹرو کے مطابق جہاں دہانہ کھلتا تھا وہ جگہ ایک درمیانے درجے کے ہال پر مشتمل تھی اور وہاں درجن بھر سپاہیوں کا پہرہ ہوتا تھا۔ اس ہال سے آگے ایک بڑا دالان تھا اور اس کے پار خاص شاہی علاقہ تھا جہاں ریناٹ اپنے اہلِ خانہ سمیت رہتا تھا۔ یہیں اس کا دفتر یعنی دربار خاص تھا اور اس کے نزدیکی ساتھی اسی دفتر میں موجود ہوتے تھے۔
میں نے ریٹرو سے ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھا مگر اس نے انکار کیا کہ اس نے وہاں ایسے حلیے والے غیر ملکیوں کو دیکھا ہے۔ ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھی یقیناً بہت رازداری کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ ریناٹ اور اس کے خاص آدمی ہی ان سے واقف ہوں گے۔ اب تک ریناٹ نے ان کو استعمال نہیں کیا تھا تو اس کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی تھی کہ ڈیوڈ شا نے خود سامنے آنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ اسے ریناٹ کی کامیابی سے دل چسپی تھی لیکن اسے اصل خطرہ مجھ سے تھا اور وہ میرے سامنے آنے کا انتظار کر رہا تھا تب ہی وہ حرکت میں آتا۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اب ریناٹ مکمل طور پر ڈیوڈ شا کے قبضے یا اثر میں تھا۔ اب تک وہ اس سے جو چاہے منوا رہا تھا۔ ریناٹ مسلسل نقصان اٹھا رہا تھا اور ڈیوڈ شا کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ یہاں استعماری سوچ کے تحت آیا تھا اس لیے وادی میں بسنے والے ہر فرد کا نقصان اس کا فائدہ تھا کہ آخر میں اسے کم سے کم لوگوں سے نمٹنا پڑے گا۔ ریناٹ کو جنگ پر اکسانے والا بھی وہی تھا اور عین موقع پر جب آرگون کی فوج قلعوں پر حملے کے لیے تیار تھی ریناٹ نے فوج کو واپس آرگون آنے کا حکم بھیجا اور اس کی بدقسمتی کہ وہ لوگ ہمارے ہاتھ آگئے اس لیے فوج تک صرف جنگ سے باز رہنے کا پیغام پہنچا اور واپسی کا حکم گول کر دیا گیا۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ ریناٹ کی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی ہوگی۔ کیونکہ ڈیوڈ شا کا مقصد تو کھلی اور بھرپور جنگ سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ اگر واقعی دونوں میں اختلاف پیدا ہوا تھا تو یہ میرے لیے اچھی خبر ہو سکتی تھی۔

قیدی آگے تھا۔ ابھی ہم نصف میل گئے ہوں گے کہ اچانک وہ ایک جگہ رکا اور اس نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ رہا پھندا۔“

یہاں فرش تقریباً ایک فٹ قطر کے گول پتھروں کا بنا ہوا تھا اور کسی قسم کے مسالے کی مدد سے پتھروں کو آپس میں جوڑا گیا تھا اور پھر ان کی گھسائی کی گئی تھی جس سے فرش ہموار ہو گیا تھا۔ قیدی نے جس پتھر کی نشان دہی کی تھی وہ دوسرے پتھروں سے قطعی مختلف نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے پتا کہ یہی وہ پتھر ہے۔“

”اس نشانی سے۔“ اس نے دیوار کے طرف اشارہ کیا جس پر ایک غیر محسوس سی سیدھی لکیر تھی۔ میں پتھر سے بچ کر آگے آیا اور لکیر کو چیک کیا یہ رگڑ کر پتھر پر بنائی گئی تھی اور اس کے مٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا جب تک یہ پتھر ہی دیوار سے نہ نکال دیا جاتا۔ ربیک نے تیر کمان پر چڑھایا اور قیدی سے کہا۔

”دس قدم آگے جاؤ اور واپس آؤ بھاگنے کی کوشش مت کرنا تم تیر سے تیز نہیں بھاگ سکو گے۔“

ربیک کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی تیر کمان پر چڑھا لیے تھے اور اتنے تیروں سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ مجبوراً قیدی آگے گیا اور پورے دس قدم گن کر وہ واپس آگیا۔ دونوں بار اس نے صرف اس پتھر کے معاملے میں احتیاط کی تھی۔ واپسی پر میں نے اسے سفید پتھر تھما کر حکم دیا۔ ”اس پتھر کے گرد نمایاں نشان لگاؤ۔ مگر احتیاط سے اس پتھر کو چھونا بھی مت۔“

وہ خود بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے بہت احتیاط سے حکم کی تعمیل کی اور اس پتھر کو چھوڑتے ہوئے اس کے گرد باقی پتھروں پر دائرہ بنا دیا۔ درمیان میں وہی پتھر تھا۔ اب آنے والوں کو اس سے بچ کر گزرنا تھا۔ ہم آگے روانہ ہوئے تو اب ریٹرو آگے تھا اس نے چیک پوسٹ آنے سے پہلے ہمیں خبردار کر دیا۔ یہ چیک پوسٹ ایک کسی قدر کشادہ کمرے میں تھی یہاں خوراک اور پانی کے ساتھ اضافی ہتھیار بھی تھے۔ یہاں دو سپاہی موجود تھے اور انہیں قابو کرنا زیادہ مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ انہیں مارنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی ان کے سروں پر ضرب لگا کر بے ہوش کیا گیا اور پھر انہیں باندھ دیا گیا۔ ایزارٹ اور اس کے آدمی اس طرف چل پڑے تھے کیونکہ جب تک ہم ان

سے نمٹ کر فارغ ہوئے ایزارٹ اپنے دستے کے ساتھ آگیا اور اس نے اطلاع دی کہ اس کے تمام ساتھی سرنگ میں آچکے تھے۔ ساتھ ہی اس نے اطلاع دی۔

''خفیہ راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس کے اندر اور باہر دونوں طرف ہمارے آدمی ہیں۔''

''باہر سے کسی خطرے کی صورت میں وہ کیا کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس صورت میں وہ بھی اندر آجائیں گے اور راستہ بند کر دیا جائے گا۔'' ایزارٹ نے بتایا۔ میرا بھی یہی خیال تھا اگر آرگون کی فوج کسی طرح یہاں آبھی جائے تو اسے سرنگ میں داخل ہونے سے روکنا تھا۔ ہم آگے روانہ ہوئے اور اس بار بھی قیدی آگے تھا اسے دوسرے پھندے کی نشان دہی کرنی تھی۔ اب تک سب کچھ پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ ریناٹ اور اس کے آدمی بے خبر تھے کہ ہم ان کی طرف آرہے ہیں۔ ان کا آخر تک بے خبر رہنا ضروری تھا۔ قیدی نے دوسرے پھندے کی نشان دہی کی اور اس کے گرد بھی سفید پتھر سے دائرہ بنا دیا گیا۔ اب آنے والوں کو اس پتھر سے بچ کر گزرنا تھا۔ ویسے یہ حیرت انگیز پھندا تھا کہ ایک پتھر پر دباؤ آنے سے نہ صرف وہ پتھر بلکہ اس کے آگے پیچھے سرنگ کے دوسرے پتھر بھی گر جاتے اور ان کے نیچے خلا تھا مگر جب تک اس پتھر پر دباؤ نہ آتا باقی پتھر مضبوطی سے اپنی جگہ جمع رہتے۔

میں نے اہرام مصر کے معماروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ایسے کمالات دکھاتے تھے۔ اہرام کیونکہ کسی بادشاہ کا مدفن یا معبد ہوتے تھے اس لیے ان میں خفیہ چیمبر اور راستے ہوتے تھے اور دراندازوں کو روکنے کے لیے ان میں ایسے ٹریپ لگائے جاتے تھے کہ ناواقف افراد ان میں پھنس کر جان سے ہاتھ دھو لیتے تھے۔ مگر اہرام مصر کے برعکس اس وادی میں شاہوں کو کسی دشمن سے اتنا خطرہ نہیں تھا اس کے باوجود انہوں نے یہ خفیہ سرنگ اور اس میں ٹریپ بھی لگائے تھے۔ دوسرے ٹریپ سے گزر کر ہم کچھ دیر بعد دوسری چیک پوسٹ پہنچے اور وہاں موجود دو سپاہیوں پر آسانی سے قابو پا لیا۔ آسانی ہمیں یوں ہوئی کہ ہم مکمل تیاری سے آئے تھے اور انہیں آخر وقت تک دھوکے میں رکھا۔

اگر ہم طاقت کے بل پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تو اس کا امکان تھا کہ ہمارا راز فاش ہو جاتا۔ کوئی ایک سپاہی بھی سیٹی بجا دیتا تو سرنگ کے آخری حصے پر موجود پہریدار سرنگ کا دروازہ نہ کھولتے یا کھولتے تو دوسری طرف بہت زیادہ تعداد میں سپاہ ہماری آمد کی منتظر ہوتی۔ ہماری جنگ شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جاتی۔ ہماری کامیابی آخر تک دشمن کو دھوکے میں رکھنے سے ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ اس دوسری پوسٹ کے سپاہیوں کو قابو کر کے ہم نے قیدی کو بھی بے ہوش کر کے ان کے ساتھ ہی لٹا دیا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیئے تھے اور اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ خود کو آزاد کرا سکتے۔ جب میں نے قیدی کے سر پر ضرب لگائی تو ریٹرو کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید اس کے ساتھ بھی اب یہی سلوک ہو۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''فکر مت کرو ہمیں تمہاری ضرورت ہے اس لیے تم ساتھ رہو گے۔''

''مگر کوئی حماقت کی تو ہمیشہ کے لیے بے ہوش ہو جاؤ گے۔'' ایرٹ نے اسے خبردار کیا۔ جب ہم روانہ ہونے والے تھے تو ایزارٹ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں بھی پہنچ گیا۔ اب آخری میل کا سفر رہ گیا تھا۔ سرنگ ایک سیدھ میں نہیں تھی بلکہ یہ کئی جگہوں سے گھوم رہی تھی اور بل کھا رہی تھی۔ کچھ مقامات پر میں نے محسوس کیا کہ یہ اوپر اور نیچے بھی آجا رہی تھی۔ یہ ناگزیر تھا کیونکہ سرنگ بنانے والوں کو زیر زمین ہر جگہ ایک جیسی نہیں ملی ہو گی کہیں بڑی چٹانیں ہوں گی جن کو توڑنا ناممکن ہو گا اور کہیں پانی کی رگیں ہونگی۔ ان سے بچنے کے لیے سرنگ کو موڑا اور اوپر نیچے کیا گیا تھا۔ پھر سرنگ کو ایسی جگہوں سے گزارا گیا ہو گا جہاں اس کا راز افشا نہ ہو۔ بہر حال یہ شہرے کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ ریٹرو آگے تھا۔ ایک موڑ پر رک کر وہ مڑا اور آہستہ سے کہا۔ ''اس کے بعد سرنگ کا دہانہ ہے۔ مگر اسے دوسری طرف سے ہی کھولا جا سکتا ہے۔''

''اور کھلوایا کیسے جاتا ہے؟''

''بالکل اسی طرح ایک پتھر ہٹا کر آواز دینے پر دوسری طرف سے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔''

''لازمی بات ہے تمہاری آواز پر دروازہ کھولا جائے گا؟''

اس نے سر ہلایا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں اس طرف

رینانٹ کی پوری قوت موجود ہے۔ اس کی سپاہ کی تعداد آپ کے کل آدمیوں سے تین گنا زیادہ ہے۔"

میں نے اس کی وارننگ نظر انداز کر کے سوال کیا۔ "خاص شاہی محل میں کتنے محافظ ہوں گے؟"

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی مدد سے بتایا کہ خاص محل میں محافظوں کی تعداد دو سو ہوتی تھی۔ ان میں خاص شاہی محافظوں کی تعداد پچاس تھی جو رینانٹ کے رہائشی حصے اور دربار خاص کی حفاظت کرتے تھے۔ کیونکہ موڑ کی صورت میں ہمیں قدرتی آڑ مل گئی تھی اس لیے میں یہاں رک کر ایزارٹ اور اس کے آدمیوں کا انتظار کرنے لگا۔ انہوں نے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ سب سے آگے ایزارٹ اپنے دستے کے ساتھ نمودار ہوا۔ شروع میں وہ پیچھے تھا مگر اب آگے آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے باقی افراد بھی تھے۔ ایزارٹ آیا تو میں نے ریٹرو کو سفید پتھر تھمایا اور اس سے کہا۔ "تم شاہی محل کی ساخت جس حد تک جانتے ہو اس کا نقشہ یہاں زمین پر بناؤ۔ ہاں اگر اوپر نیچے کئی منزلیں ہوں تو وہ بھی واضح کرو اور یہاں تہہ خانے بھی ہوں گے ان کی وضاحت بھی کرو۔"

"میں تہہ خانوں سے واقف نہیں ہوں۔" اس نے کہا اور فرش پر لکیریں کھینچنے لگا۔ "میں جتنا جانتا ہوں وہ بتا سکتا ہوں۔"

اس نے سرنگ والے ہال سے شروع کیا۔ "سرنگ یہاں نکلتی ہے۔" اس سے آگے اس نے دلان اور پھر شاہی علاقے کا نقشہ بنایا۔ "میں اندر نہیں گیا ہوں لیکن اس کے چاروں اطراف گھوما ہوں۔ یہ اتنا بڑا علاقہ ہے۔" وہ مزید لکیریں کھینچنے لگا۔ "اس کے تین طرف باغات ہیں اور پانی کے تالاب ہیں۔ چوتھی طرف ایک بڑا ہال ہے جو شاہی تقریبات کے لیے مخصوص ہے۔"

میں نے دلان کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے دوسری طرف کیا ہے؟"

"اس طرف دلان کے پاس ستونوں پر رکھی چھت ہے جو چاروں طرف سے کھلی ہے اور اس میں پردوں کی مدد سے خانے بنے ہیں۔ یہ جگہ بھی شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہے۔"

میں تصور کر سکتا تھا کہ یہاں عیش و عشرت کی کیسی محفلیں سجتی ہوں گی۔ اگر یہاں حمام ہوتا تو ایک ہی حمام والی بات درست ثابت ہوتی۔ اس جگہ کو چاروں طرف سے شاہی دستہ اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اور عملاً یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا باغ تھا اور اس کے بعد شاہی محل کا عام حصہ شروع ہو جاتا تھا۔ میں نے نقشے کو ذہن میں رکھا اور ایزارٹ سے کہا۔ "ہمیں دلان کے بعد والی عمارت پر قبضہ کرنا ہے اور اس دوران میں ہمارے آدمی اندر موجود سپاہیوں سے نمٹ کر اس ستونوں والی جگہ پر قبضہ کریں گے۔ تاکہ باہر سے مدد اندر آنے سے روکی جا سکے۔" میں کہتے ہوئے ریٹرو کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیا دلان تک آنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟"

"نہیں اسی ستونوں والی جگہ کے وسط میں ایک کھلی جگہ ہے اور یہی آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔" ریٹرو نے جواب دیا اور دلان کے عمارت والے حصے کی طرف انگلی رکھی۔ "یہاں ......" پھر اس نے ستونوں والی عمارت پر انگلی رکھی۔ "اور یہاں دونوں طرف اوپر تیر انداز ہوتے ہیں جو دلان میں گھسنے والوں کو نشانہ بنانے کے لیے تعینات کیے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد دونوں جگہوں پر بیس بیس ہوتی ہے۔"

میں نے ایزارٹ کی طرف دیکھا۔ "ہمارے آدمیوں کو کم سے کم کھلی جگہ پر رہنا چاہیے تاکہ ان کو اوپر سے تیروں سے نشانہ نہ بنایا جا سکے۔ وہ دیواروں کے ساتھ رہیں اور کھلی جگہوں پر ڈھالوں سے اپنی حفاظت کریں۔ چھوٹے ہال سے نکلتے ہوئے بڑی ڈھالوں والے آگے ہوں گے۔"

ایزارٹ نے سر ہلایا اور اپنے نائبین کو ہدایت دینے لگا۔ اس نے سپاہ کی یہ ترتیب رکھی تھی کہ اپنے پانچ نائب چن لیے تھے اور ہر نائب دو یا تین دستوں کا سربراہ تھا۔ دستے اس کے احکامات پر عمل کرتے تھے اور وہ پانچوں ایزارٹ سے حکم لیتے۔ اس طرح ایزارٹ تمام فوج کو اپنے قابو میں رکھتا اور مختصر وقت میں اس کا حکم سب تک پہنچ جاتا تھا۔ میرا دستہ سب سے الگ تھا۔ اس میں میرے قلعوں کے ساتھی اور کچھ نئے افراد تھے۔ اس کی تعداد مجھ سمیت چھبیس بنتی تھی۔ حکمت عملی یہ طے ہوئی کہ جیسے ہی راستہ کھلے ہم ہال میں موجود سپاہیوں کو تہہ تیغ کر دیں اور اس کے بعد ہماری فوج اس محدود جگہ سے جلد از جلد باہر نکلنا شروع ہو جائے۔

سب سے آگے میں اپنے دستے سمیت ہوں گا اور اس وقت ہال سے باہر نکلوں گا جب میرے بیک اپ میں کم

سے کم دو دستے آجائیں۔ میرے نکلنے کے بعد وہ باہر آکر دلان میں موجود سپاہیوں کو الجھائیں گے اور مجھے شاہی حصے کی طرف جانے کا موقع دیں گے۔ شروع میں وہ مدافعتی جنگ لڑیں گے مگر جیسے جیسے عقب سے مزید دستے آئیں گے وہ جارحانہ جنگ شروع کریں گے۔ جیسے ہی دلان پر قبضہ ہو گا۔ بڑی ڈھالوں والے آجائیں گے اور وہ تیر اندازوں کو تحفظ دیں گے جو ستونوں والی عمارت سے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ یہ موٹی موٹی تفصیلات تھیں اور جیسے جیسے جنگ آگے بڑھتی اس کا نقشہ از خود ترتیب پاتا۔ دیکھا جائے تو یہ چھاپہ مار جنگ بھی تھی اور کھلی جنگ بھی۔ یہ سرنگ سے نکلنے تک چھاپہ مار تھی اور اس کے بعد یہ کھلی جنگ بن جاتی۔ ہمیں سرنگ میں داخل ہوئے دوسرا گھنٹا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ریٹرو کی طرف دیکھا۔

''دروازہ کھلواؤ۔''

ہم تیرہ افراد پر مشتمل دستہ موڑ سے گھوم کر کوئی سو گز کے فاصلے پر موجود دیوار کی طرف بڑھا، یہاں بھی دروازہ پتھر کا تھا اور یہ بہت بڑا پتھر تھا جسے توڑنا ممکن نہیں تھا۔ پتا نہیں انہوں نے بغیر دھات کے اسے کیسے تراشا تھا اور پھر لا کر یہاں نصب کیا تھا۔ کیونکہ یہاں چھپانے کا تکلف نہیں تھا اس لیے سوراخ کھلا ہوا تھا۔ ریٹرو نے اس پر منہ رکھ کر اپنا تعارف کراتے ہوئے دروازہ کھولنے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی ہم سب نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ چند لمحے بعد دھیمی سی گڑگڑاہٹ گونجی اور دیوار کا ایک حصہ الگ ہونے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس میں اتنا خلا بن گیا کہ ایک آدمی گزر سکے۔ میں آگے بڑھا اور خلا سے گزر کر ہال میں آیا۔ یہاں ایک درجن سپاہی موجود تھے اور ان میں سے دو اس چکی کو گھما رہے تھے جس سے سرنگ کا دروازہ کھلتا تھا۔ میرے عین سامنے ایک سپاہی کمانڈر کے نشانات والی وردی میں تھا۔ فوری حملہ مناسب نہیں تھا اور میں اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ کمانڈر نے مجھ سے پوچھا۔

''ریٹرو کہاں ہے؟''

میں نے خلا کی طرف اشارہ کیا مگر منہ سے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ کمانڈر غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے کہا۔ ''میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں اپنا تعارف کراؤ۔''

میں کیا جواب دیتا مگر بالکل چپ رہنا بھی مناسب نہ تھا۔ میں کھانسا اور ذہن میں آنے والا پہلا مقامی طرف کا نام ادا کر دیا۔ ''آرٹر۔''

یہ لفظ میں نے کھانسی کے دوران ادا کیا تھا تاکہ لہجہ پہچانا نہ جائے مگر یہاں میری شناخت سامنے آگئی کمانڈر اچانک پیچھے ہٹا۔ ''جھوٹ بولتے ہو تم وہی مجرم ہو جو معبد سے فرار ہوا تھا۔ میں تمہیں پہچان گیا ہوں، پکڑلو اسے۔''

یہ کمانڈر کے آخری الفاظ تھے کیونکہ نہایت سرعت سے میں نے نیزہ اس کے گلے میں اتار دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر حکم دے رہا تھا۔ میرے تین ساتھی باہر آچکے تھے اور باقی آرہے تھے۔ کمانڈر کے الفاظ سے زیادہ اس کی وفات نے اس کے ساتھیوں کو حرکت میں آنے پر مجبور کیا اور وہ اپنے ہتھیار سنبھالنے لگے۔ ربیک اور ایرٹ نے آتے ہی تیر کمان سنبھال لیے تھے انہوں نے سب سے پہلے ان دو افراد کو نشانہ بنایا جو اپنے نیزوں سمیت میری طرف جھپٹ رہے تھے۔ میں نے کمانڈر کے گلے میں اتر جانے والا اپنا نیزہ کھینچا اور اسے تیر کھا کر ڈگمگاتے سپاہی کے پیٹ میں اتار دیا۔ پھر اسے لات رسید کی تو وہ پیچھے آنے والے ساتھی پر جا گرا اور اس کا نیزہ عقب سے مضروب کے جسم میں اتر گیا۔

اس دوران میں میرے تمام ساتھی باہر آچکے تھے۔ وہ سب تیر کمان استعمال کر رہے تھے۔ اس لیے دشمن کو نزدیک آنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

کمانڈر کے مارے جانے کے ایک منٹ کے اندر ان میں سے چھ زمین بوس ہو چکے تھے اور باقی بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ہال کے واحد دروازے کی طرف پسپا ہو رہے تھے۔ لڑائی کا آغاز ہی چیخ و پکار سے ہوا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکار رہے تھے اور حملے کی اطلاع باہر والوں کو دے رہے تھے۔ باہر سے بھی آوازیں آنے لگیں۔ مگر وہ ابھی دور تھیں۔ اس دوران میں ایزارٹ کا دستہ بھی ہال میں آنے لگا تو بچے ہوئے سپاہی بھڑک کر دروازے کی طرف جانے لگے۔ میرے ساتھی انہیں تیروں سے نشانہ بنا رہے تھے اور روکنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ مگر وہ ڈھالوں کی آڑ میں بچ رہے تھے۔ میں زمین پر بکھری لاشوں، خون اور اپنے ساتھیوں کی تیر اندازی کی لائن سے بچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور نیزے کو لاٹھی کی طرح گھما کر ایک سپاہی کی ٹانگوں پر مارا۔ وہ ڈھال سے اپنا سر اور اوپری دھڑ بچا رہا تھا۔ ضرب کھا کر وہ نیچے گرا

تو ایک تیر اس کی پسلی میں اتر گیا۔ اس کی بدقسمتی کہ تیر عین دل کے مقام پر اترا تھا۔ اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔

اب دو باقی بچے تھے اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ یہاں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے تو انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے اور جان کی امان چاہنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ ایزارٹ انہیں مروا دے گا مگر خلافِ توقع اس نے تیر اندازی روکنے کا حکم دیا۔ ذرا سی دیر میں انہیں نہتا کر کے ان کے دونوں ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے گئے تھے۔ ہال کے دروازے پر باہر سے دستک ہو رہی تھی اور چیخ چیخ کر پوچھا جا رہا تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ گرفتار شدگان کو آگے کیا گیا اور ہم نے ان کے پیچھے رہتے ہوئے دروازہ کھول دیا فوراً ہی باہر سے تیر آئے اور ان دونوں کے جسم چھلنی ہو گئے۔ میں نے ایک کو گرنے سے پہلے پکڑ لیا اور اپنی ڈھال بنائے باہر آیا۔ یہی سلوک ایزارٹ نے دوسرے کے ساتھ کیا تھا۔ دلان میں آتے ہی میں ایک لمحے کو ٹھٹکا کیونکہ وہاں سو کے قریب مسلح سپاہی موجود تھے اور وہ ہال کو ہر طرف سے گھیر چکے تھے۔ ان میں تیر اندازوں کی تعداد تیس سے زیادہ تھی اور انہوں نے تیر کمانوں پر چڑھا رکھے تھے۔

لیکن اس سے پہلے کہ ان کے تیر ہم تک آتے۔ ہمارے ڈھال بردار سپاہی باہر آنے لگے اور وہ منظم انداز میں نیم دائرے میں پھیل کر بتدریج آگے بڑھنے لگے اور عقب میں نئے آنے والوں کے لیے جگہ بن رہی تھی اور وہ ان ڈھال برداروں کے پیچھے محفوظ تھے۔ دشمنوں کی طرف سے آنے والے تیر ڈھالوں میں گھپ رہے تھے۔ دلان کے وسط میں ایک طویل قامت شخص کھڑا ہوا تھا جس نے سنہری زرہ پہنی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں خاصا موٹا اور وزنی نیزہ تھا۔ وہ یہاں موجود ریناٹ کے دستوں کا کمانڈر لگ رہا تھا۔ اس نے گونجتی آواز میں کہا۔ ”کون ہو تم اور اندر آنے کی ہمت کیسے کی؟“

”تم صرف زبان سے لڑو گے یا اپنے ہتھیار بھی استعمال کرو گے۔“ ایزارٹ نے سکون سے جواب دیا۔ ”اب تک تمہارے ساتھیوں میں سے کسی نے ایسی جرأت نہیں کی ہے یہی وجہ ہے میرے کسی ساتھی کو خراش بھی نہیں آئی ہے۔“

یہ جواب طیش دلانے والا تھا اور سنہری زرہ والے نے گرج کر کہا۔ ”انہیں فنا کر دو۔“

اس وقت ہمارے تین دستے باہر آ چکے تھے اور مزید آ رہے تھے۔ ریناٹ کے سپاہی شور مچاتے ہماری طرف لپکے۔ اس دوران میں میں اپنے ساتھیوں کو لے کر دائیں طرف سرک چکا تھا۔ شاہی حصہ اسی طرف تھا۔ عمارت میں کئی دروازے اور کھڑکیاں تھیں اور یہ سب بند ہو چکی تھیں۔ اچانک ہی ستونوں والی چھت پر تیر انداز نمودار ہوئے اور انہوں نے تیروں کی بوچھاڑ کی۔ مگر ہم پہلے ہی ہوشیار تھے۔ ڈھالوں کے پیچھے پناہ لے رکھی اور دشمنوں کے نزدیک آنے کا انتظار کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ نزدیک آئے۔ ڈھال برداروں نے ڈھالوں میں ذرا خلا کیا اور پیچھے موجود ہمارے تیر اندازوں نے پہلی باڑ ماری۔ درجن سے زیادہ سپاہی نشانہ بنے۔ وہ گرے تو آنے والوں کی رفتار اور جوش میں فرق آیا تھا اس سے تیر اندازوں کو دوسری باڑ مارنے کا موقع ملا۔ ایک تیر سنہری زرہ پوش کی زرہ میں لگا مگر وہ محفوظ رہا تھا۔

وہ سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹا اور اس نے ایک سپاہی سے بڑی ڈھال چھین کر اپنے آگے کر لی۔ وہ خود آگے نہیں آ رہا تھا مگر اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کر آگے آنے کا حکم دے رہا تھا۔ دوسری باڑ مارتے ہی ڈھال برداروں نے خلا ختم کر دیا کہ چھت پر موجود تیر انداز اس کا فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ دشمن کے بیس کے قریب سپاہی دلان میں گر چکے تھے۔ کچھ مر گئے تھے اور باقی شدید زخمی تھے۔ پچاس کے قریب سپاہی دوڑتے ہوئے اب اتنے نزدیک آ گئے تھے کہ چھت پر موجود تیر انداز ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے تھے ورنہ خود ان کے ساتھی نشانہ بنتے۔ وہ آ کر ڈھالوں سے ٹکرائے اور ہمیں پیچھے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اس دوران میں پانچواں دستہ بھی باہر آ گیا تھا اور ہم بہت چھوٹی سی جگہ میں پیک ہو گئے تھے۔ اس لیے دھکیلنے والے زیادہ نہیں دھکیل سکے اور جب ہم نے جوابی زور لگایا تو انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ خلا بنتے ہی ڈھال بردار پیچھے ہٹنے لگے اور پیچھے موجود سپاہی آگے نکل کر دشمن پر ٹوٹ پڑے تھے۔

کیونکہ ہم چھوٹی سی جگہ میں تھے اس لیے دشمن کا خیال تھا کہ ہماری تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ہم پر چڑھ آنے والوں کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ انہیں اپنے سے زیادہ آدمیوں سے واسطہ پڑے گا اور وہ افراتفری میں پیچھے ہٹنے

لگے۔ ڈھال بردار دوبارہ سامنے آگئے اور انہوں نے تیر اندازوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا جواب چھت پر موجود دشمن تیر اندازوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب اوپر موجود دشمن کو جواب ملا اور ان میں سے دو نے تیر کھائے تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور اب وہ کھل کر تیر اندازی سے گریز کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اب پورے دلان میں دست بدست جنگ جاری تھی۔ سنہری زرہ والا غائب تھا مگر ستونوں والی عمارت کی طرف سے تقریباً پچاس مزید سپاہی دوڑے آرہے تھے۔ ہمارے تیر انداز انہیں نشانہ بنانے لگے۔ درحقیقت اس جنگ میں فیصلہ کن کردار تیر اندازوں کا ہی تھا۔ میرے دستے کے پاس تین بڑی ڈھالیں تھیں اور ہم ان کی آڑ میں شاہی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔

سپاہی جو ہمارے راستے میں آرہے تھے ہم ان سے نمٹ رہے تھے۔ اب تک کی جنگ میں میں نے محسوس کیا کہ ریناٹ کے آدمیوں میں جذبہ بالکل نہیں تھا اور وہ جان دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے کمانڈر پیچھے رہ کر جنگ کر رہے تھے اور سپاہی بادل ناخواستہ لڑ رہے تھے۔ جیسے ہی ان پر دباؤ آتا وہ پسپا ہوتے تھے یا ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ ان کے دو ور جن سپاہی لڑائی کے آغاز سے پہلے مارے گئے۔ اسی طرح آرگون میں ہمیں جتنے بھی سپاہیوں سے واسطہ پڑا ان میں لڑنے کا جذبہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ آسانی سے مارے گئے یا گرفتار ہو گئے۔ حالانکہ وہ تربیت یافتہ اور کہیں بہتر ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ دلان میں سپاہی آگئے تھے ہماری تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ میں نے عمارت میں اندر جانے کے لیے دروازوں کے بجائے کھڑکی کا راستہ اختیار کرنے کا سوچا اور ایک کھڑکی کے بند پٹ پر زور لگا کر میں نے اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور پھر پیچھے ہٹ کر پوری قوت سے پاؤں اس پر مارا۔

پٹ لرزا تھا مگر کھلا نہیں۔ ایرٹ بھی میرے ساتھ آگیا اور جب ہم دونوں نے ایک ساتھ پاؤں مارے تو پٹ ایک دھماکے سے کھلا تھا اور فوراً اندر سے دو تیر آئے۔ میں اور ایرٹ اس دوران میں جھک گئے تھے مگر پیچھے موجود ہمارا ایک ساتھی نشانہ بنا۔ وہ کراہ کر گرا تھا تو باقی بھی نیچے ہو گئے۔ پھر دو تیر اندازوں نے بیک وقت اٹھ کر جوابی کارروائی کی۔ مگر اندر والے بھی ہوشیار تھے وہ کسی آڑ میں تھے۔ میں نے ایک بڑی ڈھال لی اور اسے سامنے کرتے ہوئے اندر جھانکا۔ یہ بڑا سا ہال نما کمرا تھا اور وہاں فرنیچر بتا رہا تھا کہ یہ نشست گاہ تھی۔ تیر انداز فرنیچر کے پیچھے ہی چھپے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھی سرنگ سے آتے ہوئے مشعلیں بھی لائے تھے کیونکہ آگ لگانے کی ضرورت پڑ سکتی تھی اور یہ اچھا حربہ بھی تھا۔ میں جائزہ لے رہا تھا کہ دو تیر آکر ڈھال میں پیوست ہو گئے۔ میں نے مشعل کے لیے آس پاس دیکھا تو وہ ذرا دور ایک سپاہی کے پاس تھی۔ ربیک نے اس سے مشعل مانگی جو اس نے دور سے ہماری طرف اچھال دی ربیک نے مہارت سے اسے کیچ کر کے مجھے دی۔

''آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟''

''آگ لگانے۔'' میں نے کہا اور مشعل ہال کے وسط میں پھینک دی جہاں کپڑے والے فرنیچر کی بہتات تھی۔ نتیجہ حسب مرضی نکلا اور مشعل نے گرتے ہی آگ لگا دی۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ اندر موجود سپاہیوں میں بدحواسی ان کی آوازوں سے ظاہر تھی میں موقع سے فائدہ اٹھا کر اندر کودا اور اس بار آنے والے تیروں کی تعداد زیادہ تھی۔ دو اس زاویے سے آئے تھے کہ ڈھال مجھے بچا نہیں سکتی تھی مگر بچانے والا اصل میں خدا ہے۔ ایک تیر میرے سر کے پاس سے گزر کر کھڑکی کی چوکھٹ میں پیوست ہوا اور دوسرا میری ٹانگوں کے درمیان سے نکل گیا۔ جس کا تیر سر کے پاس سے گزرا تھا اسے ایرٹ نے نشانہ بنایا اور وہ تیر کھا کر گرتا پڑتا ایک طرف بھاگا۔ میرے ساتھی اب مجھے بچانے کے لیے دھڑادھڑ تیر برسا رہے تھے۔ میں نیزہ سنبھالتے ہوئے نزدیکی سپاہی کی طرف لپکا تو اس نے مجھے آتے دیکھ کر تیر کمان پھینک دیا اور اپنا نیزہ سنبھالا۔

میں نے نزدیک جاتے ہوئے اس پر ڈھال ماری مگر وہ مہارت سے خود کو بچا گیا۔ اس نے تیزے سے جوابی وار کیا جو میں نے زاویہ بدل کر خالی جانے دیا۔ مگر اس نے نہایت پھرتی سے دوسرا وار کیا اور اس بار نیزے کی انی میری ران کو چھوتی گزر گئی۔ اگر میں پھرتی نہ دکھاتا تو نیزہ میری ران میں اتر جاتا اس کے باوجود مجھے زخم لگا تھا اور میں لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ مجھے زخمی ہوتے دیکھ کر وہ سفاک سے انداز میں مسکرایا۔ اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ماہر لڑاکا

تھا اور اس پر قابو پانا آسان نہیں ہوگا۔ مجھے ڈھال لے کر لڑنے کی عادت نہیں تھی اور مجھے اس کے ساتھ دشواری پیش آرہی تھی اس لیے میں نے ڈھال ایک طرف پھینک دی۔

اب ہم دونوں ہی پاس پاس تھے اس لیے میرے ساتھی تیر سے نشانہ نہیں لے سکتے تھے۔ البتہ وہ اندر آگئے تھے۔ اسی طرح اس کے دشمن بھی اپنے ساتھی کی وجہ سے مجھے نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔ کمرے کے وسط میں آگ بھڑک رہی تھی اور باقی دشمن سپاہی فرار ہو چکے تھے۔ میں نے حریف پر نظریں جماتے ہوئے ربیک کو حکم دیا۔

''اپنا دستہ لے کر اندر جاؤ اور راستہ صاف کرو۔''

''مگر......'' ربیک ہچکچایا۔''یہ......''

''اسے میرے لیے چھوڑ دو اور جو کہا ہے وہ کرو۔'' میں نے اس بار سخت لہجے میں حکم دیا۔''اسی راستے مزید کمک منگواؤ۔''

مجھے ربیک کے ساتھ محو گفتگو پا کر اسے غلط فہمی ہوئی اور اس نے اچانک نیزے سے وار کیا۔ میں نے اپنا نیزہ اس کے نیزے پر مارا اور اسے گھماتے ہوئے دور کر دیا۔ اب ہم دونوں ہی محتاط انداز میں نیم دائرے میں گھومتے ہوئے وار کرنے کا موقع تلاش کر رہے تھے۔ اس نے پہل کی اور اس بار میرے نیزے والے بازو کو نشانہ بنانا چاہا۔ یہ وار خطرناک نہیں تھا مگر مجھے ناکارہ کر سکتا تھا۔ اس بار مجھے پورا گھومنا پڑا اور اس کا نیزہ میرے بازو کو تقریباً چھوتا ہوا گزرا تھا۔ ربیک مجھے میرے حال پر چھوڑ کر میرے حکم کی تعمیل میں لگ گیا تھا اور میں یہی چاہتا تھا۔ ہم مہم کے مشکل ترین مرحلے میں تھے اور اس میں ذرا سی کوتاہی یا تاخیر ہماری ساری مہم کو ناکام بنا سکتی تھی۔ ریناٹ اور اس کے خاص ساتھی بچ کر نکل جاتے تو ہم ناکام ہی ہوتے۔

اس لیے میں نے ربیک اور دوسروں کو اپنا کام کرنے کا حکم دیا اور اس سپاہی سے خود نمٹ رہا تھا۔ ایک ناکام وار کے بعد وہ سنبھل گیا تھا اور شاید اب یقینی وار کرنے کی سوچ رہا تھا۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں تر نوالہ نہیں ہوں اور اگر مجھے موقع ملا تو میں اسے مار دوں گا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی نمودار ہوئی تھی اور چہرے کے تاثرات وحشیانہ ہو گئے تھے۔ اچانک اس نے میرے سینے کو نشانہ بنانا چاہا اور میں اسی کی توقع کر رہا تھا۔ اوپری دھڑ کو نیم دائرے میں گھماتے ہوئے میں نے وار ناکام کیا اور اس کے ساتھ ہی میرا نیزے والا ہاتھ نیچے سے حرکت میں آیا۔ نیزہ نیچے سے معدے کے مقام سے اس کے سینے میں گھسا اور شاید جگر کو بھی چاک کر گیا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا اور آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ میں نے نیزہ جھٹکے سے واپس کھینچا تو وہ نیچے گر گیا۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بہت نوجوان آدمی تھا اور اقتدار کی جنگ نے اس کی جان لے لی تھی۔ میرا نیزہ اب خون سے اتنا بھیگ چکا تھا کہ خون اس کے پکڑنے والے حصے تک آرہا تھا۔ یہ میرے ہاتھ سے پھسل رہا تھا۔ میں نے اپنے کرتے کے دامن سے اسے صاف کیا اور ہال کے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا جہاں سے آتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ میرے ساتھی دست بدست جنگ میں مصروف تھے۔ میں ان سے پیچھے کیسے رہ سکتا تھا؟ میں نے جلتی مشعل اٹھائی اور اس ہال میں داخل ہوا۔ یہاں دیواروں پر پردے لہرا رہے تھے میں نے ان کو آگ دکھائی اور پھر ایک طرف روشن لیمپ اٹھا کر سامنے میز نما فرنیچر پر دے مارا۔ یہاں میرے ساتھی ایک درجن افراد سے نبرد آزما تھے۔ آگ لگی تو دشمنوں میں سراسیمی پھیلی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر میرے ساتھی ان پر چڑھ دوڑے۔ اس دوران میں دوسرا دستہ بھی وہاں آگیا۔ مگر دشمن سپاہیوں کی آمد بھی مسلسل جاری تھی۔ میں نے سامنے آنے والے ایک سپاہی کو سنگی چاقو سے ٹھکانے لگایا اور ایرٹ سے کہا۔

''اپنے تیر انداز لے کر میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے کہتے ہوئے چاقو پٹکے میں اڑس کر ڈھال سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے مشعل اٹھالی تھی۔ یہاں آگ لگانے کے قابل سامان بہت تھا اور میں جہاں سے گزر رہا تھا اسے آگ دکھا رہا تھا۔ اب تک ہم جہاں گئے تھے ہمیں سپاہی ہی ملے تھے۔ کوئی عام فرد یا ریناٹ سے متعلق آدمی یا عورت نظر نہیں آئے تھے۔ وہ شاید مزید اندر تھے اور اگر ان تک ہنگامے کی اطلاع پہنچ گئی تھی جس کا بہت زیادہ امکان تھا تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے فرار یا کسی خفیہ جگہ چھپنے کی سعی کر سکتے تھے۔ شاید وہ ریناٹ اور اس کے خاص ساتھیوں کے ہمراہ تھے اور وہ انہیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے۔ انہیں زیادہ مہلت نہیں دی جا سکتی تھی اس

لیے اب میں تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ میں نے ایرٹ سے کہا۔ ”ہر فرد کو جو راستے میں نظر آئے تیر سے نشانہ بناؤ ہمارے پاس دو بدو لڑائی کا وقت نہیں ہے۔“

ایرٹ سمجھ گیا تھا وہ اور اس کے دس کے قریب تیر انداز ساتھی اب تیر کمان پر چڑھائے میرے پیچھے آرہے تھے۔ میں نے نیزہ چھوڑ دیا تھا۔ اب دفاع کے لیے میرے پاس ڈھال تھی۔ حملے کا منصوبہ بناتے وقت ہم نے آگ کے حربے کو نظر انداز کیا تھا مگر اب یہ نہایت موثر ثابت ہو رہا تھا۔ آگ لگانے سے نہ صرف دشمن کا حوصلہ پست ہو رہا تھا بلکہ اس کی وجہ سے یہاں تباہی کا ماحول بن رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ماضی میں جب فوجیں کسی شہر یا آبادی پر حملہ کرتی تھیں تو آگ لگانے کا حربہ استعمال کرتی تھیں۔ مجھے اُمید تھی کہ ایزارٹ بھی اس حربے کو استعمال کر رہا ہوگا۔ دلان کے حصے میں شدت کی جنگ جاری تھی اور ایزارٹ وہاں براہِ راست کمان کر رہا تھا۔ اس خاص حصے میں میرے ساتھ پچاس کے قریب افراد آئے تھے اور ہم یہاں دشمن سپاہ کا صفایا کر رہے تھے۔ یہ حصہ ہال در ہال پر مشتمل تھا یہ بڑے ہال آر پار ایک طرف دلان کی طرف کھل رہے تھے اور دوسری طرف عقبی باغ میں کھل رہے تھے۔ میں نے باہر باغ میں جھانک کر دیکھا تو وہاں سپاہی جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ربیک کو اشارہ کیا اور اس نے اپنے آدمیوں کے ہمراہ ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ ان میں سے کچھ تیر کھا کر گرے اور باقی منتشر ہو کر بھاگ نکلے تھے۔

ہمارے اچانک حملے نے ریناٹ کی فوج میں بد حواسی اور بددلی پیدا کی تھی اور یہی میرا مقصد تھا کہ انہیں منظم اور جمع نہ ہونے دیا جائے۔ دوسرے ہال کے بعد تیسرے ہال میں جانے والا دروازہ اندر سے بند ہو گیا تھا اور میرے ساتھی اسے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے دونوں ہالوں میں موجود دشمنوں کا خاتمہ کر دیا اور میں کسی ایسے دشمن کی تلاش میں تھا جو زندہ ہو اور معلومات دے سکے۔ ایک سپاہی پر مجھے شک ہوا کہ وہ مرا نہیں تھا کیونکہ تیر اس کی کمر میں ایسی جگہ لگا تھا جہاں اسے زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا اس کے باوجود وہ ساکت پڑا تھا۔ میں نے اس کا تیر پکڑ کر ہلایا تو اس نے بے ساختہ چیخ ماری تھی میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ میں نے ربیک کو اشارہ کیا اور وہ بھاگا آیا۔ میں نے سپاہی کی کمر میں پیوست تیر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پوچھو کہ محل کے لوگ کہاں ہیں۔ ریناٹ اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟“

ربیک نے میرا سوال دہرایا تو سپاہی خاموش رہا مگر جب میں نے دوبارہ تیر ہلایا تو وہ بول پڑا۔ ”وہ لوگ حملہ ہوتے ہی اندر چلے گئے۔“

”اندر کہاں؟“

وہ جلدی جلدی کہنے لگا۔ ”تیسرے ہال کے بعد شاہی خواب گاہیں ہیں اور ان کے عقب میں ایک خاص حصہ ہے وہاں سوائے چند خاص لوگوں کے اور کوئی نہیں جا سکتا ہے۔“

”تم نے اندر جانے کو کہا ہے۔“ ربیک نے غرا کر پوچھا۔

”وہاں زمین کے نیچے ایک جگہ ہے۔“ سپاہی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”میں اتفاق سے واقف ہو گیا ہوں ورنہ جو اس جگہ کے بارے میں جان جائے اسے مار دیا جاتا ہے۔“

مجھے یاد آیا ریٹرو نے ایک خاص ہال کا ذکر کیا تھا جہاں شاہی تقریبات ہوتی تھیں۔ میں نے ربیک سے کہا۔ ”ہمیں وہیں جانا ہے۔“

ربیک نے اس سے چند سوال اور کیے اور جب محسوس کیا کہ وہ اب مزید کچھ نہیں بتا سکتا تو اس نے اچانک اس کے سر پر وار کیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ دونوں ہالوں کے دلان کی طرف کھلنے والے دروازے کھلوا دیے گئے تھے اور اب ہم باہر ہونے والی جنگ کا مشاہدہ بھی کر سکتے تھے۔ جنگ آخری مرحلے میں تھی کیونکہ ریناٹ کی فوج نے یہاں شکست تسلیم کر لی تھی اور ایزارٹ کی فوج ستونوں والی جگہ داخل ہو چکی تھی۔ پورے دلان میں جابجا دشمن سپاہیوں کی اور کچھ حریت پسندوں کی لاشیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ مگر تناسب ایک اور دس کا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کھلی جنگ میں ریناٹ اپنے ڈیڑھ سو سے زائد آدمیوں سے محروم ہو چکا تھا۔ ہمارا نقصان بیس سے زیادہ نہیں تھا مگر جذباتی لحاظ سے یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ ہمارے لیے ہر فرد قیمتی تھا۔ میں نے دلان میں دیکھا مگر مجھے ایزارٹ نظر نہیں آیا۔ وہ آگے جا چکا تھا۔

اس دوران میں میرے ساتھیوں نے تیسرے ہال کا دروازہ توڑ دیا اور اندر سے آنے والی تیروں کی بوچھاڑ سے

بچنے کے لیے پیچھے ہٹ گئے۔ ڈھال بردار یہاں بھی موجود تھے۔ اب ہم ڈھالیں اور تیر استعمال کر رہے تھے۔ تیر انداز ڈھالوں کے پیچھے رہ کر دشمن سپاہیوں کو نشانہ بنا رہے تھے اور ہم دباؤ بڑھاتے ہوئے بتدریج تیسرے ہال میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی ڈھال برداروں نے نیم دائرے میں آکر تیر اندازوں کو تحفظ دیا۔ یہ ہال بڑا تھا اور یہاں ستون بھی تھے۔ دشمن سپاہی ان ستونوں کے پیچھے سے حملے کر رہے تھے۔ ان کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ یہ شاید ان کا آخری مورچہ تھا اور اس لیے مزاحمت شدید تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے تین ساتھی ان کا نشانہ بن گئے۔ میں نے ڈھال برداروں کو آگے آنے کا حکم دیا اور ربیک سے کہا۔ ''یہاں بھی آگ لگواؤ۔ آدمیوں سے کہو کہ وہ جلتی چیزیں لا کر یہاں پھینکیں۔''

ربیک نے فوری حکم جاری کیا۔ وہ پچھلے ہالوں میں بھڑکنے والی آگ سے جلتی چیزیں لا کر اس ہال میں فرنیچر اور پردوں پر پھینکنے لگے۔ تیر انداز اپنے تیروں کو... آگ دکھا کر پردوں پر مار رہے تھے۔ چھت کے ساتھ ساتھ پرچم لٹکے ہوئے تھے ان کو بھی نشانہ بنایا تھا۔ چند ہی منٹ میں اس ہال میں بھی آگ بھڑک اٹھی تھی اور حسب توقع دشمن یہاں بھی حوصلہ ہارنے لگا۔ وہ ایک راہداری کی طرف پسپا ہو رہے تھے۔ ایک بار وہ ستونوں کی آڑ سے نکلے تو میں نے تیر اندازوں کو پوری قوت سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ حرکت میں آئے اور اچانک ڈھالوں کے پیچھے سے نکل کر تیر برساتے اور دوسرا تیر کمان پر کھینچنے کے لیے واپس ڈھال کے عقب میں چلے جاتے۔ دشمن کے نصف درجن سپاہی اور گرے تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ سب راہداری کی طرف عجلت میں پسپا ہوئے اسی عجلت میں کئی اور مارے گئے۔

میرے دستے کے سات افراد مارے جا چکے تھے ان میں رائٹون بھی شامل تھا۔ وہ ایک بار تیر چلانے کے لیے سامنے آیا تو دشمن کا تیر اس کے سینے میں اتر گیا۔ میں نے ربیک اور ایرٹ کو اس کی لاش کے پاس افسردہ دیکھا۔ میرا بھی دل دکھا تھا مگر یہ سوگ منانے کا وقت نہیں تھا۔ یہی بات میں نے ربیک اور ایرٹ سے کہی تو وہ حرکت میں آگئے تھے۔ تیسرا ہال بھی ہمارے قبضے میں آگیا تھا۔ اس کے بعد شاہی خواب گاہیں شروع ہو جاتی تھیں۔ راہداری اسی طرف جارہی تھی اور دشمن کا اس طرف پسپا ہونا بتاتا تھا کہ اگلا مورچہ وہ اسی راہداری میں لگائیں گے۔ یہ جگہ خاصی چوڑی تھی اور اس میں جا بجا لکڑی سے بنے ہوئے بڑے بڑے سائز کے گلدان اور دوسری آرائشی اشیا رکھی ہوئی تھیں اور زیادہ تر چیزیں لکڑی سے ہی بنی تھیں۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ آگ لگانے کے لیے یہاں بھی بہت کچھ تھا۔

میں نے ربیک کو اس بارے میں ہدایات دیں اور اس نے آگ سے بچ جانے والا پردے کھینچ کر ان کے گولے سے بنائے اور ان کو آگ دکھا کر راہداری میں پھینکنا شروع کر دیا۔ بیک وقت درجن افراد یہ کام کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے راہداری کا ابتدائی حصہ آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ یہاں موجود سپاہی بھی افراتفری میں پسپا ہوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ آگ سے بہت ڈرتے تھے اور جب ہم نے آگ کا حربہ استعمال کیا تو وہ گھبراہٹ میں پسپا ہوئے تھے۔ اس راہداری کے دونوں طرف کمرے تھے اور یہی شاہی خواب گاہیں تھیں۔ آخر میں جا کر راہداری دائیں بائیں طرف مڑ رہی تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ خاص ہال اسی راہداری میں دائیں طرف تھا اور وہیں ریناٹ کے ساتھ ڈیوڈ شا اینڈ کو کی موجودگی کا پورا امکان تھا۔ اسی طرف وہ تہہ خانہ تھا جس میں ریناٹ اور اس کے خاص ساتھیوں کے جانے کی اطلاع تھی۔ پسپا ہونے والے اب وہاں دائیں طرف جمع ہو رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی بائیں طرف نہیں جا رہا تھا۔ میں نے ربیک کو مزید آتش زنی سے روک دیا۔ کیونکہ آگ اگر بڑھ جاتی تو ہمارے ہی راستے کی رکاوٹ بن جاتی۔ ذرا مہلت ملی تو میں اپنے نقصان کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے پچاس ساتھی مارے گئے تھے اور میرے پاس ابھی پینتالیس کے قریب آدمی تھے ان میں سے پانچ خاصے زخمی تھے مگر وہ لڑنے پر معصر تھے۔ مگر میں نے انہیں مرہم پٹی کرنے کا حکم دیا۔ چالیس میں سے تیس اچھے تیر انداز تھے۔

ہمارے پاس اب اسلحے کی کمی نہیں تھی مارے جانے والے دشمن کا زیادہ بہتر اسلحہ بھی ہمارے ہاتھ آگیا تھا۔ اب تک ہمارا سامنا یہاں خدام اور کنیزوں سے نہیں ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یا تو بھاگ گئے تھے یا پھر ریناٹ کے ساتھ ہی اس خاص حصے میں تھے۔ ہمارا سامنا اب تک سپاہیوں

سے ہی ہوا تھا۔ میری خواہش تھی کہ کوئی ایسا آدمی ہاتھ آئے جو مجھے اس حصے کے بارے میں بتائے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں سے فرار کا اور کوئی راستہ تو نہیں تھا جہاں سے ریناٹ اور اس کے ساتھی نکل جاتے اور ہم لکیر پیٹتے رہ جاتے۔ میں نے ایرٹ اور چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور ہال کے دوسری سمت باغ میں نکلا۔ یہ بہت بڑا اور حسین باغ تھا۔ دائیں بائیں دونوں طرف سے یہ اس عمارت کے گرد گھوم رہا تھا۔

میں بائیں طرف آیا جہاں خاص حصہ تھا۔ میں یہاں عمارت میں کوئی داخلی حصہ تلاش کر رہا تھا مگر وہاں عمارت کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں اور ان میں روشن دانوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ عقب سے بھی راستہ نہیں تھا اور اس سے آگے پانی کے تالاب تھے۔ شاہی حصے سے تالابوں کی طرف جانے کا راستہ اندر سے ہی جاتا تھا اور باہر سے تالابوں تک رسائی کا کوئی راستہ نہیں تھا سوائے چھت کے، کیونکہ اوپر سے یہ تالاب کھلے ہوئے تھے۔ اصل میں یہ شاہی خاندان کے لیے مخصوص تیراکی کے تالاب تھے۔ اس معائنے کے دوران بہ ظاہر مجھے اس خاص حصے سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی خفیہ راستہ تھا تو میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں واپس آیا تو ربیک اور اس کے آدمی شاہی خواب گاہوں تک رسائی حاصل کر کے وہاں مورچے بنا چکے تھے۔ انہوں نے بھی تصدیق کی کہ آگے جانے کا واحد راستہ صرف راہداری ہے۔ میں نے ربیک سے کہا۔

''اب تم لوگوں کو بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ یہاں بہت خطرناک لوگ ہیں۔ وہ میری طرح باہر سے آئے ہیں اور ان کے پاس ایسے ہتھیار ہیں جن کا تم مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ میں ابھی آتا ہوں تب تک تم لوگ یہاں صرف پہرہ دو گے اور اپنے طور پر کوئی حرکت نہیں کرو گے۔ دوسرے اگر تم پر انوکھے ہتھیاروں سے حملہ کیا جائے تو تم اپنا بچاؤ کرو گے۔ چاہے اس کے لیے تمہیں اس جگہ سے پیچھے ہٹنا پڑے۔ یہ میرا حکم ہے اور اس کی اسی طرح تعمیل ہونی چاہیے۔''

ربیک مستعد ہو گیا۔ ''آپ بے فکر رہیں میں سمجھ گیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

میں واپس دلان کی طرف آیا۔ ابھی شاہی عمارت کی اوپری منزل کلیئر کرنا تھی مگر مجھے اُمید تھی کہ وہاں سوائے چند سپاہیوں کے اور کوئی نہیں ہوگا۔ دلان میں لڑائی ختم ہو گئی تھی البتہ ستونوں والی عمارت سے شاہی حصے کی اوپری منزل پر تیراندازی کی جا رہی تھی اور ظاہر ہے دوسری طرف سے بھی اس کا جواب دیا جا رہا تھا۔ میں نے ایک بھاری ڈھال اٹھائی اور اس کی آڑ لیتا ہوا ستونوں والی عمارت تک آیا۔ ایزارٹ کے سپاہی یہاں قابض ہو چکے تھے۔ اس لیے مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مگر اندر اتنے سپاہی نہیں تھے۔ ان میں سے بیشتر شاید آگے جا چکے تھے۔ میں نے ایک سپاہی کو روک کر پوچھا۔ ''ایزارٹ۔''

اس نے جواب دیا۔ ''وہ آگے ہے۔''

میں ستونوں والی عمارت کے دوسرے حصے کی طرف بڑھا اور یہاں مجھے شور سنائی دیا۔ آس پاس کہیں بھرپور جنگ جاری تھی۔ ہتھیار کے شور، تیروں کی سنسناہٹ اور نیزوں و لاٹھیوں کے آپس میں ٹکرانے کی آوازوں کے ساتھ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی چیخ و پکار ایک بھرپور تاثر دے رہی تھی۔ میں سامنے والے حصے میں سیڑھیوں پر آیا تو جنگ کا منظر اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ سامنے آ گیا تھا۔ ایزارٹ اور اس کے ساتھی سیڑھیوں پر تھے اور ریناٹ کی سپاہ نیچے میدان میں جمع تھی۔ وہ سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ایزارٹ اپنے ساتھیوں کے ساتھ انہیں روک رہا تھا۔ یہاں ایزارٹ کے ساتھ ڈھائی سو کے قریب افراد تھے۔ جب کہ ریناٹ کی سپاہ کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ تعداد کے لحاظ سے ان کا پلہ بھاری تھا مگر جذبے اور جگہ کے لحاظ سے ایزارٹ اور اس کے آدمی حاوی تھے۔ وہ بلندی سے زیادہ بہتر نشانہ بنا رہے تھے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ایزارٹ کے تیراندازوں کا کوئی تیر خالی نہیں جا رہا تھا۔ ریناٹ کے آدمی اس وقت بھاری ڈھالوں سے محروم تھے اور اپنی چھوٹی ڈھالوں سے دفاع کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے کیونکہ انہیں آگے بڑھ کر حملہ بھی کرنا تھا اور ڈھال سامنے رکھ کر یہ مشکل کام تھا۔ لڑنے کے لیے انہیں سامنے آنا پڑتا تو ایزارٹ کے تیرانداز انہیں نشانہ بناتے تھے۔ ایک منٹ میں درجن سے زیادہ دشمن مارے جا چکے تھے۔ دست بہ دست جنگ میں ایزارٹ کا انداز مدافعانہ تھا اور وہ صرف دشمن کو آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔ اصل کام اس کے تیرانداز کر رہے تھے۔ اچانک ہی ہماری طرف سے تیراندازی میں کمی آئی اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو خاصے تیرانداز اپنی جگہوں پر

نہیں تھے۔ میں حیران تھا کہ وہ کہاں چلے گئے۔ حملے میں کمی آئی تو دشمن کا حوصلہ بڑھا تھا اور وہ دباؤ بڑھانے لگا۔ میں بھیڑ میں ہوتا ہوا ایزارٹ تک پہنچا جو سر سے پاؤں تک خون میں نہایا ہوا تھا۔ میں نے اشارے سے پوچھا۔

''تیرانداز کہاں جارہے ہیں؟''

''چھت پر۔'' اس نے جواب دیا اور آگے بڑھنے والے ایک دشمن سپاہی کو پہلے نیزہ مارا اور پھر ڈھال مار کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔ ایزارٹ کی توجہ پوری طرح دشمنوں پر تھی اور میں نے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں آنے والے تیروں سے بچتا ہوا ستونوں والی عمارت میں آیا اور تیراندازوں کے پیچھے روانہ ہوا۔ انہوں نے کسی طرح اس کے ایک ستون سے رسی اور لکڑی سے بنی سیڑھی باندھ لی تھی اور اس سے اوپر جا رہے تھے۔ ستون ایسی جگہ تھا کہ عمارت کے آگے یا پیچھے سے نظر نہیں آتا تھا۔ تیرانداز تھوڑے وقفے سے آرہے تھے اور ایک بار مجھے موقع ملا تو میں بھی اوپر چڑھ گیا۔ چھت پر آکر میں نے دیکھا کہ پینتیس چالیس تیرانداز اوپر آچکے تھے۔ ان میں سے کچھ شاہی حصے کی دوسری منزل پر موجود تیراندازوں کے خلاف کارروائی کررہے تھے اور باقی سامنے والے حصے میں ایک قطار میں جمع ہورہے تھے۔ انہوں نے اپنے تیر کمانوں پر چڑھالیے تھے۔ مگر ابھی حملے کا آغاز نہیں کیا تھا۔

میں عقبی حصے میں آیا اور شاہی حصے کا جائزہ لیا۔ مجھے تالاب والے حصے کی خالی جگہ یہاں سے نظر آرہی تھی اور اس کے چاروں طرف موجود عمارت کی چھت اس جگہ سے کوئی پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں اس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک تیر سنسناتا ہوا میرے پاس سے گزرا۔ تیر شاہی حصے سے آیا تھا۔ جس نے مارا تھا وہ ہمارے تیراندازوں کی جوابی کارروائی کا نشانہ بن گیا۔ اس کے بعد دشمن کی طرف سے خاموشی چھاگئی۔ تیراندازوں کے کمانڈر نے اس طرف موجود تیراندازوں کو بھی اپنی طرف بلالیا اور پھر پچاس کے قریب تیراندازوں نے اچانک ہی چھت کے کنارے سے نیچے موجود دشمن کو تیروں کی باڑ پر رکھ لیا۔ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ دشمن بدحواس ہوکر پیچھے ہٹا۔ اس کے درجنوں سپاہی فرش پر پڑے اپنے ہی خون میں تڑپ رہے تھے۔ دوسری باڑ نے مزید درجنوں کو زخمی کردیا۔ دوسری طرف ایزارٹ کے آدمی جو اب تک مدافعانہ جنگ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے اچانک ہی جارحانہ انداز اختیار کیا اور دشمن پر چڑھ دوڑے تھے۔

جب ہم سرنگ سے نکل کر شاہی محل میں داخل ہورہے تھے تو صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی اور اب پوری طرح اجالا ہوچکا تھا۔ اس لیے آس پاس کا ہر منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تیراندازوں نے تیسری باڑ بھی اندھا دھند ماری اور اس کے بعد وہ سنبھل کر انفرادی نشانے لینے لگے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ریناٹ کی فوج کے سو سپاہی مارے گئے تھے یا شدید زخمی تھے۔ یعنی جنگ کے قابل نہیں رہے تھے۔ دوسری طرف ایزارٹ اور اس کے ساتھی بھی اب حملہ آور تھے۔ اس دوطرفہ مار نے اچانک ہی جنگ کا نقشہ بدل دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پیچھے والے فرار ہونے لگے تھے اور جو ہمارے آدمیوں کے سامنے تھے وہ ہتھیار پھینک کر زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ کہیں انہیں معاف کیا جارہا تھا اور کہیں ہتھیار ڈالنے پر بھی موت مل رہی تھی۔ اب معاملہ مقابلہ کرنے والی سپاہ کے ہاتھ میں تھا۔ شاید ایزارٹ نے اس بارے میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی تھی کہ ہتھیار ڈالنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ ایک سپاہی دشمن کو ہتھیار پھینکنے پر بھی قتل کرنے جارہا تھا کہ میں نے اوپر سے چلا کر کہا۔ ''نہیں۔''

سپاہی نے چونک کر مجھے دیکھا اور میں نے ہاتھ کے اشارے سے بھی منع کیا تو وہ رک گیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھنے لگا۔ ایزارٹ نے دیکھ لیا تھا اس نے چلا کر حکم دیا۔ ''ہتھیار ڈالنے والوں کو قتل نہ کیا جائے۔''

یہ سننا تھا کہ باقی لڑنے والوں نے بھی اپنے ہتھیار پھینک دیئے اور ان کی تعداد بھی دو سو کے قریب تھی۔ ایزارٹ کے آدمی انہیں گھیر رہے تھے اور جو پیچھے تھے ان کو فرار سے روک رہے تھے۔ ایزارٹ نے دوسرا حکم دیا۔ ''جو فرار کی کوشش کرے اسے پیچھا کرکے قتل کر دو۔''

یہ سن کر جو فرار ہونا چاہتے تھے وہ رک گئے۔ اس جنگ میں ریناٹ کے سو سے زیادہ آدمی مارے گئے تھے اور اتنے ہی زخمی تھے جب کہ باقی ہتھیار ڈال کر قیدی بن گئے تھے۔ میں نیچے آیا اور اب مجھے ایزارٹ سے گفتگو کے لیے ترجمان کی ضرورت تھی۔ میں واپس شاہی حصے میں آیا اور وہاں حالات جوں کے توں تھے۔ میں نے پہلے وہاں

موجود افراد کو خوشخبری سنائی کہ ہم تقریباً یہاں قابض ہو چکے ہیں اور ریناٹ کی سپاہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ پھر میں ربیک کو لے کر واپس آیا۔ ایزارٹ ستونوں والی عمارت میں موجود تھا۔ اس کے آدمی قیدی بننے والوں کو باندھ رہے تھے اور انہی سیڑھیوں کے آگے کھلی جگہ قطار میں بٹھا رہے تھے۔ اس کے کچھ آدمی اپنے زخمیوں کو دیکھ رہے تھے اور ان کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ کچھ لاشیں ایک طرف کر رہے تھے۔ میں نے ایزارٹ سے کہا۔

''اگرچہ ہم یہاں قابو پا چکے ہیں لیکن یہ مت سمجھنا کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں ابھی تمہارے دشمن باقی ہیں جو بہت خطرناک ہیں۔'' ایزارٹ نے کہا۔ ''لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر وہ اتنے ہی خطرناک ہیں تو انہوں نے اس جنگ میں حصہ کیوں نہیں لیا۔ ریناٹ نے انہیں استعمال کیوں نہیں کیا؟''

''یہ تو میں بھی سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ ڈیوڈ شا نے فی الحال جنگ میں مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ یہاں ریناٹ کی مدد کرنے نہیں بلکہ اپنے مقاصد لے کر آیا ہے اور اس کی پوری کوشش ہو گی کہ وادی کے باشندوں کا زیادہ سے زیادہ خون بہے اور وہ آپس میں لڑ کر اتنے کمزور ہو جائیں کہ اس کے اصل عزائم کے سامنے مدافعت نہ کر سکیں۔ قلعوں پر حملہ بھی اسی کی سازش ہو گی مگر جب کسی وجہ سے ریناٹ نے حملہ ملتوی کرایا تو ڈیوڈ شا اس کی مدد سے پیچھے ہٹ گیا۔''

ایزارٹ نے سر ہلایا۔ ''ہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن وہ ہیں کہاں؟''

''میرا خیال ہے وہ بھی ریناٹ کے ساتھ اسی حصے میں محدود ہیں۔ ہم نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔''

''تب اچانک حملہ کر کے ان کا خاتمہ کیوں نہ کر دیا جائے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہتھیاروں کے فرق کی وجہ سے انہیں حملہ کر کے ختم کرنا بہت مشکل ہے۔''

''اس صورت میں ان پر کیسے قابو پایا جائے؟''

میرے ذہن میں ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں سے نمٹنے کے لیے ایک خیال آ رہا تھا۔ میں نے ایزارٹ سے کہا۔ ''جب تمہارے آدمی اس کام سے نمٹ جائیں تو انہیں یہاں آتش گیر روغن کی تلاش پر لگا دو۔ یہاں بھی گودام ہیں اور ان میں لازمی یہ روغن ہو گا۔''

''میں ابھی کچھ آدمیوں کو لگاتا ہوں۔'' ایزارٹ نے جوش سے کہا شاید وہ میرا خیال بھانپ گیا تھا۔ ''اس جنگ میں میں نے دیکھا کہ آگ بہت موثر حربہ رہی ہے۔''

''تم لوگ تو جنگوں سے ہی ناواقف ہو۔ آج پہلی بار یوں جنگ لڑی ہے لیکن باہر کی دنیا میں جنگیں عام ہیں اور ان میں بھی آتش اور آتشیں ہتھیار ہی اصل کردار ادا کرتے ہیں۔''

ایزارٹ کے آدمی مرنے والوں کی لاشیں الگ الگ کر کے ان کو قطاروں میں رکھ رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی قطار انہوں نے الگ رکھی تھی اور ریناٹ کے مرنے والے سپاہیوں کی لاشیں الگ قطار میں رکھی تھیں اور یہ قطار خاصی طویل تھی۔ میں گنتی کرنے لگا۔ ہمارے مارے جانے والے ساتھیوں کی تعداد ستر کے لگ بھگ تھی۔ شدید زخمی پچاس تھے اور باقی معمولی زخمی تھے جن کے زخم لڑنے یا حرکت کرنے میں رکاوٹ نہیں تھے۔ اب ریناٹ کے آدمیوں کی لاشیں لائی جا رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ مرنے والے دو سو سے اوپر ہوں گے۔ مگر جلد تعداد دو سو سے تجاوز کر گئی اور لاشیں مسلسل آ رہی تھیں۔ یہاں بھاری سامان لانے لے جانے کے لیے ہاتھ گاڑیاں تھیں ایزارٹ کے آدمی ان پر ہی لاشیں لاد کر لا رہے تھے۔ تعداد ڈھائی سو تک پہنچی اور جب آخری لاش لا کر ڈالی گئی تو یہ تعداد دو سو ستر ہو گئی تھی۔

ڈیڑھ سو کے قریب شدید زخمی تھے اور ان میں سے کچھ کا بچنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ معمولی زخمی اور جنہوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔ ان کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔ اگر یہاں آٹھ سو سپاہی تھے تو اس کا مطلب تھا کہ ریناٹ کے پاس پچاس سے بھی کم سپاہی رہ گئے تھے۔ کچھ سپاہیوں کو میں نے فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ مگر مسئلہ ان سپاہیوں کا نہیں تھا بلکہ ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی کا تھا۔ مارے جانے اور زخمیوں کو نکال کر ہمارے پاس اب بھی دو سو سے اوپر لڑاکا تھے مگر یہ سب بھی ان چار افراد کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جو جدید ترین آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ ان کے پاس بم بھی ہوتے اور شاید واکس بم بھی تھے۔ ایزارٹ

نے اپنے جن آدمیوں کو آتشیں روغن کی تلاش پر لگایا تھا انہوں نے زیادہ دیر نہیں لگائی اور نزدیک ہی واقع ایک بڑے گودام میں نہ صرف آتشیں روغن بلکہ بہت بڑی مقدار میں غلہ اور کھانے پینے کا دوسرا سامان بھی دریافت کیا تھا۔
آتشیں روغن لکڑی کے بڑے پیپوں میں تھا اور یہ دس گیلن کے لگ بھگ روغن سے بھرے ہوئے تھے۔ ایسے پیپوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی مگر ہمارے لیے چند درجن ہی کافی تھے۔ میں نے تین درجن پیپے منگوائے۔ جب پیپے آگئے تو میں نے سب سے پہلے انہیں تالاب کے گرد موجود عمارت کی چھت پر چڑھانے کا حکم دیا۔ سپاہی چھت پر چڑھے اور پھر انہوں نے پیپے اوپر پہنچائے۔ ایک درجن پیپے اوپر پہنچانے کے بعد انہیں اس حصے پر لایا گیا جہاں میرے خیال میں نیچے وہ خاص جگہ تھی جہاں ریناٹ کی سپاہ موجود تھی۔ وہ اپنے خاص ساتھیوں سمیت تہہ خانے میں جا چکا تھا۔ میں نے یہاں روغن یوں چھت پر پھیلانے کا حکم دیا کہ یہ کہیں سے نیچے نہ جائے۔ سپاہیوں نے چھت کے پرنالے بند کردیے اور اس کے بعد پیپے الٹانے لگے۔ ذرا سی دیر میں پوری چھت روغن سے تر ہوگئی تھی۔
نیچے آکر میں نے باقی پیپے شاہی حصے میں پہنچانے کا حکم دیا۔ انہیں خاموشی اور رازداری کے ساتھ راہداری کے آخری حصے میں پہنچایا گیا جہاں اب ریناٹ کے سپاہی موجود نہیں تھے۔ وہ بالکل ہی اندرونی حصے میں جا پہنچے تھے۔ میں نے ایک پیپا فرش پر ڈلوا کر اس کی ڈھلان کا اندازہ کیا اور خوش قسمتی سے یہ اندرونی حصے کی طرف تھی۔ مگر زیادہ روغن انڈیلنے کی صورت میں واپس ہماری طرف بھی آسکتا تھا اس لیے پہلے پیپے کا روغن آگے جانے کا انتظار کیا اور جب یہ راہداری کے سرے پر واقع دروازے تک پہنچ گیا۔ تو میں نے بیک وقت دو پیپے کھلوا کر انہیں راہداری میں ذرا آگے دھکیل دیا تھا۔ جب یہ سوراخ کی حد تک خالی ہوگئے تو انہیں اوندھا کر دیا تاکہ باقی ماندہ روغن بھی نکل جائے۔ یکے بعد دیگرے اسی طرح درجن پیپے خالی کیے تو روغن راہداری کے آخری حصے میں موجود دروازے کے نیچے سے گزر کر اندر جانے لگا اور اندر ہل چل مچ گئی تھی۔ سپاہی شور مچارہے تھے اور آگ نہ لگانے کی اپیل کر رہے تھے۔ ربیک نے چلا کر کہا۔
''اگر تم لوگ جل کر مرنا نہیں چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال کر باہر آجاؤ۔''
اس پر اندر کچھ دیر کی خاموشی چھائی تھی پھر دروازہ کھلا اور ایک سپاہی سامنے آیا اسے دھکا دے کر بھیجا گیا تھا۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''اگر ہم ہتھیار ڈال دیں تو کیا ضمانت ہے کہ تم ہمیں مارو گے نہیں؟''
''احمقانہ سوال مت کرو، اگر مارنا ہوتا تو تمہیں مہلت کیوں دیتے اب تک آگ نہ لگا چکے ہوتے۔'' ربیک نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اب تمہارے پاس وقت نہیں ہے اگر فوراً ہی سب نہتے ہوکر باہر نہ آئے تو روغن کو آگ لگا دی جائے۔ بھاگنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے اور تم سب اذیت ناک موت مرو گے۔''
ربیک کی اس دھمکی نے اثر کیا اور اندر شور اٹھا تھا۔ یقیناً کچھ سپاہی ہتھیار نہ ڈالنے کے حق میں ہوں گے مگر بیشتر اپنی جان بچانا چاہتے تھے۔ شور ان کی آپس کی لڑائی اور بحث مباحثے کا تھا۔ یہ شور زیادہ دیر جاری نہیں رہا، اچانک ہی درجن سے زیادہ سپاہی دونوں ہاتھ بلند کرکے باہر آئے۔ وہ چیخ چیخ کر ہتھیار ڈالنے کا کہہ رہے تھے۔ ربیک نے اشارہ کیا۔ ''اس طرف آجاؤ۔''
وہ سب دوڑتے ہوئے اس طرف آنے لگے۔ معاً اندر سے تیر چلے اور دو سپاہی نشانہ بن کر گرے۔ مگر باقی بھاگتے ہوئے راہداری کے سرے پر آگئے اور انہیں سپاہی باہر لے جانے لگے۔ وہ سب نہتے تھے اور ان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ جنہیں تیر لگے تھے وہ بھی اٹھ کر گرتے پڑتے آگئے تھے۔ دروازے کے پار ہنگامہ جاری تھا اور پھر ایسا لگا کہ وہ آپس میں لڑ پڑے ہوں۔ کم سے کم چیخ و پکار سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ شور شرابے کے بعد ایک بار پھر دروازہ کھلا۔ پہلی بار تیر اندازی کے بعد دروازہ بند ہوگیا تھا۔ اس بار آنے والوں کی تعداد پندرہ تھی۔ ان میں سے کچھ زخمی تھے جنہیں دوسرے سہارا دیئے ہوئے تھے۔ ربیک نے ایک نوجوان کو روک لیا۔ ''اندر اور کتنے سپاہی ہیں؟''
''صرف چھ اور وہ مر گئے ہیں یا مرنے والے ہیں۔'' سپاہی نے جواب دیا۔ ''وہ ہتھیار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں بھی نہیں آنے دے رہے تھے مجبوراً ہمیں ان سے لڑنا پڑا۔''
''ریناٹ اور اس کے آدمی کہاں ہیں؟''
''وہ نیچے تہہ خانے میں جا چکے ہیں۔''

اس بار میں نے سوال کیا۔ ''تم اسی حصے کے سپاہی ہو اور تم نے یقیناً ان لوگوں کو دیکھا ہو جو باہر سے یہاں آئے ہیں۔'' میں نے سوال کے ساتھ ڈیوڈ شا، زینی، کرنل اور باسو کا حلیہ بھی بتایا۔ سپاہی نے سر ہلایا۔

''تم آسمان والوں کی بات کر رہے ہو؟ وہ بھی شاہ معظم کے ساتھ ہیں۔''

میں چونکا۔ ''آسمان والے؟''

سپاہی نے سر ہلایا۔ ''شاہ معظم نے اب مہا پجاری کا منصب بھی سنبھال لیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ان چاروں کو سینتور نے ان کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔''

میں ریناٹ کی مکاری پر دنگ رہ گیا۔ اس نے انہیں آسمانی مددگار قرار دے کر اپنے آدمیوں کو مطمئن کر دیا تھا۔ مہا پجاری فیرون کے بعد اس نے خود یہ منصب سنبھال لیا تھا۔ مگر میں سپاہی کے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے ان چاروں کو ریناٹ کے ساتھ تہہ خانے میں جاتے دیکھا ہے۔''

سپاہی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے صرف شاہ معظم کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ اس وقت ہم اس حصے سے دور تھے اور وہ چاروں اسی جگہ رہتے تھے۔ حملے سے بچنے کے لیے جب ہم اندر گھسے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔''

میرے اندر گھنٹی بجنے لگی۔ ڈیوڈ شا نہ تو احمق تھا اور نہ ہی بزدل کہ چوہوں کی طرح تہہ خانے میں جا گھستا۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرح وہ محصور ہو جائے گا۔ میں نے ربیک سے کہا۔ ''یہاں سے نکلنے والے ہر سپاہی سے معلوم کرو کہ... ان چاروں کو کس نے آخری بار کہاں دیکھا تھا؟''

ربیک میرے لہجے سے سمجھ گیا کہ معاملہ سنگین ہے۔ میں نے ربیک کے ساتھ جانے سے پہلے ایرٹ کو بلایا اور اسے ذمے داری سونپی۔ ''تم یہاں رہو گے اور اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو فوراً روغن کو آگ دکھا دو گے اور یہی کام چھت پر موجود روغن کے ساتھ کیا جائے۔ اس کے بعد تم سب کو لے کر یہاں سے نکل آؤ گے۔ لیکن بہت محتاط رہنا ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا روغن کو آگ دکھا دے۔ یہ کام بہر صورت ہماری مرضی سے ہونا ہے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا جناب۔'' ایرٹ نے یقین دلایا۔ میں اور ربیک باہر آئے۔ شاہی حصے سے پکڑے جانے والوں کو بھی ستونوں والی عمارت کے سامنے میدان میں بٹھایا ہوا تھا۔ ربیک نے وہاں جا کر انہیں الگ کرنا شروع کیا۔ ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی۔ ان کے بارے میں عام سپاہیوں سے بھی تصدیق کی گئی اور انہوں نے بتایا کہ یہ خاص حصے کے محافظ تھے، ربیک نے ان سے ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھا۔ ان میں سے بیشتر لاعلم تھے۔ چند ایک نے انہیں دیکھا تھا مگر وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ ڈیوڈ شا اس وقت کہاں ہو سکتا تھا؟ ان میں ایک نوعمر سا لڑکا تھا میں نے کئی بار محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر بول نہیں پا رہا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا اور نرم لہجے میں بولا۔

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کرتے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب میں بتانا چاہتا ہوں لیکن آپ مجھے جھوٹا مت سمجھیے گا۔''

میں نے اسے نزدیک بلوایا اور ربیک کے توسط سے کہا۔ ''تم بولو کوئی تمہیں جھوٹا نہیں سمجھے گا۔''

کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''رات میں تالاب والے حصے میں پہرے پر تھا تب میں نے ان چاروں کو چھت پر جاتے دیکھا۔ ان کے پاس بڑے بڑے تھیلے تھے۔''

میں چونکا۔ ''صرف تم نے دیکھا؟''

''جی وہاں صرف میں تھا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''چھت پر جا کر انہوں نے اپنے تھیلے کھولے اور ان سے سامان نکال کر پرندے جیسی چیز بنانے لگے۔''

''پرندے جیسی چیز؟'' میں پھر چونکا۔ ''تم کیا بتا رہے ہو؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں وہ پرندے جیسی چیز تھی۔'' نوجوان بولا اور پھر اس نے فرش پر انگلی سے خاکہ سا بنایا اور میں اچھل پڑا تھا۔ میرے ذہن میں برف والے کی آواز گونجی۔

''آج میں نے وادی کی فضاؤں میں اجنبی پرندے محسوس کیے ہیں۔''

میں حیران تھا حالانکہ یہ بالکل بھی حیرت کی بات نہیں تھی۔ دنیا میں گلائیڈر کا استعمال عام ہے اور اب تو چھوٹے انجن والے گلائیڈر بھی آگئے ہیں جو اسے بالکل جہاز کی

طرح استعمال کے قابل بنا دیتے ہیں۔ سب سے اہم بات کہ المونیم کی بنی راڈز جو ہلکی اور ٹکڑوں کی صورت میں ہوتی ہیں انہیں جوڑ کر اور مضبوط ترین پیراشوٹ چڑھا کر اسے آسانی سے گلائیڈر کی صورت دی جا سکتی ہے۔ ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھی اسی طرح نیچے آئے تھے اور اسی طرح یہاں سے کہیں چلے گئے تھے۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ شاید وہ واپس چلے گئے تھے مگر یہ ممکن نہیں تھا گلائیڈر اتنی بلندی پر نہیں اڑتے ہیں۔ چھ سات ہزار فٹ کی بلندی پر تو اڑ سکتے ہیں مگر سولہ سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر جانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی پیراشوٹ سے نیچے آئی ہو۔ مگر ان کے پاس گلائیڈر موجود تھے۔ میں نے نوجوان سے پوچھا۔

''جب انہوں نے پرندے نما چیز بنالی تو اس کے بعد کیا کیا؟''

''وہ اس سے لٹک کر دوڑتے ہوئے چھت سے اڑ گئے اور پھر معبد کی طرف چلے گئے۔'' نوجوان نے بتایا۔

''تم نے خود جاتے دیکھا تھا۔''

''میں نے خود جاتے دیکھا تھا۔'' نوجوان نے یقین سے کہا۔

ایزارٹ بھی آگیا تھا اور وہ نوجوان کے جوابات سن رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''وہ معبد کی طرف کیوں گئے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ کسی اچھے ارادے سے نہیں گئے ہیں۔''

''ریناٹ اور اس کے آدمی کہاں ہیں؟''

''وہ تہ خانے میں محصور ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انہیں زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرنی ہے لیکن اگر وہ گرفتاری نہ دیں تو ان کا انجام تم پر ہے۔''

ایزارٹ چونکا۔ ''کیا مطلب...... تم کہیں جا رہے ہو؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''معبد...... میرے ساتھ صرف ربیک، ایرٹ اور چند ساتھی ہوں گے۔''

''نہیں تم اس خطرے کا مقابلہ اکیلے نہیں کرو گے؟'' ایزارٹ نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''اس کے برعکس میں اس خطرے کا مقابلہ اکیلے بہتر کر سکتا ہوں۔ دوسروں کی موجودگی میرے لیے مسائل پیدا کرے گی۔'' میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ایزارٹ میرے پیچھے آیا۔ وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے زیادہ افراد لے کر جانا چاہیے۔ مگر میں نے انکار جاری رکھا۔ ''تم یہاں اپنا قبضہ مستحکم کرو۔ ریناٹ کے کچھ آدمی ہیں جو چھپ گئے ہوں گے انہیں تلاش کرو اور شہر میں موجود اپنے ہمدردوں کو ریناٹ کے اقتدار کے خاتمے کی اطلاع دو۔ یہاں خوراک کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو پورے شہر کو خاصے عرصے کے لیے کافی ہوگا۔ اس سے پہلے کہ یہاں لوٹ مار اور بدامنی شروع ہو چیزوں پر اپنی گرفت مضبوط کرو۔ یہ مت بھولو کہ آرگون کی فوج موجود ہے اور وہ ریناٹ کی وفادار رہے گی جب تک وہ ہمارے ہاتھ نہیں آجاتا یا مارا نہیں جاتا۔''

ایزارٹ غور سے سن رہا تھا اور مجھ سے اتفاق کر رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''مگر تمہارا یہاں ہونا بھی ضروری ہے۔''

''نہیں میرا اس فتنے کو ختم کرنا ضروری ہے جو تم لوگوں کی آزادی کے لیے ریناٹ سے کہیں بڑا خطرہ ہے۔ ریناٹ سمجھ لو اس کے مقابلے میں بچہ ہے۔''

ایزارٹ کو تعجب ہوا تھا۔ ''وہ اتنا خطرناک آدمی ہے۔''

''تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔'' میں نے کہا اور ربیک سے کہا۔ ''ایمار، مارٹ، ایرٹ اور تم میرے ساتھ چلو گے۔''

''میں ابھی ان کو بلاتا ہوں۔'' ربیک چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ان تینوں کو لے آیا تو میں نے ایزارٹ سے کہا۔

''یہاں ایک لڑکی روبیر ہو سکتی ہے۔ وہ میرے ساتھ تھی پھر اسے آرگون کے سپاہی اغوا کر کے لے گئے۔ اسے تلاش کرو اور اس کا ایک محبوب بھی ہے جو آرگون کی فوج میں سپاہی تھا۔ اس کا نام شاہین ہے۔ مگر یہ سب فرصت سے کرنے والے کام ہیں اصل کام وہی ہیں جو میں نے تم سے کرنے کو کہا ہے۔ سمجھ لو کہ آرگون اور اس کے باسیوں کا مستقبل اب تمہارے شانوں پر ہے۔''

''میں دیکھوں گا۔'' ایزارٹ نے کہا۔ ''یہاں افرادی قوت کم ہے میں سوچ رہا ہوں کہ شہر میں جانے والے اپنے آدمیوں کو بلوالوں۔''

''بالکل اور جو زخمی ہیں ان کو علاج کے لیے یہاں سے منتقل کرو۔ علاج کی سہولتیں بھی شہر میں ہوں گی۔

''قیدیوں کا کیا کرنا ہے؟''

''انہیں قید خانے میں ڈال دو اور جو زخمی ہیں ان کا علاج کرا دُ۔ یہ بہرحال تمہارے ہی بھائی بندے ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے ربیک، ایرٹ، ایمار اور مارٹ کا معائنہ کیا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھے اگر زخم بھی آئے تھے تو معمولی درجے کے تھے اور ان کا لباس بھی صاف ہی تھا کیونکہ وہ دست بہ دست لڑنے کے بجائے تیر اندازی کر رہے تھے۔ البتہ میرا لباس خراب ہو رہا تھا۔ ربیک نے میرے لیے ایک نئی اور صاف وردی کا بندوبست کیا۔ میں نے شاہی تالاب میں چند ڈبکیاں لگا کر خود کو صاف کیا اور نیا لباس پہن کر خاصا بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ ہم نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب بھوک لگ رہی تھی۔ شاہی باورچی خانے میں کھانے کو اتنا تھا کہ پوری فوج کا پیٹ بھرا جا سکتا تھا مگر یہ اعلیٰ درجے کی خوراک صرف چند لوگوں کے لیے تھی اور یقیناً اس کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہوگا۔

ایزارٹ میری ہدایات کی روشنی میں احکامات دے رہا تھا اور خود نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے اب تک خون میں بھیگا ہوا لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا اور ایسے چلتے پھرتے کھا لیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں لیڈر ثابت ہو رہا تھا۔ اسے یوں دیوانوں کی طرح مصروف اور پُرعزم دیکھ کر اس کے آدمیوں کا جوش و جذبہ کم نہیں ہوا تھا بلکہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دن اب پوری طرح نکل آیا تھا اور دوپہر کا آغاز ہو گیا تھا۔ آرام کے وقفے اور خوراک نے ہمیں تازہ دم کر دیا تھا۔ شاہی محل کی ملازموں والی عمارت سے تقریباً دو سو ملازمین تھے۔ ان میں کنیزیں اور غلام دونوں شامل تھے۔ انہیں فی الحال اسی جگہ نظر بند کر دیا تھا اور انہوں نے بتایا تھا کہ رات کے وقت شاہی محل میں دو درجن کے قریب خادم اور کنیزیں ہوتی ہیں۔ وہ یقیناً ریناٹ، اس کے خاندان اور ساتھیوں کے ہمراہ تہہ خانے میں چلے گئے تھے۔ اسی وجہ سے ہمیں اوپر کوئی خادم مرد یا عورت نہیں نظر آیا تھا۔

ربیک، ایرٹ، ایمار اور مارٹ تیار ہو کر آگئے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''ہم ایک بہت خطرناک مہم پر جا رہے ہیں جو اس ساری قتل و غارت گری سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم چاروں اپنی مرضی سے میرے ساتھ چلو۔ اگر تم انکار کرتے ہو تو میں بہ خوشی تمہیں چھوڑ جاؤں گا۔''

''ایسا مت کہیں۔'' ربیک نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ ''ہمارا جینا مرنا اب آپ کے ساتھ ہے۔''

''جہاں آپ وہاں ہم۔'' ایرٹ بولا۔

''میں آپ کے ساتھ میدانِ جنگ میں رہنا پسند کروں گا بہ نسبت آپ کے بغیر اپنے گھر میں رہوں۔'' ایمار بولا اور مارٹ نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔ ربیک نے کہا۔

''اگر رائٹون زندہ ہوتا تو وہ بھی آپ کو چھوڑ کر نہ جاتا۔''

میں ان کے جذبات سمجھ رہا تھا۔ وہ چاروں اتنی شدت سے میری ذات سے وابستہ ہو گئے تھے کہ اب چھوڑنا بھی چاہتے تو چھوڑ نہیں سکتے تھے اور خاص طور سے اس موقع پر تو قطعی نہیں جب میں موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں تمہارے جذبات اور خلوص کو سمجھ رہا ہوں لیکن میری درخواست ہے کہ ایک بار پھر سوچ لو۔ اب تک ہم وادی کے لوگوں کے لیے لڑ رہے تھے مگر یہ میرے ذاتی دشمن ہیں۔''

''جو آپ کا دشمن ہے وہ میرے لیے ذاتی دشمن سے بڑھ کر دشمن ہے۔'' ربیک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''یہ طے ہے کہ ہم آپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔''

وہ چاروں تیار تھے۔ تیروں سے بھرے ترکش، نئی اور بہتر کمان جو ریناٹ کے سپاہی استعمال کرتے تھے۔ نیزے اور لاٹھیاں لے کر ہم روانگی کے لیے تیار تھے۔ ایزارٹ ہمارے ساتھ سرنگ کے دہانے تک آیا۔ میں نے کچھ سامان اور بھی لیا تھا اس میں خوراک بھی شامل تھی۔ ایزارٹ اب بھی چاہ رہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلے مگر میں نے اسے واپس جانے پر مجبور کیا اس کی ضرورت شہر میں کہیں زیادہ تھی۔ ہم سرنگ میں داخل ہوئے تو وہاں تاریکی تھی کیونکہ اندر جلنے والی مشعلیں کب کی بجھ چکی تھیں اور کوئی نئی مشعلیں لگانے والا نہیں تھا۔ ہم نے اپنے ساتھ لائی مشعلیں روشن کر لیں اور آگے بڑھنے لگے۔ کچھ آگے گئے ہوں گے کہ بیل گاڑیاں اور ان سے بندھے جانور ملے۔ مگر گاڑیاں سامان یا انسانوں سے خالی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی وجہ سے یہ جانور آزاد ہو گئے تھے اور گاڑیوں سمیت سرنگ میں چلے آئے تھے۔ میری چھٹی حس کہنے لگی کہ معبد کے لوگ کسی حادثے سے دوچار ہو چکے تھے۔ ورنہ یہ جانور

یوں لاوارث نہ پھر رہے ہوتے۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں نے مشعلیں بجھانے کو کہا۔

''ہم ہوادانوں سے آنے والی معمولی روشنی کے سہارے آگے جائیں گے۔ اگر دشمن دہانے کے آس پاس ہوا تو مشعلوں کی روشنی سے ہوشیار ہوسکتا ہے۔''

روشنی بجھی تو چند لمحے تک کچھ نظر نہیں آیا کیونکہ ہم اتنا دور نکل آئے تھے کہ عقب میں سرنگ کا داخلی دہانہ بھی نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی دوسری طرف کا دہانہ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ ہوادانوں سے آنے والی معمولی روشنی میں ہماری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں اور ہم آگے روانہ ہوئے۔ ہم ہر ممکن خاموشی اور احتیاط سے سفر کر رہے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ عجیب سی آواز میں نے پہلے سن لی۔ آواز مدھم تھی مگر رہ رہ کر ابھر رہی تھی۔ میں رک گیا اور اشارے سے اپنے ساتھیوں کو بھی رکنے کو کہا۔ ساتھ ہی میں سماعت پر پورا زور دے رہا تھا۔ اس بار مجھے آواز نزدیک سے آئی اور پھر مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے کیونکہ یہ ہارن کے بھاری قدموں کی چاپ تھی۔

پھر کوئی تین سو گز دور ایک ہیولہ سا نمودار ہوا۔ وہ ہماری طرف ہی آرہا تھا میرے ساتھیوں نے بھی چاپ کی آواز سن لی تھی اور وہ ہارن سے واقف تھے اس لیے ہم افراتفری میں پیچھے ہٹنے لگے۔ ہم کوشش کر رہے تھے کہ ہمارے قدموں کی آہٹ نہ ابھرے۔ ہارن کے کان تیز ہوتے ہیں اور یہ معمولی سی آواز بھی سن لیتا تھا۔ چاپ سے لگ رہا تھا کہ ہارن بھی سست روی سے آرہا ہے شاید اسے بھی صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر عجلت میں پیچھے ہٹتے ہوئے کسی کا پاؤں زمین پر پڑی کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ چیز دیوار سے ٹکرائی تو خاصی آواز بلند ہوئی تھی۔ یہ آواز ہارن کے کانوں تک گئی اور وہ خوفناک انداز میں غرایا۔ فوراً ہی چاپوں کی آواز تیز ہوئی اور میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''بھاگو۔''

ہم پلٹ کر بھاگے اور عقب سے ہارن کے بھی دوڑنے کی آواز آئی۔ اس نے ہماری موجودگی بھانپ لی تھی اور اب تیز رفتاری سے آرہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سرنگ میں ہارن جیسی بلا سے سامنا ہوگا جہاں بھاگنے کا راستہ بھی ایک ہی تھا۔ ہم گاڑیوں کے پاس پہنچے تو ہماری آمد سے پہلے بیل نما جانور ہارن کی آمد سے باخبر ہوگئے تھے اور وہ عجلت میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اسی عجلت میں انہوں نے گاڑیاں آپس میں بھڑا کر وہی کام کیا تھا جو معروف سڑکوں پر عجلت پسند ڈرائیور کر کے ٹریفک جام کر دیتے ہیں۔ ہم نے گاڑیاں پھلانگیں اور دوسری طرف اترتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ ''گاڑیوں کو آگ لگا دو۔''

ایک مشعل جلائی اور اس سے دوسری مشعلیں جلا کر ہم گاڑیوں پر پھینکنے لگے۔ اس وقت ہارن کوئی دو سو گز دور تھا۔ روشنی میں اسے بہتر نظر آیا تو اس کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ جانور اب نکلنے کے لیے زور لگا رہے تھے اور مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں وہ گاڑیوں کو نہ نکال لے جائیں اس لیے ہم ان جانوروں کو کھولنے لگے اس دوران میں گاڑیوں کی خشک لکڑی نے آگ پکڑ لی تھی اور ان سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ جانوروں کو آزاد کراتے ہی ہم ان کے ساتھ بھاگے۔ عقب میں ہارن کے غرانے کی آواز بڑھ گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ رک گیا تھا مگر گاڑیوں کے اس پار آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے رفتار تیز کی۔ معاملہ صرف ہماری زندگی کا نہیں تھا اگر یہ عفریت سرنگ سے نکل آتا تو وہاں نہ جانے کیا تباہی پھیلاتا۔ دوسری طرف موجود افراد کو اس سے خبردار کرنا لازمی تھا۔ ہم سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے اس لیے تین منٹ میں سرنگ کے دہانے تک پہنچ گئے۔

ربیک اور ایرٹ نے باہر نکلتے ہی لوگوں کو چلا چلا کر ہارن کے خطرے سے خبردار کرنا شروع کر دیا ساتھ ہی وہ تیر اندازوں کو بھی پکار رہے تھے۔ شاہی محل کے احاطے کی دیوار میں موجود ایک چھوٹا دروازہ تھا ہم اسی سے باہر آئے تھے۔ وہ دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ تیر انداز دیوار پر چڑھ رہے تھے جہاں سے وہ ہارن کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ میں فکرمند تھا کہ وہ سرنگ سے نکل کر کہیں آبادی والے حصے کی طرف نہ چلا جائے۔ وہاں سارے عام لوگ تھے اور وہ اس بلا کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ فصیل سرنگ کے دہانے سے دور تھی اور اتنی دوری سے تیر اس پر زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوتے۔ میں نے ربیک سے کہا۔ ''کم سے کم ایک درجن تیر انداز بلاؤ۔ ہمیں باہر جا کر اسے روکنا ہوگا۔ ورنہ وہ آبادی کی طرف چلا جائے گا۔ جلدی کرو۔''

ربیک اندر کی طرف لپکا تھا وہ چیخ چیخ کر تیر اندازوں کو بلا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ ہارن معبد میں قید ہارن تو نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہ ایک سرنگ کی مدد سے تہہ

خانے میں موجود کنویں تک لایا گیا تھا اور کنویں سے اسے نکالنا بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ جنگل سے سرنگ میں آیا تھا مگر یہ جنگل سے سرنگ میں کیسے آسکتا تھا۔ اس کی صرف ایک صورت تھی کہ معبد کے گرد موجود فصیل کسی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی اور اس سے ہارن اندر آیا اور پھر سرنگ میں آگیا۔ شاید اسی ہارن نے معبد میں تباہی مچائی تھی اور اس کے نتیجے میں بیل نما جانور گاڑیوں سمیت بھاگ کر سرنگ میں آگئے تھے۔ کچھ دیر میں ربیک ایک درجن تیر اندازوں کے ساتھ آیا مگر جب انہیں پتا چلا کہ انہیں ایک ہارن کے سامنے جا کر اس کا شکار کرنا ہے تو ان کے چہرے سفید پڑ گئے تھے حالانکہ وہ ریناٹ کی خاص سپاہ سے لڑتے وقت خوفزدہ نہیں ہوئے تھے۔ میں نے ربیک کے توسط سے انہیں حوصلہ دیا۔

''یہ صرف ایک جانور ہے اور اگر سب مل کر اس پر تیر برسائیں تو یہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔''

فصیل پر موجود سپاہیوں میں ہل چل مچی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہارن سرنگ کے دہانے سے نکل آیا۔ میں نے انہیں تیر اندازی سے منع کیا ورنہ ہارن بدک کر بھاگ جاتا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ احاطے کی طرف آئے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہارن کو اپنی جھلک دکھائی جاتی۔ میں نے دروازہ کھلوایا اور باہر آیا تو ہارن کوئی تین سو گز کی دوری پر موجود تھا۔ ربیک اور دوسرے تیر انداز بھی باہر آگئے تھے۔ میں نے انہیں حکم دیا۔ ''جب یہ نزدیک آئے اور میں تیر چلاؤں تو سب اس پر تیر چلائیں۔ اس کے چہرے اور سینے کا نشانہ لیں۔''

ہارن پہلے ہی ہمیں دیکھ چکا تھا۔ میری آواز پر وہ بھیانک سی غراہٹ کے ساتھ ہماری طرف لپکا۔ سب نے تیر کمانوں پر کھینچ لیے۔ انسانوں پر ہمارے تیر سو گز کی دوری تک کارآمد ہوتے تھے مگر ہارن کہیں زیادہ مضبوط اور جاندار تھا۔ اس لیے میں اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ گھوڑے کے مقابلے میں ہارن پاؤں سمیٹ کر نہیں بلکہ باہر کی طرف اچھالتے ہوئے دوڑتا تھا۔ اس کے دوڑنے کا یہ انداز اتنا بھیانک تھا کہ میرے ساتھی غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹنے لگے اور جو فصیلوں پر تھے وہ بھی ڈر گئے تھے۔ ہارن سو گز کی دوری پر تھا کہ میں نے اللہ کا نام لے کر تیر چھوڑا۔ میرا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا اس لیے میں نے اس کے چوڑے سینے کو نشانہ بنایا اور تیر ٹھیک سینے میں لگا۔ اسے جھٹکا لگا تو اس کی رفتار میں کمی آئی۔ فوراً ہی اس پر تیروں کی بوچھاڑ ہوگئی تھی۔ وہ ہاتھوں کی مدد سے اپنا چہرہ تیروں سے بچا رہا تھا۔ مگر تیر دو الگ الگ سمتوں سے آ رہے تھے۔ ابھی وہ ستر پچھتر گز کے فاصلے پر تھا اور درجنوں تیر اس کے جسم میں اتر چکے تھے۔ ایک اس کی گردن میں اتر کر پار ہو گیا تھا۔

ہارن کی رفتار کم ہوئی تھی اور ہر تیر کے بعد یہ مزید کم ہو رہی تھی مگر وہ رکا نہیں تھا۔ میں خود اس دوران میں اس پر مزید دو عدد تیر چلا چکا تھا اور باقیوں کی رفتار مجھ سے زیادہ ہی تھی۔ ہر سیکنڈ تین چار تیر اس کے جسم میں اتر رہے تھے اور اب وہ پچاس گز کی دوری پر تھا۔ میرے ساتھی اس پر تیر مارتے ہوئے دروازے کی سمت سمٹ رہے تھے۔ میں نے کمان پر چوتھا تیر چڑھایا اور اسے کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف جانے کی بجائے مخالف سمت میں سرکنے لگا۔ ہارن زیادہ آدمیوں کی طرف جا رہا تھا اور اس نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ میرا نشانہ اس کا چہرہ تھا اور میں نے کمان کی تانت پوری قوت سے کھینچ رکھی تھی اور اس کے مزید نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شدید زخمی ہو چکا تھا اور اس کے جسم سے دھاروں کی صورت میں خون بہہ کر پتھر سے بنے فرش پر پھیل رہا تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ واضح تھی مگر انسان دشمنی میں وہ بالکل اندھا ہو کر خودکشی والے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اب اس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ میں نے بیس گز کے فاصلے سے اس پر تیر چھوڑا جو اس کی آنکھ کے نیچے رخسار میں گھس گیا اور سر کے عقبی حصے سے اس کا سرا نکلا تھا۔ وہ جھٹکے سے رکا آگے کی طرف جھکا اور پھر پُرشور انداز میں منہ کے بل گرا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کر آخری حملہ کر رہا ہو۔ میرے ساتھی بھڑک کر دروازے میں گھسے تھے۔ مگر ہارن جان سے گزر چکا تھا۔ میرا تیر اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا تھا۔ دراصل یہ براہِ راست اس کے دماغ میں لگا تھا اور فوری موت کا سبب بن گیا تھا۔ میں نے ذرا فاصلے سے اس کا معائنہ کیا اور بلند آواز میں اس کی موت کا اعلان کیا تو سب نے شور مچا کر ہارن کی موت کا جشن منایا تھا۔ ربیک اور ایریٹ آ کر مجھ سے لپٹ گئے۔

''آپ نے پھر کمال کر دیا۔'' ربیک پُرجوش لہجے

میں بولا۔

''کمال تو سب نے مل کر کیا میں نے بس آخری تیر مارا تھا۔'' میں مسکرایا اور پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''یہ شاید پہلا ہارن ہے اور اس کے پیچھے مزید ہارن یا دوسرے خطرناک درندے اس طرف آسکتے ہیں۔''

یہ خدشہ ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس وقت آبادی سے دوسرے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے جنہیں ایزارٹ ڈتے داریاں دے رہا تھا۔ ہارن کے مارے جانے کے وقت وہ بھی آگیا تھا اور جب میں نے اسے اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو وہ بھی متفکر ہو گیا۔ ''اس کا مطلب ہے ہمیں سرنگ بند کرنا پڑے گی۔''

''بالکل اور یہ کام بہت جلد کرنا ہوگا۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''اس کا مطلب ہے تم لوگ بھی اب معبد نہیں جا سکو گے؟''

''یہ تم سے کس نے کہا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم لازمی جائیں گے مگر اب ان جانوروں سے نمٹنے کی تیاری کر کے جائیں گے۔''

ایزارٹ چونکا۔ ''وہ کیسے؟''

''ہمارے پاس ایسا محلول ہے جس کے پینے سے پسینے میں ایسی بُو آتی ہے جس سے ہارن سمیت تمام خوفناک جانور بدکتے ہیں اور نزدیک نہیں آتے۔ ہمارے پاس وہ محلول ہے۔''

''تب تم لوگوں نے سرنگ میں کیوں نہیں پیا؟''

''کیونکہ وقت نہیں تھا۔ اس محلول کو پینے کے کچھ دیر بعد جسم سے بُو آتی ہے۔ اب ہم پہلے پی کر روانہ ہوں گے۔ تم فوری طور پر سرنگ بند کرنے کا بندوبست شروع کرو۔''

ایزارٹ پریشان ہو گیا۔ ''میرے پاس اتنے آدمی نہیں ہیں۔''

''ریناٹ کے جو آدمی قیدی بنے ہیں ان سے کام لو۔ مٹی پتھر لکڑی جو بھی چیز ملے اسے دہانے میں بھرنا شروع کر دو۔''

''ٹھیک ہے ہم دہانہ بند کر دیں تو تم لوگ کیسے واپس آؤ گے۔''

''ہم معبد سے نکل کر جنگل سے ہوتے ہوئے آئیں گے۔ یعنی اب آرگون کے پھاٹک سے اندر داخل ہوں گے۔''

ایزارٹ نے فوری طور پر سرنگ کا دہانہ بند کرنے کا حکم دیا اور اس مقصد کے لیے قیدیوں کو بلالیا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنے پاس موجود بوتلوں سے محلول پیا۔ میں نے ربیک سے بڑی مشعلوں کا انتظام کرنے کو کہا تاکہ جانوروں کو بھگانے کے لیے ہمارے پاس آگ کا حربہ بھی ہو۔ دو شاخ والی لکڑیاں اور ان پر کپڑا لپیٹ کر اسے روغن سے تر کر لیا تھا۔ کچھ روغن ہم لوگوں نے ساتھ لیا۔ اس دوران میں قیدی آ گئے تھے اور ان کے ساتھ دوسرے بھی تھے۔ سرنگ بند کرنے کے لیے گاڑیوں میں مٹی پتھر بھر کر لانا شروع کر دیا تھا اور اسے ڈھلان سے اندر پھینکا جا رہا تھا۔ کچھ افراد اسے مزید آگے پہنچانے میں لگ گئے تاکہ سرنگ اچھی طرح بند ہو اتنی ہی بند نہ ہو کہ جانور اسے کھود کر باہر آ جائیں۔ وہ لوگ پوری منصوبہ بندی سے کام کر رہے تھے۔ ایزارٹ ایک بار پھر ہمیں چھوڑنے آیا اور اس بار وہ سرنگ کے اندر بھی آیا۔ اس نے کہا۔

''میں نے شہر سے اپنے آدمی بلوا لیے ہیں اور شدید زخمیوں کو علاج کے لیے شہر منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔''

''ریناٹ اور اس کے ساتھیوں کو باہر نکالنے کے لیے کیا کیا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ شہر پر اپنی گرفت مضبوط کر لوں اس کے بعد اس کی طرف توجہ دوں۔''

''اگر وہ کسی طرح سے نکل گیا تو؟''

''اگر کوئی اور راستہ ہے تو وہ اب تک نکل چکا ہوگا اور کوئی راستہ نہیں ہے تو وہ وہیں ملے گا۔''

میں نے سر ہلایا اور مشورہ دیا۔ ''اپنے آدمیوں کو فصیل کی طرف بھیج دو اور وہاں تعینات آدمیوں کو بلوا لو۔ اس وقت فصیل اور دروازے پر تربیت یافتہ اور تجربے کار لوگ ہونے چاہئیں۔ ممکن ہے ریناٹ کسی ذریعے سے فوج تک پیغام بھیجنے میں کامیاب ہو جائے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ سرنگ کے کام سے فارغ ہوتے ہی سب سے پہلے یہی کرتا ہوں۔'' ایزارٹ نے کہا اور چلا گیا۔ ہم سرنگ میں آگے بڑھنے لگے۔ محلول پیے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہو چکے تھے اور ہمارے جسموں سے بُو آنے لگی تھی۔ مگر یہ زیادہ تیز نہیں تھی۔ اسے تیز کرنے

کے لیے ہم نے تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ اس سے پسینا آتا اور بو تیز ہو جاتی۔ دوسرے فاصلہ بھی جلد کٹتا۔ ہم نے چھوٹی مشعلیں جلالی تھیں۔ ان کی روشنی میں تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ درمیان میں جلائی جانے والی گاڑیاں راکھ ہو چکی تھیں اور اس راکھ سے اب حدت اٹھ رہی تھی۔ ہم اس سے بچتے ہوئے آگے آئے۔ ہارن بھی آگ سے ڈرتا ہے مگر وہ انسان دشمنی میں آگ پھلانگ کر دوسری طرف آگیا تھا۔ اگر ہم جرأت سے کام لے کر اسے ہلاک نہ کرتے اور وہ آبادی کی طرف نکل جاتا تو نہ جانے کتنی تباہی پھیلاتا۔

میں نے خاصا سوچا تھا مگر اب تک سمجھنے سے قاصر تھا کہ ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھی معبد کی طرف کیوں گئے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا اور اب وہ وہاں کیا کر رہے تھے۔ بھرپور قوت رکھنے کے باوجود انہوں نے ریناٹ کی کوئی مدد نہیں کی اور ہمارے حملے سے پہلے اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم اب اتنا آگے آگئے تھے کہ سرنگ کا دوسرا دہانہ نظر آنے لگا تھا۔ روشنی دیکھتے ہی ہم نے مشعلیں بجھا دی تھیں۔ اب احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر جیسے جیسے ہم روشنی کے پاس ہو رہے تھے مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا اور جب ہم اتنے نزدیک آئے کہ صاف نظر آنے لگا تو پتا چل گیا کہ کیوں اور کیا عجیب لگ رہا تھا۔ سرنگ معبد میں نہیں نکل رہی تھی بلکہ یہاں اس کی چھت گر گئی تھی اور معبد کی طرف جانے والا راستہ بند ہو گیا تھا۔ البتہ چھت گرنے سے جنگل کی طرف سے ایک راستہ سرنگ میں کھل گیا تھا۔ اوپر سے گرنے والی مٹی، پتھر اور دوسری چیزیں اتنی زیادہ تھیں کہ انہوں نے سرنگ بھر دی تھی اور ان کے گرنے سے اوپر سے نیچے تک ایک ڈھلانی راستہ بن گیا تھا۔ یہ راستہ باہر جنگل میں نکل رہا تھا اور ہارن اسی طرف سے سرنگ میں داخل ہوا تھا۔ تب معبد میں کیا ہوا تھا اور وہاں کس نے تباہی پھیلائی تھی۔ اس سوال کا جواب واضح تھا۔ یہ ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کی کارروائی تھی۔

”یہ تو سرنگ کی چھت گر گئی ہے۔“ ریبک نے کہا۔

”میرا نہیں خیال کہ چھت گری ہے۔“ میں نے ملبے کے نزدیک جاتے ہوئے کہا۔ ”یہ اصل میں گرائی گئی ہے۔“

”اسے کون گرا سکتا ہے اور کیوں گرانے لگا؟“ ایرٹ تعجب سے بولا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”ڈیوڈ شا کے پاس ایسی چیزیں ہیں جو اس سے بڑی تعمیر کو تباہ کر سکتی ہیں۔ سرنگ گرانے کا مقصد ایک تو معبد کی طرف جانے والا راستہ بند کرنا اور دوسرے جنگل کے خطرناک جانوروں کو شہر کی طرف جانے کا راستہ دینا تھا۔ ہارن اسی راستے سے سرنگ میں آیا ہوگا۔“

اس گفتگو کے دوران ہم باہر دیکھ رہے تھے۔ ڈھلان آڑی ترچھی تھی مگر چڑھنے اور اترنے کے قابل تھی تب ہی تو ہارن جیسا بھاری بھرکم جانور نیچے اتر آیا۔ میں پہلے اوپر چڑھا اور پتھروں اور گرنے والی جھاڑیوں کی شاخوں کا سہارا لے کر تقریباً پچاس فٹ اوپر آیا۔ جنگل میرے سامنے تھا میں نے اشارے سے ان سب کو بھی اوپر بلایا اور خود اب زیادہ احتیاط سے اور بنا آہٹ کے باہر جانے لگا۔ آس پاس جانوروں کی موجودگی عین ممکن تھی۔ جنگل میں یہ خاصا بڑا حادثہ تھا کہ زمین کا ایک بڑا حصہ

ایک چھوٹی سی چڑیا ہوتی ہے۔ جسے ہمنگ برڈ کہتے ہیں۔ بہت خوب صورت اور اس کا وزن صرف اتنا ہوتا ہے جتنا ایک روپے کا سکہ۔ آپ اسے قدرت کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔

ایک شعر ہے۔ ”میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے“۔

اس دنیا میں نہ جانے کتنے بے گھر ہوں گے جن کی یہی خواہش ہوگی لیکن خواہش پوری کہاں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایسے بے شمار گھر ہیں جو خالی پڑے رہتے ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ امریکا میں بے گھر لوگوں سے کہیں زیادہ خالی گھر موجود ہیں۔ یعنی ان گھروں کو تقسیم کر دیا جائے تو امریکا میں کوئی بے گھر نہ رہے۔ آسمان پر بادلوں کے درمیان کوندتی ہوئی بجلی، کیسا منظر ہوتا ہے اور جب یہ بجلی گر جائے تو محاورتاً نہیں حقیقتاً لیکن عورتوں کے لیے ایک خوشی کی خبر یہ ہے کہ مرد حضرات آسمانی بجلی سے عورتوں کی نسبت چھ گنا زیادہ زد میں آتے ہیں۔ یعنی مردوں پر بجلی زیادہ گرا کرتی ہے۔

مرسلہ: سرمد علی۔ لاہور

اندر دھنس گیا تھا اور جانور جو آس پاس موجود ہوں گے وہ تجسس میں ضرور اس طرف آئے ہوں گے۔ جیسے ہارن آیا تھا۔ جب میرے ساتھی اوپر آئے تو میں نے انہیں بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ یہاں جھاڑیاں تھیں اور ان جھاڑیوں سے مجھے وہ خوش رنگ پرندہ نظر آیا جو زہریلے تیر برساتا تھا۔ وہ ایسی ہی جھاڑیوں میں رہتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ واپس جھاڑیوں میں گھس گیا۔میں نے ڈھال سنبھال لی۔

''ہوشیار یہاں زہریلے کانٹوں والا پرندہ ہے۔''

میرا اندازہ تھا کہ سرنگ جہاں سے تباہ کی گئی وہ جگہ معبد سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یعنی معبد کے گرد موجود فصیل آس پاس سے نظر آنی چاہیے تھی۔ مگر جہاں میں تھا یہاں سے فصیل نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا اور ایک کسی قدر بلند نظر آنے والے درخت کی طرف بڑھا۔ یہاں درخت اونچے کم تھے اور پھیلے ہوئے زیادہ تھے۔ نزدیک آکر میں نے ربیک کو دیکھا اور وہ میرا مطلب سمجھ کر اوپر چڑھنے کی تیاری کرنے لگا اسے یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ ہمیں کیا تلاش کرنا ہے۔ اس نے اپنا سامان اتار کر رکھا اور شاخوں کو پکڑتے اور پاؤں جماتے ہوئے اوپر چڑھنے لگا۔ تقریباً تیس فٹ کی بلندی پر پہنچ کر اس نے شمال کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے معبد کی سمت بتائی۔ پھر وہ نیچے اترنے لگا اور نیچے آکر آہستہ سے بولا۔ ''معبد یہاں سے دو سو قدم دور ہے مگر درمیان میں جھاڑیاں ہیں اور ان جھاڑیوں میں زہریلے کانٹے برسانے والا پرندہ رہتا ہے۔''

''کوئی ایسی جگہ جہاں یہ جھاڑیاں نہ ہوں؟''

''اس جگہ سے تو نظر نہیں آئی۔'' ربیک نے جواب دیا اور شمال مغرب کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں سمت جا کر دیکھنا ہوگا۔''

ایرٹ، ایمار اور مارٹ تیر کمان لیے محتاط تھے اور ہر طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے اس طرف چلتے ہیں۔''

جھاڑیاں وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ معبد کی فصیل کے گرد یہ جھاڑیاں جان بوجھ کر لگائی اور بڑھائی گئی تھیں تاکہ خوش نما لیکن قاتل پرندہ آکر یہاں بسے اور اس کی وجہ سے دوسرے جانور معبد کی فصیل کے پاس آنے سے گریز کریں۔ مجھے یاد ہے معبد سے فرار کے بعد میں جس راستے سے باہر آیا تھا اس پر بھی یہ جھاڑیاں موجود تھیں اور جنگل مغرب کی طرف ملا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت میرا واسطہ اس پرندے سے نہیں پڑا تھا۔ ہم جھاڑیوں میں ایسی جگہوں سے گزر رہے تھے جہاں خلا زیادہ تھا اور تنگ راستوں سے گزرنے سے گریز کر رہے تھے۔ چلتے ہوئے ہماری کوشش تھی کہ آہٹ نہ پیدا ہو۔ چند سو گز سفر کے بعد جھاڑیاں ختم ہونے لگیں اور یہاں سے اونچے درختوں والے جنگل کا آغاز ہوا تھا۔ کہیں کہیں خالی جگہیں تھیں جہاں گھاس پھونس اور چھوٹے پودے اگے ہوئے تھے۔ ایسی ہی ایک جگہ ہمیں ایک چھوٹا ہارن دکھائی دیا۔ چھوٹا ان معنوں میں کہ وہ بلوغت کے آس پاس تھا اور اس کا سائز ابھی خاصا کم تھا یوں سمجھ لیں کسی صحت مند خچر کے برابر ہوگا۔ وہ زمین سے چھوٹے پودے اکھاڑ کر کھا رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی ہم نے راستہ بدل لیا اور دور جانے لگے۔ ایک ہارن یہاں تھا تو دوسروں کی موجودگی بھی ممکن تھی۔ ویسے بھی ہارن کا گڑھ یہی علاقہ تھا۔ ہم مغرب کی طرف جا رہے تھے مگر ساتھ ہی شمال کی طرف بھی گھوم رہے تھے۔ تاکہ معبد سے زیادہ دور نہ ہوں۔ کوئی نصف میل دور آنے کے بعد ربیک دوبارہ ایک بلند درخت پر چڑھا۔ یہ سیدھے تنے والا کوئی سو فٹ اونچا درخت تھا جس کے تنے سے ہر طرف بے شمار شاخیں نکل رہی تھیں اور اس پر چڑھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کوئی ساٹھ ستر فٹ کی بلندی پر جانے کے بعد ربیک رکا اور اس نے شمال مشرق کی طرف دیکھا۔ چند منٹ بعد وہ نیچے اترنے لگا۔ اس بار چڑھائی اور اترائی زیادہ تھی۔ اس لیے اس کا سانس پھول گیا تھا اور اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''معبد اب یہاں سے چار سو قدم دور ہوگا مگر یہاں بھی فصیل کے ساتھ جھاڑیاں نظر آرہی ہیں۔''

میں ان جھاڑیوں میں جانے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا۔ ''ہمیں آگے جانا ہوگا۔ فصیل کے پاس رہنے کے لیے کون سی سمت اختیار کرنا ہوگی؟''

''یہ سمت۔'' ربیک نے شمال مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ ہم آگے بڑھے۔ سہ پہر کا... وقت تھا اور دن ڈھلنے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں رات ہونے سے پہلے معبد کے اندر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ورنہ اس خطرناک جنگل میں

رات گزارنا ہرگز مناسب نہیں تھا۔ محلول کی بو زیادہ سے زیادہ چھ سات گھنٹے تک رہتی تھی۔ بہرحال ابھی ہمارے پاس خاصا وقت تھا اور ہم پورے معبد کے گرد بھی گھوم سکتے تھے۔ ہم کچھ آگے گئے ہوں گے کہ ایک گوزن ملا اور وہ چند تیر کھا کر بھاگ نکلا۔ مزید کوئی نصف میل بعد ربیک نے کہا۔ ''اب ہم معبد کے عقب میں آگئے ہیں۔''

اس بار ایرٹ درخت پر چڑھا اور اسے بھی اس کام میں خاصی مہارت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہم نے فصیل تک جانے کا کوئی راستہ نکال بھی لیا تو فصیل کے پار کیسے جائیں گے۔ یہ کوئی تیس فٹ اونچی دیوار تھی جس پر چڑھنا یقیناً آسان کام نہیں تھا۔ میں نے ربیک سے کہا تو اس نے جواب دیا۔ ''میں کمند تیار کرتا ہوں۔''

اس نے آس پاس تلاش کی اور اسے مخصوص ساخت کی ایک مضبوط سوکھی لکڑی مل گئی۔ یہ خاصی موٹی اور بھاری تھی۔ ربیک اسے توڑ کر اپنے مطلب کی بنانے لگا۔ جب لکڑی اس کے مطلب کی ہوگئی تو اس نے اس کے ایک سرے پر رسی باندھی۔ یہ وی شکل میں تھی اگر اسے مہارت سے پھینکا جاتا تو اس کا وی صورت والا حصہ دیوار کے اوپر پھنس جاتا اور دیوار پر چڑھا جا سکتا تھا۔ ایرٹ نے پہلے معبد کی سمت دیکھا تھا پھر اس نے آس پاس کا جائزہ بھی لیا اور یہ جائزہ لینا کام آگیا۔ اچانک اس نے بے تابی سے ہمیں اشارے شروع کر دیے۔ وہ ہمیں درخت کے اوپر آنے کو کہہ رہا تھا۔ اس نے یقیناً آس پاس کوئی خطرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ احتیاط کی وجہ سے آواز نہیں نکال رہا تھا یعنی خطرہ اتنا پاس آگیا تھا کہ ہماری آواز اس تک جا سکتی تھی۔ میں نے اشارہ کیا اور ربیک اوپر چڑھا۔

چند شاخیں اوپر جانے کے بعد اس نے تیر کمان سنبھال لیا اور ہمیں اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میں گیا اور میرے پیچھے ایمار اور مارٹ تھے۔ ایرٹ کا سامان اور ہتھیار ان دونوں کے پاس تھے۔ ایرٹ نے ہمیں مزید اوپر آنے کا اشارہ کیا تو ہم اور اوپر جانے لگے۔ کوئی چالیس فٹ کی بلندی پر آنے کے بعد میں نے ہارن کے اس چھوٹے ریوڑ کو دیکھا جس میں چار ہارن تھے اور وہ یہاں پیٹ پوجا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اس درخت سے کوئی سو گز کے فاصلے پر وہ زمین سے پودے اکھاڑ کر کھا رہے تھے۔ یہ چاروں دیوہیکل اور دیکھنے میں ہی جوان نظر آتے تھے۔ ان کی جلد چمک رہی تھی۔ سر کے بال ریشم کی طرح سرسرا رہے تھے۔ کھاتے پیتے ہوئے وہ غراہٹ بھری آواز میں گفتگو بھی کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی منہ اٹھا کر جیسے ہوا سونگھتا تھا۔ ایک بار ایک ہارن نے اسی طرح سونگھا اور جیسے چونک گیا۔

اس نے اس سمت دیکھا جہاں ہم درخت پر تھے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے اپنے ساتھیوں کو مزید اوپر چڑھنے اور خود کو چھپانے کا اشارہ کیا۔ ہم تیزی سے اوپر جانے لگے۔ ہتھیاروں اور سامان کے ساتھ یہ خاصا مشکل کام تھا مگر ہمیں کرنا ہی تھا۔ ایک بار ہارن کو یہاں ہماری موجودگی کا پتا چل جاتا تو وہ یہاں ڈیرہ جما کر بیٹھ جاتے اور ہم ساری عمر تو درخت پر رہ نہیں سکتے تھے۔ زیادہ خطرہ یہ تھا کہ وہ درخت ہی نہ گرا دیں۔ اگرچہ یہ تین فٹ سے زیادہ موٹے تنے والا درخت تھا مگر اس کی بہت زیادہ اونچائی اور وزن نے اسے غیر مستحکم کر دیا۔ یہاں شاید آندھی طوفان نہیں آتے تھے اس لیے درختوں کے تنے ایک حد سے زیادہ موٹے اور مضبوط نہیں تھے اور ان کی اونچائی بہت زیادہ تھی۔ اگر چار ہارن جیسے طاقتور جانور مل کر زور لگاتے تو اسے گرا سکتے تھے۔

ہماری خیریت اسی میں تھی کہ انہیں یہاں ہماری موجودگی کا ثبوت نہ ملے۔ بو کی وجہ سے انہیں جو شبہ ہو سکتا تھا وہ شبہ ہی رہے۔ ایرٹ مسلسل ان کی نگرانی کر رہا تھا اور پھر اس نے اشارے سے خبردار کیا کہ وہ اسی سمت آرہے تھے۔ سب سے نیچے اب مارٹ تھا اور وہ بھی کوئی ساٹھ فٹ کی بلندی پر آگیا تھا یہاں شاخیں گھنی اور پاس پاس تھیں۔ ہم ان میں روپوش ہو سکتے تھے۔ اس لیے اب جو جہاں تھا وہ وہیں ساکت ہوگیا اور خود کو ممکنہ حد تک شاخوں میں چھپا لیا۔ میں ربیک کے بعد تھا اور کوئی ستر فٹ کی بلندی پر تھا۔ یہاں سے معبد دکھائی دے رہا تھا خاص طور سے اس کا سنہری اہرام بالکل واضح تھا۔ مگر احاطہ، اس میں سامنے والی عمارات، باغات اور خاص طور سے سرنگ کے دہانے والا حصہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا کہ ہم معبد کے بالکل عقبی حصے میں تھے۔ یہاں سے صرف اہرام اور اس کے مشرق میں واقع پجاریوں کی رہائش کے لیے مخصوص عمارت کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اہرام کے عقب میں بڑا سا ہموار میدان تھا۔ یہ احاطے کے ایک سرے سے دوسرے

سرے تک پھیلا ہوا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ اس کی لمبائی کوئی پانچ سو گز تھی۔

میدان بالکل خالی تھا اور یہاں نہ تو کوئی گھاس یا پودے لگے تھے۔ نہ درخت تھے اور نہ ہی کسی قسم کی تعمیر کی گئی تھی حد یہ کہ زمین بھی کچی لیکن ہموار تھی۔ شاید یہ میدان کھیلوں کے لیے مخصوص تھا۔ پجاری اور اوپری طبقے نے عام شہریوں پر کھیلنے کی بھی پابندی لگا رکھی تھی اور خود وہ ہر تفریح کرتے تھے اور شاید آپس میں کھیلتے بھی تھے۔ بہرحال میدان دیکھ کر یہ سب چند لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا اور میں آنے والے خطرے کی طرف متوجہ ہوا۔ ہارن اب درخت کے اتنے نزدیک تھے کہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اب وہ جب بالکل نیچے آجاتے تب ہمیں نظر آتے اور یہ اس لحاظ سے اچھا تھا کہ ہم بھی ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اتنی بلندی سے درخت کے بالکل نیچے کا بھی معمولی سا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم جہاں تھے یہاں گھنی شاخوں کی وجہ سے نیم تاریکی تھی اور مجھے اُمید تھی کہ ہارن یہاں ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے۔

چند لمحے بعد نیچے سے ٹاپوں کی آواز آئی۔ ہارن نیچے آچکے تھے اور وہ غرا رہے تھے اور شاید ہماری موجودگی جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انہیں صرف بو آرہی تھی۔ بو سونگھنے کے لیے وہ زور سے سانس کھینچ رہے تھے جس کی آواز اوپر آرہی تھی۔ پھر ان میں آپس میں غراہٹوں کا تبادلہ خیال شروع ہو گیا۔ شاید وہ آپس میں بحث کر رہے تھے کہ درخت کے اوپر انسان ہیں یا انہیں وہم ہو رہا ہے۔ بو ایسی چیز ہے کہ آدمی کو اس پر سب سے کم یقین ہوتا ہے۔ ہارن کے بارے میں میں کہہ نہیں سکتا تھا انہوں نے سو گز کی دوری سے ہماری بو محسوس کر لی تھی بلکہ یہ وہ ناگوار بو تھی جس سے ہارن بھاگتے تھے۔ اس لیے بھی وہ کنفیوز ہو رہے تھے کہ آنے والی بو انسانوں سے آرہی ہے یا یہ کوئی اور بو ہے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ مشکوک ہی رہیں۔ ان کا شک یقین میں نہ بدلے۔ اس کے بعد وہ جلد از جلد یہاں سے دفع ہو جائیں۔

ہم ساکت بیٹھے تھے اور اپنا سارا سامان بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ کوئی چیز اتفاق سے بھی نیچے نہ جا گرے۔ ہم سانس بھی آہستہ لے رہے تھے کہ ہارن کے تیز کان اس کی آواز بھی نہ سن لیں۔ ہارن آپس میں بات کرتے ہوئے کبھی درخت سے دور چلے جاتے اور کبھی پاس آجاتے تھے مگر وہ یہاں سے دفع ہونے کے موڈ میں نہیں تھے۔ وقت گزر رہا تھا اور کچھ دیر میں شام ہو گئی۔ کیونکہ ہارن کی طرف سے صرف محتاط رہنا تھا اس لیے میری نظر وقفے وقفے سے معبد کی طرف جاتی تھی۔ اب تک مجھے وہاں نہ تو کوئی انسان نظر ... آیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی نقل و حرکت محسوس ہوئی تھی وہاں قطعی سناٹا تھا۔ یہ سناٹا فطری نہیں تھا۔ معبد میں موجود درجنوں پجاری اور ان کے سینکڑوں خادم تھے۔ اگر وہ زندہ تھے تب بھی حرکت کرنے کے لیے آزاد نہیں تھے۔

معبد میں سو کے قریب مسلح سپاہی بھی ہوتے تھے مگر ان کی نااہلی میں خود ملاحظہ کر چکا تھا اور اکیلا باسو ہی ان کے لیے کافی تھا۔ صرف چار ہونے کے باوجود وہ آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے اور ان کے پاس دھماکا خیز ہتھیار بھی تھے۔ سرنگ کی تباہی اس کا ایک ثبوت تھی۔ اس لیے سینکڑوں غیر مسلح اور پرانے طرز کے ہتھیاروں سے مسلح افراد بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی کو ریناٹ کے محل سے روانہ ہوئے بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اور اتنا وقت معبد پر مکمل قبضے کے لیے کافی تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ یہاں آئے کیوں تھے؟ شام کی روشنی رفتہ رفتہ رات کے سرمئی غبار میں بدلنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں یہاں تاریکی چھا جاتی۔ ہارن موجود تھے اور ان کی غراہٹیں تھم گئی تھیں مگر ٹاپوں کی آواز اور کبھی کبھی زور سے سانس لینے کی آواز آتی تھی۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی اور نہ ہی انہیں شام کو گھر جا کر بیوی بچوں کو منہ کرانا تھا اس لیے وہ بے فکری سے یہیں براجمان ہو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنا شک رفع کیے بغیر یہاں سے جانے کو تیار نہیں تھے۔

دیکھا جائے تو ہم اچھی خاصی مشکل میں پڑ گئے تھے اور ساری عمر کیا چند گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ اتنی دیر ہم نے ساکت رہ کر اور پہلو بدلے بغیر درخت کی سخت اور کھردری شاخوں پر وقت گزارا تھا تو یہ بھی کمال تھا کہ یہ کھردرا پن نہایت غیر موزوں مقامات پر چبھ رہا تھا۔ پہلو بدلتے ہوئے بھی بہت احتیاط کرنا پڑتی تھی کہ کوئی چیز ہاتھ سے نہ نکل جائے یا خود ہم ہی نہ پھسل جائیں۔ مجھے تجربہ تھا کہ تاریکی ہوتے ہی کیڑے مکوڑے نکل آتے تھے اور وہ

یہاں بھی نکلتے۔ اس کے بعد ہم ایک نئی مشکل میں گرفتار ہو جاتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش میرے پاس ایک ہی رائفل ہوتی تو میں ہارن کو آسانی سے ختم کر سکتا تھا۔ مگر برف والے نے مجھے بالکل نہتا کر کے ریناٹ کے آدمیوں کے حوالے کیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو کسی طریقے سے میرے ہتھیار مجھ تک پہنچا سکتا تھا مگر اس نے نہ جانے کیوں ایسا نہیں کیا۔ کچھ ہی دیر میں تاریکی مکمل ہوگئی اور اب کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ معبد کی طرف سے کچھ روشنی جھلک رہی تھی جیسے اس کے اگلے حصے میں شاید مشعلیں وغیرہ جل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر سمت تاریکی تھی اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ربیک کوشش کر کے کسی طرح میرے نزدیک آیا اور اس نے بہت ہلکی سی سرگوشی میں کہا۔

''جناب ہم اس طرح کب تک بیٹھے رہیں گے؟''

''جب تک بیٹھ سکتے ہیں۔''

''ہمت جواب دے رہی ہے۔''

''کوئی بھی مشکل موت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتی ہے۔'' نیچے موت ہے اس لیے صبر کرو۔''

''اگر سامان نہ ہوتا تو آدمی بیٹھ سکتا ہے سامان کے ساتھ یہ کام بہت مشکل ہے۔''

''ٹھیک ہے سامان شاخوں سے یوں باندھ دو کہ آواز نہ ہو۔'' میں نے اجازت دی۔ میں خود بھی اسی مشکل میں تھا۔ طے ہوا کہ باری باری سب اپنا سامان باندھیں گے اگر ایک ساتھ سب نے حرکت کی تو شور زیادہ ہوگا۔ پہلے ایرٹ نے اپنا سامان باندھا اس نے سب کچھ ترکش میں کر کے اسے شاخ سے باندھ دیا۔ پھر ربیک اور پھر میری باری آئی تھی۔ میں نے چیزیں باندھنے کے لیے اسی شاخ کا اگلا حصہ استعمال کیا جس پر میں براجمان تھا۔ رسی سب کے پاس تھی اور سنگی چاقو سے اس کے ٹکڑے کرنے میں آسانی رہی تھی۔ میرے بعد مارٹ اور ایمار کی باری تھی میں رسی کو آخری گرہ لگا رہا تھا کہ میری نظر معبد کی طرف گئی اور میں چونک گیا۔ وہاں اہرام کے عقبی میدان میں روشنی تھی اور یہ مشعلوں کی روشنی نہیں تھی بلکہ تیز برقی لالٹین کی روشنی تھی۔

لالٹین باسو کے ہاتھ میں تھی جس نے اسے بلند کر رکھا تھا اور اتنی دوری سے وہ اپنی جسامت کی وجہ سے پہچانا گیا۔ ورنہ ان کے چہرے صاف نہیں تھے۔ اس کے ساتھ دوسرا طویل قامت فرد یقیناً کرنل تھا۔ ڈیوڈ شا متوسط قامت کا تھا اور زینی کا قد اس سے بھی کم تھا۔ باسو اسے روشنی دکھا رہا تھا اور کرنل جھک کر زمین پر کچھ رکھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح جھکے جھکے آگے بڑھ رہا تھا اور ہر چند گز کے بعد زمین پر کچھ رکھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ میدان کے درمیان تک آگیا تھا اور اس کے دوسرے سرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کرنل کیا کر رہا ہے۔ وہ اسی طرح زمین پر کچھ رکھتا ہوا احاطے کے آخری حصے تک پہنچا پھر وہاں سے نوّے درجے کے زاویے پر مڑا اور اسی چند بار زمین پر چیز رکھنے کے بعد وہ پھر نوّے درجے کے زاویے پر مڑا اور اب وہ واپس اسی سمت جا رہا تھا۔ مشکل سے دس منٹ میں وہ احاطے کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا تھا۔ ایرٹ اور ربیک نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ ربیک نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں؟''

''میں بھی ناواقف ہوں۔''

کرنل واپس میدان کے وسط میں آیا اور اس نے ...... ہاتھ میں موجود بیگ شانے سے لٹکا لیا تھا۔ وہ اسی بیگ سے کوئی چیز نکال کر زمین پر رکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ اوپر کر کے کچھ کیا تو یک دم ہی میدان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک زمین پر رکھی گول ڈسک لائٹس سرخ رنگ میں روشن ہوگئیں اور احاطے میں ان سے دو رویہ روشن لائنیں بن گئی تھیں۔ دونوں لائنوں کے درمیان کوئی دس گز کا فاصلہ تھا اور دونوں لائنیں کوئی چار سو گز طویل تھیں۔ چند لمحے تک میں الجھن میں رہا کہ یہ کیا ہے اور پھر اچانک مجھے خیال آیا اور میں اچھل پڑا تھا۔ شکر ہے کہ میرے ہاتھ شاخ پر جمے تھے ورنہ میں گر بھی سکتا تھا۔ کرنل اور باسو معبد کے احاطے میں رن وے بنا چکے تھے۔ اب کوئی بھی چھوٹا طیارہ رات میں بھی آرام سے یہاں لینڈ کر سکتا تھا۔ ربیک حیران تھا اس نے کہا۔ ''یہ کیسی روشنی ہے؟''

''میرے خدا۔'' میں نے خود سے کہا تھا۔ اسی لمحے نیچے ایمار سے کوئی چیز چھوٹ گئی اور وہ شاخوں سے الجھتی اور آواز پیدا کرتی نیچے جانے لگی تھی۔ شور اتنا ضرور تھا کہ ہارن چونک جاتے۔ ان کے غرّانے کی آواز آئی اور پھر درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز بہت قوت سے اس سے ٹکرائی ہو۔ ایمار کی چیخ سنائی دی وہ نیچے گر گیا تھا۔

جاری ہے

چھوٹا سا کام

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
مافوق الفطرت واقعات ہماری زندگی کا حصہ ہیں۔ ہم کبھی نہ کبھی ایسے کسی عجیب واقع سے دو چار ضرور ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اسے میں جھٹلا نہیں سکتی اور سننے والے عقل کی کسوٹی پر پرکھ نہیں پاتے۔ واقعہ دلچسپ ہے اس لیے خصوصی طور پر پُراسرار نمبر کے لیے لکھا ہے۔ گزارش ہے کہ ضرور لگائیں۔

رابعہ
(لاہور)

میرے بابا پڑھے لکھے نہیں تھے۔ وہ بالکل ان پڑھ تھے۔ مگر دنیا کے تجربوں سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا اور وہ تجربات ہمیں بھی بتاتے تھے۔ میں چھوٹی سی تھی جب بابا نے دمے کے مرض کی وجہ سے زمین پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور زمینوں کی ساری ذمے داری میرے دونوں بڑے بھائیوں اکرم اور مکرم نے اٹھالی تھی۔ حالانکہ وہ بھی زیادہ بڑے نہیں تھے۔ اس وقت سترہ اور سولہ سال کے تھے مگر گاؤں دیہات میں اس عمر میں لڑکے جوان ہی سمجھے جاتے ہیں۔ ویسے بھی میرے دونوں بھائی کئی سال سے بابا کے ساتھ زمین پر کام کر رہے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے اسکول جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اکرم بھائی ساتویں تک پڑھے ہوئے تھے اور مکرم بھائی نے صرف پرائمری پاس کی تھی مگر دونوں ہوشیار تھے اور زمین کے معاملات سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بابا کے گھر بیٹھنے کے بعد جلد ہی تمام کام سمجھ لیے، شروع میں بابا کو ان کے ساتھ جانا پڑتا تھا تو ایک سال بعد اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔

مکرم بھائی سے پانچ سال چھوٹی شازیہ تھی اور اس کے دو سال بعد میں یعنی رابعہ پیدا ہوئی۔ جب بابا گھر بیٹھے تو میں چوتھی کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ بابا کو تعلیم سے دلچسپی تھی اور وہ ہم سے ہماری پڑھائی کے بارے میں سوال کرتے رہتے تھے۔ ہم جو جواب دیتے تو بابا اندازہ کر لیتے کہ ہم کیسا پڑھ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں شاباش یا ڈانٹ ملتی تھی۔ شازیہ پڑھنے میں ذرا سست تھی اس لیے اسے زیادہ ڈانٹ پڑتی تھی اور جب بابا پڑھائی کے بارے میں پوچھنا شروع کرتے تو وہ کام کا بہانہ بنا کر غائب ہو جاتی تھی۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا اس لیے مجھے بابا کا پوچھنا اور پھر ان سے شاباش لینا اچھا لگتا تھا۔ پڑھائی کا پوچھ کر بابا آخر میں ہمیشہ کوئی بات کرتے اور اس انداز میں کرتے جیسے ہمیں خاص بتا رہے ہوں۔ وہ ہمیشہ اس جملے سے شروع کرتے تھے۔ ”بیٹا جی میری یہ بات یاد رکھنا......“ اور پھر ہمیں یا مجھے بتاتے تھے۔ ایک دن میں صحن میں بابا کے پاس بیٹھی اپنے اگلے دن کا سبق یاد کر رہی تھی۔ سبق بہت لمبا تھا اور میں بار بار بھول جاتی تھی۔ بابا نے کہا۔

”کیا یاد کر رہی ہے جو یاد نہیں ہو رہا؟“

میں نے منہ بسور کر کہا۔ ''بابا کل کا سبق ہے اور کلاس میں سنانا ہے۔ لیکن بہت بڑا ہے میں بار بار بھول رہی ہوں۔ ٹھیک سے یاد ہی نہیں ہو رہا۔''

بابا مسکرائے۔ ''بیٹا جی میری ایک بات یاد رکھنا، زندگی میں کامیابی ہمیشہ چھوٹا کام کرنے سے ملتی ہے۔ بڑے کام زندگی کو مشکل بناتے ہیں۔''

میں سمجھی نہیں تھی۔ میں گھر میں واحد فرد تھی جو بابا سے بے تکلف تھی ورنہ باقی سب پر بابا کا بہت رعب تھا۔ اکرم اور مکرم بھائی اتنے بڑے تھے مگر بابا کے سامنے کھل کر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بابا سے کوئی بات کہلوانی ہوتی تو میرا سہارا لیتے تھے۔ میں بابا سے آرام سے بات کر لیتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا مطلب بابا؟''

''بیٹا جی زندگی میں ایسے موقع آتے ہیں جب کام چھوٹا سا اور آسان ہوتا ہے لیکن اسے کرنا بہت مشکل لگ رہا ہوتا ہے اگر آدمی وہ کام کر لے تو اسے اس کا اچھا پھل ملتا ہے۔ وہ بڑے کام جو آسانی سے ہو جائیں ان سے آدمی کو اکثر کچھ نہیں ملتا ہے۔''

میں نے بابا کی بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن نہیں سمجھ سکی۔ ایک گیارہ بارہ سال کی لڑکی جو گاؤں میں پلی بڑھی ہو اس کی سمجھ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے کل سبق سنانا ہے اور میں بابا کی بات بھول کر اس میں لگ گئی۔ بابا حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ دمے کے باوجود انہوں نے حقہ نہیں چھوڑا تھا حالانکہ ڈاکٹر نے بابا کو سختی سے منع کیا تھا۔ مگر وہ حقہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھے ایک مرتبہ سردیوں میں ان کی حالت زیادہ ہی خراب ہوئی تو اماں نے ان کا حقہ غائب کر دیا۔ حقہ نہ ملا تو بابا کی حالت دمے سے زیادہ ہی خراب ہو گئی اور ان کی کیفیت دیکھ کر سب ڈر گئے اور ان کو حقہ دے دیا۔ مزے کی بات ہے حقہ ملنے کے بعد بابا کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ وہ حکیم اور ڈاکٹر کی دوائیاں کھاتے تھے دوسری احتیاط بھی کرتے تھے۔ کھانے پینے میں جن جن چیزوں سے منع تھا وہ ان کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ صرف حقہ تھا جو وہ چھوڑ نہیں سکتے تھے اور یہ ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک ان کے ساتھ رہا۔

بابا کی کئی ایک مربع زمین تھی اور اس لحاظ سے ہم کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ ہمارا بڑا سا ایک کنال سے زیادہ رقبے پر بنا ہوا پکا گھر تھا۔ اس میں آگے پیچھے بڑے سے صحن جن میں آم، امرود، شریفے اور کینو کے پھلدار درخت تھے۔ اس کے علاوہ نیم، ٹاہلی، شیشم اور پیپل کے درخت بھی تھے۔ یہ درخت بابا نے بہت پہلے لگائے تھے۔ جب ہم بڑے ہو رہے تھے اور ہمارے لیے الگ کمروں اور فرنیچر کی ضرورت ہوئی تو بابا نے ان کی درختوں کی لکڑی سے ہمارے لیے فرنیچر اور کمروں کی کھڑکیاں دروازے بنوائے تھے۔ بھائیوں کی شادی ہوئی تب بھی درخت کٹوا کر فرنیچر اور دوسری چیزیں بنوائی تھیں۔ شازیہ اور میرا جہیز کا فرنیچر بھی گھر کے شیشم کی لکڑی سے بنا تھا۔ ہمارا گھر گاؤں کے ساتھ والی زمین پر تھا اور اس لحاظ سے

گاؤں سے ذرا الگ بھی تھا۔
میں نے بتایا کہ بابا اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ میرے بھائی اس وجہ سے آگے نہ پڑھ سکے کہ وہ زمین پر لگ گئے تھے۔ اگرچہ بابا انہیں کہتے رہے تھے کہ وہ پرائیویٹ ہی پڑھ لیں مگر کام میں لگ کر ان کا دھیان تعلیم کی طرف نہیں رہا تھا۔ اس لیے بابا نے اپنی توجہ ہم بیٹیوں کی طرف کرلی۔ انہوں نے ہمیں اسکول میں داخل کرایا اور اس کے بعد بھی ہماری تعلیم میں پوری دل چسپی لیتے رہے۔ ان کی تو خواہش تھی کہ ہم بہنیں اسکول کے بعد بھی پڑھیں مگر شازیہ کو دل چسپی نہیں تھی اس نے بہ مشکل میٹرک کیا اور آگے پڑھنے سے صاف انکار کردیا۔ مجھے شوق تھا مگر جن دنوں میں میٹرک میں تھی اوپر سے بابا کا بلاوا آگیا۔ مسلسل حقہ نوشی سے ان کا دمے کا مرض بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اگرچہ ہم بہنوں کو نہیں بتایا مگر اماں کی اتری صورت اور بھائیوں کی پریشانی سے ہمیں بھی احساس ہوگیا تھا۔

ایک رات بابا کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو بھائی انہیں لے کر اسپتال بھاگے مگر بابا کا وقت پورا ہوگیا تھا انہوں نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔ اسپتال میں ڈاکٹروں نے بھی تصدیق کردی تو بھائی بابا کی لاش لے کر گھر آگئے۔ اماں اور ہم بہنوں پر قیامت گزر گئی تھی۔ ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم سے پیار کرنے والے بابا یوں خاموشی سے ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ بھائی بھی دکھی تھے مگر وہ پہلے ہی جان گئے تھے۔ کسی حد تک اماں بھی باخبر تھیں مگر ہم بہنیں تو بالکل ہی بے خبر تھیں اور اسی وجہ سے ہم نے بابا کی موت کا دکھ بہت زیادہ محسوس کیا تھا۔ کئی دن ہمارے آنسو ہی نہیں رکے تھے۔ شازیہ نے طبیعت اتنی خراب کرلی کہ اسے اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ بہرحال دکھ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ انسان کو رفتہ رفتہ صبر آجاتا ہے۔ ہمیں بھی صبر آگیا۔ پھر میرے میٹرک کا امتحان قریب تھا اس لیے دل نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے پڑھائی کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔ میں نے پیپرز دیئے اور بہت اچھے دیئے۔ مجھے اُمید تھی کہ مجھے کالج میں داخلہ مل جائے گا۔ مگر جب میں نے اماں سے کہا تو انہوں نے صاف انکار کردیا۔

''بس جتنا پڑھ لیا تھا پڑھ لیا۔ اب اپنے گھر جانے کی تیاری کر۔''

''اماں، بابا نے وعدہ کیا تھا۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''وہ وعدہ بھی ان کے ساتھ ہی گیا۔'' اماں نے گہری سانس لی۔ ''رابعہ ہوش کر اب تو، شازیہ اور میں تیرے بھائیوں کے سر پر ہیں۔ وہ اس گھر کے بڑے ہیں اور جو وہ چاہیں گے وہی ہوگا۔''

میرا دل ڈوب گیا۔ ''تو بھائی نہیں مانیں گے؟''

''اکرم شاید مان جائے مگر مکرم......'' اماں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ دونوں بھائیوں میں مکرم بھائی سخت طبیعت کے تھے وہ ہم بہنوں کا باہر آنا جانا زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور اگر ہم جاتے تو خاصی روک ٹوک اور پابندیاں لگاتے تھے۔ ہمیں اکیلے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسکول بھی بڑی مشکل سے برداشت کیا تھا اور اکثر اس بات پر اماں اور بابا سے الجھتے تھے کہ میں اکیلے اسکول جاتی ہوں۔ شازیہ دو سال پہلے گھر بیٹھ گئی تھی اور دو سال میں اکیلے جاتی رہی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ بابا کے ہونے اور نہ ہونے سے کیا فرق پڑا ہے۔ ہم بہنیں بچ بچ بھائیوں کے رحم و کرم پر آگئی تھیں۔ ہمارے بھائی سخت نہیں تھے ہم بہنوں سے محبت کرتے تھے۔ بابا کے بعد بہت زیادہ خیال رکھنے لگے تھے مگر جو آزادی ہمیں بابا کے ہوتے ہوئے میسر تھی وہ اب باقی نہیں رہی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اکرم بھائی سے بات کی تو انہوں نے مجھے پیار سے سمجھایا۔ ''رابعہ اگر میں مکرم سے بات کروں تو وہ شاید مان جائے مگر اس کے بعد وہ تجھے سکون سے کالج میں کہاں پڑھنے دے گا۔ روک ٹوک کرے گا تو تیرے لیے مشکل ہوجائے گا۔ اگر تجھے پڑھنے کا شوق ہے تو پرائیویٹ پڑھ لے۔ ابھی تیرے پاس وقت بھی ہے ایف اے کرلے گی۔''

اکرم بھائی کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ واقعی اگر میں ضد کرکے کالج میں داخلہ لے بھی لیتی تو مکرم بھائی اسے انا کا مسئلہ بنالیتے اور مجھے بہت تنگ کرتے۔ میں سکون سے پڑھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اکرم بھائی کی بات مان لوں۔ مگر مجھے خدشہ تھا کہ مکرم بھائی اس میں بھی مداخلت کریں گے اس لیے میں نے ساری ذمے داری اکرم بھائی پر ڈال دی۔ ''ٹھیک ہے بھائی میں پرائیویٹ پڑھوں گی مگر میرا سب آپ نے کرنا ہے۔''

اکرم بھائی خوش ہوگئے۔ ''تو فکر مت کر میں سب

کروں گا اور میری ذمے داری ہوگی۔ مکرم اس معاملے میں ذرا بھی دخل نہیں دے گا۔''

جب میرا رزلٹ آیا اور میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تو اکرم بھائی نے اپنا وعدہ پورا کیا اور میرا پرائیویٹ ایف اے میں انرولمنٹ کرادیا اور ساتھ ہی مجھے کورس کی کتابیں بھی لادیں۔ مکرم بھائی نے اعتراض نے کیا تھا مگر اکرم بھائی نے انہیں خاموش کرادیا۔ بابا اکرم بھائی اور شازیہ کا رشتہ اپنی زندگی میں طے کر گئے تھے۔ اکرم بھائی کی منگ ہماری چچازاد بہن تھیں اور بابا نے انہیں بچپن میں مانگ لیا تھا مگر وہ بی ایڈ کر رہی تھیں اس لیے اکرم بھائی کے سہرے کے پھول ابھی تک نہیں کھلے تھے۔ شازیہ کی شادی اسی سال کرنی تھی مگر اچانک بابا کا انتقال ہوگیا اور شادی ایک سال آگے چلی گئی۔ اماں نے طے کیا کہ دونوں بہن بھائی کی شادی ساتھ ہی کر دیں گی۔ اس کے ساتھ انہوں نے مکرم بھائی اور میرے لیے رشتے کی تلاش بھی شروع کردی۔

ایک سال گزرا اور بابا کی وفات کے بعد پہلی بار ہمارے گھر میں خوشی آئی تھی۔ اکرم بھائی اور شازیہ دونوں بہت خوش تھے شازیہ کا ہونے والا شوہر بھی زمیندار گھرانے سے تھا۔ وہ کچھ ہی دور ایک اور گاؤں میں رہتے تھے اور اس کی نزدیک ہائی وے پر موٹر آئل کی دکان تھی۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ شکل صورت کا بھی اچھا تھا اس لیے شازیہ خوش تھی۔ دونوں شادیاں دھوم دھام سے ہوئیں۔ مگر اپنی شادی والے دن شازیہ اور اکرم بھائی بابا کو یاد کر کے بہت روئے تھے۔ اکرم بھائی تو صبح سے غائب تھے۔ تلاش کرایا تو پتا چلا کہ قبرستان میں بابا کی قبر پر بیٹھے ہیں۔ اس روز ہمیں درست طور پر اندازہ ہوا کہ وہ بابا سے کتنی محبت کرتے تھے۔ ان کا نکاح بابا کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا۔ شازیہ گئی اور بھابی آگئیں۔ میں اور اماں سوچ رہے تھے کہ شبینہ بھابی اتنی پڑھی لکھی ہیں اور اکرم بھائی صرف ساتویں پاس ہیں تو ان میں مسئلہ نہ ہو مگر شادی کے شروع کے دنوں میں اندازہ ہوگیا تھا کہ ان دونوں کی خوب نبھ رہی تھی اس کی وجہ بھابی کی اکرم بھائی سے محبت اور خدمت گزاری تھی۔ انہیں اپنی تعلیم کا ذرا بھی غرور نہیں تھا۔ ایک بار ان سے بات ہو رہی تھی تو انہوں نے کہا۔

''تعلیم عورت کو شوہر کی تابعداری اور اولاد کی اچھی پرورش سکھاتی ہے جو عورت تعلیم یافتہ ہو کر یہ دونوں کام ٹھیک سے نہ کر سکے اس سے ہزار درجہ اچھی وہ ان پڑھ عورتیں ہوتی ہیں جو شوہر کو خوش رکھتی ہیں اور اولاد کو اچھا انسان بناتی ہیں۔''

یہی وجہ تھی کہ اکرم بھائی بھابی کا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ محبت تو ان سے کرتے ہی تھے۔ سچی بات ہے کہ بھابی کے آنے سے ہمارے گھر کا ماحول اور بھی اچھا ہوگیا تھا۔ بھابی کام کے معاملے میں بھی تیز تھیں۔ ان کے آنے سے پہلے زیادہ تر کام میں اور اماں کرتے تھے کیونکہ شازیہ کام سے جی چراتی تھی۔ ان کے آنے کے بعد سارا کام میں نے اور بھابی نے سنبھال لیا اور اماں کو آرام ملنے لگا۔ یہ ان کا حق تھا کیونکہ انہوں نے ساری عمر بابا اور اولاد کی بہت خدمت کی تھی۔ دو شادیاں نمٹا کر اماں نے میرے اور مکرم بھائی کے لیے رشتے کی تلاش تیز کردی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی میں ایف اے کروں گی وہ میری شادی کر دیں گی۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اب تک انہیں کامیابی نہیں ملی تھی۔ پھر ان ہی دنوں مکرم بھائی اماں سے خاموشی سے کھسر پھسر میں بات کرتے نظر آنے لگے جب کہ انہوں نے زندگی میں بھی اس طرح چوری چھپے کوئی بات نہیں کی تھی وہ جو کہتے کھل کر کہتے تھے۔ صرف ایک بابا تھے جن کے آگے ان کی زبان نہیں کھلتی تھی ورنہ وہ باقی اور کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہ بات میں ہی نہیں شبینہ بھابی نے بھی محسوس کی اور انہوں نے مجھ سے کہا۔

''کیا چکر ہے مکرم آج کل ماں جی سے سرگوشیوں میں بات کرتا ہے۔''

''میں نے بھی دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا خیال ہے اماں سے معلوم کریں۔''

''نہیں ماں جی نے بتانا ہوتا تو اب تک بتا چکی ہوتیں، میں تیرے بھائی سے معلوم کرتی ہوں۔ بھائیوں کی کوئی بات آپس میں چھپی نہیں ہوتی ہے۔''

بھابی نے اکرم بھائی کو کریدا اور سچ ان کے علم میں تھا کہ مکرم بھائی اماں سے کیا بات کر رہے ہیں۔ اصل میں انہیں ایک لڑکی پسند آگئی تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے اماں کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اکرم بھائی نے بتایا کہ مسئلہ اس گھرانے کی شہرت کا تھا۔ عورتیں ٹھیک تھیں مگر اس گھر کے مرد نشے اور

دوسرے چکروں میں ہوتے ہیں اس لیے اماں نہیں مان رہی تھیں۔ کیونکہ مکرم بھائی اور اماں نے اس بات کا کھل کر اظہار نہیں کیا تھا اس لیے اکرم بھائی نے بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ جب بھابی نے پوچھا تو وہ چھپا نہ سکے۔ بھابی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تیرے بھائی بہت ہوشیار بنتے ہیں لیکن ان کو معلوم نہیں ہے شوہر کے معاملے میں بیوی سے زیادہ ہوشیار اور کوئی نہیں ہوتا ہے۔''

اس کے بعد میں نے اور بھابی نے اماں کو گھیرا اور انہیں بھی اعتراف کرنا پڑا۔ مکرم بھائی نے جگنو کی بہن کو پسند کیا تھا۔ یہ گھرانا جگنو کی وجہ سے زیادہ مشہور تھا جو عادی نشے باز اور بدمعاش تھا، ایک بار جیل کاٹ کر آچکا تھا۔ یہ چھ بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ صرف دو بڑے بھائیوں کی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شرافت کی زندگی گزار رہے تھے لیکن باقی چار بھائیوں کے چھن اچھے نہیں تھے ان میں جگنو پہلے نمبر پر تھا اور باقی بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ انہیں خراب کرنے میں جگنو کا ہاتھ تھا۔ بہنوں میں تین شادی شدہ تھیں اور صرف چھوٹی مہر النسا باقی تھی۔ مکرم بھائی کو وہی پسند آئی تھی۔ اماں نے انکشاف کیا کہ یہ پسند دوطرفہ تھی اور وہ بھی مکرم بھائی کو پسند کرتی تھی اور اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ مکرم بھائی سے شادی کرے گی ورنہ زہر کھا کر مر جائے گی۔ میں اور بھابی حیران رہ گئے کہ بات مرنے مارنے تک پہنچ گئی ہے اور ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔

سچی بات ہے کہ اماں کی طرح ہمیں بھی یہ رشتہ اچھا نہیں لگا تھا۔ ہمارے گھرانے کی گاؤں میں عزت تھی اور آج تک ہمارے گھر سے کوئی ایسی بات باہر نہیں گئی تھی جس پر کسی کو ہمارے اوپر انگلی اٹھانے کی جرات ہوتی۔ لیکن یہ بات کھل جاتی تو گاؤں والے کیسی باتیں بناتے اور سب سے بڑھ کر مہر النسا کے بھائیوں کا ردعمل کیا ہوتا؟ یہ سوچ کر ہی ہم پریشان تھے مگر مکرم بھائی کو کوئی پروا نہیں تھی۔ بہ قول اماں کے وہ مہر النسا کے پیچھے پاگل ہو رہے تھے اور اس کے لیے اپنی جان بھی دینے کو تیار تھے۔ بھابی نے کہا۔ ''وہ تو جان دینے کے لیے تیار ہے لیکن اس نے اپنے بھائی اور بہنوں کا سوچا ہے۔''

''وہ شروع سے خود غرض رہا ہے۔'' اماں نے تلخی سے کہا۔ ''اسے سوائے اپنے اور کسی کی پروا نہیں ہے۔''

''آپ نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ خود کر سکتا ہے تو کر لے میں اس کا رشتہ لے کر نہیں جاؤں گی۔''

اماں نے ایسا ہی کہا تھا کیونکہ مکرم بھائی کا ردعمل بڑا واضح تھا۔ وہ کسی سے بات نہیں کر رہے تھے اور صبح گھر سے جاتے تو رات گئے واپس آتے تھے۔ اکرم بھائی نے بتایا کہ وہ زمین کے کاموں میں بھی دل چسپی نہیں لے رہے تھے۔ فصل کی بوائی کا وقت تھا اور سارا کام اکرم بھائی اپنی نگرانی میں کرا رہے تھے۔ وہ بے چارے بھی صبح کے گئے رات کو دیر سے واپس آتے تھے۔ مکرم بھائی نہ جانے کہاں جاتے تھے؟ اماں فکرمند ہوتی تھیں کہ مہر النسا کے بھائیوں تک بات پہنچی تو وہ جھگڑا کر سکتے تھے۔ گاؤں میں ایسی باتیں پھیلنے میں زیادہ وقت بھی نہیں لگتا تھا بس کسی ایک غیر متعلق آدمی کو پتا چل جائے تو اس کے بعد بات پر لگا کر دوسروں تک پہنچتی تھی۔ پھر یہاں ایسی باتیں اشتعال انگیز پیرائے میں دوسروں تک پہنچائی جاتی ہیں۔ عزت و غیرت کے ایسے طعنے دیئے جاتے ہیں کہ ٹھنڈے ترین آدمی کے جذبات بھی بھڑک جائیں اور وہ قتل و غارت گری پر اتر آئے۔ اس وجہ سے پورا گھر پریشان تھا اور واحد فرد جسے کوئی فکر نہیں تھی وہ مکرم بھائی تھے۔ اکرم بھائی نے ان سے بات کی مگر وہ اپنی ضد سے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف اماں نہیں مان رہی تھیں کہ اچانک مکرم بھائی نے دھماکا کر دیا انہوں نے کہا۔

''مجھے میرا حصہ چاہیے میں بٹوارہ چاہتا ہوں۔''

گاؤں میں زمین مشترک ہوتی ہے اور شاذ ہی اس کے بٹوارے کی نوبت آتی ہے۔ کیونکہ بٹوارے کی صورت میں بڑی زمینداریاں ختم ہو جاتی ہیں اور لوگ چھوٹے کسان بن کر رہ جاتے ہیں۔ زمین بٹنے سے فصلوں پر بھی اثر پڑتا ہے اس لیے بٹوارے کو عام طور سے اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے اور انتہائی صورت میں جا کر بٹوارہ ہوتا ہے۔ اماں اور اکرم بھائی اس کے لیے کسی صورت تیار نہیں تھے۔ انہوں نے تو ہم بہنوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ زمین نہیں دیں گے اگر ہم نے مطالبہ کیا تو وہ ہمیں ہمارے حصے کے بجائے رقم دی جائے گی۔ شرعی لحاظ سے یہ ٹھیک نہیں ہے مگر گاؤں دیہات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے بھائی تو پھر بھی نقدی کی صورت میں دینے کو تیار تھے ورنہ اکثر زمین والے بیٹیوں اور بہنوں سے پکے کاغذ پر زمین سے دست

برداری لکھوا لیتے ہیں۔ بہرحال مکرم بھائی کے مطالبے نے سب کے ہوش اڑا دیئے تھے۔

اماں نے سمجھایا اور اکرم بھائی نے بھی بات کی تو مکرم بھائی نے شرط رکھ دی کہ اگر ان کی شادی مہر النسا سے کرا دی جائے تو وہ بٹوارے کا مطالبہ نہیں کریں گے دوسری صورت میں انہوں نے پٹواری کو دینے کے لیے درخواست بھی تیار کرا لی تھی۔ اماں، اکرم بھائی اور بھابی سر جوڑ کر بیٹھے اور طویل مشاورت کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ مکرم بھائی کی بات مان لی جائے اور ان کا رشتہ مہر النسا کے لیے لے جایا جائے۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی ناگزیر تھا کہ بٹوارے کے بعد مکرم بھائی نے ایسا ہی کرنا تھا اور اس صورت میں بات خراب ہونے کا خطرہ تھا اس لیے اماں اور بھائی بھابی نے مناسب سمجھا کہ ان کی بات مان لی جائے اور کم سے کم جھگڑے سے بچا جائے۔ بدنامی تو ویسے بھی مقدر تھی۔ ایک ہفتے بعد اماں نے پہلے ایک نائن کے توسط سے رشتہ بھجوایا۔

جیسا کہ گاؤں دیہات کا رواج ہے کہ دو بڑے گھروں میں جن کی آپس میں پہلے سے رشتے داری نہ ہو تو وہاں نائیوں کے توسط سے رشتہ بھیجا جاتا ہے تاکہ اگر انکار کرنا ہو تو کسی کی بے عزتی نہ ہو۔ ہماری خواہش تو یہ تھی کہ دوسری طرف سے انکار ہو جائے۔ مگر وہاں سے اقرار ہو گیا اور اب ہمیں جانا تھا۔ اس کے ایک ہفتے بعد ہم مہر النسا کے گھر گئے۔ میں نے اس سے پہلے مہر النسا کو سرسری دیکھا تھا لیکن اس روز وہ بہت چہک رہی تھی اور تیار ہوئی تھی اس لیے خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ تقریباً بائیس برس کی دبلی لیکن خوب صورت نقوش والی لڑکی تھی۔ اس میں مردوں کو متوجہ کرنے والی چمک دمک تھی۔ شاید اسی وجہ سے مکرم بھائی لٹو ہوئے تھے۔ ہم نے رشتہ ڈالا اور کچھ دن بعد ان کی طرف سے ہاں ہو گئی۔ اماں مہر النسا کے ہاتھ پر پیسے رکھ آئی تھیں۔ دونوں طرف سے رسم ہوئی اور رشتہ پکا ہو گیا۔

اس وقت ان کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شادی آنے والے سرما میں طے ہوئی تھی۔ مگر رشتہ ہونے کے دو مہینے بعد جس نائن کے توسط سے ہم نے رشتہ بھیجا تھا اسی کے توسط سے مہر النسا کے گھر والوں میرے لیے اس کے بھائی ارشاد کا رشتہ بھیجا۔ ارشاد جگنو سے چھوٹا تھا۔ عمر ستائیس کے آس پاس تھی اور صورت شکل کا بھی اچھا تھا مگر اس کے کرتوت اتنے ہی خراب تھے۔ وہ نہ صرف شراب کا نشہ کرتا اور جوا کھیلتا تھا بلکہ پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ خراب عورتوں کے چکر میں بھی رہتا ہے۔ ہمارے گاؤں سے ذرا دور لاہور اور سیالکوٹ کو ملانے والی ہائی وے گزرتی تھی۔ ارشاد نے وہاں سرکاری زمین پر قبضہ کر کے باڑہ بنایا ہوا تھا جو اصل میں بدمعاشوں کا اڈہ تھا۔ گاؤں کے نصف درجن گھرانوں میں اس کا رشتہ جا چکا تھا مگر کسی نے اسے لڑکی نہیں دی تھی لوگوں کا خیال تھا کہ ارشاد کو دینے سے بہتر ہے کہ وہ اپنی لڑکی کو زہر یا کنویں میں دھکا دے دیں۔

سچی بات ہے کہ جب نائن ہمارے ہاں آئی اور اماں سے بات کر کے رخصت ہوئی تو بھابی نے جو وہاں موجود تھی اس کے جاتے ہی تقریباً روہانسے لہجے میں مجھے بتایا اور میرے ہاتھوں سے توتے اڑ گئے تھے۔ میں دھاڑیں مار کر رونے لگی اور اماں دوڑی آئی تھیں انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”چپ کر جا ابھی میں زندہ ہوں انہوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں نے نائن سے انکار کہلوا دیا ہے۔“

”پر اماں مجھے ڈر لگ رہا ہے مکرم بھائی......“

مگر اماں اس وقت اتنے غصے میں تھیں کہ انہوں نے مکرم بھائی کو بھی سنا دیں۔ ”آنے دے اسے بات کرتی ہوں انہوں نے سمجھا کیا ہوا ہے۔“

یہ اور بات ہے کہ کچھ ہی دیر بعد جب مکرم بھائی گھر آئے تو وہ غصے میں تھے اور آتے ہی اماں پر برس پڑے۔ ”یہ آپ نے مہر کے گھر والوں کے ساتھ کیا کیا ہے ایسا تو کوئی غیر کے ساتھ نہیں کرتا ہے وہ تو اب رشتے دار ہیں ہمارے۔“

”کیا کیا ہے میں نے؟“ اماں ذرا دب گئی تھیں۔

”انہوں نے رشتہ بھیجا تھا نا تو اس میں نائن کو بے عزت کر کے بھگانے کی کیا ضرورت تھی۔ آدمی آرام سے بھی جواب دے سکتا ہے۔“

”میں نے آرام سے ہی جواب دیا تھا۔ وہ جھوٹ بولتی ہے کہ اسے بے عزت کر کے نکالا ہے۔“ اماں نے کہا۔ مگر مکرم بھائی سن ہی نہیں رہے تھے وہ اماں پر گرجتے برستے رہے اور پھر یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے کہ اب یہ مسئلہ آسانی سے ختم نہیں ہوگا۔ اگر بات ان کے رشتے تک آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ اماں پریشان ہو گئیں انہوں نے سوچا نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔ مکرم بھائی کے رویے

سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے سسرال کے طرف دار تھے اور اماں کی طرف سے فوری انکار کو ان کی بے عزتی سمجھ رہے تھے۔ اگر وہ ان کی حمایت پر اتر آتے اور رشتے پر اصرار کرتے تو میری جان پر بن جاتی۔ میں کسی صورت ارشاد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے صرف ایک اماں اور اکرم بھائی کا سہارا تھا۔ وہی مجھے اس رشتے سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ جب اکرم بھائی آئے اور انہیں پتا چلا تو انہیں بھی غصہ آیا تھا انہوں نے کہا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے جب کہ انہیں معلوم ہے کہ ہماری برادری میں وٹہ سٹہ نہیں ہوتا ہے۔''

''وہ اب بد معاشی دکھا رہے ہیں۔'' اماں نے کہا۔ ''مکرم بھی ان کا حامی بنا ہوا ہے۔''

''میں سب کو دیکھ لوں گا۔'' اکرم بھائی نے غصے سے کہا۔ ''رابعہ میری بہن ہے کوئی دکان پر پڑا ہوا مال نہیں جو مانگے اسے دے دی جائے۔ اس کی شادی ہم اپنی مرضی سے جہاں چاہیں گے وہاں کریں گے۔''

اس رات پہلی بار دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ ورنہ مکرم بھائی زبان کے کتنے ہی تیز سہی لیکن وہ اکرم بھائی کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتے تھے۔ اکرم بھائی نے صاف کہہ دیا۔ ''ہم نے مجبور ہو کر یہ رشتہ کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہمارے سر پر چڑھیں۔ تو ان کا ہونے والا داماد ہے تجھ تک رہیں اس سے آگے نہ آئیں۔''

''انہوں نے کیا کیا ہے رشتہ ہی تو بھیجا ہے۔'' مکرم چلّا کر بولا۔

''رشتہ؟'' اکرم بھائی نے طنز کیا۔ ''ارشاد کی شہرت نہیں جانتا ہے کیا؟''

''بھائی جی وہ برا آدمی نہیں ہے اسے بری صحبت نے خراب کیا ہے۔'' مکرم بھائی کا لہجہ دب گیا تھا۔ ''شادی ہوگی تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اسے بری صحبت خراب کرے گی۔'' اکرم بھائی نے زیادہ طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ خود بری صحبت ہے جس سے لوگ اپنے لڑکوں کو بچاتے ہیں۔ ان لوگوں کو رشتہ بھیجنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔''

''کیا میرا سسرال گرا پڑا ہے۔'' مکرم بھائی نے بھڑک کر کہا۔

''اگر تم نہیں جانتے ہو تو گاؤں والوں سے پوچھ لو۔''

اس پر مکرم بھائی چیخنے چلّانے لگے تو اکرم بھائی کو بھی غصہ آگیا اور انہوں نے بھی مکرم بھائی کو خوب سنائیں۔ گھر کا ماحول سخت کشیدہ ہو گیا تھا۔ مگر مجھے ذرا اطمینان ہوا تھا کہ میرا ارشاد سے رشتہ کسی صورت نہیں ہوگا۔ رشتے کی بات مکرم بھائی نے بھی نہیں کی تھی انہیں اعتراض یہ تھا کہ اماں نے نائن کو فوری انکار کر کے ان کے سسرال والوں کی بے عزتی کی ہے۔ شاید انہیں خوف تھا کہ کہیں اس بات کو بنیاد بنا کر ان کے رشتے سے بھی نہ انکار کر دیا جائے۔ اماں اور اکرم بھائی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ جھگڑے کے بعد مکرم بھائی نے دھمکی دی کہ اگر یہ رشتہ ختم ہوا تو وہ وراثت کا بٹوارہ کر لیں گے۔ اکرم بھائی بھی اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے کہا۔ ''تو رشتہ ختم ہونے کا انتظار مت کر کل ہی بٹوارہ کر لے مگر ایک بات یاد رکھ کہ اب بٹوارہ ہوا تو سب کو حصہ ملے گا۔ بہنوں کو بھی اور اماں کو بھی۔''

مکرم بھائی نے اس کا جواب نہیں دیا تھا۔ اکرم بھائی کی جوابی دھمکی نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا کیونکہ اس صورت میں ایک مربع زمین سے انہیں زمین ملتی کہ گزارہ بھی نہ ہوتا پھر انہیں سارا کام بھی خود کرنا پڑتا۔ ابھی تو ساری دیکھ بھال اکرم بھائی کر رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے پھر بٹوارے کی بات نہیں کی۔ حساب کتاب سارا اکرم بھائی کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور وہ آمدنی کے چار حصے کرتے تھے۔ ایک خود رکھتے تھے۔ ایک مکرم بھائی کو دیتے تھے ایک اماں کو دیتے تھے جو اماں اور ہم بہنوں کے لیے ہوتا تھا اور ایک حصہ وہ بچت کے طور پر الگ کر دیتے تھے تاکہ کوئی ہنگامی صورت حال پیش آئے یا زمین کا اضافی خرچ ہو تو اس سے پورا کریں۔ ابا کے بعد انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا ویسے ابا جی بھی ایسا ہی کرتے تھے اور اس وقت بھی سب کے حصے میں اتنی اتنی رقم ہی آتی تھی۔

اکرم بھائی کو فضول خرچی کی عادت نہیں تھی۔ انہوں نے یہ کیا کہ شادی سے پہلے اپنی بچت سے ایک پلاٹ لے لیا تھا اور اس پر اب عمارت تعمیر کرا رہے تھے ان کا ارادہ یہاں اسکول کھولنے کا تھا جسے بھابی چلاتیں۔ اس سے تعمیر کا کام خاصی حد تک مکمل ہو گیا تھا اور اگلے سال سے اسکول کا آغاز کرنے کا ارادہ تھا۔ بھابی ابھی سے اس کی تیاری کر رہی تھیں اور انہوں نے دو ٹیچرز بھی رکھ لی تھیں۔ اکرم بھائی

کے برعکس مکرم بھائی اپنی آمدنی کا کیا کرتے تھے اس کا پتا نہیں تھا۔ اگرچہ وہ کسی بری عادت میں بھی نہیں تھے اگر ایسا ہوتا تو یہ بات ہم سے چھپی نہ رہتی۔ وہ اچھا پہنتے اور کھاتے پیتے تھے۔ جب مہر النسا سے رشتہ ہوا تو انہوں نے ذرا پرانے ماڈل کی جیپ لے لی تھی اور سارا دن اسی پر گھومتے پھرتے تھے۔ ویسے ہمارے پاس ایک ڈبل کیبن گاڑی بھی تھی جو اکرم بھائی کے اور زمین کے کاموں میں استعمال ہوتی تھی۔ اکرم بھائی کو بھائی کی اس روش پر اعتراض نہیں تھا وہ بے چارے خود سارا بوجھ اٹھا کر بھی خوش تھے۔ اگر مہر النسا کے گھر والے یہ حرکت نہ کرتے تو ہم ناخوشی میں بھی صرف مکرم بھائی کی خاطر ان کی لڑکی لے آتے۔ مگر اب اس رشتے کا بھی یقین ختم ہو گیا تھا۔

اماں اس پریشانی میں تھیں کہ اگر مہر النسا کے گھر والوں نے یہ رشتہ ختم کیا تو مکرم بھائی کا ردِعمل کیا ہوگا۔ ان کے تاثرات تو ابھی سے خوفناک تھے۔ پھر وہی بٹوارے والے جھگڑے ہوں گے مگر اکرم بھائی اور بھابی ڈٹ گئے تھے۔ اکرم بھائی نے اماں سے کہا۔ ''وہ بٹوارہ چاہتا ہے اسے کرنے دیں۔ اگر اس کے سسرال والوں نے کوئی حرکت یا شرارت کی تو یہ اس کی ذمے داری ہوگی اب ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بیٹا'' اماں نے کہا۔ ''بھلا رشتے چھوڑے جا سکتے ہیں۔''

''یہ مکرم کو بھی سوچنا چاہیے کہ صرف ہماری ذمے داری رہ گئی ہے۔'' اکرم بھائی نے تلخی سے کہا تھا۔ گھر کا ماحول بھی تلخ سا تھا۔ ان دنوں شازیہ بھی رہنے کے لیے آئی تھی۔ وہ اُمید سے تھی اور اماں نے کچھ دن کے لیے اسے پاس بلا لیا تھا۔ وہ بھی مکرم بھائی کی مخالفت کر رہی تھی اور ماحول کا ذمے دار انہیں سمجھ رہی تھی۔ کچھ وقت گزرا اور مہر النسا کے گھر والوں کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں آیا تو ہم بھی پریشانی سے نکلنے لگے۔ مکرم بھائی کا وہی وتیرہ تھا کہ صبح کے جاتے اور رات کو واپس آتے تھے۔ انہوں نے زمین کے کاموں میں حصہ لینا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا اور اب زیادہ تر وقت ارشاد کے ڈیرے پر گزارتے تھے۔ اماں اور اکرم بھائی نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ میرے امتحانی فارم آئے اور اکرم بھائی نے جمع کرا دیے۔ مجھے انگریزی میں مشکل ہو رہی تھی اس لیے میں نے شبینہ بھابی سے مدد لینا شروع کر دی۔ انہوں نے صرف انگریزی ہی نہیں بلکہ دوسرے مضامین میں میری اچھی تیاری کرا دی تھی۔ مکرم بھائی کی شادی کا طے ہوا تھا کہ سرما میں کریں گے مگر ان کے سسرال والوں کی طرف سے کوئی آیا ہی نہیں۔ درحقیقت اس واقعے کے بعد سے ان کے گھر سے کوئی نہیں آیا تھا اور نہ ہی ہماری طرف سے کوئی گیا تھا۔ عام طور سے ایسا ہوتا نہیں ہے لیکن یہاں ایسا ہی ہو رہا تھا۔ سرما آیا اور گزر گیا۔ میرے امتحانات بہار میں تھے اور سینٹر گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے قصبے میں پڑا تھا۔ اکرم بھائی مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑنے اور لینے آتے۔ پیپر تو سے بارہ تک ہوتا۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے تک مجھے سینٹر چھوڑ دیتے اور لینے کے لیے بارہ بجے تک آجاتے تب تک میں باہر آجاتی۔

شروع کے پیپرز میں اسی بات پر عمل ہوتا رہا۔ اس دن آخری پیپر تھا۔ میں حسبِ معمول پیپر دے کر باہر آئی تو خلافِ توقع اکرم بھائی نہیں آئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی۔ میرے پاس موبائل نہیں تھا کیونکہ اماں غیر شادی شدہ لڑکیوں کو موبائل دینے کے سخت خلاف تھیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ میرے پاس موبائل ہوتا تو میں بھائی کو کال کر لیتی مجھے تسلی تو ہو جاتی کہ وہ کیوں دیر کر رہے ہیں اور کب تک آئیں گے۔ ابھی تو میں بالکل ناواقف تھی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ کسی وجہ سے نہیں آئے تھے۔ میں سینٹر کے گیٹ کے ساتھ درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ اکرم بھائی مجھے یہیں سے لیتے تھے۔ شروع میں بہت سی لڑکیاں تھیں مگر رفتہ رفتہ سب چلی گئیں اور میں اکیلی وہاں کھڑی رہ گئی۔ سینٹر ایک رہائشی سڑک پر تھا اور یہاں ویرانی سی تھی۔ اب میں ہراساں ہو رہی تھی۔

اچانک درخت کے پاس سے کسی لڑکے کے اوباشانہ انداز میں ہنسنے کی آواز آئی۔ میں نے ذرا رخ موڑ کر دیکھا تو ایک صورت اور حلیے سے آوارہ نظر آنے والا لڑکا وہاں کھڑا ہوا تھا کچھ دیر بعد اس نے ایک واہیات گانا شروع کر دیا۔ اس کے بول سن کر مجھے درخت کی خنک چھاؤں میں بھی پسینا آنے لگا تھا۔ میں نے گھبرا کر وہاں سے جانے کا سوچا مگر یہ سوچ کر رک گئی کہ یہاں سے کہاں جاؤں گی۔ بھائی لینے نہیں آئیں گے۔ اگر میں یہاں سے ہٹی تو بھائی مجھے کیسے تلاش کریں گے۔ میں عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ مجھے

بدستور کھڑے پا کر اور اس سے زیادہ تنہائی کی وجہ سے اس کا حوصلہ بڑھتا جا رہا تھا اور اب وہ درخت کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ میرا خوف سے برا حال ہو گیا اور میں نے سوچ لیا کہ اگر اب یہ آگے آیا تو میں یہاں سے بھاگ کھڑی ہوں گی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا اور مجھے یہاں سے بھاگنا پڑتا اچانک ایک بائیک آ کر میرے پاس رکی اور اس پر بیٹھے نوجوان نے مجھ سے کہا۔ ''آپ رابعہ ہیں نا؟''

''ہاں۔'' میں نے گھبرائے انداز میں کہا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''آپ نے پہچانا نہیں۔'' اس نے تعجب سے کہا۔ ''میں سعید احمد ہوں۔ حمید احمد میرے ابا ہیں۔''

حمید احمد ہمارے گاؤں میں لڑکوں کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور وہ ان کا بیٹا تھا میں اتنی بوکھلائی ہوئی تھی کہ اسے پہچان ہی نہیں سکی تھی۔ میری کیفیت ایسی تھی کہ منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے اوباش لڑکے کو دیکھا اور پھر مجھے یونیفارم میں دیکھا تو سمجھ گیا کہ میں یہاں پیپر دینے آئی ہوں۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ کو لینے کوئی آتا ہے؟''

''اکرم بھائی۔'' میں نے رندھے لہجے میں کہا۔ ''مگر آج نہ جانے کیا ہوا ہے وہ اب تک نہیں آئے ہیں۔''

اوباش لڑکا سعید کو دیکھ کر اور مجھے اس سے بات کرتا دیکھ کر دوبارہ ذرا دور ہوا تھا۔ سعید ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ''اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔''

آج کے دور میں بھی ہمارے گاؤں میں ایسی آزادی نہیں ہے کہ کوئی لڑکی کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ چاہے وہ اس کے گاؤں کا رہنے والا ہی کیوں نہ ہو، موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سفر کرے۔ مگر اس وقت میری کیفیت ایسی تھی کہ میں آگے پیچھے کا سوچے بغیر مان گئی اور اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔ سعید نے بائیک آگے بڑھا دی۔ اس کے پیچھے کیریئر نہیں تھا مجبوراً مجھے اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا پڑا تھا۔ اس قصبے سے ہمارا گاؤں بیس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ قصبے سے نکلی تو مجھے آگے کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اگر میں اس کے ساتھ بائیک پر گھر تک پہنچی تو سارا گاؤں دیکھ لے گا اور اس کے بعد میرے بارے میں جو باتیں بنائی جائیں گی میں وہ بھی جانتی تھی اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ گاؤں سے باہر ہی اتر جاؤں۔ جب بائیک ہائی وے سے گاؤں جانے والے راستے پر مڑی تو میں نے اسے روک لیا۔ ''بس مجھے یہیں اتار دیں۔''

اس نے بائیک روک دی اور میں نیچے اتر آئی۔ اس نے اصرار نہیں کیا کہ مجھے گھر تک چھوڑے گا۔ شاید وہ بھی اس چیز کو سمجھتا تھا اسی لیے اس نے میرے کہتے ہی بائیک روک دی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے بائیک آگے بڑھا دی اور میں پیدل ہی گاؤں کی طرف چل پڑی۔ یہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اور دوسرے میں نے اپنی سفید چادر اس طرح لپیٹ لی تھی کہ میرا چہرہ نظر نہ آئے اگر آس پاس کسی نے مجھے بائیک سے اترتے دیکھا بھی تھا تو وہ میری صورت نہ دیکھ سکے۔ میں پیدل چلتی ہوئی گھر تک آئی اور اماں مجھے اتنی دیر سے اور بغیر بھائی کے آتے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ ''اتنی دیر کہاں لگا دی اور اکرم کہاں ہے؟''

''بھائی پتا نہیں کہاں ہیں۔'' میں نے تھکے لہجے میں کہا۔ ''میں بہت دیر انتظار کرتی رہی اور جب وہ نہیں آئے تو میں سڑک سے وین میں بیٹھ کر آئی ہوں۔''

میں نے جھوٹ بولا تھا۔ بھابی اندر سے آئیں اور انہوں نے فکرمند ہو کر اکرم بھائی کو کال کی تو پتا چلا کہ وہ مجھے سینٹر کے آس پاس دیکھ کر آ رہے تھے اور پریشان تھے۔ بھابی نے انہیں تسلی دی کہ میں گھر آ گئی ہوں۔ اکرم بھائی نے سکون کا سانس لیا۔ پھر ذرا غصے ہوئے کہ میں وہاں انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ بھابی نے بتایا تو میں نے انہیں اوباش لڑکے کا بتایا جو مجھے تنگ کر رہا تھا اسی وجہ سے میں وہاں سے نکل آئی۔ کچھ دیر میں اکرم بھائی بھی آ گئے۔ ان کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اور اسے ٹھیک کرنے میں دیر لگی تھی۔ کوئی اور گاڑی دستیاب نہیں تھی۔ مجھے سینٹر کے باہر نہ پا کر وہ پریشان ہو گئے تھے۔ اکرم بھائی کو یہ خیال نہیں آیا کہ میں گھر آ گئی ہوں گی۔ سب نے میری بتائی بات مان لی۔ میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ بے شک میرے گھر والے مجھ پر اعتماد کرتے تھے مگر یہ بات ایسی تھی جو میں ان سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ مگر مجھے کیا پتا تھا کہ سعید کے ساتھ مشکل سے پندرہ منٹ کا سفر میرے لیے کیا قیامت لے کر آئے گا۔

آخری پیپر تھا اور اس کی تھکن میں تمام پیپرز کی تھکن

شامل تھی۔ میں رات کا کھانا جلد کھا کر لیٹ گئی اور رات کسی وقت مجھے لگا جیسے مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ یہ قیامت مکرم بھائی تھے جنہوں نے بالوں سے پکڑ کر مجھے سوتے سے اٹھایا تھا اور اب تھپڑ پر تھپڑ مار رہے تھے۔ پہلے تھپڑ پر میں جاگ گئی اور اس کے بعد کے تھپڑوں نے میرے حواس گم کر دیئے تھے۔ میں اماں کے کمرے میں سوتی تھی اور اماں مجھے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مکرم بھائی مجھے مار رہے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ میں نے ان کی ناک کٹوا دی ہے۔ شور سن کر اکرم بھائی اور بھابی بھی اٹھ کر آ گئے تھے۔ اکرم بھائی نے مکرم بھائی کو دھکا دے کر مجھے چھڑایا اور بولے۔ ”تیرا دماغ خراب ہے آدمی رات کو یہ تماشا لگا رہا ہے۔“

”تماشا میں نے نہیں اس نے لگایا ہے۔“ مکرم بھائی ہانپتے ہوئے بولے۔ ”یہ باہر گل چھرے اڑاتی پھر رہی ہے اور تم لوگوں کو پتا ہی نہیں ہے۔“

”مکرم بکواس نہ کر یہ تیری بہن ہے۔“ اماں نے کہا۔

”تبھی دل چاہ رہا ہے کہ اس کے ٹوٹے کر دوں۔“ مکرم بھائی نے کہا۔ ”پوچھو اس سے یہ ماسٹر حمید کے لڑکے سعید کے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں گھوم رہی تھی۔ اس کی تصویریں ہیں۔ یہ دیکھو۔“

مکرم بھائی کے پاس بڑی اسکرین والا اسمارٹ فون تھا۔ اس میں میری اور سعید کی تین تصویریں تھیں جن میں ، میں اس سے بات کر رہی تھی اور پھر اس کی بائیک پر بیٹھ کر وہاں سے جا رہی تھی۔ تینوں تصویریں سینٹر کے پاس کی تھیں اور حواس باختہ ہونے کے باوجود مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ اسی اوباش لڑکے نے لی تھیں۔ اس کے پاس کیمرا یا کیمرے والا موبائل تھا میں نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ تصویریں دیکھتے ہی اماں اور اکرم بھائی کے تاثرات بدل گئے تھے اور بھابی حیران سی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ مکرم بھائی ایک بار پھر میری طرف لپکے تھے مگر اکرم بھائی نے روک دیا۔ ”ایک منٹ رک جا پہلے اسے وضاحت کرنے دے۔“

”میں اسے قتل کر دوں گا۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔“ میں نے بلبلا کر کہا۔ ”صرف ایک جھوٹ بولا ہے۔“

پھر میں نے ہچکیوں اور آنسوؤں کے درمیان انہیں ساری بات بتائی کہ میں کیوں مجبور ہوئی کہ سعید احمد کی بائیک پر بیٹھ کر گاؤں تک آئی۔ راستے میں اتر گئی تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے اور گاؤں میں ہماری عزت متاثر نہ ہو۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اوباش لڑکا میری اور سعید کی تصویریں لے لے گا اور یہ تصویریں اتنی تیزی سے مکرم بھائی تک بھی پہنچ گئیں۔ مکرم بھائی میری وضاحت ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مگر اکرم بھائی اور دوسرے سمجھ رہے تھے۔ اس معاملے میں میری غلطی ضرور تھی مگر میری نیت خراب نہیں تھی۔ جو ہوا اتفاق سے ہوا اور اگر میرا سعید سے کوئی غلط تعلق ہوتا تو میں اسے سینٹر کے باہر کیوں بلاتی جہاں اکرم بھائی آنے والے تھے۔ اماں نے میری حمایت کی۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے کیونکہ ایک بج کر پندرہ منٹ میں یہ گھر پر تھی۔“

اکرم بھائی خاموش رہے اور بھابی مجھے لے کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ انہوں نے میرے زخم دیکھے، تھپڑوں سے میرے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور ناک سے بھی خون آ رہا تھا۔ گال سوج گئے تھے۔ انہوں نے پانی گرم کر کے میری سکائی کی اور میں سسکیاں لیتی رہی۔ میں نے بھابی کے سامنے اپنی بے گناہی کی دہائی دی تو انہوں نے نرمی سے کہا۔ ”رابی میں تجھے جانتی ہوں۔ اس لیے جب تک تجھے اپنی آنکھوں سے کسی برائی میں شامل نہیں دیکھوں گی یقین نہیں کروں گی۔ مگر تیرے بھائیوں کا معاملہ مختلف ہے۔ ایک تو ان کو باہر لوگوں کا سامنا کرنا ہے اور دوسرے مرد کا یقین بہت کچا ہوتا ہے۔“

میں سہم گئی۔ ”وہ مجھے مار دیں گے۔“

”ایسا بھی نہیں ہے مگر تجھ پر سختی ضرور ہوگی اور تجھے صبر و حوصلے سے کام لینا ہوگا جب تک اوپر والا تیرے حق میں فیصلہ نہ کر دے۔“

مکرم بھائی دیر تک جھگڑتے اور چیختے چلاتے رہے پھر وہ چلے گئے تو اماں مجھے کمرے میں لائیں۔ اس رات میں بہت ڈری رہی، سوتی تو بھیانک خواب نظر آتے کہ مکرم بھائی نے بیچ بیچ میرے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور میری شادی ارشاد سے کی جا رہی ہے۔ کبھی میں دیکھتی کہ مجھے اور سعید کو ایک گڑھے میں ڈال کر ہمیں سینے تک مٹی میں دبا دیا ہے اور گاؤں والے ہمیں پتھر مار رہے ہیں اور میں چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا اعلان کر رہی ہوں مگر کوئی ماننے اور سننے کو تیار

نہیں ہے۔ جب مجھے خواب آتا میں چیخ مار کر بیدار ہوتی تھی اور پھر اماں مجھے تسلی و تھپکی دے کر سلاتی تھی۔ صبح ہوئی تو میں اس وقت تک کمرے سے نہیں نکلی کہ جب تک مکرم بھائی گھر سے نہیں چلے گئے۔ بلکہ اس کے بعد بھی مجھے باہر نکلتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا اور میں کمرے میں بیٹھی رہی۔

سارا دن اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہی کہ میں نے کبھی اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی عزت کو ذرا سا ہلکا کرنے کا بھی نہیں سوچا تھا۔ نہ کبھی میرے ذہن میں کسی لڑکے کا خیال آیا۔ میں تو اس لیے گھر سے بھی کم نکلتی تھی کہ میرے بھائیوں کو پسند نہیں تھا پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ کاش کہ میں نے گھر آکر اماں اور بھابی کو حقیقت بتا دی ہوتی تو یوں مجرم تو نہ بنتی۔ اماں نے زبردستی ناشتا کرایا اور پھر دن میں بھی کھلایا۔ دو دن میں یونہی کمرے میں قید رہی۔ اماں کے ساتھ بھابی نے بھی آکر سمجھایا مگر میں باہر نہیں آئی۔ موقع پا کر تیسرے دن بھابی نے مجھے چپکے سے بتایا کہ تصویر والی بات مکرم بھائی تک ارشاد کے توسط سے پہنچی تھی اور وہ اوباش لڑکا اصل میں ارشاد کے حالی موالیوں میں شامل ہے۔ مگر یہ بات گاؤں میں نہیں پھیلی ہے۔

مکرم بھائی کا تو سامنا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر میں اکرم بھائی کا سامنا بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اگرچہ انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ اس کے بعد سے میرے کمرے میں نہیں آئے تھے اور نہ ہی مجھ سے بات کی تھی۔ صرف اماں اور بھابی تھیں جو میرے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ شازیہ کو بھی یہ بات نہیں بتانی ہے کیونکہ وہ پیٹ کی بہت ہلکی ہے اپنے شوہر کو بتا دے گی اور وہ اپنے گھر والوں کو بتا دے گا۔ شازیہ کی ایک نند بی بی سی قسم کی چیز تھی اگر اسے کسی کے بارے میں ایسی کوئی بات پتا چلتی تھی تو جب تک وہ اپنے سب جاننے والوں کو نہیں بتا دیتی تھی اسے چین نہیں آتا تھا اور اتفاق سے اس کا سسرال ہمارے گاؤں میں تھا۔ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد مکرم بھائی نے اماں اور اکرم بھائی سے ایک بات کی اور ہمارے گھر میں سناٹا چھا گیا تھا۔

☆☆☆

خالہ کلثوم کا گھر تین منزلہ تھا۔ یہ خاصا بڑا اور پرانے طرز کا مکان تھا جو پرانے لاہور میں ہے۔ یہاں تنگ گلیاں اور اونچے اونچے مکانات تھے اس لیے گلیوں میں دن کے وقت بھی سناٹا اور نیم تاریکی رہتی تھی۔ خالہ کلثوم کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں دونوں بیٹے شادی شدہ اور اوپری منزل پر رہتے تھے نیچے خالہ کلثوم اپنی دو غیر شادی شدہ لڑکیوں نمرہ اور اسرا کے ساتھ رہتی تھیں۔ دو بڑی بیٹیاں شادی ہو کر اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ لاہور ہمارے گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے اور خالہ اماں کی ایک ہی بہن تھیں مگر مجھے یاد ہے ہم کل چار مرتبہ خالہ کے گھر گئے تھے کیونکہ ہمارے خالو ذرا دوسرے مزاج کے آدمی تھے اور وہ سسرال والوں کا اپنے ہاں زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ خود وہ کبھی ہمارے گاؤں نہیں آئے۔ نہ ہی بابا ان کے ہاں گئے تھے۔

البتہ اماں اور خالہ بچوں سمیت ایک دوسرے کے ہاں آتی جاتی تھیں۔ خالہ ہر دوسرے تیسرے سال ہمارے ہاں آتی تھیں اور بچوں سمیت کئی کئی ہفتے ہمارے ہاں رہ کر جاتی تھیں جب کہ ہم جو چار دفعہ گئے تو اس دوران میں کل ملا کر شاید دس دن وہاں رکے ہوں گے۔ خالو کا رویہ دیکھتے ہوئے اکرم اور مکرم بھائی نے پہلی بار کے بعد جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے اماں مجھے اور شازیہ کو لے کر جاتی رہی تھیں۔ اگرچہ ہمارے ساتھ بھی ان کا رویہ اچھا نہیں تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح چند دن ہمیں برداشت کر لیتے تھے۔ میں جب آخری بار گئی تو نویں کلاس میں تھی۔ اس کے چند مہینے بعد اچانک ہی خالو کا انتقال ہو گیا تو اماں اور اکرم بھائی گئے تھے۔ بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ خالہ بابا کے انتقال پر آئیں تو اپنے بیٹوں کو لائی تھیں۔ البتہ جب اکرم بھائی اور شازیہ کی شادی ہوئی تو خالہ کا پورا گھر آیا تھا۔

نمرہ مجھ سے ایک سال بڑی اور اسرا ایک سال چھوٹی تھی اس لیے ہمارے درمیان اچھی دوستی تھی۔ ان کے پاس موبائل تھے اور وہ پہلے اکرم بھائی اور پھر بھابی کے موبائل پر مجھے میسج بھیجتی تھیں۔ اس لیے جب میں اماں کے ساتھ بنا اطلاع کے اچانک وہاں پہنچی تو وہ دونوں خوش ہو گئیں۔ نمرہ نے سیکنڈ ائر کے پیپرز دیئے تھے اور اسرا نے میٹرک کے پیپرز دیئے تھے اور دونوں فارغ تھیں۔ اس لیے مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ اماں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ ملنے آئی ہیں اور میں پیپرز کے بعد فارغ تھی اس لیے مجھے یہاں چھوڑنے آئی ہیں۔ خالہ کے گھر ہم خود ہی پہنچ گئے تھے۔ خالہ زاد بھائیوں ریحان اور عدنان نے کہا کہ انہیں بتایا ہوتا تو وہ

بس اڈے پر لینے آجاتے مگر بس اڈہ یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ تین دن رک کر اماں واپس جانے لگیں تو عدنان بھائی انہیں بس پر بٹھا آئے تھے۔ گاؤں تک کا سفر ڈھائی تین گھنٹے کا تھا۔

اماں نے خالہ کو اصل بات بتادی تھی۔ البتہ ان کے بچوں کو علم نہیں تھا کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں۔ موسم گرم تھا اور پہلی رات جب سونے کے لیے چھت پر جانے کے بجائے کمروں کا انتخاب کیا گیا تو مجھے حیرت ہوئی کیونکہ ہم ہمیشہ گرمیوں میں یہاں آتے تھے اور رات کو چھت پر ہی سوتے تھے نیچے خاصی گرمی ہوتی تھی۔ میں نے نمرہ سے پوچھا تو وہ ٹال گئی تھی۔ رات بہت مشکل سے نیند آئی کیونکہ پنکھے سے بھی گرم ہوا نکل رہی تھی۔ خالہ کے کمرے میں اے سی تھا اور ریحان وعدنان بھائی نے بھی اپنے کمروں میں اے سی لگوائے ہوئے تھے اس لیے وہ سکون سے سو گئے۔ امی خالہ کے کمرے میں رکی تھیں۔ گپ شپ کرنے کے چکر میں نمرہ اور اسرا مجھ سمیت اپنے کمرے میں رہی تھیں۔ ہم جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے رات ذرا ٹھنڈی ہوئی تو ہمیں نیند آگئی۔ دن میں نچلا حصہ سب سے ٹھنڈا ہوتا تھا۔ مگر شام ہوتے ہی یہاں گرمی ہوجاتی تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ رات کو نیچے سونے کے ساتھ وہ شام کو بھی چھت پر جانے سے گریز کررہی تھیں۔ میں نے نمرہ اور اسرا سے چھت پر چلنے کو کہا تو وہ بھی ٹال گئیں۔

''چھوڑو یہیں بیٹھتے ہیں۔''

اس وقت اماں تھیں اور وہ خالہ کے ساتھ لگی رہتی تھیں مجھے خیال آیا کہ شاید یہ دونوں بھی اماں کے ساتھ بیٹھنا چاہ رہی ہیں لیکن جب اماں کے جانے کے بعد بھی انہوں نے اوپر جانے سے گریز کیا تو میں چونکی تھی۔ خالہ کا گھر کوئی نصف کنال پر تھا۔ اس میں سامنے کی طرف کھلا صحن تھا پھر گراؤنڈ فلور تھا جس میں پانچ کمرے تھے۔ تین بیڈ رومز، ایک لاؤنج اور ایک نشست گاہ تھی۔ اوپر تین تین کمروں کے دو پورشن تھے جن میں عدنان بھائی اور ریحان بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ دوسری منزل پر دو بڑے کمرے تھے اور پہلے وہ کرائے پر دیئے ہوئے تھے۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے نمرہ سے پوچھا۔ ''تم لوگوں نے کرائے دار کیوں نکال دیئے۔''

''بس نکال دیئے۔'' اس نے عجلت میں کہا۔ ''اماں کو پتا ہوگا۔''

وہ لوگ جس طرح اوپر کی منزل پر جانے سے گریز کر رہے تھے اور اس کا ذکر بھی نہیں کر رہے تھے اس سے صاف لگ رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ آخر اوپر ایسا کیا تھا کہ یہ لوگ نہیں جا رہے تھے اور نہ ذکر کر رہے تھے۔ اماں کے جانے کے دوسرے دن میں دوپہر میں واش روم جانے کے بہانے باہر آئی۔ یہاں واش روم کمروں کے ساتھ نہیں تھے بلکہ باہر کے حصے میں تھے۔ البتہ یہ حصہ گرل کی مدد سے گھر میں شامل کرلیا گیا تھا۔ یہاں دو عدد کمل اور جدید واش روم تھے۔ میں دبے قدموں سیڑھیوں تک آئی۔ سیڑھیاں پہلے اوپری منزل تک جارہی تھیں۔ یہاں ایک دروازہ دوسرے فلور پر کھل رہا تھا جسے رات کے وقت اندر سے بند کرلیا جاتا تھا۔ عدنان اور ریحان بھائی کی بیویاں نیچے زیادہ آتی جاتی نہیں تھیں اس لیے یہ دروازہ اکثر بند ہی رہتا تھا۔ اس سے اوپر زینہ دوسری منزل پر جا رہا تھا۔ میں دبے قدموں چڑھ کر اوپر آئی تو وہاں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور سناٹا تھا۔ چھت کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

پرندوں کی بیٹ اور گرد کی موٹی تہہ بتا رہی تھی کہ وہاں نہ تو کوئی آتا تھا اور نہ ہی صفائی ہوتی تھی۔ بلکہ آخر کی چند سیڑھیاں بھی اسی طرح مٹی سے اٹی تھیں کہ وہاں سے جھاڑو بھی نہیں ماری جاتی تھی۔ اوپر چارپائیاں پڑی تھیں اور ان کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ دونوں کمرے بند تھے اور ان پر تالے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے وہاں کی حالت دیکھ کر خوف سا محسوس ہوا تھا اور میں واپس آرہی تھی کہ مجھے لگا جیسے کسی نے عقب سے مجھے ہلکا سا دھکا دیا ہو اور میں اس وقت سیڑھیوں کے پاس تھی گرتے گرتے بچی۔ اس کے بعد میرے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں تیز قدموں سے نیچے آئی تو میرا سانس پھولا ہوا تھا اسی وقت نمرہ باہر آئی تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ''تو کہاں گئی تھی...... اوپر چھت پر؟''

''ہاں۔'' میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ وہ لپک کر میرے ساتھ آئی۔

''بے وقوف کیوں گئی تھی۔ وہاں کوئی نہیں جاتا ہے۔''

اندر آکر میں نے فریج سے پانی نکال کر پیا تو مجھے ذرا سکون آیا تھا۔ ''بس ایسے ہی چلی گئی تھی۔ جب سے

یہاں آئی ہوں کھلا آسمان نہیں دیکھا ہے۔ مگر تم لوگ اوپر کیوں نہیں جاتے ہو اور وہاں کی حالت سے بھی لگ رہا ہے کہ وہاں نہ تو کوئی جاتا ہے اور نہ ہی وہاں کی صفائی ہوتی ہے۔"

نمرہ نے میری بات کا جواب نہیں دیا وہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ "تو ڈری ہوئی لگ رہی کیا تو نے کچھ دیکھا یا سنا ہے۔"

"نہیں میں نے کچھ دیکھا یا سنا نہیں ہے۔" میں نے کہا تو مجھے اس دھکے نما احساس کا خیال آیا مگر میں نے نمرہ کو اس بارے میں نہیں بتایا۔ اس کے بجائے میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ معاملہ کچھ پُراسرار سا لگ رہا ہے۔"

"شش۔" نمرہ نے گھبرا کر کہا۔ "پلیز چپ کر جا۔"

میں نے کہنا چاہا تو اس بار اس نے میرے منہ پر باقاعدہ ہاتھ رکھ دیا۔ وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ مجبوراً میں نے سر ہلایا تو اس نے میرے منہ سے ہاتھ ہٹایا۔ شام کے وقت عدنان بھائی نے ہم تینوں سے شالیمار باغ لے جانے کو کہا تھا اس لیے وہ جلدی آفس سے آگئے۔ ان کی دو سال پہلے شادی ہوئی تھی اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے بھابی نے جانے سے انکار کر دیا کہ وہ پھر تنگ کرے گا۔ ہم تینوں اور خالہ تیار ہوئے تھے۔ ہم شالیمار باغ پہنچے تو وہاں خاصی رونق تھی۔ گرمی سے بوکھلائے لوگ خاصی تعداد میں وہاں آئے ہوئے تھے۔ عدنان بھائی ہمیں وہاں ایک جگہ چھوڑ کر کھانے پینے کی چیزیں لینے چلے گئے۔ راستے میں، میں نے نمرہ کو اس بارے میں کریدا مگر اس نے سرگوشی میں کہا۔ "سب کے سامنے نہیں اکیلے میں بتاؤں گی۔ اماں اور اسرا کو بھی پتا نہ چلے۔"

میرا تجسس بڑھ گیا تھا کہ ایسی کیا بات ہے۔ آخر نمرہ کس بات سے اتنی خوفزدہ تھی۔ کچھ دیر میں عدنان بھائی دہی بھلے، چنا چاٹ اور کولڈ ڈرنک لے آئے۔ کھاپی کر اسرا نے جھولا جھولنے کی فرمائش کی تو خالہ اسے اس طرف لے گئیں جہاں جھولے لگے ہوئے تھے۔ عدنان بھائی کو اتفاق سے ان کا ایک دوست مل گیا جو فیملی کے ساتھ آیا ہوا۔ وہ اس سے گپ شپ میں لگ گئے۔ دوست کی فیملی نے ہم سے بس سلام دعا کی اور آپس میں مگن ہو گئی اس لیے مجھے نمرہ سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اب بتا اور کوئی نہیں سننے والا۔"

نمرہ سنجیدہ ہو گئی اور اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے سہمے لہجے میں کہا۔ "ڈھائی سال سے ہم اس مصیبت میں ہیں۔ مگر نہ تو کسی کو بتا سکتے ہیں اور نہ ہی آپس میں بات کر سکتے ہیں۔ اگر گھر میں اس بارے میں بات کریں تو فوراً ہی کوئی نہ کوئی نقصان ہو جاتا ہے۔ لیکن بات نہ کرو تو کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اسی لیے میں گھر میں بات نہیں کر رہی تھی۔"

"آخر ہوا کیا؟" میرا تجسس انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ نمرہ نے جواب میں جو بتایا وہ کچھ یوں تھا۔

☆☆☆

اوپری منزل ہمیشہ کرائے پر رہتی تھی۔ پہلا کرائے دار تو بیس سال رہا تھا۔ اس وقت خاندان چھوٹا تھا اور پہلی منزل بھی کرائے پر ہوتی تھی اور خالہ خالو بچوں سمیت گراؤنڈ فلور پر رہتے تھے۔ پہلے کرائے دار کے جانے کے بعد چند ایک اور کرائے دار آئے اور کسی نہ کسی وجہ سے جلدی خالی کر گئے۔ پھر ایک مولوی نظر آنے والا آدمی آیا۔ اس کی بیوی اور ایک بیٹی تھی۔ بہ ظاہر وہ دین دار اور نیک نظر آتا تھا۔ اس کا نام افضل حسین تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی پردہ کرتی تھیں۔ وہ تینوں زیادہ تر گھر میں رہتے تھے۔ افضل حسین کا ذریعہ آمدنی معلوم نہیں تھا مگر وہ کرایہ اور بل وغیرہ وقت پر ادا کرتا تھا۔ اس لیے خالو کو تجسس نہیں تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ کئی مہینے ہو گئے تھے مگر اس کی بیوی اور لڑکی ایک بار بھی خالہ اور ان کی بیٹیوں سے نہیں ملی تھی۔ چند مہینے سکون رہا تھا پھر ایک رات اچانک اوپر سے ایسی دھماچوکڑی کی آواز آئی جیسے چھت پر کوئی گرز مار رہا ہو اور ساتھ ہی عجیب سا شور بھی سنائی دیا تھا۔ خالو، خالہ اور بچے ڈر گئے تھے اس وقت عدنان بھائی کی تازہ تازہ شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیوی ایسی ڈری کہ بے ہوش ہو گئی۔ خالو اور لڑکے اوپر پہنچے اور انہوں نے دوسری منزل کا دروازہ بجایا تو خاصی دیر بعد جا کر افضل حسین نے دروازہ کھولا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ جسم پسینے میں شرابور تھا۔ خالو نے پوچھا۔

"یہ شور کیسا تھا تم لوگ کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں کر رہے۔" وہ کرخت لہجے میں بولا۔ "جاؤ اب شور نہیں ہوگا۔" اس نے کہتے ہوئے دروازہ

دھڑ سے بند کر دیا۔ خالو اور لڑکے حیران رہ گئے کیونکہ وہ بہت مہذب اور نرم لہجے میں بات کرنے والا شخص تھا۔ مگر اس وقت وہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ ریحان اور عدنان بھائی کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے خالو سے کہا۔

''ابا یہ کس طرح بات کر رہا ہے اس سے کل ہی مکان خالی کرائیں۔ اگر انہوں نے روز یہ ہنگامہ کیا تو ہمارا سکون ختم ہو جائے گا۔''

خالو بھی یہی سوچ رہے تھے انہوں نے اگلے دن ہی افضل حسین سے بات کی۔ ''تم میرا مکان خالی کر دو۔''

''اس کی تو بات ہی مت کرنا۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ ''ایسا نہ ہو کہ تم لوگوں کو یہ مکان خالی کرنا پڑ جائے۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔'' خالو کو غصہ آ گیا۔

''تمیز سے بات کرو میرے قبضے میں جنی ہے۔'' افضل حسین نے اکڑ کر کہا۔ ''اگر یقین نہیں آ رہا تو ابھی دکھاتا ہوں۔ شیبا سامنے آ۔''

خالو کا کہنا تھا کہ انہیں لگا کہ ان کی پلک جھپکی ہو اور ایک نہایت حسین مگر لمبی تڑنگی عورت ان کے سامنے آ گئی۔ اس نے سرخ بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا اور اس کی آنکھیں انسان کے بجائے بلی جیسی تھیں۔ خالو کے ہوش اڑ گئے اور وہ اٹھ کر بھاگے تو گراؤنڈ فلور کی سیڑھیوں پر آ کر گر پڑے اور انہیں خاصی چوٹ آئی تھی۔ کئی دن تو بستر سے اٹھ نہیں سکے تھے۔ اس وقت گھر والے سمجھے کہ وہ شاید غلطی سے گر گئے ہیں۔ خالو نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ وہ شاید خالہ کو بتا دیتے مگر جب ڈاکٹر کے پاس سے آ کر وہ کمرے میں لیٹے ہوئے تھے تو اچانک ہی شیبا ان کے سامنے آئی اور اس نے کرخت لہجے میں دھمکی دی۔ ''اگر کسی سے اس واقعے کا ذکر کیا یا میرا نام لیا تو وہ تیری زندگی کا آخری لمحہ ہوگا۔''

اس واقعے سے خالو اور خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ایک بار گلی میں افضل حسین سے سامنا ہوا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ ''تم نے اچھا کیا جو اپنی زبان بند رکھی ورنہ وہ سچ مچ تمہاری گردن مروڑ دیتی۔''

خالو نے ہمت کر کے کہا۔ ''افضل بھائی یہ کیا چکر ہے؟''

''لمبا چکر ہے تم نہیں سمجھو گے بس یوں سمجھ کہ کچھ عرصے کے لیے یہ جنی میرے قابو میں آ گئی ہے اور میں اس

سے جو چاہے کروا سکتا ہوں۔"
"اگر تم اس سے جو چاہے کروا سکتے ہو تو اپنے لیے مکان کا بندوبست کرالو اور میرا مکان چھوڑ دو۔" خالو نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا۔"
"فکر مت کرو میں زیادہ عرصے یہاں نہیں رہوں گا۔ کچھ مجبوری ہے جس کی وجہ سے میں یہاں سے جا نہیں سکتا مگر کرایہ اور بل میں اسی طرح ادا کرتا رہوں گا۔ تم چاہو تو زیادہ کرایہ لے لو۔"
"نہیں۔" خالو نے جلدی سے کہا۔ "تمہاری اتنی ہی مہربانی کافی ہے کہ تم مکان خالی کر دو گے۔"
خالو نے گھر والوں کو نہیں بتایا تھا مگر کسی نہ کسی طرح گھر والوں کو احساس ہو گیا۔ شام کے وقت اوپر سے بے پناہ خوشبوئیں آتیں۔ ان میں لذیذ پکوانوں کی خوشبو بھی ہوتی تھی۔ افضل حسین کی بیوی اور بیٹی جو پہلے برقع کے بغیر نظر نہیں آتی تھیں اب بنا پردے کے زرق برق لباس اور ڈھیروں سونے کے زیورات میں لدی پھندی نظر آنے لگیں۔ افضل حسین نے بہترین گاڑی لے لی تھی اور روز ہی پورا خاندان کہیں نہ کہیں تفریح پر جاتا تھا۔ ان کے گھر قیمتی سامان آ گیا تھا اور روز ہی وہ کچھ نہ کچھ خرید کر آ رہے ہوتے تھے۔ خالو جانتے تھے کہ یہ سب کس طرح ہو رہا ہے۔ مگر باقی گھر والوں کو بھی شک ہو گیا تھا۔ پھر گھر کے لوگوں نے سیڑھیوں پر ایک سرخ بھڑکیلے لباس والی عورت کو دیکھا۔ گھر والے بھی خوفزدہ ہو گئے۔ خالہ جب خالو سے اس بارے میں بات کرتیں تو وہ انہیں خاموش کرا دیتے۔
انہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس بارے میں زیادہ بات نہ کریں اور اگر کچھ دیکھیں تو اسے اپنے تک رکھیں۔ محلے میں بات کرنے کی تو بالکل بھی کوشش نہ کریں ورنہ انہیں یا گھر کے کسی فرد کو نقصان ہو سکتا تھا۔ جب گھر کا سربراہ ایسی بات کر رہا ہو تو دوسرے لازماً خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ افضل حسین اس واقعے کے بعد چند مہینے وہاں اور رہا پھر ایک رات اس کے فلور سے شور اٹھا اور وہی دھما چوکڑی والی آوازیں آئیں مگر اس بار ڈر کے مارے کوئی اپنے کمرے سے بھی نہیں نکلا تھا۔ سب دروازے بند کر کے بیٹھے رہے۔ اگلی صبح افضل حسین جا کر ٹرک لایا اور اس نے اپنا سامان اس میں ڈالا۔ خالی گھر کی چابیاں خالو کو پکڑائیں اور وہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ خالو اور دوسرے گھر والے پریشان تھے۔ خالو ڈرتے ڈرتے اوپر گئے۔ کمرے خالی تھے مگر وہاں بہت تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک شیبا کی آواز آئی۔
"جا یہاں سے پھر مت آنا اب یہاں کوئی نہ آئے۔ ورنہ نقصان اٹھائے گا۔"
"یہ میرا گھر ہے۔" خالو نے ہمت کر کے کہا۔
"تیرا تھا اب یہ میرا ہے میں نیچے نہیں آؤں گی مگر کوئی اوپر نہیں آئے گا۔" شیبا نے کہا اور خالو کو اچانک دھکا لگا تو وہ اڑ کر صحن میں آ گرے تھے۔ انہیں خاصی چوٹ آئی تھی اور وہ اٹھ کر بہ مشکل نیچے آئے اور گھر والوں کو اس بارے میں بتا کر اوپر جانے سے منع کر دیا۔ خالو کی چوٹ ٹھیک ہو گئی مگر ان کی طبیعت نہ سنبھل سکی اور وہ بیمار رہ کر کچھ عرصے بعد دنیا سے گزر گئے۔ اس کے بعد سے اوپر کی منزل خالی پڑی تھی اور وہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔ ایک بار عدنان بھائی نے وہاں کے دروازے پر تالا لگایا تو وہ اگلے ہی دن ٹوٹا ہوا پایا گیا تو اس کے بعد کسی کی جرأت نہ رہی کہ اوپر کے کسی معاملے میں دخل اندازی کرے۔ اب وہاں کوئی نہیں جاتا تھا مگر نیچے بھی کوئی نہیں آتا تھا اور پہلے سیڑھیوں پر جو سرخ لباس والی عورت نظر آتی تھی وہ اب غائب تھی۔ البتہ شام کے وقت اور اکثر بدھ والے دن اوپر سے تیز خوشبوئیں آتی تھیں۔ محلے والوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنی چھت سے ان کی چھت پر کسی عورت کو ٹہلتے دیکھا تھا۔ مگر خالہ اور ان کے بچوں نے کبھی محلے والوں کی بات کی تصدیق نہیں کی اور نہ ہی ان سے اس موضوع پر بات کی تھی۔ وہ محلے والوں کو جھٹلا دیتے تھے۔

☆☆☆

میں دنگ رہ گئی تھی اور مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ نمرہ نے جو بتایا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی مجھے لاکھ روپے بھی دیتا تو میں چھت کا رخ نہ کرتی میں نے اس سے شکوہ کیا۔ "تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا میں بے خبری میں اوپر چلی گئی اگر وہ مجھے مار دیتی تو......؟"
"اسی لیے نہیں بتایا کہ تو ڈر جائے گی اور شاید جلدی واپس چلی جائے۔"
"مجھے ڈر لگتا مگر واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے سرد آہ بھری تو نمرہ چونک گئی۔ اس نے کہا۔

''رابعہ کیا بات ہے خالہ بھی پریشان لگ رہی تھیں اور انہوں نے امی سے کچھ کہا ہے انہوں نے بتایا تو نہیں مگر مجھے لگ رہا ہے کوئی چکر ہے جو تو اچانک ہمارے رہنے آگی ہے۔''

''چکر تو بہت بڑا ہے۔'' میں نے کہا اور پھر نمرہ کو سب بتا دیا۔ وہ بھی اتنا حیران ہوئی جتنا کہ میں خوف زدہ ہوئی تھی۔ بکرم بھائی سے ارشاد نے کہا ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے اور ڈھکے چھپے انداز میں انہیں دھمکی دی ہے کہ اگر اب بھی انکار ہوا تو ان کا مہرالنسا سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ وہ اس کے لیے پاگل ہو رہے تھے اور انہوں نے گھر میں روز ہی اس موضوع پر ہنگامے شروع کر دیئے تھے اور ان کی تان مجھ پر ٹوٹتی تھی جب وہ شور شرابے کے بعد مجھے مارنے دوڑتے تھے۔ پہلے بھی انہوں نے مجھے لہولہان کر دیا تھا۔ دوسری بار جب انہوں نے مجھے مارا تو اماں نے فیصلہ کیا کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا وہ مجھے خالہ کے ہاں چھوڑ دیں۔ اس لیے اماں نے خاموشی سے مجھے خالہ کے ہاں چھوڑ دیا اور انہیں ساری حقیقت بتاتے ہوئے ان سے کہا۔

''رابعہ تیرے ہاں رہے گی جب تک یہ مسئلہ طے نہیں ہو جاتا۔''

خالہ نے اماں کو اطمینان دلایا کہ وہ میری طرف سے بے فکر رہیں۔ میں چاہوں تو یہیں رہوں اور سیکنڈ ائیر کی تیاری کرتی رہوں۔ اتفاق سے نمرہ نے بھی ایف اے کیا تھا اور اب وہ بی اے کے پہلے سال میں آگئی تھی، اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے تیاری کرا دے گی کیونکہ مجھے بھی مسئلہ جلد حل ہوتا نظر نہیں آرہا تھا اس لیے میں ایک دن نمرہ اور اسرا کے ساتھ بازار گئی اور دوسری چیزوں کے ساتھ کورس کی کتابیں بھی لے آئی۔ جون کے آخر میں بارشیں شروع ہو گئیں۔ جس سے گرمی کا زور ٹوٹنے لگا۔ میں جون کے شروع میں یہاں آئی تھی تب بے پناہ گرمی تھی۔ اب موسم اچھا ہوا تو میں نمرہ اور اسرا کے ساتھ گھومنے پھرنے باہر بھی جانے لگی۔ اسرا بھی نمرہ کے کالج میں داخل ہوئی تھی اور وہ اکثر کالج کی طرف سے نمائشوں اور پکنک پر جاتی رہتی تھیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔ سچی بات ہے یہاں آکر میں نے بہت انجوائے کیا تھا۔

گھر میں شبینہ بھابی بھی تھیں لیکن ایک تو وہ عمر اور

آپ نے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے بارے میں تو بہت کچھ سنا ہوگا۔ وہ کتابیں بھی دیکھی ہوں گی۔ اب آپ کو گنیز بک پر آئے ورلڈ ریکارڈ کا ایک ریکارڈ بتا دوں۔ یہ وہ واحد کتاب ہے جس کو آج تک دنیا کی کسی لائبریری سے چرایا نہیں گیا۔ حالانکہ کتابوں کی چوری تو ایک عام سی بات ہے۔

مرسلہ: عباس علی زاہد۔ لاہور

☆☆☆

افریقا بہت پُراسرار اور بہت دلچسپ ملک ہے۔ اس کے رسوم ورواج اس کی روایات، اس کی کہانیاں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ طرح طرح کے رسم ورواج تھے۔ ان کی تعداد کا آپ اس سے اندازہ کرلیں کہ ایک زمانے میں افریقا میں دس ہزار ریاستیں تھیں اور ہر ریاست کی سینکڑوں رسوم تو ہوتی ہی ہوں گی پھر سوچ لیں افریقا کیا رنگا رنگ سرزمین ہو گی۔ چلیں افریقا کی ایک رسم کے بارے میں بتا دیں۔ یہ رسم کلان قبیلے کی تھی۔ یہ بے چارے اتنے ہمدرد، نرم دل اور مہربان ہوتے تھے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر باہر کے قبیلے کا کوئی فرد آکر ان کی زمین پر اپنا گھر بنالیتا تو یہ مروت میں اسے کچھ نہیں کہتے تھے۔ صرف اس کے گھر کو آگ لگا دیتے تھے۔ وہ بے چارہ بے گھر ہو کر پھر ان کی زمین کو خدا حافظ کہہ دیتا تھا۔

مرسلہ: ہما بخاری۔ ملتان

☆☆☆

آپ نے ہیروئن تو ضرور دیکھی ہوگی۔ دو طرح کی ہیروئنیں مشہور ہیں ایک فلم کی ہیروئن اور دوسری نشے والی ہیروئن۔ مشہور دوا ساز کمپنی ''بائر'' کھانسی کی ایک دوا کو ہیروئن کے نام سے فروخت کرتی رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان ایک باشعور مخلوق ہے لیکن تھوڑا سا شعور تو دوسروں میں بھی ہوتا ہے۔ جیسے کوؤں میں۔ کتے 250 الفاظ سمجھنے اور یاد کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اشارے سمجھ لیتے ہیں اور اگر محنت کی جائے تو آسان حساب کتاب بھی کر لیتے ہیں۔

مرسلہ: نرجس افروز۔ لاہور

رشتے میں بڑی تھیں اور پھر ان پر بہت سی ذمے داریاں بھی تھیں انہیں گپ شپ کرنے کے لیے کم وقت ملتا تھا۔ بے تکلفی ہوگئی تھی اور اسرا سے بھی گپ شپ تھی۔ ان دونوں کے ساتھ بہت مزہ آتا تھا۔ خالہ مجھ سے محبت کرتی تھیں اور مجھے آئے ہوئے دوسرا مہینا تھا مگر وہ اب بھی مہمانوں کی طرح پوچھتی تھیں۔ شروع کے چند دن تو میں فارغ رہی مگر مجھ سے خالی نہیں بیٹھا جا رہا تھا اس لیے میں چھوٹے موٹے کاموں میں حصہ لینے لگی۔

خاص طور سے خالہ کا ہاتھ بٹاتی تھی اگرچہ وہ بہت منع کرتی تھیں۔ خالہ کے لیے خالو بہت کچھ چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کے پاس ماہانہ آمدنی والے سرٹیفکٹس تھے جن سے خالہ کو اتنا ملتا تھا کہ وہ آرام سے اپنا اور بیٹیوں کا گزارا کرتی تھیں۔ عدنان اور ریحان بھائی جو دیتے تھے وہ نمرہ اور اسرا کی شادی کے لیے جمع کر لیتی تھیں۔ ویسے بھی انہوں نے بہت کچھ جمع کر لیا تھا خاص طور سے دونوں بیٹیوں کے لیے زیور بنا لیا تھا۔ اسی طرح بہت سی چیزیں جو قبل از وقت بنائی جا سکتی تھیں وہ خالہ نے بنا لی تھیں۔ نچلے فلور کا ایک کمرا انہوں نے اسی سامان کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس میں دو بڑے سائز کی پیٹیوں میں نمرہ اور اسرا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اماں نے خالہ کو میرا خرچ دینا چاہا مگر انہوں نے بہت برا مانا تھا اور اماں سے ایک روپیا لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس لیے اماں جاتے ہوئے وہ رقم مجھے دے گئی تھیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو میں نمرہ اور اسرا کے ساتھ جا کر لے آتی تھی۔

گھر کے حالات سے میں بھابی کے توسط سے باخبر تھی۔ نمرہ اور بھابی کے موبائل سمیں ایک ہی کمپنی کی تھیں اور نمرہ کے پاس پیکیج بھی ہوتا تھا تو مجھے جب ضرورت ہوتی میں اس سے موبائل لے کر بھابی سے بات کر لیتی تھی اور ان سے ہونے والی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نکرم بھائی مکمل طور پر ارشاد کے حامی تھے اور مجھے بدنامی کی وجہ قرار دیتے ہوئے ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ مجھے ارشاد سے بیاہ دیا جائے کیونکہ میں کسی شریف آدمی کی بیوی بننے کے لائق نہیں رہی تھی۔ میں یہ باتیں سنتی تو میرا دل دکھ سے بھر جاتا تھا۔ نکرم بھائی کو صرف اپنی فکر تھی اور وہ مجھے اپنے مفاد کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس واقعے سے انہیں موقع مل گیا تھا رفتہ

رفتہ وہ دھمکیوں پر آ گئے تھے کہ ارشاد اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرے گا اور اگر اس نے کچھ برا کیا تو پھر میرے گھر والے شکایت نہ کریں۔ اس پر اکرم بھائی نے انہیں بہت سخت سنائی تھیں اور کہا تھا کہ وہ جو چاہے کرلے مگر رابعہ کا رشتہ اس سے نہیں ہوگا۔ بے شک وہ مہر النسا کے رشتے سے انکار کر دیں۔

میں سوچ رہی تھی کہ بے شک یہ میری خالہ کا گھر ہے لیکن میں اس طرح کب تک رہ سکتی تھی۔ لوگ باتیں کرتے اور شک کرتے کہ کوئی بات ہے جو میں اس طرح یہاں رہ رہی ہوں۔ خود خالہ کی بہوئیں اب مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی تھیں اگرچہ وہ کچھ کہتی نہیں تھیں کیونکہ خالہ نے شروع دن سے ایسا ماحول رکھا تھا کہ نہ ان کے کسی معاملے میں دخل دیتی تھیں اور نہ انہیں اپنے معاملے میں دخل دینے دیتی تھیں۔ خالہ، نمرہ اور اسرا کو علم تھا اس لیے وہ میرے ساتھ نارمل رہتی تھیں اور اکثر مجھے تسلی بھی دیتی تھیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خالہ کبھی کبھی حسرت سے کہتیں کہ کاش تیرے خالو رکاوٹ نہ بنتے تو میں تم دونوں بہنوں کو یہاں لے آتی۔ اللہ بخشے انہیں میرے گھر والوں سے بیر تھا۔

گرما گزرا اور خزاں کا موسم آیا اب شام کا وقت ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ صرف دن میں ہلکی سی گرمی ہوتی تھی اور وہ بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مگر اس روز خاصی گرمی تھی اور صبح سے حبس تھا۔ دوپہر میں تو ایسی کیفیت ہوگئی کہ سانس بھی مشکل سے لیا جا رہا تھا۔ شام کے وقت اچانک ہی بہت تیز آندھی آئی اور ہواؤں کے گرد آلود جھکڑ اتنے تیز تھے کہ ہم نے اندر گھس کر سارے کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیے۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ باہر اندھیرا سا چھا گیا اور کچھ دیر بعد لائٹ گئی تو اندر بھی اندھیرا ہو گیا تھا۔ خالہ نے یو پی ایس لگوایا ہوا تھا جس سے لائٹ جانے کی صورت میں دو کمروں کے پنکھے اور انرجی سیور چل جاتے تھے۔ آندھی ابھی جاری تھی کہ بہت تیز بارش شروع ہو گئی۔ ہم سب خالہ والے کمرے میں جمع تھے۔

آندھی اور بارش کے ساتھ ہی گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا اور ہم اندر بھی اسے واضح محسوس کر سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہواؤں کا زور کم ہوا تو ہم برآمدے میں نکل آئے اور بارش کے منظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ہوا بہت خنک تھی اور جسم پر لگ رہی تھی۔ اچانک بادل زور سے گرجے اور اس

کے ساتھ ہی ایک طویل چیخ نما آواز آئی۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب بادل کی گرج تھم گئی مگر چیخ نما آواز جاری رہی تھی اور یہ واضح طور پر چھت سے آرہی تھی۔ خالہ نے گھبرا کر کہا۔ ”لڑکیوں اندر چلو، جلدی کرو، آؤ اندر آؤ۔“

نمرہ اور اسرا بھی گھبرا گئی تھیں۔ وہ اندر جانے لگیں اور میں ان کے ساتھ تھی کہ اچانک صحن سے بلی کے بچے کی آواز آئی۔ آواز میں کمزوری اور مدد کی اپیل نمایاں تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو صحن میں بچھے تخت تلے ایک سفید اور سنہری بالوں والا بہت پیارا سا بلی کا بچہ دکھائی دیا اس کی فر پر کہیں کہیں خون کی سرخی نظر آرہی تھی۔ شاید وہ زخمی تھا۔ وہ خوف زدہ اور لرزتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے نمرہ سے کہا۔ ”رکو وہ بلی کا بچہ اسے مدد کی ضرورت ہے۔“

”رابعہ اسے چھوڑ اندر آ۔“ خالہ نے کمرے سے چلاّ کر کہا۔ میں مجبوراً اندر جانے لگی تھی کہ ایک خوفناک سی غراہٹ سنائی دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو تخت سے کچھ دور دیوار پر ایک بہت بڑا اور سیاہ رنگ کا بلا بیٹھا ہوا تھا اور اس کی سرخ انگارہ آنکھیں بلی کے معصوم بچے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی غراہٹ کے ساتھ ہی اوپر سے وہی طویل چیخ سنائی دی۔ بلے کی غراہٹ نے بچے کو سہما دیا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ یہ بلا یقیناً اسے مارنے کے درپے تھا اور شاید اسی نے اسے زخمی کیا تھا۔ مگر اوپر سے آنے والی چیخ نما آواز بلی کی نہیں تھی اور مجھے احساس ہوا کہ معاملہ بہ ظاہر وہ نہیں ہے جو نظر آرہا تھا۔ میرے اندر خوف سا ابھرنے لگا۔ اس دوران میں نمرہ اور اسرا کمرے میں جا چکی تھیں اور بار بار مجھے اندر آنے کو کہہ رہی تھیں۔ مگر میں برآمدے میں رہی۔ نہ جانے کیوں اس وقت مجھے ابا کی بات یاد آگئی۔ ”بیٹا جی میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کامیابی ہمیشہ چھوٹے کام کرنے سے ملتی ہے۔“

بہ ظاہر یہ چھوٹی سی بات لگ رہی تھی کہ میں صحن میں جاؤں اور بلی کے بچے کو اٹھا کر اپنی حفاظت میں لے لوں۔ مگر جو ماحول تھا اور جو اس گھر میں ہوتا رہا تھا۔ اس کے تناظر میں یہ کام بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔ اوپر سے آتی چیخ نما آواز اور بلے کی موجودگی نے ماحول کو خوفناک بنا دیا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتی رہی پھر اللہ کا نام لے کر صحن میں آئی۔ میں نے اندر سے آتی پکاروں سے اپنا دھیان ہٹا لیا تھا۔ میرے باہر آتے ہی بلا پھر خوفناک آواز میں غرایا۔ اس بار اس کی آواز میں جیسے بادلوں کی سی گرج تھی مگر میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ میں تخت تک آئی اور جھک کر بلی کے بچے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ کچھ دیر مجھے معصومیت سے دیکھتا رہا پھر اچک کر میرے ہاتھوں میں آگیا۔ وہ چھوٹا سا تھا مگر جب میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے لگا جیسے کوئی چار پانچ سیر وزنی چیز میرے ہاتھ میں آگئی ہے اور میں نے اسے ذرا مشکل سے اٹھایا تھا۔

جیسے ہی میں سیدھی ہوئی بلا دیوار سے کود کر صحن میں آگیا۔ وہ زمین پر گرا تو باقاعدہ دھمک محسوس ہوئی تھی۔ وہ منہ پھاڑ کر غرایا تو اس کے دانت نمایاں ہو رہے تھے۔ میرا خوف سے برا حال تھا اور دل اس رفتار سے دھڑک رہا تھا جیسے سینے سے باہر آجائے گا۔ میں واپس صحن کی طرف جانا چاہتی تھی کہ اوپر سے وہی چیخ نما آواز آئی اور اس بار مجھے لگا جیسے اس میں التجا تھی۔ میں نے اوپر دیکھا تو مجھے منڈیر پر سرخ رنگ کی جھلک نظر آئی۔ وہاں کوئی تھا اور میں جانتی تھی کہ سرخ رنگ میں وہاں کون ہو سکتا ہے۔ ایک لمحے کو میرا دل چاہا کہ میں بچے کو پھینک کر اندر بھاگ جاؤں۔ خالہ، نمرہ اور اسرا کی آوازیں بند ہو گئیں۔ انہوں نے بعد میں بتایا کہ یہ سب دیکھ اور سن کر ان کی گھگی بندھ گئی تھی۔ مگر میں اپنے خیال پر عمل نہ کر سکی۔ مجھے لگا اگر میں نے بچے کو چھوڑا تو یہ بلا اسے اچک کر لے جائے گا اور اس کا خون میرے گردن پر ہوگا۔

میں کچھ دیر سوچنے کے بعد ہمت کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اس پر بلا غرایا تھا اور اس نے میری طرف آنے کی کوشش کی مگر اسی لمحے آسمان پر جیسے بجلی سی چمکی اور میں نے بس یہ دیکھا کہ بلا اڑ کر مجھ سے دور دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور بہت خوفناک سی آوازیں نکال رہا تھا۔ میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی تو میرے کان میں کسی نے کہا۔ ”جلدی کرو وہ پھر آرہا ہے۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا تو بلا مجھے سیڑھیوں کی طرف لپکتا دکھائی دیا۔ میں نے گھبرا کر رفتار تیز کر دی تھی۔ میں پہلی منزل تک آئی تھی کہ بلا سیڑھیوں پر آگیا۔ اس وقت اس کا انداز نہایت خوفناک اور جارحانہ تھا اس کے بال کھڑے ہوئے تھے اور منہ غیر معمولی حد تک کھلا ہوا تھا۔ وہ غرا کر اوپر لپکا تھا کہ میرا دل کانپا اور میں نے بے ساختہ اعوذ باللہ پڑھی۔ جیسے ہی میں نے یہ پڑھی بلا جھٹکے سے رکا اور پلٹ کر

سیڑھیوں سے نیچے جا گرا تھا۔ اس کے بعد میں مسلسل اعوذ باللہ پڑھتی رہی اور ایک ایک سیڑھی کر کے اوپر چڑھتی رہی۔ بلا نیچے کھڑا تلملا رہا تھا اور غرا رہا تھا مگر وہ سیڑھیوں پر قدم نہیں رکھ پا رہا تھا۔ میں اسی طرح اعوذ باللہ پڑھتی ہوئی اوپر کھلے صحن میں آئی۔ بارش زور و شور سے جاری تھی اور پانی ٹھنڈا تھا مگر مجھے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ اوپر آ کر میں نے آس پاس دیکھا مگر مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آیا پھر اچانک ہی ایک کمرے کا دروازہ خود بہ خود کھل گیا۔ وہاں سرخ لباس والی ایک حسین و جمیل عورت کھڑی تھی۔ اس نے بنا کچھ کہے دونوں ہاتھ آگے کیے تو یقین کریں اس کے ہاتھ کوئی بیس فٹ دور مجھ تک آ گئے اور اس نے بہت نرمی سے بلی کا بچہ مجھ سے لے لیا۔ پھر ہاتھ واپس گئے۔ عورت نے کچھ نہیں کہا مگر میرے کانوں میں آواز گونجی۔

''تمہارا شکریہ جس طرح تم نے میرے بچے کو بچایا ہے اسی طرح اوپر والا تمہیں بھی مشکلوں سے بچائے۔''

اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا۔ میں ایسی دم بہ خود کھڑی تھی کہ اعوذ باللہ پڑھنا بھی بھول گئی تھی اور بلے کا خیال بھی میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ دروازہ بند ہونے پر میں چونکی اور سہمے قدموں سے نیچے آئی۔ اب مجھے خوف اوپر کا نہیں بلکہ نیچے موجود بلے کا تھا مگر جب میں وہاں آئی تو نیچے بلا نہیں تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی تو خالہ نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ ''میری بچی تو ٹھیک ہے نا؟''

میں نے خالہ کے یہ الفاظ سنے اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں پورے ایک دن بے ہوش رہی۔ خالہ مجھے اسپتال لے گئیں اور میں وہاں داخل رہی۔ جب مجھے ہوش آیا تو اماں، اکرم بھائی اور بھابی لاہور آ گئے تھے۔ اماں میرے سرہانے موجود تھیں۔ میرے ہوش میں آنے پر سب نے سکون کا سانس لیا اور اماں نے شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔ کمزوری کی وجہ سے میں ایک دن اور اسپتال میں رہی اور پھر مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی اور اس سے اگلے دن ہم واپس گاؤں آ گئے کیونکہ وہاں سے خبر ہی ایسی آئی تھی۔ ارشاد کے ڈیرے میں رات کے وقت اچانک آگ بھڑک اٹھی اور اس نے ڈیرے پر موجود شراب کے ذخیرے تک رسائی حاصل کی تو بہت بڑا دھماکا ہوا تھا۔ اس دھماکے اور آگ سے جل کر ارشاد اور جگنو سمیت تین بھائی مارے گئے تھے۔ پولیس نے چوتھے بھائی کو غیر قانونی اسلحے اور شراب کے کیس میں گرفتار کر لیا۔

مکرم بھائی بھی وہیں تھے اور وہ شدید زخمی ہوئے تھے۔ اس خبر نے ہمیں واپس گاؤں جانے پر مجبور کر دیا۔ مکرم بھائی کو پہلے مقامی اسپتال اور پھر لاہور کے ایک اسپتال میں لے گئے۔ ان کے جسم کا ساٹھ فیصد حصہ جل گیا تھا۔ ان کی زندگی خطرے میں تھی مگر اللہ نے کرم کیا اور ان کی زندگی بچ گئی مگر ان کے دونوں ہاتھ انگلیوں اور کلائی سے ناکارہ ہو گئے تھے۔ وہ ان سے کام نہیں لے سکتے تھے۔ ڈیرے پر لگنے والی آگ نے جہاں دوسری چیزوں کو جلا دیا تھا وہیں میری تصاویر بھی ضائع ہو گئیں۔ یوں اللہ نے مجھے ایک مستقل بدنامی سے بچا لیا تھا۔ مکرم بھائی دو ہفتے بعد گھر آئے تو بالکل بدل گئے تھے وہ رو رو کر اماں اور مجھ سے معافی مانگتے رہے۔ وہ میرے بھائی تھے تو میں کیسے معاف نہ کرتی۔

اگلے سال میں نے انٹر پاس کر لیا تو میرا رشتہ طے ہو گیا اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرا رشتہ سعید سے ہی ہوا۔ اس کے گھر والوں نے میرا انتخاب کیا تو وہ حیران ہوا تھا اور جب رشتہ آیا تو ہم حیران ہوئے تھے۔ اس وقت ہم سمجھے کہ سعید کی مرضی سے آیا ہے مگر سعید کی امی اور بہنوں نے بتایا کہ مجھے انہوں نے پسند کیا تھا۔ شادی کے بعد میں نے بی اے اور پھر بی ایڈ کیا اور بھابی کے ساتھ اسکول میں آ گئی۔ اب ہمارا اسکول مڈل تک آ گیا ہے۔ کچھ عرصے بعد یہ سیکنڈری ہو جائے گا۔ بھابی کا ارادہ اسے ہائی اسکول تک لے جانے کا ہے۔ آخر میں مکرم بھائی کا بتا دوں کہ ان کی شادی مہر النسا سے ہی ہوئی۔ وہ سچ مچ ان سے محبت کرتی تھی اور اس نے انہیں اس حال میں بھی قبول کر لیا اور اب وہ دونوں خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کیا یہ ساری تبدیلیاں اور آسانیاں میرے اس چھوٹے سے کام کی وجہ سے آئی تھیں؟ آخر میں یہ بھی بتا دوں کہ خالہ کا گھر بھی خالی ہو گیا ہے اور وہاں اب کوئی اثر نہیں رہا۔ خالہ بتاتی ہیں کہ میرے آنے کے دوسرے دن انہیں خواب آیا، جیسے کسی نے ان سے کہا ہو ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ اوپر والے کمرے کو استعمال کر سکتی ہو۔ اس دن کے بعد سے وہ زرق برق لباس والی بھی کسی کو نظر نہیں آئی۔

یہ قصہ جو ابھی آپ پڑھیں گے یہ ایک آپ بیتی ہے، ہوسکتا ہے آپ میں سے کچھ لوگوں کے ساتھ یہ ہوا ہو لیکن آپ نے اس کو محسوس نہ کیا ہو یا زیادہ غور نہ کیا ہو، زیادہ امید ہے کہ عام سی بات سمجھ کے درگزر کر دیا ہوگا۔

لیکن میرا مسئلہ ایک یہ ہے کہ مجھے خوفناک کہانیوں کو پڑھنے کا نہ صرف شوق ہے بلکہ میں ان پہ بنی فلمیں بھی بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ساتھ ہی غیر ماورائی چیزوں پہ یقین بھی رکھتی ہوں، تو جیسے ہی مجھے وہ سرسراہٹ محسوس ہوئی مجھے پرانی پڑھی ہوئی ساری کہانیاں اور فلمیں یاد آگئیں اور پھر وہ ہو گیا جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

لیکن رکیں میں آپ کو شروع سے بتاتی ہوں پھر آپ معاملے کی سنگینی کو سمجھیں گے۔

☆☆☆

میں بائیس سال کی اپنے آپ میں گم رہنے والی ایک ایوریج طالب علم ہوں جو زیادہ تر اپنی پُراسرار کتابوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتی ہے۔

میں اور ثومی، میری چھوٹی بہن امی ابو بس یہ چھوٹا سا گھرانا ہے، ابو ایک فیکٹری میں اکاؤنٹ مینیجر کی پوسٹ پہ ہیں اور کبھی کبھی کام کا زیادہ بوجھ ہو تو رات فیکٹری میں رک جاتے ہیں۔

کیونکہ ہم متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشرے کی چلن کو بھی اپنائے رکھا ہے تو بس بی اے کرنے کا انتظار ہے پھر تایا کے بیٹے جنید سے شادی خانہ آبادی کر کے نئی زندگی بسر کرنی ہے جس کے ساتھ میری نسبت بچپن سے ہی طے ہے۔

خیر میرا روز کا معمول ہے کالج سے واپس آ کے زیادہ تر ہارر کتابیں یا سسپنس فلمیں دیکھنا، اور یہ جو قصہ میں آپ کو

سرسراہٹ

محترم مدیراعلی

السلام علیکم

اندھیری رات ہو تو ماحول میں پُراسراریت خود بخود در آتی ہے جس کی لفظی تصویر کشی ارسالِ خدمت ہے۔ یہ میں نے آپ کا شائع کردہ پُراسرار نمبر کا اشتہار پڑھ کر لکھا ہے۔ اشتہار پڑھتے پڑھتے یکایک یہ واقعہ یاد آگیا تھا اگر آپ نے شائع کردیا تو نوازش ہو گی۔

عمارہ خان

سنانے جارہی ہوں وہ پچھلے مہینے کا ہے۔

☆☆☆

میں جب کالج سے واپس آئی تو امی اور ثومی میرے انتظار میں صحن میں رکھے تخت پہ بیٹھے تھے۔

میں انہیں تیار دیکھ کر چونک گئی۔

''خیریت؟''میں نے اپنا رجسٹر اور شولڈر بیگ تخت پہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں تمہاری تائی کا فون آیا تھا ان کا حج کا ویزا لگ گیا ہے۔ میں اور ثومی جارہے ہیں۔''

''تو؟''میں نے تنک کے پوچھا اور تخت پہ آڑی ترچھی ہو کے لیٹ گئی۔

''مبارک باد دینے جانا ہے۔ قریبی رشتہ ہے پھر تمہارے حوالے سے نازک بھی ہے خیال تو رکھنا ہے نا۔''امی نے اپنی عادت کے عین مطابق تحمل سے جواب دیا اور صحن سے اندر کمرے میں اپنی چادر اور پرس لینے چلی گئیں۔

''تو ابھی فوراً جانے کی کیا تک ہے؟''میں نے ثومی سے پوچھا۔

ثومی نے کندھے اچکا کے امی کی طرف اندر اشارہ کیا کہ ان سے پوچھو۔

''اچھا مجھے کھانا تو دے دو پھر جہاں مرضی جاؤ۔'' میں .... چڑ کے بولا۔''ایک تو تھک کے گھر آؤ، بجائے کھانا پانی دینے کے ہمارے گھر والے اپنے سیر سپاٹوں پہ نکل جاتے ہیں۔''

اور ثومی بیچاری ہمیشہ کی طرح چھوٹی ہونے کی وجہ سے میری چڑچڑاہٹ کا شکار بن گئی۔

☆☆☆

خیر میں جب تک کھانا کھاتی امی اور ثومی تائی اماں کے گھر کے لیے روانہ ہو چکی تھیں ساتھ ہی بتا گئیں کہ ابو نہیں آئیں گے، اندر سے لاک لگا لینا، ہم سات آٹھ بجے تک آجائیں گے۔''

کیونکہ ابو پانچ بجے آتے تھے اور آج آئیں گے نہیں سو میں اب شام تک آزاد تھی۔ اسی آزادی کا فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے سکون سے کھانا کھایا اور لیپ ٹاپ پہ نیو ہارر فلمیں سرچ کرنے لگی۔

☆☆☆

آہا میرے منہ سے قلقاری سی نکلی۔ کیا فلم لگ رہی ہے اور فوراً ڈاؤن پہ لگا دی۔

رات کا اندھیرا، ایک اکیلی لڑکی کی پرچھائیں، جنگل کا پُراسرار سا ماحول، دور ایک درخت سے خون کی ٹپکتی بوندیں اور ایک کالی بلی کی سی دو چمکتی آنکھیں۔

واہ کیا ٹائیٹل کور ہے۔

میری ساری کوفت جو امی اور ثومی کے جانے کی وجہ سے ہوئی تھی اڑن چھو ہو گئی۔

جب تک فلم ڈاؤن لوڈ ہوتی چائے ہی بنا لوں، میں سوچتے ہی عمل کرنے کچن کی طرف چل دی۔

چائے بنا کے اپنے کھانے کے برتن دھو کے کچن پہ ایک نظر دوڑائی۔

صاف ہی ہے، چلو سکون سے فلم انجوائے کی جائے۔

خود کلامی کرتے ہوئے میں نے لاؤنج کے پردے گرائے اور مین گیٹ لاک کیا۔

اب نیم اندھیرا سا تھا۔ لاؤنج میں، میں صوفے پہ کشن کا سہارا لیے لیپ ٹاپ پہ نظریں جمائے بیٹھی تھی جہاں پُراسرار سا میوزک شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

فلم فل اف مسٹری اور ہارر پہ مبنی تھی سو میں بھی اب صوفے پہ باقاعدہ نیم درازسی، کشن سر کے نیچے اٹکا کے صوفے کی ہتھی پہ سر پیچھے کیے، پلکیں جھپکائے بغیر لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نظریں لگائے ہوئے تھی کہ اچانک!

اچانک مجھے اپنی گردن پہ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایسا لگا کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی گردن سے سر کی جانب رواں ہے۔

پہلے تو ہاتھ گھما کے جھٹکا دیا کہ کوئی چیونٹی ہو تو خود ہی مر جائے یا بھاگ جائے لیکن ایک دو منٹ بعد وہی سرسراہٹ پھر سے شروع ہو گئی تو میں نے ایکدم پلٹ کے دیکھا۔ ادھر سوائے ڈیکوریشن پیس کے کچھ تھا ہی نہیں۔ میں نے چہرہ واپس موڑ لیا اور فلم انجوائے کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کے وہی سرسراہٹ محسوس ہوئی، میں نے فوراً گردن اوپر کر کے پیچھے کی طرف کی، بجائے پورا منہ موڑنے کے کشن سے گردن بلند کی اور آنکھیں گھما گھما کے اچھی طرح دیکھا۔

اب تو مجھے یقین ہو گیا یہ کچھ اور ہی ہے، یہ خیال آتے ہی ایکدم سے چیخ نکل گئی اور میں لاؤنج سے باہر کی طرف بھاگی۔

باہر نکلی تو محسوس ہوا کتنا وقت بیت گیا اندھیرا سا پھیلا ہوا تھا،

واپسی کے سفر کی طرف رواں دواں پنچھیوں کی آوازیں عجیب ہی منظر پیش کررہی تھیں۔

آسمان پہ سرخی کے ساتھ اداسی بھی تھی، میں ابھی آسمان پہ غور ہی کررہی تھی کہ ایکدم لائٹ چلی گئی۔

سونے پہ سہاگہ یوپی ایس کی بیٹری ختم ہوچکی تھی اور جنریٹر مجھے اسٹارٹ کرنا نہیں آتا تھا۔ ابو یا ثومی ہی چلاتے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں حوصلہ کرکے کچن تک جاتی کہ کچن میں ایک ٹارچ اور ایمرجنسی لائٹ ہوتی تھی۔ میرے کان کے پیچھے پھر وہی سرسراہٹ ہوئی۔

میں نے پاگلوں کی طرح سر جھٹکا اور ہاتھ سر پہ مارتے ہوئے بے ساختہ چھت کی طرف دوڑ لگادی۔

چھت کی سیڑھیاں باہر صحن سے ہی جاتی تھیں دوسرا قریب ہونے کی وجہ سے وہی عافیت کا در لگا۔

چھت تک جانے میں سرسراہٹ تو ختم ہوگئی لیکن اب میں اپنی بے وقوفی پہ سر پیٹنا شروع ہوگئی۔

کیونکہ چھت پہ اندھیرا تھا اور ساتھ والا گھر بھی ایک عرصے سے خالی تھا اور اس وقت اندھیرے میں وہ ویران گھر عجیب سا تاثر دے رہا تھا۔

ان کے صحن میں اگی لمبی لمبی گھاس جب ہوا سے لہلہاتی تو ایسا لگتا کوئی کھڑا ہل رہا ہے۔ میں بھی ٹکٹکی باندھے اسی جانب گھورتی رہی۔

پھر میں کافی دیر بجلی کا انتظار کرتی رہی مگر اس نے نہ آنا تھا نہ آئی، ایسا لگتا تھا کوئی لمبا ہی فالٹ آگیا ہے۔

مصیبت یہ ہوگئی تھی کہ اب ایسی اندھیری رات میں بچپن کی پڑھی ساری خوفناک کہانیاں حقیقت کا روپ دھار رہی تھیں ساتھ ہی ایک عجیب سا ڈرا دینے والا ماحول بن رہا تھا۔

جن، بھوت، چڑیلیں، ڈریکولا، برابر ویران مکان میں آگے جھاڑ جھنکار کی سرسراہٹیں، لمبے لمبے سائے اور ساتھ ہی مجھے ہر جگہ متحرک پرچھائیاں اور عجیب شکل کے سائے سے ہلتے نظر آنے لگے تھے، خوف کی شدت سے میرا حلق خشک ہوچکا تھا۔

چند لمحے میں مزید ضبط کرتی رہی مگر کسی کے بیحد قریب سے چلنے کی آواز پر میں ایکدم ڈر گئی اور میں نے بے ساختہ اونچی آواز میں کہا۔

''ک ک کون ہے۔ کون ہے وہاں؟''

کوئی جواب نہیں آیا، مکمل سکوت، ہر طرف ایک بھیانک خاموشی حکومت کررہی تھی۔

میں نے اپنے ماتھے پر موجود پسینا صاف کیا۔

مجھے رہ رہ کر خود پر غصہ آرہا تھا کہ آخر میں نے اتنی پُراسرار کتابیں پڑھ کے کیا کرلیا سوائے ڈرنے کے۔

خیر پھر میں نے سوچا خود ہمت کرکے نیچے چلی ہی جاؤں مگر اب شاید ڈر کی زیادتی سے نیچے کا راستہ اس اندھیرے میں بے حد خوفناک لگ رہا تھا، ساتھ ہی مجھے خیال آیا نیچے تک پہنچ بھی جاتی تو آگے کیا کرتی؟

اسی وقت نیچے گھر میں بھی اندھیرے کا راج ہوگا اور میری حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ میں لاؤنج سے پہلے موبائل لیتی پھر اس کی ٹارچ کی مدد سے کچن تک جاتی اور ایمرجنسی لائٹ تلاش کرتی۔

مجھے احساس ہورہا تھا جیسے میں چھت پہ قید ہوچکی ہوں، ایسی قید جس سے چاہ کر بھی باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

تنہائی میں رات کے اندھیرے اور اس کی خوفناکی اور دہشت میں اضافہ ہوتا گیا۔ طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر لگا کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ہے۔ میں نے بے اختیار چیخیں ماریں اور چھت کے دوسری طرف بھاگ نکلی۔

کندھے پر ہاتھ رکھنے کے احساس کے بعد میری حالت خراب ہوچکی تھی، میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

میں نے خود کو بلا ارادہ کوسنا شروع کردیا، میں شاید نیم دیوانگی کی حالت میں جا چکی تھی، اکیلے پن کے احساس۔ خوف اور شدید ڈر نے میری ذہنی صلاحتیں جیسے ختم کردی تھیں اور میں کچھ سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

تبھی مجھے اچانک رونا آگیا اور میں مسلسل تب تک روتی رہی جب تک آنسو خشک نہ ہوگئے۔

خیر ڈر ڈر اور سہم سہم کے میں نے کچھ وقت گزار ہی دیا...

تبھی مجھے لگا کوئی چیز سامنے سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ عجیب سا احساس تھا، بس کسی کی موجودگی محسوس ہورہی تھی کہ کوئی آس پاس موجود ہے اور مجھے دیکھ رہی ہے۔

عجیب چھلاوا جیسی چیز تھی، میری رگوں میں خون منجمد سا

ہو گیا، رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے، رواں رواں لرز رہا تھا، خوف ہی خوف تھا ہر سو۔

رات کا خوف، انہونی کا خوف اور ان چیزوں کا خوف جو میں آج تک پڑھتی یا دیکھتی آئی تھی۔

میں نے بے بسی سے اوپر کھلے آسمان کو دیکھا، جہاں بہت خوبصورتی سے ستارے چمک رہے تھے، اور دور کہیں ایک باریک سی خوشنما لائن تھی جو بتا رہی تھی یہ چاند کی آخری تاریخیں ہیں۔ لیکن میں اب اس قدر تنگ آ چکی تھی کہ نہ صرف ذہن ماؤف ہو چکا تھا بلکہ اب بیزاری کی لہر دوڑنے لگی تھی جسم میں۔

یہ پل پل، لمحہ لمحہ موت سے تو ایک دفع کی موت بہتر ہے۔ میں نے جھنجلا کر سوچا۔

''جو بھی ہو ......سامنے آؤ، میں یہاں ہوں ......آؤ، میرے اعصاب شاید جواب دے گئے تھے۔ میں اچانک کھڑی ہو کر چیخنے لگی ...... میری نظریں اس خوفناک اندھیرے میں چاروں طرف گشت کر رہی تھیں۔

''آتے کیوں نہیں؟ میرا خون پیو گے لو پی لو، قصہ تمام کر دو میرا۔ میں یہاں ہوں۔ آؤ... سامنے آؤ۔'' میں ہذیانی لہجے میں بولے جا رہی تھی، تبھی مجھے لگا جیسے وہ چھلاوا اب وہاں نہیں تھا، میں بے اختیار زور زور سے ہنسنے لگی۔

''بھاگ گیا...... ڈرپوک کہیں کا، ہنہ...... نرا بزدل، مجھ اکیلی کمزور لڑکی سے ڈر کر بھاگ گیا۔

میری ہنسی نہیں تھم رہی تھی، کیونکہ میں شاید خوف کی آخری حد تک جا چکی تھی کہ ایک دم میاؤں میاؤں کی آواز سے میرا دل حلق میں آ گیا اور مجھے گویا سکتہ ہو گیا۔ میں جہاں تھی ادھر ہی بت بن گئی۔ اور دہشت سے آہستہ آہستہ کپکپانا شروع ہو گئی۔

مجھ سے تھوڑے ہی فاصلے پہ دو چمکتی ہوئی آنکھیں یقیناً بلی کی ہی تھیں اور اندھیرے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی روشن تھیں۔

ایک تو گھر میں اکیلی، لائٹ نہیں، برابر میں ویران گھر اور میں چھت پہ ایک کالی بلی کے ساتھ۔ رفتہ رفتہ میرے ذہن میں ایک غبار سا چھانے لگا اور مجھے لگا میں بے ہوش ہونے لگی ہوں۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہو جاتی نیچے سے امی کی آواز آئی۔

''سویرا سویرا۔ ہزار بار منع کیا ہے اس وقت چھت پہ نہ جایا کرو نیچے آؤ۔''

اور میرے پیروں میں گویا پر لگ گے اور میں اڑتی ہوئی نیچے کی طرف بھاگی ابھی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا ہی تھا کہ میاؤں کی آواز سے جیسے کوئی مجھے پیغام دے رہا ہو آج تو بچ گئی ہو اگلی بار سہی۔

اور میں نے پھر پلٹ کے نہ دیکھا بس ناک کی سیدھ میں امی کے پاس آ کے ہی دم لیا۔

امی نے میرے لیے موبائل کی ٹارچ جلا رکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ امی مجھے مزید ڈانٹتیں میں امی کے گلے لگ کے جو دھواں دھار روئی وہ بیچاری پریشان ہو گئیں۔

ایک تو امی اتنا لمبا سفر کر کے آئی تھیں اوپر سے میں نے اچانک رونا دھونا مچا دیا تھا۔

''ارے ارے باؤلی ہو گئی کیا۔ کیا ہو گیا آخر۔'' امی نے بوکھلا کے پوچھا۔

اتنے میں گھر گھر کی خوبصورت آواز آئی اور ایکدم گھر روشن ہو گیا یقیناً ثومی نے جنریٹر چلایا ہو گا۔

''چلو اندر چلو۔'' امی نے تنگ آ کے میرا بازو پکڑ کے ہلایا اور اندر کی طرف قدم بڑھایا۔

☆☆☆

''لو سویرا باجی آپ پھر لاؤنج میں صوفے پہ لیٹی تھیں نا؟''

ثومی کی آواز پیچھے سے آئی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے چھت کی طرف دیکھا اور پھر پلٹ کے ثومی کو سوالیہ نظروں سے۔

''تم کو کیسے معلوم ہوا؟''

ثومی نے لاؤنج کے صوفے کے ساتھ ہی رکھا ڈیکوریشن کے طور پہ سجائے سوکھی گھاس نما لمبی سی ڈنڈی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا میرے بالوں سے نکال کے مجھے دکھایا۔

''ایسے۔''

اور مجھے اس سرسراہٹ کی وجہ معلوم ہو گئی۔

لیکن پھر وہ ہاتھ کس کا تھا جو چھت پہ میرے کندھے پہ رکھا تھا اور وہ پرچھائی کس کی تھی جو مجھے محسوس ہوئی تھی! اف یہ ذہن بھی کیا ہے۔ دماغ میں چھپے خدشات کو بھی تصویر دے دیتا ہے۔

خواب یا سچائی

جناب ایڈیٹر
السلام علیکم
ایک دلچسپ واقعہ سنانے جارہا ہوں۔ دس سال قبل میں بھارت کے شہر پٹنہ گیا تھاپھروہاں سے رانچی۔ وہیں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گا۔

ندیم انصاری
(کراچی)

میں اس وقت رانچی کے نواح میں تھا۔
رانچی ہندوستان کے صوبہ بہار کا ایک پُرفضا شہر ہے (اب یہ شہر جھارکھنڈ) میں شامل ہوگیا ہے۔
میں تفریح کی غرض سے گیا تھا۔

ویسے تو قیام عظیم آباد (پٹنہ) میں تھا لیکن ایک رشتے دار کے بلاوے پر رانچی چلا گیا تھا۔ میں جن کے یہاں گیا تھا وہ کسی محکمے میں جاب کرتے تھے۔ مظفر نام تھا ان کا۔
ان کے گھر میں سوائے ان کی بیوی کے اور کوئی نہیں

ہوتا۔ دو بچے تھے۔ دونوں دہلی میں تھے۔ رانچی میں صرف میاں بیوی تھے۔

اب مظفر صاحب تو صبح اٹھ کر اپنی ڈیوٹی پر نکل جاتے اور میں دن بھر گھر میں پڑا ہوا بور ہوتا رہتا۔ ایک دن میں نے خالہ سے کہا۔ ''خالہ میں دن بھر بور ہوتا رہتا ہوں۔ شام کے وقت ذرا اِدھر اُدھر گھومنے چلا جاؤں گا۔''

''بیٹا یہ نئی جگہ ہے۔ نہ جانے کدھر نکل جاؤ اور تم ویسے بھی پاکستان سے آئے ہو۔''

''خالہ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ بھٹک جاؤں گا اور کسی کو کیا معلوم کہ میں پاکستانی ہوں۔ میرا لباس بھی یہاں کا ہے۔ چپلیں بھی کولا پوری ہیں۔ بول چال بھی یہاں والوں جیسی ہے تو کون شک کرے گا۔''

''چلو بیٹا جیسی تمہاری مرضی لیکن کوشش کرنا کہ جلدی لوٹ آؤ۔''

میں گھر سے نکل کر ایک طرف چل پڑا۔ ہر طرف اجنبی ماحول، اجنبی لوگ، اجنبی فضا تھی۔ مجھے یہ سب بہت اچھا اور بہت پُرکشش لگ رہا تھا۔

ویسے بھی یہ میری عادت رہی ہے۔

نئی نئی جگہ کو دیکھنا، نئے لوگوں سے ملاقاتیں، نئی زندگی اور نئے ماحول کا احساس یہ سب مجھے بہت اٹریکٹ کرتے ہیں۔

پاکستان میں بھی میرا یہی حال تھا۔

میں کراچی سے لاہور جاتے ہوئے کئی دفعہ جان بوجھ کر مختلف مقامات پر اتر چکا ہوں۔ جو شہر دکھائی دیا اس جگہ کی خاک چھاننے لگا۔

ہوسکتا ہے کہ دوسرے کے لیے اس قسم کی مشقت فضول ہو لیکن یہ میری بہت بڑی انجوائے منٹ تھی۔ بہرحال تو میں گھر سے نکل کر ایک طرف چل پڑا۔ شہر بہت پیچھے چھوٹ چکا تھا۔

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہر طرف اجنبی لوگ، چھوٹے چھوٹے گھران کے درمیان عظیم الشان درختوں کے پاس رکھے ہوئے بت۔

مقامی عورتیں اور مرد مجھے حیرت سے دیکھتے رہے لیکن میں بے پروائی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں سڑک سے گزر رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں یہ گویا بازار تھا۔

میں نے بازار کو بھی کراس کرلیا۔ پتا نہیں کون سی دھن تھی جو آگے لیے جارہی تھی۔ بازار ختم ہونے کے بعد کھیتوں کا سلسلہ تھا اور کھیتوں کے بعد ایک اونچا سا ٹیلہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس ٹیلے کو ایک چھوٹی پہاڑی کی طرح سمجھا۔

مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس بلندی سے شہر کو دیکھا جائے۔

کھیتوں میں کچھ کسان کام کررہے تھے۔ انہوں نے میری طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ میں کھیت عبور کر کے اس ٹیلے کے پاس آگیا۔

اچھا خاصا اونچا ٹیلہ تھا۔ جس پر طرح طرح کے پودے لگے ہوئے تھے۔ (خیال رہے کہ رانچی ایک پہاڑی مقام ہے) میں نے دیکھا کہ ایک طرف پتھر اس طرح تراشے ہوئے تھے جیسے سیڑھیاں بنی ہوئی ہوں۔

میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آگیا۔

وہ مجھے اوپر دکھائی دی تھی۔ چھوٹی سی مسجد تھی۔ جس کے دو مینار تھے۔ درمیان میں صحن تھا اور ایک سجدہ گاہ کی طاق بنی ہوئی تھی۔

میں اس مسجد کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ میرے خدا اس ویران علاقے میں کس نے یہ مسجد بنائی ہوگی۔ یہاں کون لوگ نماز پڑھتے ہوں گے۔ کیونکہ میں تو راستے بھر دیکھتا آرہا تھا۔ مسلمان بس گنتی ہی کے نظر آئے تھے۔ ورنہ سب ہندو تھے۔ وہ چند مسلمان یہاں آکر نماز تو نہیں پڑھتے ہوں گے۔

مسجد کی حالت یہ بتارہی تھی کہ یہ بہت عرصے سے ویران پڑی ہوئی تھی۔

جگہ جگہ کبوتروں کی بیٹیں تھیں۔ خدا جانے اس وقت کون سا جذبہ تھا کہ میں نے اپنے طور پر اس مسجد کو صاف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

مسجد کی ایک دیوار کے ساتھ کسی زمانے کی ایک جھاڑو بھی پڑی ہوئی تھی۔ بس میرا کام بن گیا تھا۔ میں نے وہی جھاڑو اٹھا کر صحن کی صفائی شروع کردی۔

تھوڑی دیر کی محنت کے بعد صحن اچھا خاصا صاف ہوگیا تھا۔ اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اَن دیکھی طاقت مجھ سے کام کروا رہی ہو۔

میں نے ایک طرف کی دیوار کو تھپ تھپا کر تیمم کیا۔ کیونکہ وہاں پانی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ پھر ایک طرف کھڑے ہو کر اذان دینی شروع کردی۔

شاید کوئی بندۂ خدا آنکلے۔ صحرا میں اذان دے رہا ہوں۔

پھر نیت باندھ کر نماز شروع کر دی۔ اس دوران مجھے ایسا لگا جیسے کچھ لوگ مسجد میں داخل ہو کر میرے پیچھے صف بنا رہے ہوں۔

دل میں کچھ عجیب سا خیال آیا۔ یہ کون لوگ ہیں۔ اس ویران مقام پر اتنے اللہ کے بندے کہاں سے آگئے۔ لیکن پھر اپنے خیال کو جھٹک کر نماز میں مصروف ہو گیا۔

سلام پھیرا تو مسجد بالکل خالی تھی۔ میرے علاوہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

کیا تھا یہ سب، کیا میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا تھا یا میرا وہم تھا لیکن وہم اتنا مضبوط کیسے ہو سکتا ہے۔

میں نے ان کی موجودگی واضح طور پر محسوس کی تھی۔ ان کے لباسوں کی سرسراہٹیں میرے عقب سے آرہی تھیں۔

پھر وہ ذرا سی دیر میں کہاں غائب ہو گئے تھے۔

آہستہ آہستہ مجھ پر خوف غالب آتا گیا۔ شاید وہ انسان نہیں کوئی اور مخلوق تھی۔

میں نے فوری طور پر واپسی کا ارادہ کر لیا اور ابھی مسجد سے باہر ہی نکلا تھا کہ کوئی میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک ہندو سادھو تھا۔ اس نے صرف ایک لاچا باندھ رکھا تھا۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ وہ اچھا خاصا صحت مند تھا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

''کیوں مہاشے۔'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اپنی موت کو بلا کر واپس جا رہے ہو۔''

''کیا مطلب۔'' میں اس کی بات سن کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''نہیں جا سکو گے۔ یہ لوگ تمہیں نہیں جانے دیں گے۔ روک لیں گے تم کو، اگر زبردستی جانا چاہو گے تو مار دیں گے۔''

''مہاراج تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''میں ان ہی کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے پیچھے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ انسان نہیں ہیں۔ یہاں دور دور تک کوئی نہیں رہتا اور پہاڑی کے پیچھے پوری بستی ہندوؤں کی ہے۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہاں نماز پڑھنے کون آئے گا۔''

''لیکن تم...... تم کو کیسے معلوم ہوا؟''

''میں برسوں سے اس پہاڑی پر بیٹھ کر تپسیا کر رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں ایسے تماشے کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ تم جیسے بے وقوف آتے ہیں۔ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں اور وہ لوگ اسے واپس نہیں جانے دیتے مار دیتے ہیں۔''

''لیکن کیوں مار دیتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ انہیں مسجد کی سیوا کے لیے کوئی شخص چاہیے، کوئی ایسا چاہیے جو وقت پر اذان دے اور نماز پڑھائے۔ اس لیے وہ جانے نہیں دیں گے۔ تم کو یہیں رکھیں گے۔''

''لیکن میں...... میں تو نہیں رک سکتا۔ مجھے تو جانا ہے۔''

''اسی لیے تو بھگوان نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے کہ تمہاری سہایتا کروں۔ تمہیں بستی تک پہنچا دوں تاکہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

مجھے اس سادھو کی ہر بات سچ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس ویرانے میں انسان کہاں سے آسکتے تھے۔

یہ کوئی اور ہی مخلوق تھی اور اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہو گیا تھا جب وہ میرے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر اچانک غائب بھی ہو گئے۔

''سوچ کیا رہے ہو، جلدی کرو۔'' سادھو نے کہا۔

''دیر مت لگاؤ یہاں سے نکل لو۔''

میں سادھو کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس وقت ہر قدم پر یہی خوف ہو رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں روک لیا جاؤں۔

یہ سادھو مجھے کوئی مہربان شخص معلوم ہو رہا تھا۔ وہ مجھے ایک شارٹ کٹ سے پہاڑی کے نیچے لے آیا تھا۔ بستی میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ ''بس بھائی میرا کام ختم ہو گیا۔ اب یہاں سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔''

''مہاراج ایک بات تو بتاؤ۔ جب میں تمہارے ساتھ آ رہا تھا تو انہوں نے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔'' سادھو مسکرا دیا۔ ''میں نے برسوں تپسیا کی ہے۔ محنت کی ہے۔ دنیا سے کٹ کر بھگوان سے لو لگائی ہے۔ اس لیے تھوڑی بہت شکتی تو میرے پاس بھی ہے۔ اب میں تمہیں ایک بات بتاؤں گا اس کو بہت دھیان سے سننا۔''

''جی مہاراج بتاؤ۔''

''دیکھو کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر ہندو سادھو یا پنڈت جنتر منتر اور کالے علم سے کام لے کر کسی کی زندگی برباد کرتا ہو اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جنوں میں سب ہی اچھے جن ہوں۔ جو مخلوق تم کو نظر آئی تھی وہ جنات تھے۔ برسوں سے اس مسجد کے آس پاس رہتے ہیں۔ سب مسلمان ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں لیکن ان کا یہ کام اچھا نہیں ہے کہ جو بھولا بھٹکا مسلمان مسافر اس مسجد کی طرف آ نکلے۔ اسے قید کر کے رکھ لیتے ہیں۔ اس کی آزادی چھین لیتے ہیں۔ اس سے مسجد کی خدمت کرواتے ہیں۔ میں دو مسافروں کا حال دیکھ چکا ہوں۔ جن کو اس مخلوق نے اس لیے مار دیا کہ وہ بے چارے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ میں نے تم کو دیکھ لیا اور تمہاری مدد کے لیے آ گیا۔ اب تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ۔''

''مہاراج میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب تم جاؤ۔''

میں ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ خالہ کے یہاں پہنچا تو وہاں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سب کے سب پریشان ہو رہے تھے کہ میں کہاں چلا گیا۔ نئی جگہ ہے۔ خدا جانے میرے ساتھ کیا گزری۔ جب ان لوگوں نے مجھے دیکھا تو اطمینان کا سانس لینے لگے۔

میرے خالو مظفر صاحب بھی اپنی ڈیوٹی سے واپس آچکے تھے یا شاید فون کر کے انہیں بلایا گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑے۔

''خدا کے بندے کہاں چلے گئے تھے تم میں تو ابھی پولیس کے پاس تمہاری رپورٹ لکھوانے جا رہا تھا۔''

''بس خالو کچھ نہ پوچھیں کیا ہوا ہے میرے ساتھ۔'' میں نے کہا۔ اتنی دیر میں خالہ میرے لیے چائے لے آئی تھیں۔

''ہاں بتاؤ، کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ۔''

''خالو! میں ٹہلتا ہوا بستی کے آخری سرے تک چلا گیا تھا۔ وہاں ایک پہاڑی ہے۔ اس پہاڑی کے اوپر ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔''

''او خدا وہ تو جنوں والی مسجد کہی جاتی ہے۔ کیا تم وہاں چلے گئے تھے۔''

''جی خالو! میں نہ صرف وہاں پہنچ گیا تھا بلکہ میں نے اس مسجد کی خدمت بھی کی ہے۔''

پھر میں نے ان لوگوں کو سارا واقعہ سنا دیا۔ کس طرح میں نے اذان دی۔ کس طرح بہت سے لوگ میرے پیچھے آکر نماز پڑھنے لگے اور کس طرح وہ غائب ہو گئے۔ پھر ایک سادھو مہاراج مل گیا۔ اس نے پھر کیا کیا باتیں کیں اور مجھے بستی تک پہنچا کر واپس چلا گیا۔

''خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بچ کر آ گئے۔'' خالو نے کہا۔

''میں نے یہ سن رکھا ہے کہ بہت پہلے بھی دو تین آدمی اوپر گئے تھے لیکن ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔''

''ایسا کیا!''

''بیٹے تم پاکستان سے آئے ہوئے ہو۔ مہمان ہو ہمارے۔ اگر خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہم کیا کرتے۔ کس کو کیا جواب دیتے۔'' میں خاموش رہا۔

''بہر حال آیندہ سے احتیاط کرنا۔'' خالو نے کہا۔ ''تم نہیں جانتے کہ یہاں کتنی پرانی پرانی جگہیں ہیں اور وہاں کیا کیا ہے۔''

''جی خالو میں اب احتیاط کروں گا۔''

خالہ نے میرے لیے بستر کر دیا تھا۔ بستر پر گرتے ہی نیند آ گئی تھی۔ طرح طرح کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ کبھی میں کسی ریگستان میں ہوں اور اچانک چاروں طرف سے اذانوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور کبھی کسی مندر میں داخل ہو رہا ہوں۔

آنکھ اس وقت کھلی جب خالہ کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے اٹھا رہی تھیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خالہ کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا ہوا خالہ خیریت تو ہے نا؟''

''بیٹا کوئی آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''مجھ سے؟ لیکن مجھے یہاں کون جانتا ہے۔''

''پتا نہیں بیٹا تمہارے خالو بھی اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ ورنہ وہ خود ہی بات کر لیتے۔''

میں دروازے پر آیا تو ایک نورانی صورت شخص میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ ایک مسلمان تھا۔ اس نے مقامی رواج کے مطابق ایک سفید لنگی باندھ رکھی تھی۔ اوپر ایک سفید کرتہ تھا۔

''جی محترم فرمائیں۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''میں تو تمہارے پیچھے تھا۔ تم مجھے کیسے دیکھ سکتے تھے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا!'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ کہاں پیچھے تھے آپ؟''

''جہاں تم نے نماز ادا کی تھی۔'' اس نے بتایا۔

اور اس وقت مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔

ایک برف سی لہر میری ہڈیوں میں اترنے لگی تھی۔ اس نے میری حالت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم کو اندازہ ہو گیا ہے کہ میں کون ہوں۔''

''جی۔'' مجھ سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

''گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آیا۔''

وہ دھیرے سے بولے۔ ''تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ صدیوں بعد کسی انسان نے اس مسجد میں اذان دی تھی۔ نماز پڑھی تھی۔ بہت پہلے ایک مسلمان اس مسجد کی طرف آیا تھا لیکن اس ہندو سادھو نے اسے بہکا کر واپس بھیج دیا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس مسجد کی خدمت کی جائے۔ اس لیے وہ الٹی سیدھی باتیں کر کے ہماری طرف سے بدگمان کر دیتا ہے۔ پھر آج تم آئے تو ہم نے یہ جانا کہ اس مسجد کو ایک رکھوالا مل گیا ہے لیکن وہ سادھو پھر ہمارے راستے میں آ گیا۔ ہم نے اسے بہت برداشت کیا، کیونکہ اب تک ہم اسے نظر انداز کر رہے تھے لیکن آج ہم نے اسے سزا دے دی ہے اور جہاں تک تمہارا سوال ہے تو تم واپس چلے جاؤ۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کچھ تمہاری واپسی کو پسند نہ کریں اور تمہارے لیے رکاوٹ بن جائیں۔ اب جاؤ اور اس بستی میں دوبارہ نہیں آنا۔''

وہ نورانی صورت بزرگ واپس چلے گئے اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میں اس واقعے کے بعد اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ مجھ سے وہاں رہا نہیں گیا۔ میں واپس آ گیا۔

اپنے ملک پاکستان واپس آ گیا۔

خدا جانے یہ سب کیا تھا۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ ایک ایسا خواب یا ایک ایسی سچائی جو یہ احساس دلا رہی ہے کہ اس دنیا میں ایسے ایسے بھید ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ نہ جانے کون سی مخلوق کہاں بیٹھی ہوئی ہے اور کس روپ میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ہم اسے پہچان ہی نہیں پاتے۔

خانہ خالی

مکرم و محترم معراج رسول
السلام علیکم
پُراسرار نمبر کی نوید سنا کر خوش کردیا۔ اس بار میں نے اپنا ایک واقعہ پیش کرنے کی ٹھانی ہے۔ لکھ کر بھیج تو رہا ہوں اس اُمید پر کہ شاید آپ کو پسند آجائے۔

فیصل
(سیالکوٹ)

یہ ایک کہانی ہے، عام سی کہانی۔ لہٰذا اس کہانی میں اصلاح کا پہلو اور کوئی سبق وغیرہ تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کیوں کہ میں نے اس قسم کا کوئی تکلف ہی نہیں کیا میں نے صرف کہانی لکھ دی ہے۔

اگر آپ زبردستی اس میں کسی قسم کا سبق تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہیں تو آپ کی مرضی۔

کہانی بہت عام سے انداز سے شروع ہوتی ہے کہ میں اس وقت سویا ہوا تھا۔ جب منیر نے آکر مجھے جگا دیا۔ اس کی حرکتیں اسی قسم کی ہوتی تھیں۔ حالانکہ اس وقت صبح کے صرف دس ہی بجے تھے اور اس خدا کے بندے نے آکر نیند برباد کردی تھی۔

"کیا ہوگیا؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔ "کیا قیامت

آ گئی ہے۔''

''یار فیصل، میں ابھی ناشتے کا سامان لینے بازار گیا تھا تو میں نے وہاں تین آدمیوں کو دیکھا۔'' اس نے بہت پُرجوش ہو کر بتایا۔

''تو پھر میں کیا کروں۔''

''وہ تینوں صورت ہی سے بہت خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔'' اس نے مزید بتایا۔ ''یہ گھنی مونچھیں، اونچا قد، بھرے ہوئے بدن اور شاید ان کے پاس سامان بھی تھا سامان سمجھتے ہو نا؟''

''ابے کیوں نہیں سمجھتا۔ یہی ڈبل روٹی، مکھن، چینی وغیرہ۔''

''یہ سامان نہیں بھائی۔'' اس نے کہا۔ ''میں ٹی ٹی، ریوالور وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔''

''چلو اگر سامان تھا بھی تو میں کیا کروں۔''

''تم ہی کو تو کرنا ہے میرے بھائی۔''

''کیوں، مجھے کیوں کرنا ہے۔''

''اس لیے کہ وہ تینوں تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔'' اس نے بتایا۔

اتنا سنتے ہی میری نیند ہوا ہو گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیا بکواس کر رہا ہے بھائی۔ وہ مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے۔''

''ابے مجھے کیا معلوم۔ انہوں نے سامنے والے دکاندار سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ فیصل ندیم، جس کے ماتھے پر چوٹ کا ہلکا سا نشان ہے۔ ظاہر ہے سوائے تمہارے اور کون ہو سکتا ہے اور ہاں میں ایک بات تو بھول ہی گیا۔ میں نے آپس میں ان کی گفتگو بھی سن لی تھی۔''

''اچھا! کیا کہہ رہے تھے۔''

''ان میں سے ایک کہہ رہا تھا کہ آج صرف اس کی ٹانگیں توڑنا ہیں۔ پورا حساب کتاب بعد میں کریں گے۔ اچھا تم اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ میں دودھ لے آیا ہوں۔ تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

''ابے لعنت بھیج چائے پر۔ یہ بتا ہوا کیا۔''

''فیصل صاحب! تم تو میری اس صلاحیت سے اچھی طرح واقف ہو کہ میں دس میل دور سے بھی خطرے کو بھانپ لیتا ہوں۔ مجھے پتا چل جاتا ہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔''

''ہاں ہاں بھائی، جانتا ہوں جانتا ہوں، لیکن تم تو یہ بتاؤ ہوا کیا۔''

''تو میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ خوش قسمتی سے دکاندار کو تمہاری پوری Detail نہیں معلوم۔ کیوں کہ تمہارا یہ ریکارڈ رہا ہے کہ تم ایک بار جس دکان سے ادھار لے لو۔ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرتے۔''

''خدا کے بندے کیوں بکواس کیے جا رہا ہے۔ آگے بھی تو بتا کیا ہوا۔''

''ہونا کیا ہے۔ دکاندار کے انکار کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا۔ کیوں کہ اتفاق سے میں بھی وہیں پر کھڑا ہوا تھا۔''

''میرے دوست، مجھے یقین ہے کہ تم نے ان کم بختوں کو ٹال دیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''کیوں، ٹالتا کیوں؟ میں تو انہیں اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔'' منیر نے بتایا۔ ''اس وقت بھی وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ تم لوگ ٹھہرو۔ میں فیصل کو لے کر آتا ہوں۔ اب جلدی چلو۔ ورنہ وہ لوگ دروازہ توڑ کر اندر آجائیں گے۔ بہت خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔''

''بے وقوف انسان اور تو ان خطرناک لوگوں کو میرے سر پر لے آیا ہے۔''

اسی وقت دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ کم بخت منیر کا گلا ہی گھونٹ دوں۔ نہ جانے کن ظالموں کو لے آیا۔ دروازے پر ہونے والی دستک ایسی تھی کہ واقعی ذرا بھی دیر ہو جاتی تو دروازہ ہی توڑ دیتے۔

میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ تین آدمی تھے اور تینوں خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے بڑے تپاک کے ساتھ ان تینوں سے ہاتھ ملایا اور پھر مصافحے کے بعد ہاتھ اپنے سینے پر پھیرتا ہوا مسکراتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ اندر سے مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ اس دوران میں وہ تینوں کڑی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہے تھے۔

میں نے پھر وہ تقریر کی جو میں عام طور پر ایسے خطرناک موقع پر کیا کرتا ہوں۔ ''جناب! آپ تینوں کا آنا میرے لیے بہت خوشی اور فخر کی بات ہے۔ میں تو دماغ درست کر دوں گا اس شخص کا جس نے آپ تینوں کو دروازے پر کھڑا رکھا ہے۔ ارے آپ جیسے معزز مہمانوں کو تو فوراً اندر لانا چاہیے تھا۔ آئیں اندر تشریف لائیں۔''

''اوئے فارسی کی اولاد۔'' ان میں سے ایک بھڑک

اٹھا۔ ''سیدھی طرح ہماری بات سن اور اس قسم کی بکواس رہنے دے۔''

''جی فرمائیں جناب۔''

''ہمیں کامران بیگ نے بھیجا ہے۔ جانتا ہے نا کامران بیگ کو۔''

''کیوں نہیں جناب! بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ان جیسا شریف آدمی تو چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ کیا خاندانی آدمی ہیں۔ شرافت تو ان کے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔''

''اس شریف آدمی نے ہم سے یہ کہا ہے کہ اگر کل تک تم نے یہ فلیٹ خالی نہیں کیا تو تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دوں۔''

''ارے نہیں جناب! انہوں نے مذاق کیا ہوگا۔''

''کوئی مذاق نہیں۔'' دوسرا غرایا۔ ''اگر کل تک فلیٹ خالی نہیں ہوا تو خود دیکھ لینا کہ مذاق کیا ہوتا ہے۔''

وہ دھمکیاں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

منیر یہ سب کچھ دروازے کے پیچھے کھڑا ہوا سن رہا تھا۔ میں جیسے ہی اندر آیا وہ مجھ سے لپٹ پڑا۔ ''یار فیصل بھائی! اب کیا ہوگا۔''

''ابے ہٹ ایک طرف۔'' میں نے اسے دھکا دے کر خود سے الگ کر لیا۔ ''ابے یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ تو فلیٹ کے کرائے میں شیئر کرے گا لیکن تو نے سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا ہے۔''

''تو کیا کروں فیصل بھائی۔ اب تم خود ہی دیکھو، میری تو نوکری ہی چلی گئی۔ اب میں پیسے کہاں سے دوں۔''

''یہ بتا اب ہم جائیں گے کہاں۔ تو نے دیکھ لیا نا۔ ہمیں کل تک ہر حال میں مکان خالی کرنا ہوگا۔ ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارا سامان کہاں جائے گا۔''

''سامان!'' منیر ہنس پڑا۔ ''فیصل بھائی! اپنے ایمان سے بتاؤ اس گھر میں سامان نام کی کیا چیز ہے۔ دو دریاں ہیں، تھوڑے سے برتن ہیں اور ہم دونوں کے دو سوٹ کیس ہیں۔ ہمارے پاس تو نہ ٹی وی ہے نہ فرنیچر۔ کوئی مہمان آتا ہے تو اسے دری پر بٹھا کر کہتے ہیں کہ یہ ہماری مشرقی روایت ہے۔ تو مشرقی روایت کو لپیٹ کر نکل لینے میں کیا دیر لگتی ہے۔''

''بکواس مت کر۔ یہ بتا ہم جائیں گے کہاں۔''

''بہت دنوں سے میں نے ایک جگہ تاڑ رکھی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم وہیں جا کر آباد ہو جائیں گے اور ہمیں وہاں سے کوئی نکالنے والا بھی نہیں ہوگا۔''

''لیکن وہ جگہ کون سی ہے۔''

''پیلی حویلی۔'' منیر نے بتایا۔

''پیلی حویلی۔'' میں چونک گیا۔ ''یعنی تو اس حویلی کی بات کر رہا ہے جو کالونی کے آخر میں ریلوے لائن کے ساتھ بنی ہوئی ہے۔''

''ہاں، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔''

''کیا پاگل ہو گئے ہو۔ وہ حویلی تو آسیب زدہ ہے۔ سنا ہے وہاں چڑیلیں رہتی ہیں۔''

''یہ سب کہانیاں ہیں میرے بھائی۔ آج کے دور میں کون ان باتوں پر یقین کرتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''فیصل بھائی! تم خود دیکھ لو۔ وہ حویلی برسوں سے خالی پڑی ہوئی ہے۔ اس کی طرف کوئی جاتا بھی نہیں ہے۔ کسی کے باپ کو بھی پتا نہیں چل سکتا کہ ہم اس میں رہتے ہیں۔ کون آئے گا کرایہ وصول کرنے، کون آئے گا ہر مہینے دھمکی دینے۔''

اس کی بات دل کو لگ تو رہی تھی لیکن ابھی بھی بہت سی باتیں غور طلب تھیں۔

''دیکھو بھائی وہ ایسی جگہ ہے جہاں نہ بجلی ہے۔ نہ گیس ہے، نہ پانی ہے، پھر ہم کیسے رہ سکتے ہیں؟''

''نہیں بھائی! جہاں تک بجلی کا تعلق ہے تو ہمیں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم رات کو ویسے ہی دیر سے واپس آتے ہیں۔ صرف سونا ہی تو ہے۔ اس فلیٹ میں بھی ہم صرف سونے ہی کے لیے آتے ہیں۔ باقی وقت تو یوں ہی گزر جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ موم بتیاں جلا لیا کریں گے اور کیا ہوگا۔''

''اور گیس۔'' میں نے پوچھا۔ ''اس کے لیے کیا کریں گے۔''

''یار فیصل کوئٹہ ہوٹل زندہ باد۔ یا تو خود وہاں جا کر چائے پی لو یا پھر پارسل لے آؤ۔'' اس نے کہا۔ شاید وہ پوری تیاری کے ساتھ مجھ سے بات کر رہا تھا۔

''اچھا! ایک بات بتا۔ یہ گرمی کا موسم ہے، ہم گرمی میں تو مر جائیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ لمبی چوڑی حویلی ہے۔ زبردست چھت ہے اس کی۔ ہم اس کی چھت پر سویا کریں گے۔''

''اور ڈر نہیں لگے گا؟''

''کس ڈر کی بات کر رہے ہو ڈر تو انسانوں سے لگتا

ہے۔ اس طرف تو کوئی جاتا ہی نہیں ہے۔ پھر ڈر سے لگے گا۔ چور ڈاکو سب اس جگہ سے دور بھاگتے ہیں کیوں کہ وہ حویلی آسیب زدہ مشہور ہے۔ جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم وہاں آرام سے جب تک جی چاہے رہ سکتے ہیں۔''

کچھ دیر اور بحث ہوتی رہی۔ پھر اس نے مجھے اس بات پر قائل کر ہی لیا کہ ہم دونوں کو اس حویلی میں جا کر رہنا ہے۔ بغیر کسی کرائے کے۔ بغیر کسی پریشانی کے۔

ہم نے اسی دن اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا۔ ہمارے پاس سامان نام کی کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ بس اتنا سامان تھا کہ ایک رکشے میں آگیا تھا۔ ہم نے فلیٹ کی چابی پڑوس کو دے دی تھی کہ جب کامران بیگ آئے تو یہ چابی اس کے حوالے کر دیں۔

ہم نے ایڈوانس کے طور پر کامران بیگ کو بیس ہزار روپے دیے ہوئے تھے لیکن ان پر اب ہمارا حق اس لیے نہیں تھا کہ ہم پر جو کرائے چڑھے ہوئے تھے وہ بیس ہزار سے کہیں زیادہ تھے۔

ہم رکشا کر کے کالونی پہنچ گئے۔ ہم نے حویلی سے بہت فاصلے پر رکشا رکوایا تھا۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ہمیں اس حویلی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ سکے۔

پھر اپنا سامان اٹھا کر پیدل ہی چل پڑے۔

''ہم سامنے والے گیٹ سے داخل نہیں ہوں گے۔'' منیر نے بتایا۔ ''میں نے اس حویلی کا دوسرا راستہ تلاش کیا ہے۔ حویلی کے پیچھے ایک میدان ہے۔ جس میں جھاڑیاں اور درخت وغیرہ ہیں۔ ایک جگہ سے دیوار اچھی خاصی ٹوٹی ہوئی ہے۔ یہ سمجھ لو پورا دروازہ بن گیا ہے۔ ہم اس سے داخل ہوں گے۔''

''ابے تجھے یہ سب کیسے معلوم؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں بہت دنوں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''مجھے یہ اندازہ تھا کہ ہم لوگوں کو اس فلیٹ سے نکلنا ہوگا۔''

حویلی کے پیچھے واقعی ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ جنگلی جھاڑیاں تھیں اور پودے وغیرہ تھے اور ان کے درمیان حویلی میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ بھی تھا۔

کیا شاندار حویلی تھی۔ بڑے بڑے کمرے۔ ایک بڑا سا ہال، فانوس لگے ہوئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ لائٹ نہیں تھی اور جو سب سے حیرت انگیز بات تھی وہ میں نے اندر آتے ہی محسوس کر لی تھی کہ اس حویلی کے کمرے اور ہال وغیرہ سب صاف ستھرے تھے۔ جیسے روزانہ صفائی کی جاتی ہو۔

''یار منیر یہ کیا چکر ہے۔ اس حویلی میں اتنی صفائی کیوں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہو۔''

''کیسی بات کر رہے ہو۔ یہ حویلی برسوں سے ویران پڑی ہے۔''

''تو پھر اتنی صفائی کیوں ہے۔''

''یہ بات تو ہے۔'' منیر بھی پریشان ہو گیا تھا۔ ''ایسا تو نہیں کہ جو دو چڑیلیں یہاں رہتی ہیں انہوں نے صفائی کر رکھی ہو۔''

''ابے کیوں ڈرا رہے ہو، تم نے تو خود کہا تھا کہ چڑیل وغیرہ سب کہانیاں ہیں۔''

''کہا تو تھا لیکن کیا بھروسا۔''

اس حویلی میں فرنیچر بھی تھا۔ قدیم انداز کا۔ مضبوط اور بھاری بھاری کرسیاں، میزیں۔ ہم نے کئی کمرے دیکھے۔ ہر کمرے میں مسہری بھی موجود تھی۔

''دیکھ لیا، کتنی بڑی حویلی ہے۔'' منیر نے کہا۔ ''اب یہ سمجھ لو کہ یہ ہمارے باپ دادا کی حویلی ہو گئی۔ اب ساری زندگی یہاں رہ سکتے ہو۔''

اور اس وقت کسی کے ہنسنے کی آواز نے ہم دونوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ بہت خوب صورت ہنسی تھی۔ کسی لڑکی کی۔ مترنم، کھنکتی ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے آئی تھی۔ پھر خاموشی ہو گئی۔ جیسے ذرا سی دیر کے لیے بجلی چمک جاتی ہو۔

''یار فیصل بھائی! یہ کیا تھا؟'' منیر نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

''میں کیا بتاؤں۔ کسی لڑکی کی ہنسی تھی۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔'' اس نے میرا بازو تھام لیا۔

''پاگل مت بنو۔ تم ہی مجھے یہاں تک لائے ہو اور خود ڈر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اور ویسے بھی یہ آواز لڑکی کی تھی۔ کسی جن بھوت کی نہیں تھی۔''

''پھر بھی اس ویران حویلی میں لڑکی کہاں سے آ گئی۔''

''یہی تو چل کر دیکھنا ہے آؤ۔''

حالانکہ فیصل سے زیادہ تو خود میں ڈر رہا تھا۔ پھر بھی

ہمت دکھانی ضروری تھی۔ ورنہ یہاں رہ نہیں سکتے تھے۔

ہم دل ہی دل میں وظیفہ وغیرہ پڑھتے ہوئے اس کمرے سے باہر آ گئے۔ دور تک ایک راہداری تھی اور وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

''فیصل بھائی یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' منیر نے کہا۔

''وہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے گردن ہلائی۔ ''چلو کمروں میں دیکھتے ہیں۔''

ہم نے دو چار کمرے دیکھ ڈالے۔ لیکن کوئی بھی نہیں تھا ہاں وہ بھید اپنی جگہ برقرار رہا کہ ہر کمرے میں صفائی تھی۔ جیسے باقاعدگی سے جھاڑو دی جاتی ہو۔

''چلو چھوڑو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارا وہم ہی ہو۔'' منیر نے کہا۔ ''شام ہونے والی ہے۔ اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے ہمیں رہنے کے لیے کوئی کمرا دیکھ لینا چاہیے۔''

''ہاں لیکن ہم ایسا کمرا دیکھیں گے جو دروازے کے قریب ہو۔ میرا مطلب ہے باہر والے خفیہ دروازے سے۔ تاکہ کوئی ایسا برا وقت آئے تو بھاگ نکلنے میں آسانی ہو۔''

خفیہ دروازے کے پاس ہی ایک کمرا تھا۔ جس کی کھڑکیاں بھی بہت بڑی تھیں اور خوب ہوا آ رہی تھی۔ اگر ہم یہاں سوتے تو ہمیں گرمی نہیں لگ سکتی تھی۔

ہم نے اس کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ اپنی دریاں بچھا دیں۔ تکیے رکھ دیے۔ واہ کیا مزے کا بستر ہو گیا تھا۔

زندگی آسان ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی ٹینشن نہیں۔ کوئی کرایہ نہیں کوئی بل نہیں۔

''یار فیصل! یہاں پانی کا کیا بندوبست ہوگا۔'' منیر نے کہا۔

''وہ کس لیے؟''

''یار ہاتھ منہ دھونے کے لیے۔ واش روم وغیرہ جانے کے لیے۔ ہاں یاد آیا ہم نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ یہاں واش روم بھی ہے یا نہیں۔''

ہم واش روم کی تلاش میں چل پڑے اور دو عدد واش روم مل گئے اور دونوں انتہائی صاف ستھرے ٹائلز لگے ہوئے۔ جدید طرز کے بنے ہوئے اور دونوں میں دو دو بالٹیاں بھی تھیں۔ پانی سے بھری ہوئیں۔

''منیر یہاں ضرور کوئی رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔

فٹ بال دنیا کا مقبول ترین گیم ہے۔ اور اس گیم کے شوقین شاید سب سے زیادہ جنونی ہیں۔ جب ورلڈ کپ ہوتا ہے یا جب مقامی کلب آپس میں کھیلتے ہیں تو یہ جنون اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ نبراسکا یونیورسٹی میں جب مقامی ٹیم فٹ بال میچ کھیلتی ہے تو اسٹیڈیم ملک کا تیسرا بڑا شہر بن جاتا ہے۔ اسٹیڈیم تو خیر بھرا ہی رہتا ہے۔ اس کے آس پاس کی سڑکیں اور گلیاں تک بھر جاتی ہیں۔ پورا بازار لگ جاتا ہے۔ بے تحاشا گاڑیاں، دنیا بھر کے ٹی وی کیمرے، رپورٹرز اور نہ جانے کیا کیا۔ اس شوق کو کیا نام دیا جاسکتا ہے؟

مرسلہ: کوثر ملک۔ سکھر

آپ نے سنا ہوگا جب خدا حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ شیر ایک طاقت ور جانور ہے۔ لہٰذا اس میں نزاکت کچھ اس طرح آتی ہے کہ وہ مغرور ہو جاتا ہے اور خاص طور پر جب کسی کو شکار کر کے فتح حاصل کر لیتا ہے تو اس کی چال ڈھال دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اس کے ہر انداز سے اس کے غرور کا اظہار ہوتا ہے۔

مرسلہ: فوزیہ تسلیم۔ سکھر

برف باری قدرت کا بہت خاص اور خوب صورت نظارہ ہے۔ جب روئی کے گالوں کی طرح برف گرتی ہے اور ہر طرف سفیدے کی چادر پھیل جاتی ہے تو اس وقت سبحان اللہ کہنے کو دل چاہتا ہے۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ برف باری کا یہ حسین نظارہ پاکستان میں بھی دیکھنے میں آتا ہے لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کی دوتہائی اکثریت نے برف باری ہی نہیں دیکھی۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ برف باری کیا ہوتی ہے۔

مرسلہ: نوشین چوہدری۔ ملتان

آپ اگر فلموں کے شوقین ہیں تو آپ نے الفریڈ ہچکاک کی فلمیں ضرور دیکھی ہوں گی۔ ہچکاک کو ماسٹر آف سسپنس بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک بے مثال فلم ہے۔ اس فلم میں شاور سے پانی گرنے کا سین ہے اور ہچکاک نے اس میں کمال کر دکھایا ہے۔ پانی گرنے کی جو آواز ہے وہ اعصاب کو چٹخا کر رکھ دیتی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ آواز کیسے پیدا کی گئی تھی۔ تربوز پر مسلسل انگلیاں مار کر، ہے نا کمال۔

مرسلہ: ماہا ملک۔ لاہور

''دیکھ رہے ہو تم، کوئی تو ہے جس نے یہ سارا انتظام کر کے رکھا ہوا ہے۔''

''لیکن کون ہو سکتا ہے، ہم تو تلاش کر کے تھک گئے۔''

''ہم نے پوری حویلی کہاں دیکھی، چلو اوپر چلتے ہیں۔''

''فیصل بھائی! اس وقت نہیں رات ہونے والی ہے۔ چل کر سو جاتے ہیں۔ صبح دیکھیں گے۔''

''اور کھانا۔ کھانے کا کیا ہوگا؟''

''اس وقت گول کر جاؤ۔ کل صبح ہوٹل چل کر ناشتا کرلیں گے۔''

ہم اس کمرے میں واپس آ گئے۔ جہاں ہم نے اپنے بستر لگائے تھے یہاں آتے ہی ہمیں ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

کمرے کے فرش پر ایک بڑا سا اخبار بچھا ہوا تھا۔ اس پر دو تین برتن تھے۔ ایک دو قاب تھے۔

ایک بڑے سے ڈونگے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ دوسرے ڈونگے میں سالن تھا۔ پانی سے بھرا ہوا ایک بڑا سا جگ تھا۔ دو گلاس تھے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

''ابے یہ سب کیا ہے؟'' میں نے منیر کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں۔ میرا تو دماغ چکرا گیا ہے بھائی۔ چلو یہاں سے بھاگ لیں ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' میں نے دیکھا۔ ''اس سے یہ بات پتا چلی ہے کہ وہ جو بھی ہیں ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ ورنہ وہ ہمارے لیے کھانے کا بندوبست نہیں کرتے۔''

''کیا پتا۔ کھانے میں زہر ملا ہو۔''

''بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ہمیں مارنے کے لیے یہاں زہر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ویسے ہی مار کر اس حویلی میں دفن کر سکتے ہیں۔ کون پوچھنے والا ہوگا۔''

''پھر بھی۔ وہ ہیں کون۔''

''آؤ ان کو آوازیں دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''شاید وہ ہمارے سامنے آنے سے کترا رہے ہیں۔'' ہم نے کمرے سے باہر آ کر آوازیں دینی شروع کر دیں۔

''کون ہو تم لوگ۔ کہاں ہو سامنے آؤ، پلیز ہم تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم لوگ بہت اچھے ہو تو پھر سامنے کیوں نہیں آتے۔''

برآمدے کے دوسرے سرے پر جو کمرا تھا اس کا دروازہ کھلا اور دو لڑکیاں اس میں سے نکل کر ہماری طرف آنے لگیں۔

میں اور منیر سکتے کے عالم میں اپنی جگہ کھڑے رہ گئے تھے۔

دونوں لڑکیاں ہمارے قریب آ گئیں۔ دونوں ہی خوب صورت اور جوان لڑکیاں تھیں۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی خوب صورت تھیں۔

''کون ہو تم دونوں؟'' میں نے پوچھا۔ وہ دونوں ہمارے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

''میرا نام ارم ہے۔'' ان میں سے ایک نے بتایا۔

''اور یہ میری دوست جویریہ ہے۔'' اس نے دوسری کی طرف اشارہ کیا۔

''تم دونوں اس ویران حویلی میں کیا کر رہی ہو؟'' فیصل نے پوچھا۔

''وہی جو تم دونوں کر رہے ہو۔'' دوسری والی یعنی جویریہ نے کہا۔ ''یعنی پناہ کی تلاش میں اس حویلی میں آ کر چھپ گئے ہیں۔''

''کیا تمہیں یہاں ڈر نہیں لگتا؟'' میں نے پوچھا۔

''کس بات کا ڈر۔ ڈر تو بدمعاش قسم کے انسانوں سے لگتا ہے اور تم دونوں ویسے نہیں ہو۔ اس لیے تو بے خوف ہو کر تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم کہ ہم بدمعاش قسم کے لوگ نہیں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ ہم چھپ چھپ کر تم دونوں کی باتیں سنتے رہے ہیں۔'' اس لڑکی نے کہا جس نے اپنا نام ارم بتایا۔ ''جس وقت تم دونوں کمروں میں چکراتے پھر رہے تھے۔ اس وقت ہم تمہارے آس پاس ہی تھیں اور تمہاری ہر بات سن رہی تھیں۔ پتا چل گیا کہ تم دونوں مفلس قسم کے نوجوان ہو۔ کرائے کے فلیٹ سے نکل کر آئے ہو۔ تمہیں یہ حویلی مناسب لگی اور تم یہاں آ گئے۔''

''اور تمہارا نام منیر ہے۔'' جویریہ نے منیر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور تم فیصل ہو۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا تھا۔

''لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا۔'' فیصل نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو ناموں سے پکارتے رہے ہو۔'' ارم نے کہا۔

''جاؤ اب جا کر کھانا کھا لو۔ ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''ایک بات بتاؤ۔ یہ تم لوگوں نے کھانے کا

بندوبست کہاں سے کردیا۔'' میں نے پوچھا۔

''چلو، اندر چل کر کھانا کھاتے رہو۔ پھر ہم سب بتا دیں گے۔''

جویریہ اپنے ساتھ موم بتیاں بھی لیتی آئی تھی۔ ہم نے وہ موم بتیاں جلادیں۔ اب ایک عجیب سا ماحول ہوگیا تھا۔

ایک بہت قدیم ویران حویلی، جو پورے شہر میں آسیب زدہ مشہور ہے۔ اندھیری رات، ایک کمرے میں موم بتیاں جل رہی ہیں اور دو نوجوان مرد اور دو نوجوان لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ جو ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔

یہ کتنی پُراسرار سچویشن تھی۔ بالکل فلموں یا کہانیوں والی لیکن اس وقت ہم سب خاص پُراسرار ماحول کی ایک جز بن کر رہ گئے تھے۔

ان دونوں نے ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ پہلے کھا چکی تھیں۔ دسترخوان پر جو کچھ تھا وہ ہم دونوں کے لیے تھا اور بہت لذیذ تھا۔

''واہ، مزا آگیا۔'' فیصل نے کھانا ختم کرنے کے بعد کہا۔

''چائے کا بھی بندوبست ہے۔'' ارم نے بتایا۔

''خدا کی پناہ۔ تم دونوں یہ سب کس طرح کر لیتی ہو۔''

''تم دونوں نے پوری حویلی نہیں دیکھی نا۔ اس لیے حیران ہورہے ہو۔'' ارم نے کہا۔ ''اوپری منزل پر پورا باورچی خانہ ہے دو دو چولہے ہیں۔''

''لیکن ایندھن کہاں سے آتا ہے۔ میرا مطلب ہے گیس وغیرہ۔''

''اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ دونوں چولہے لکڑی کے ہیں۔ یعنی لکڑی سے جلانے والے اور ایک کمرے میں لکڑیاں ہی لکڑیاں بھری ہوئی ہیں۔ شاید اس حویلی کے مکین ان ہی لکڑیوں سے کھانے بناتے ہوں گے۔ پھر وہ اچانک کہیں غائب ہوگئے۔''

''اور اب وہی لکڑیاں ہمارے کام آرہی ہیں۔'' جویریہ نے کہا۔

''لیکن تم دونوں یہاں کب سے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس حویلی میں ہمارا چوتھا مہینا ہے۔'' ارم نے بتایا۔

پھر ان دونوں نے اپنی جو کہانی سنائی وہ بہت حیرت انگیز اور دل چسپ تھی۔ بالکل میری اور فیصل کی کہانیوں سے ملتی جلتی کہانی۔

وہ دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کی دوست تھیں۔ دونوں نے تعلیم حاصل کی اور جب بڑی ہوئیں تو والدین نے ان دونوں کی شادیاں ایسے لڑکوں سے کرنی چاہی جو کسی طرح بھی ان دونوں کے قابل نہیں تھے۔ دونوں نے بہت احتجاج کیا لیکن والدین انہیں ضد پر اڑے رہے۔ پھر ان دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ گھر سے فرار ہو جائیں اور دونوں گھر سے فرار ہوگئیں۔''

''یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہارے والدین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم دونوں نے بھی کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی ہے۔ تمہارے والدین کتنے پریشان ہوں گے کہ پتا نہیں تم دونوں کے ساتھ کیا گزری ہوگی۔''

''ہم نے اپنے اپنے والدین کو فون کرکے بتا دیا تھا کہ ہم زندہ اور خیریت سے ہیں۔ جویریہ نے بتایا اور کہا کہ ہم بہت جلد گھر واپس آجائیں گے۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' فیصل نے پوچھا۔

''اس کے بعد یہ ہوا کہ شہر آکر ہم نے جاب تلاش کی لیکن ہر جگہ ہماری خوب صورتی ہماری دشمن بن کر ہمارے سامنے آتی گئی۔'' ارم نے بتایا۔ ''پتا نہیں لوگ ٹیلنٹ سے زیادہ صورت کو کیوں دیکھتے ہیں۔''

''اس کے ساتھ دوسری پرابلم یہ ہوئی کہ ہمیں رہنے کا کوئی معقول ٹھکانا بھی نہیں مل سکا۔'' جویریہ نے کہا۔ ''پھر ہمیں یہ ٹھکانا دکھائی دیا اور ہم نے اس حویلی میں پناہ لے لی۔ تم دونوں کی طرح۔''

''ہم پورے ایک ہفتے تک اس حویلی کی صفائی کرتے رہے تھے۔'' ارم نے بتایا۔ ''توبہ توبہ اتنی گرد تھی کہ بتا نہیں سکتی۔''

''اور تمہیں یہاں ڈر نہیں لگا۔''

''نہیں، ایک دن بھی نہیں کیونکہ اس طرف تو کوئی آتا ہی نہیں ہے۔'' جویریہ ہنس کر بولی۔ ''ہم دو تین دفعہ حویلی کی چھت پر دکھائی دیے ہوں گے۔ تو لوگوں نے مشہور کردیا کہ اس حویلی میں دو چڑیلیں رہتی ہیں اور وہ چڑیلیں ہم دونوں ہیں۔''

''تم دونوں تو بہت معقول قسم کی چڑیلیں ہو۔'' فیصل نے کہا۔

''اور اب اس حویلی میں دو چڑیلوں کے ساتھ دو بھوت بھی آکر رہنے لگے ہیں۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔

پھر ہم سب بہت دیر تک ہنستے بولتے رہے۔ وہ دونوں بہت خوش مزاج بھی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ روز صبح جاب کی تلاش میں نکل جاتی ہیں اور واپسی میں بازار سے سودا بھی لے آتی ہیں۔ پھر وہ ہوتی ہیں اور اس حویلی کی تنہائی۔

''اب کل صبح سے ہم چاروں جاب کی تلاش میں اس حویلی سے نکلا کریں گے۔'' منیر نے کہا۔ ''ان میں سے دو چڑیلیں ہوں گی اور دو بھوت ہوں گے۔''

''نہیں ہم چاروں ایک ساتھ نہیں نکلیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی بھی ہمیں دیکھ سکتا ہے۔ پھر اسکینڈل بنتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔''

''اب تم دونوں بتاؤ تمہارے ساتھ کیا کہانی ہے؟'' ارم نے پوچھا۔

''ہماری کہانی بہت مختصر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جس طرح تمہاری کہانی ہے۔ پڑھے لکھے ہیں لیکن جاب نہیں مل رہی ہے۔ کرائے کے مکان سے تنگ آکر اس حویلی میں پناہ لے لی ہے اور یہاں آکر تم دونوں کا ساتھ ہو گیا ہے۔ بس یہ ہے کل داستان۔''

''چلو اب سو جاؤ۔'' جویریہ نے کہا۔ ''ہمیں بھی کل صبح آٹھ بجے ایک جگہ پہنچنا ہے۔''

وہ دونوں برتن وغیرہ سمیٹ کر اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئیں۔ اس کے بعد کس کو نیند آنی تھی۔ ایک تو یہ حویلی پھر دو بہادر قسم کی لڑکیوں سے ملاقات۔ سب کچھ بہت عجیب سا ہو گیا تھا۔

''فیصل بھائی۔'' منیر نے میری طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ ''یار! یہ لڑکیاں اگر ہماری بیویاں بن جائیں تو زندگی کتنی رومانٹک اور کتنی خوب صورت ہو جائے۔''

''ہاں یار! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''ارم کی آنکھوں میں مجھے اپنے کھوئے ہوئے خواب دکھائی دے رہے ہیں۔''

''اور جویریہ کی آنکھیں مجھے اپنی طرف بلاتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ ہائے کیا لڑکیاں ہیں۔''

''منیر! کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ دونوں کہیں انگیج ہوں۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں ایسا تو نہیں لگتا۔'' منیر نے کہا۔ ''ورنہ یہ باتوں باتوں میں ضرور ذکر کر دیتیں۔''

''چل بھائی اب سو جا۔ صبح سے پوری سنجیدگی کے ساتھ جاب تلاش کرنی ہے۔''

صبح ہماری آنکھ دروازے پر دستک سے کھلی تھی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا وہی دونوں کھڑی ہوئی تھیں۔

''جائیں جا کر نہا لیں۔ فریش ہو جائیں۔'' ارم نے کہا۔ ''سب کچھ تیار ہے۔ اس کے بعد ہم آپ کے لیے ناشتا لے کر آتے ہیں۔''

میں گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''ارے اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں۔'' ارم نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

''ایک تو یہ ہے کہ دن کی روشنی میں تمہیں دیکھ رہا ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ تم اس وقت بالکل فکر مند بیوی کی طرح دکھائی دے رہی ہو۔''

''اچھا اچھا جائیں جائیں۔'' جویریہ بول پڑی۔ ''جلدی سے تیار ہو جائیں ہم دونوں چلی گئیں تو ناشتا بھی نہیں مل سکے گا۔''

ہم دونوں نے اپنے اپنے واش روم کی طرف دوڑ لگا دی۔ یہاں سب کچھ تھا۔ بالٹی میں تازہ پانی۔ نہانے کا صابن، صاف ستھرا تولیہ، بالکل پُرسکون گھریلو زندگی کا مزہ آرہا تھا۔

ہم دونوں تیار ہو کر کمرے میں پہنچے تو ٹرے میں ناشتا تیار تھا۔ توس، ہاف فرائی انڈے، گرما گرم چائے، سب کچھ تھا۔

''مزہ آگیا۔'' فیصل نے ٹرے پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب چیزیں کہاں سے آتی ہیں۔''

''ہم واپسی میں بازار سے لیتے ہوئے آتے ہیں۔'' ارم نے جواب دیا۔ ''بلکہ ایک ہفتے کا راشن ایک ساتھ لے آتے ہیں۔''

''پھر تو ہماری وجہ سے تمہارا راشن کم پڑ جائے گا۔'' فیصل نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' جویریہ مسکرا دی۔ ''ہم اور لے آئیں گے۔ گھر سے آتے ہوئے ہم نے اچھے خاصے پیسے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔''

''اب تم دونوں کا کیا پروگرام ہے۔'' ارم نے مجھ سے پوچھا۔

''ہم دونوں کو نکلنا ہے۔ ایک فرم میں جاب ہے۔

ہمیں وہاں جانا ہے۔ دوپہر تک واپسی ہو جائے گی۔''
''چلو تو پھر تم دونوں کے لیے کھانے کا بندوبست کر کے رکھیں گے۔'' جویریہ نے کہا۔
''کیوں کیا تم دونوں کو کہیں نہیں جانا۔''
''نہیں۔ آج نہیں جانا۔ آج ہمیں کپڑے دھونے ہیں۔ اگر تم دونوں کے پاس بھی ہوں تو دے دینا۔''
''ارے نہیں۔ ہم اپنے کپڑے خود دھو لیا کریں گے۔'' فیصل نے کہا۔ ''تم دونوں ہمارے لیے جو کچھ کر رہی ہو وہی بہت ہے۔''
''اچھا اب تم دونوں جلدی سے نکلو۔'' ارم نے کہا۔
''جن بچوں کو کام پر جانا ہوتا ہے وہ زیادہ دیر نہیں لگاتے۔''
اس کے انداز میں اتنا پیار اور اپنائیت تھی کہ میں پگھل کر رہ گیا تھا۔
میں نے اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ٹکا دیں۔ اس نے شرما کر اپنی گردن جھکالی تھی۔ شاید یہی کیفیت منیر کی بھی ہوگی۔
ہم تیار ہو کر حویلی کے پچھلے خفیہ دروازے سے باہر نکل آئے۔ اس وقت دونوں ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے موجود تھیں۔
کسی نے ہمارا نوٹس نہیں لیا تھا۔ ویسے بھی حویلی کی سمت پر سناٹا ہی رہتا تھا۔ ہم اس بستی کے ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ ہمیں پوری صورتِ حال کا جائزہ لینا تھا۔
ہم نے چائے منگوالی۔ اس دوران ہم دونوں ہی بہت پُرجوش ہو رہے تھے۔ ہمارے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے ہو۔
بالآخر منیر نے کہا۔ ''فیصل بھائی ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم شادی شدہ زندگی کے مزے لے رہے ہیں۔''
''ہاں یار!'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''یہ دونوں تو ہمارا بہت خیال رکھ رہی ہیں۔''
''کاش یہ وقت اسی طرح ٹھہر جائے۔'' منیر نے ایک گہری سانس لی۔
''یار! یہ سب کچھ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''زندگی کا یہ رخ اچانک ہمارے سامنے آ گیا ہے۔''
''اور کس خوب صورتی سے آیا ہے۔''
''کاش! ہم ان کی توقعات پر پورے اتر سکیں۔''

یہ کمپیوٹر اور نیٹ بھی کیا چیز ہے۔ آپ کو دنیا بھر کے لوگوں سے رابطہ کرنے میں کتنی آسانی ہوگئی ہے۔ بس ایک کلک کیا اور پوری دنیا آپ کے سامنے کھلتی چلی گئی۔ آپ کو ٹوئیٹر کے بارے میں تو ضرور علم ہوگا۔ دنیا بھر کے پیغامات اب اس پر آنے لگے ہیں اور دن بھر میں کتنے لوگ شیئر کرتے ہیں۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو؟ یا چلیں ہم بتا کر آپ کو حیران کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹوئیٹر پر دن بھر میں جتنے نام آتے ہیں ان سے دس لاکھ صفحات کی ایک کتاب بن سکتی ہے۔ جی ہاں دس لاکھ صفحات کی کتاب، بس پڑھتے چلے جائیں اور پڑھتے ہی چلے جائیں۔

مرسلہ: نعمان اشرف۔ کوئٹہ

میں نے کہا۔
''کیوں انہوں نے ہم سے کون سی توقعات باندھ لی ہیں۔''
''ایک بات محسوس کرو۔ کیا ایسا نہیں لگتا کہ ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اتنی اپنائیت، اتنا خیال ہمیں پہلے کہاں ملا ہے۔ جیسے حویلی سے روانہ کرتے وقت وہ دونوں کتنی پُرامید اور پُرجوش تھیں۔ فکرمند بیویوں کی طرح۔ جن کے شوہر جاب کے لیے انٹرویو دینے جا رہے ہوں تو ان کی خواہش تو یہی ہوگی کہ کاش ہمیں جاب مل جائے۔''
''ہاں فیصل بھائی اور ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لیے دعائیں بھی کر رہی ہوں۔''
''یار منیر ایسا لگتا ہے جیسے قدرت ہمیں جان بوجھ کر خاص پلاننگ کے ذریعے اس حویلی تک لائی ہے۔ تاکہ ہم ان دونوں لڑکیوں کے سہارے بن جائیں۔ انہیں ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کر لیں۔''
''ہاں یار! مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔''
''تو پھر کیوں نہ ایک کام کیا جائے۔''
''کون سا کام؟''
''ہم ان سے اظہارِ محبت کر دیں۔'' میں نے کہا۔
''نہیں بھائی کیا پاگل ہو گئے ہو۔ اتنی جلدی اس کی کیا ضرورت ہے۔''
''ضرورت ہے۔ سمجھا کرو اس سے یہ ہوگا کہ انہیں

پھر کسی اور کی طرف دیکھنا نہیں پڑے گا۔ اس کے علاوہ ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اگر انہوں نے ہاں کردی تو ہم میں ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا ہو جائے گا۔ ہم نئے انداز سے جاب کی تلاش کریں گے۔ ایک نئی آرزو کے ساتھ اس یقین کے ساتھ کہ کسی کو ہماری کامیابی کی آس ہے کوئی یہ چاہتا ہے کہ ہمیں جاب مل جائے۔ کوئی ہے جو ہمارے لیے کھانا تیار کر کے رکھتا ہے ہمارے کپڑے دھوتا ہے جو ہماری کامیابیوں سے خوش ہوگا۔‘‘

’’ہاں فیصل بھائی! یہ بات تو ہے۔‘‘ منیر نے میری تائید کی۔

’’تو چلو چل کر انہیں اپنی وفاداری اور محبت کا احساس دلا دیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اتنی جلدی، شام کو بات ہو جائے گی نا۔‘‘

’’نہیں ابھی تاکہ ہم میں نیا حوصلہ آجائے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’پھر جب ہم ان سے اپنے دلوں کی بات کہہ کر باہر نکلیں گے نا تو پھر بات ہی کچھ اور ہوگی۔ پھر ہم جاب کے سلسلے میں جہاں بھی جائیں گے ہمارے ساتھ محبت کی طاقت ہوگی۔ محبت کا ولولہ ہوگا۔‘‘

’’ڈن۔‘‘ منیر مسکرادیا۔ ’’چلو واپس چلتے ہیں۔‘‘

’’لیکن ان کے لیے کچھ لیتے چلیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میرا مطلب ہے کوئی پیار بھرا تحفہ۔‘‘

’’وہ سامنے پھولوں کی دکان دکھائی دے رہی ہے۔‘‘ منیر نے اشارہ کیا۔ ’’ہم وہاں سے گلاب کے پھول لے لیتے ہیں۔ اس سے اچھا تحفہ کچھ نہیں ہوسکتا۔‘‘

ہم نے گلاب کے دو بڑے بڑے پھول لے لیے۔ ایک اپنے لیے دوسرا منیر کے لیے۔

ہم اسی طرح پچھلی طرف کے خفیہ راستے سے اندر پہنچ گئے۔ اتفاق سے وہ دونوں برآمدے میں ہی کھڑی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی دوڑتی ہوئی ہمارے پاس آگئیں۔

’’ارے کیا ہوا؟‘‘ ارم نے پوچھا۔ ’’تم دونوں واپس کیوں آگئے، خیریت تو ہے نا۔‘‘

’’ہاں خیریت ہی ہے ارم، ہم ایک بہت ضروری بات بھول گئے تھے۔‘‘ میں نے بتایا۔

’’کون سی بات؟‘‘ جویریہ نے پوچھا۔

’’تم سے محبت کا اظہار کرنا۔‘‘ فیصل نے کہا۔

’’کیا!‘‘

’’ہاں! ہم نے اتنی دیر میں یہ محسوس کرلیا ہے کہ تم میرے لیے ناگزیر ہو چکی ہو۔ میں اب شاید تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔‘‘

’’ہاں، جویریہ۔ یہی حال میرا بھی ہے۔‘‘ فیصل نے کہا۔

’’ارم۔‘‘ میں نے گلاب اس کی طرف بڑھا دیا۔ ’’یہ لو اگر تم نے اس کو قبول کرلیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ تم نے میری محبت قبول کرلی ہے۔‘‘

’’جویریہ یہ پھول تمہارے لیے ہے۔‘‘ منیر نے جویریہ کی طرف پھول بڑھا دیا۔

وہ دونوں چند لمحوں تک ہماری طرف دیکھتی رہیں۔

پھر دونوں نے پھول لے لیے اور اس کے ساتھ ہی وہ دونوں اوپر کی طرف دیکھ کر ایک آواز میں بولنے لگیں۔ ’’ہم آرہے ہیں۔ ہم نے تمہاری شرط پوری کردی ہے۔ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ ہماری سزا ختم ہوگئی ہے۔‘‘

’’ارم! کیا کہہ رہی ہو تم دونوں کیسی سزا؟‘‘ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

’’کہانی کچھ یوں ہے کہ ہمارا تعلق تمہاری دنیا سے نہیں ہے۔ ہم تو اجنا سے ہیں۔‘‘ جویریہ نے کہا۔

’’جویریہ یہ کیا بکواس ہے۔‘‘ فیصل بھڑک اٹھا تھا۔

’’یہ بکواس نہیں سچائی ہے۔ ہم نے اپنی دنیا کے کچھ اصول توڑے تھے۔ جس پر ہمیں سزا کے طور پر انسانوں کی دنیا میں بھیج دیا تھا۔‘‘

’’اور ہماری سزا ختم ہونے کی شرط یہ تھی کہ انسان ہم سے محبت کا اظہار کردیں۔ تم دونوں نے محبت کا اظہار کردیا ہے۔ لہٰذا ہماری سزا ختم ہوگئی ہے۔ اب ہم اپنی دنیا میں واپس جارہے ہیں۔‘‘

اور اچانک وہ دونوں غائب ہوگئیں۔ اس جگہ کھڑے کھڑے اور ہم دونوں بھی غائب ہوگئے۔ یعنی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

اب اس واقعے کو کئی برس ہو چکے ہیں۔ ہماری اپنی زندگی ہے۔ ہماری شادیاں بھی ہوگئی ہیں۔ اپنا گھر ہے۔ لیکن ابھی بھی جب اس حویلی کی طرف سے گزرتے ہیں تو بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔

اس کہانی سے کوئی اور سبق ملتا ہو یا نہ ملتا ہو لیکن یہ سبق ضرور ملتا ہے کہ کبھی بھی اپنے گھر یا حویلی وغیرہ کو خالی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

دہشت کدہ

محترم مدیر
السلام علیکم
اس روداد کے بارے میں کیا عرض کروں۔ آپ خود ہی پڑھ کر اندازہ کریں کہ یہ دنیا اس طرح کے کتنے ہی پُراسرار واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ ہمارے آس پاس ان دیکھی مخلوق موجود ہے۔ میری پیاری سہیلی مریم کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ ہی کہیے۔ یعنی کس طرح اسے ایک نادیدہ مخلوق نے ستا رکھا تھا۔

دانیہ صدیقی
(کراچی)
راوی: مریم ادریس

یوں تو روزانہ کی سطح پر دنیا میں دہشت گردی کے ایسے ہولناک واقعات جنم لے رہے ہیں کہ ہمارا سکھ، چین سب برباد ہو گیا ہے لیکن اگر ہم ان روزمرہ کے واقعات کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو ہر آٹھ میں سے ایک بندہ کسی اَن دیکھی مخلوق کا تختۂ مشق بنا نظر آئے گا۔ یہ ایک ایسا ہی عقل سے ماورا قصہ ہے جو میری بہت قریبی سہیلی کے ساتھ پیش آیا تھا اور میرے بے حد اصرار پر وہ ڈرتے ڈرتے تفصیل بتانے پر رضامند ہوئی تھی کیونکہ

اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ سب کچھ دوبارہ نہ شروع ہو جائے۔
میرے یقین دلانے پر اس نے مجھے واقعے سے تو آگاہ کر دیا لیکن ایک شرط یہ بھی رکھی کہ میں ایک سال تک کسی سے اس واقعے کا ذکر نہیں کروں گی اور اس دوران میں اگر کچھ نہ ہوا تو میں اس شرط سے آزاد ہو جاؤں گی۔ چنانچہ میں نے ایمانداری سے یہ وعدہ نبھایا اور اب اسی کی اجازت سے یہ واقعہ آپ لوگوں کے سامنے لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ یہ واقعہ سنانے کا مقصد آپ کو خوفزدہ کرنا یا شیطانی طاقتوں کو بڑھاوا دینا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ شیطان... چاہے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو بالآخر رحمانی طاقت کے آگے دم توڑ دیتا ہے اور طاقت کا سرچشمہ بلاشبہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے۔

آپ کا وقت ضائع کیے بغیر میں جلد از جلد کہانی کی جانب بڑھتی ہوں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ چند ذاتی وجوہات کی بناء پر میں نے تمام کرداروں اور جگہوں کے نام تبدیل کر دیئے ہیں کیونکہ تقریباً تمام کردار ماشاء اللہ حیات ہیں اور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ اب آپ میری سہیلی کی زبانی ہی یہ واقعہ سنیئے۔

یہ آج سے پندرہ سال پرانی بات ہے۔ میری بڑی بہن جنہیں میں آپا کہہ کر بلاتی ہوں اپنی ساس کی اچانک طبیعت خرابی کی بناء پر ایمرجنسی میں لندن سے کراچی پہنچیں۔ ان کی ساس ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کی پرانی مریضہ تھیں لیکن پرہیز سے ان کی جان جاتی تھی، ماشاء اللہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا اور ہاتھ کی بھی کھلی تھیں۔ سسر صاحب بھی یار باش قسم کے آدمی تھے اسی لیے گھر میں ہر وقت لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا جن میں زیادہ تعداد تو ساس صاحبہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے چٹ پٹے کھانوں اور مزیدار میٹھوں کے طلب میں کھنچی چلی آتی تھی اور مجال ہے جو کوئی ان کے گھر سے خالی پیٹ اٹھتا ہو، دونوں میاں بیوی کھلانے پلانے اور میزبانی کے معاملے میں بہت وضع دار تھے چنانچہ لگاتار بد پرہیزی کے نتیجے میں ساس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ میرے بہنوئی تیمور بھائی جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے ان دنوں ملازمت کے سلسلے میں بیوی بچوں کے ہمراہ لندن میں مقیم تھے۔ جب انہیں اپنی والدہ کے اسپتال پہنچنے کی خبر ملی۔ انہوں نے فوراً چھٹی کے لیے درخواست دے دی لیکن کچھ دفتری معاملات نمٹانے ضروری تھے چنانچہ انہوں نے پہلی فرصت میں اپنی بیوی اور بچوں کو کراچی روانہ کر دیا اور ایک ہفتے بعد خود بھی آ گئے۔ ان کی والدہ تو جیسے اپنے بیٹے سے ملاقات کی آس میں ہی جی رہی تھیں کیونکہ اگلی ہی صبح وہ وفات پا گئیں۔

آپا کے سسر صاحب نے اس واقعے کا بہت گہرا اثر لیا اور گم صم ہو کر رہ گئے۔ تیمور بھائی نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ لندن چلنے کو راضی ہو جائیں مگر انہوں نے سختی سے یہ تجویز ٹھکرا دی۔ دوسری طرف ان لوگوں کو واپس بھی جانا تھا کیونکہ تیمور بھائی کی ملازمت اور بچوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا لیکن وہ کسی طرح بھی اپنے والد کو اس حال میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ جب ان کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود والد صاحب لندن چلنے کو راضی نہیں ہوئے تو مجبوراً تیمور بھائی اور آپا نے میرے ابو اور امی سے طویل مشاورت کی جس کے نتیجے میں یہ طے پایا کہ آپا اور دونوں بچے یہیں رک جائیں اور کسی اچھے اسکول میں بچوں کا داخلہ کروا دیا جائے۔ تیمور بھائی ابھی فی الحال واپس لندن جائیں گے اور اپنی نوکری سے استعفیٰ دے کر اور فرنیچر وغیرہ فروخت کر کے چھ ماہ بعد کراچی آ جائیں گے اور واپس آ کر اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ ان کے والد پیشے کے لحاظ سے سنار تھے اور کراچی کے مختلف علاقوں میں ان کی سونے کی چار دکانیں تھیں۔

یہاں کچھ باتیں بتاتی چلوں کہ آپا نے یہ طے کیا تھا کہ وہ گلستان جوہر میں واقع اپنے سسر صاحب کے مکان میں رہنے کے بجائے اپنے بنگلے میں رہیں گی جو وہاں سے محض پانچ منٹ کی دوری پر تھا حالانکہ میرے امی اور ابو نے بہت زور دیا کہ وہ ہمارے ساتھ رہ جائیں لیکن آپا کیونکہ بچپن ہی سے مزاج کی تھوڑی تیز تھیں اور ان کی اور میری بھابی کی بالکل نہیں بنتی تھی اسی لیے انہوں نے اپنے بنگلے پر رہنے کو ہی ترجیح دی۔ ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ روزانہ شام کو وہ سسر صاحب کے گھر چلی جایا کریں گی تاکہ بچوں کی موجودگی میں ان کا دل بہلا رہے اور رات کا کھانا کھا کر واپس آ جائیں گی لیکن رات اپنے بنگلے پر ہی گزاریں گی۔ اس شرط پر میرے والدین اور تیمور بھائی نے اعتراض کیا لیکن آپا کی ضدی طبیعت کے آگے انہیں گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ آخرکار تیمور بھائی بچوں کا داخلہ کروا کر اور ان کے رہنے سہنے کے سارے انتظامات کر کے واپسی کا وعدہ لیے لندن روانہ ہو گئے۔

یہیں سے اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اوپر باندھی گئی تمہید کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ اس واقعے کے مکمل بیک گراونڈ سے آگاہ ہو جائیں اور کہانی سمجھنے میں آپ کو کوئی مشکل نہ پیش آئے۔ تیمور بھائی کے واپس چلے جانے کے بعد آپا اور بچے سکون سے اپنے چھ سو گز پر بنے آراستہ بنگلے میں رہ رہے تھے۔ میری دونوں بھانجیاں مریم اور سارہ جو اس وقت بالترتیب بارہ اور دس سال کی تھیں پابندی سے اسکول جیا تی تھیں۔ آپا لندن میں وقت گزاری کے لیے جاب کیا کرتی تھیں، اسی لیے جب یہاں بھی دن بھر گھر میں پڑے پڑے اکتا گئیں تو اپنا دل لگانے کے لیے گھر کے وسیع لان میں باغبانی شروع کردی اور جگہ جگہ خوبصورت پھولوں سے آراستہ کیاریاں بنا ڈالیں، خاص طور پر گلاب کی کیاری پر تو انہوں نے خوب محنت کی تھی اور اعلیٰ قسم کے گلاب کے پودے منگوا کر یہاں لگوائے تھے۔ دو ماہ بعد ہی ابو کے ایک قریبی دوست کی وساطت سے انہوں نے ایک پرائیویٹ فرم بھی جوائن کرلیا، بچیوں کی پریشانی نہیں تھی کیونکہ سسر صاحب نے اپنی ایک پرانی اور قابلِ اعتبار ملازمہ کو آپا کے گھر بھیج دیا تھا۔ وہ ملازمہ جسے سب بوا کہتے تھے نہایت شریف اور نیک عورت تھی۔ پنج وقتہ نمازی ہونے کے ساتھ ساتھ دم درود بھی کیا کرتی تھی اور مالکن کے ساتھ رہ رہ کر ذائقے دار کھانے پکانے میں بھی طاق ہو چکی تھی۔ بچیاں اسکول سے واپس آتیں تو نہانے دھونے سے فارغ ہو کر گرم گرم کھانا کھا کر سو جاتیں اور جب اٹھتیں تو آپا کو شام کی چائے پر ہنستا مسکراتا موجود پاتیں۔

میری بڑی بھانجی مریم اس وقت ساتویں جماعت کی طالبہ تھی اور مجھ سے سب سے زیادہ قریب تھی۔ اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی مشکل وہ مجھے بتاتی اور میں اسے حل کرنے کی پوری پوری کوشش کرتی، اکثر ہم دونوں گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھیں۔ وہ مجھے عینی خالہ کہہ کر پکارتی تھی اور اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتی تھی۔ ابھی ان لوگوں کو مکان میں رہتے ہوئے دو ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک مریم کا وزن تیزی سے کم ہونے لگا اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے شروع ہو گئے۔ آپا نے شروع میں خاص توجہ نہ دی اور ماحول کی تبدیلی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے اسے پھل اور دودھ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی تاکید کی۔ ڈاکٹر نے بھی دو تین ضروری ٹیسٹ کر کے اسے کلیئر قرار دیا اور چند طاقت کی دوائیں لکھ کر فارغ کر دیا۔ تیمور بھائی نے اسے باپ سے دوری پر محمول کیا اور دونوں بچیوں کے لیے ڈھیر ساری... چاکلیٹس بھجوائیں لیکن مریم دن بدن گھن لگی لکڑی کی طرح سوکھ رہی تھی جبکہ وہ ڈاکٹر کی دی ہوئی دواؤں کا بھی .... پابندی سے استعمال کر رہی تھی۔

کچھ دنوں سے مریم بالکل خاموش ہو گئی تھی اور اکثر سر درد کی شکایت کرتی تھی۔ آپا نے آئی اسپیشلسٹ کو دکھایا تو اس نے ہلکے نمبر کا چشمہ بنا کر دے دیا۔ مریم کی خاموشی مجھے بہت کھل رہی تھی کیونکہ میں اسے بہت قریب سے جانتی تھی اور اس کی مزاج آشنا تھی۔ کئی بار مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر گھبرا کر چپ ہو جاتی، اس کی آنکھوں میں مسلسل ڈر اور ویرانی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ وہ لڑکی جو ہر وقت ملے گلے اور موج مستی کی شوقین تھی اچانک گھٹ کر رہ گئی تھی اور کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح برتاؤ کرنے لگی تھی۔ یہ سب کچھ نہ صرف حیران کن تھا بلکہ بہت حد تک پریشان کن بھی تھا۔ آپا بھی مریم کے اس بدلے ہوئے رویئے سے پریشان تھیں اور تیمور بھائی کو جلد از جلد واپس آنے پر زور دے رہی تھیں۔

ایک دن سارہ نے بتایا کہ مریم روز رات کو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے، یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ آپا نے چوکیدار کو سختی سے ہدایت کردی کہ وہ کسی صورت مریم کو گیٹ سے باہر نہ جانے دے اور دونوں بچیوں کو اپنے کمرے میں بیڈ پر ساتھ سلانے لگیں لیکن دوسری ہی رات مریم نے نیند نہ آنے کا بہانہ کیا اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ سارہ نے کمرے میں واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے وجہ یہ بتائی کہ اب اسے مریم سے ڈر لگنے لگا ہے کیونکہ اکثر مریم اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے گھنٹوں ایک ہی جانب تکا کرتی ہے اور کبھی کبھار تو اس نے مریم کو خود سے باتیں کرتے بھی دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپا یہ ساری باتیں سن کر پریشان ہو گئیں، انہوں نے تیمور بھائی سے مشورہ کر کے مریم کو ایک نامور سائیکا ٹرسٹ کو دکھانے کی ٹھانی۔ انہوں نے اگلے ہی دن اپائنٹمنٹ لے لیا اور مریم کے سیشنز ہونے لگے۔ سائیکاٹرسٹ نے تسلی کروائی کہ ماحول اور اسکول کی... اچانک تبدیلی نیز دوستوں کا ساتھ چھوٹنے کو مریم کی حساس طبیعت نے قبول نہیں کیا اور وہ ڈپریشن میں چلی گئی اسی لیے وہ وقتی طور پر ایسا برتاؤ کر رہی ہے جو زیادہ حیرت انگیز بات

نہیں ہے۔اس نے یقین دہانی کروائی کہ باقاعدہ علاج اور دواؤں سے یہ ڈپریشن ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

مریم کا علاج جاری تھا اور آپا بھی اس کے علاج سے مطمئن تھیں۔تیمور بھائی کو واپس گئے اور آپا کو اس بنگلے میں شفٹ ہوئے پانچ ماہ گزر چکے تھے۔انہی دنوں گھر میں عجیب وغریب واقعات جنم لینے لگے مثلاً چیزوں کا اپنے آپ غائب ہو جانا اور تھوڑی دیر بعد واپس اپنی جگہ پر موجود ہونا، پورے بنگلے کی گھڑیاں بھی چلتے چلتے رک جاتیں اور تھوڑی دیر بعد خود سے چل پڑتیں۔حیرت انگیز بات یہ تھی کہ چاہے وہ دو گھنٹے بعد ہی چلیں لیکن وقت بالکل ٹھیک بتاتیں تھیں۔کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھے رکھے اچانک غائب ہو جاتیں اور پھر ان کا کچھ اتا پتا نہ ملتا، بوا کی وفاداری پر شک کرنا بیکار تھا اور سوال یہ تھا کہ بوا کھانے پینے کا سامان چرا کر کرتیں بھی کیا؟ کیونکہ دنیا میں ان کا ایک بیٹی کے سوا کوئی نہ تھا اور وہ بھی کوسوں دور نوابشاہ میں رہتی تھی۔ایک مرتبہ آپا نے ہم سب کو رات کے کھانے پر بلایا اور قورمہ تیار کرنے کے لیے چوکیدار سے دو کلو چکن منگوائی، چوکیدار نے چکن لا کر دی تو آپا نے اسے دھو کر سنک میں رکھ دی اور خود فون سننے کے لیے لاؤنج میں آگئیں جو کچن کے بالکل سامنے ہی ہے یعنی اگر کوئی کچن میں جاتا ہے تو اسے لاؤنج سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔آپا نے بتایا کہ وہ کچن کے سامنے ہی بیٹھی تھیں اور اس دوران میں نہ کوئی کچن کے اندر گیا تھا اور نہ باہر آیا تھا لیکن فون سننے کے بعد جب وہ کچن میں گئیں تو دو کلو چکن ایسے غائب تھی جیسے انہوں نے کبھی رکھی ہی نہ تھی، حد تو یہ ہے کہ چکن کو دھونے کے دوران جو آلائشیں اور چھیچھڑے انہوں نے الگ سے ایک تھیلی میں باندھ کر رکھ دیئے تھے وہ تھیلی بھی غائب تھی۔امی انھیں ڈھارس بندھاتی رہتی تھیں کہ یہ سب وقتی... پریشانیاں ہیں۔درحقیقت امی بھی سمجھ چکیں تھیں کہ یہ ساری آسیبی کارروائیاں ہیں مگر آپا کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے وہ جھوٹی تسلیاں دیتی تھیں۔

اسی دوران میں سردیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو آپا نے مجھے رہنے کے لیے اپنے گھر بلوالیا، مجھے خود بھی مریم کے ساتھ باتیں کیے بہت عرصہ ہو گیا تھا چنانچہ میں ایک ہفتے کے لیے آپا کے گھر رہنے آگئی۔میری توقع کے برخلاف مریم نے مجھ سے مل کر کسی خوشی کا اظہار نہ کیا اور سلام کر کے کمرے میں چلی گئی۔آپا نے بتایا کہ آج کل وہ ایسی ہی ہو گئی ہے اور زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہنا ہی پسند کرتی ہے۔یہ سب میرے لیے بہت افسوسناک تھا لیکن جلد ہی میں سارہ اور آپا کے ساتھ باتوں میں محو ہو گئی اور مریم کا سرد رویہ میرے ذہن سے فرو ہو گیا۔

اگلی صبح میری آنکھ دس بجے کھلی۔آپا آفس جا چکیں تھیں اور بچیاں اپنے کمروں میں سو رہی تھیں۔سارا گھر... بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔پچھلے دو روز سے بوا بھی اپنی بیٹی کے یہاں نوابشاہ گئی ہوئی تھیں جس کے یہاں کسی بھی وقت ننھے مہمان کی آمد متوقع تھی۔میں کچھ دیر تو بستر پر کسلمندی سے پڑی رہی پھر اٹھ کر ناشتا بنانے کا سوچا۔اپنی سوچ پر فوراً عملدرآمد کرتے ہوئے میں نے بستر چھوڑا اور باتھ روم سے فارغ ہو کر کچن کی راہ لی۔میرا ارادہ تھا کہ آج بچیوں کو ان کے پسندیدہ ناشتے کا سرپرائز دوں۔ناشتا تیار کر کے پہلے میں نے سارہ کو اس کے کمرے میں جا کر جگایا پھر مریم کے کمرے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہو گئی۔اس وقت مریم جاگ چکی تھی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے میں محو تھی۔مریم کو مصروف دیکھ کر مجھے شرارت سوجھی اور میں نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر اسے "ہاؤ" کی آواز نکالتے ہوئے کمر سے دبوچ لیا۔میں یہ امید کر رہی تھی کہ مریم ڈر کے مارے اچھل پڑے گی اور عینی خالہ کہہ کر میرے پیچھے لپکے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔مریم اسی پوزیشن میں ساکت کھڑی باہر دیکھتی رہی، میں نے حیرت زدہ ہو کر اس کی کمر چھوڑی اور آگے بڑھ کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا، وہ کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی رہی۔میں نے گھبرا کر اسے آواز دی تو اس نے ویسے ہی کھڑے کھڑے ہلکی سی گردن گھمائی اور میری جانب دیکھا۔اس وقت مریم کی آنکھیں زندگی سے بالکل خالی تھیں، میں یہ کہنے میں عار محسوس نہیں کروں گی کہ مجھے مریم کی آنکھوں پر کسی مُردے کی اَدھ کھلی آنکھوں کا گمان ہوا، بے نور اور احساسات سے عاری! بس یہ احساس چند لمحوں کے لیے تھا پھر اس کی آنکھوں میں زندگی واپس لوٹ آئی اور وہ مسکرا کر بولی۔"آپ چلیں عینی خالہ، میں بس دو منٹ میں ناشتے کے لیے آتی ہوں۔ویسے بھی آپ کے ہاتھ کے بنے اسپیشل آملیٹ کو چکھے بہت دن گزر گئے ہیں۔"

مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا جیسے اس نے کوئی غلط بات.... کہہ دی ہو۔میں مزید کوئی بات کیے بغیر اس کے کمرے سے نکل آئی لیکن کوئی بات مجھے کھٹک رہی تھی اور میری توجہ

مانگ رہی تھی۔

بچیوں نے ناشتا ختم کیا تو میں نے ان دونوں کے لیے کافی تیار کی اور ڈی وی ڈی پر مووی لگانے کا اعلان کیا۔ سارہ تو خوشی سے اچھل پڑی اور فوراً میرے ساتھ لاؤنج میں آ گئی لیکن مریم سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے مووی لگائی اور سارہ کے ساتھ کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ جو مجھے صبح سے پریشان کیے ہوئے تھی اب وقتی طور پر میرے ذہن سے ہٹ گئی تھی۔ مووی دیکھتے دیکھتے میرا ایک پاس پڑی پانی کی بوتل پر لگا تو وہ لڑھکتی ہوئی صوفے کے نیچے چلی گئی جسے اٹھانے کی زحمت نہ میں نے کی اور نہ ہی سارہ اٹھی کیونکہ مووی اپنے کلائمکس پر تھی۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد مووی ختم ہو گئی تو کاؤچ سے اٹھتے اٹھتے مجھے بوتل اٹھانے کا خیال آیا، میں نے جمائی لیتے ہوئے صوفے کے نیچے ہاتھ بڑھایا لیکن میرا ہاتھ ویسے ہی فضا میں بلند رہ گیا اور حیرت کی زیادتی سے جمائی کے لیے کھلا ہوا منہ ویسے ہی کھلا رہ گیا کیونکہ بوتل اپنی جگہ یعنی میرے پیروں کے پاس موجود تھی جبکہ نہ صرف میں نے بلکہ سارہ نے بھی اسے لڑھک کر صوفے کے نیچے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے اس طرح حیرت کا بت بنا دیکھ کر سارہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جب اس نے بوتل کی جانب دیکھا تو ایک لمحے کے لیے وہ بھی ٹھٹک گئی پھر بے پروائی سے کاندھے اُچکا کر بولی۔ ''آپ پریشان مت ہوں عینی خالہ، جب سے مریم بیمار ہوئی ہے گھر میں اس قسم کے واقعے ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

ایک دَم سے میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور جو چیز صبح سے میرے خیالوں میں کلبلا رہی تھی میرے سامنے آ گئی۔ صبح جب میں مریم کے کمرے میں گئی تھی تو میں نے اسے اپنی آمد کی وجہ نہیں بتائی تھی لیکن اس نے یہ کیسے جانا کہ میں اسے ناشتے پر بلانے آئی ہوں اور اس نے خاص طور سے میرے بنائے ہوئے اسپیشل آملیٹ کا ذکر کیا جبکہ وہ تو صبح سے اپنے کمرے میں تھی۔ سوال یہ تھا کہ اسے کس نے بتایا کہ آج میں نے اس کے لیے اس کی پسند کا ناشتا تیار کیا ہے؟

آپا اور سارہ نے بے حد اصرار کر کے مجھے راضی کر لیا تھا کہ جب تک بچیوں کی چھٹیاں چل رہی ہیں میں آپا کے یہاں ہی رُکوں اور ان کے اسکول کھلنے کے بعد ہی اپنے گھر کی راہ لوں۔ وقت بہت مزے میں گزر رہا تھا، مجھے آپا کے گھر آئے ہوئے دس روز گزر چکے تھے اور سوائے پہلے دن کے تلخ تجربوں کے بعد ایسا کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں ہوا تھا۔ میں، آپا اور سارہ راتوں کو دیر تک جاگ کر باتیں کرتیں، کبھی کبھار مریم بھی ہمارے ساتھ ایک خاموش سامع کی صورت میں شامل ہو جاتی لیکن وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کا علاج جاری تھا اور سائیکاٹرسٹ نے بھی اس کے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی سے منع کیا تھا اسی لیے جب وہ کمرے میں جانا چاہتی تو ہم میں سے کوئی اعتراض نہ کرتا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ اچانک ایک واقعے نے مجھے اور گھر والوں کو دہلا کر رکھ دیا۔

مجھے آپا کے گھر میں رہتے ہوئے بارہواں دن تھا۔ سارہ کو دو دن سے فلو کی شکایت تھی چنانچہ وہ اپنے کمرے میں دوا کھا کر سو رہی تھی۔ مریم بھی اپنے کمرے میں تھی جبکہ آپا اپنی سہیلی کی شادی میں گئی ہوئی تھیں، وہ ہم سب کو بھی لے جانا چاہ رہی تھیں لیکن سارہ اپنی طبیعت خرابی کی بناء پر تیار نہیں ہوئی اور مریم کی حالت فی الحال ایسی نہیں تھی کہ اسے اس قسم کی تقریبات میں لے جایا جاتا، میں بھی طبیعتاً کچھ تنہائی پسند واقع ہوئی ہوں اسی لیے خوشی خوشی بچیوں کے ساتھ رکنے کو تیار ہو گئی۔ پہلے دن پیش آنے والے واقعات میرے ذہن سے مکمل طور پر محو ہو چکے تھے اور میں نے اپنے ذہن کو مختلف وضاحتیں دے کر خود کو بڑی حد تک مطمئن بھی کر لیا تھا۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل ہو گا جب میں کھانا کھا کر فارغ ہوئی اور اپنے لیے گرما گرم کافی بنا کر لاؤنج میں آ گئی۔

دسمبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا اور سردی اپنے جوبن پر تھی۔ میں کچھ دیر تک تو صوفے پر بیٹھی کافی پیتے ہوئے رات کے سناٹے کو انجوائے کرتی رہی پھر تھوڑی دیر بعد اُکتا کر ٹی وی چلا لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس وقت ایک دلچسپ پروگرام دیکھنے میں مصروف تھی کہ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں انجانی سی ٹھنڈک اترتی محسوس ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے برف کوٹ کر بھر دی ہو، میں نے جُھرجُھری لے کر کھڑکی کی جانب دیکھا تو وہ بند تھی۔ مجھے کچھ غیر معمولی سا احساس ہونے لگا، آہستہ آہستہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور چھٹی حس چیخ چیخ کر کسی خطرے کی جانب اشارہ کرنے لگی۔ میں نے گھبرا کر گھڑی کی جانب دیکھا اس وقت سوا بارہ بج رہے تھے۔ اس زمانے میں موبائل فون کا استعمال اتنا عام نہیں ہوا تھا اسی لیے آپا سے رابطہ کی صورت ممکن نہیں تھا۔

اچانک میری داہنی جانب سے ایک سایہ سا گزرا اور

ساتھ ہی باہر کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ مریم تھی کیونکہ وہ راتوں کو اکثر گھر میں ٹہلا کرتی تھی لیکن آج تو اس نے حد ہی کر دی کہ گھر کا دروازہ کھول کر اتنی سردی میں باہر نکل گئی۔ میں کچھ غصے اور پریشانی کے ملے جلے جذبات لیے تیزی سے ۔۔۔ مریم کے پیچھے لپکی۔ دروازہ کھولتے ہوئے مجھے حیرت کا جھٹکا لگا جب میں نے اسے اندر سے بند پایا، بہرحال میں رُکی نہیں کیونکہ میں نے پورے۔۔۔ ہوش وحواس میں سائے کو باہر کی جانب جاتے دیکھا تھا اور دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی صاف آواز بھی سنی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی ٹھنڈی، برفیلی ہواؤں نے میرا استقبال کیا۔ میں نے شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور لان میں نظریں دوڑائیں۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا اور آخری تاریخوں کا چاند بھی بہت پہلے ہی سردی سے ٹھٹھر کر دم توڑ چکا تھا۔ اچانک مجھے گلاب کی کیاری کے پاس مریم نظر آئی۔ وہ کیاری کے پاس کھڑی ہوا میں ہاتھ ہلا ہلا کر کسی نادیدہ ہستی سے باتیں کر رہی تھی۔ جس چیز نے مجھے پریشانی میں مبتلا کیا وہ یہ تھی کہ اتنی سخت سردی کے باوجود وہ اپنی ہلکی سی سلیولیس نائٹی پہنے، ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر سردی سے بے نیاز کھڑی تھی۔ میرے ذہن میں جو خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا وہ یہ تھا کہ۔۔۔ بیماری کے باعث مریم پہلے ہی بہت کمزور ہو چکی تھی اور اس طرح کی بے پروائی اس کے لیے سنگین ثابت ہو سکتی تھی۔

اس خیال کے آتے ہی میں دیوانہ وار اس کی طرف دوڑی لیکن اس کے قریب پہنچ کر نجانے کیا ہوا کہ میں ٹھٹک کر رک گئی۔ کچھ عجیب سا احساس تھا، جیسے میرے پاؤں زمین نے پکڑ لیے ہوں یا وہ لوہے کے بنے ہوں اور زمین نے کسی مقناطیس کا کردار کرتے ہوئے انہیں روک لیا ہو۔ میں۔۔ چاہنے کے باوجود بھی اپنی جگہ سے جنبش کرنے سے قاصر تھی۔ ٹھٹھرتی سردی کے باوجود میرا پسینا بہہ نکلا تھا اور میں شدید خوف کے عالم میں پوری جان سے لرز رہی تھی۔ اچانک مریم نے میری جانب رُخ موڑا اور آہستہ روی سے میری طرف قدم بڑھانے لگی۔ دیوار کے پاس لگے ساٹھ واٹ کی ہلکی زرد اور ٹمٹماتی روشنی میں مجھے مریم کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے نقوش بگڑے ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ۔۔۔ مناسب ہوگا کہ وہ مریم کا چہرہ تھا ہی نہیں بلکہ کسی خبیث مخلوق کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ اگر بے دردی سے میری گردن بھی کاٹ دی جاتی تو خون کا ایک قطرہ تک نہ نکلتا۔ وہ میرے بالکل نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے بالوں کو چہرے پر سے ہٹا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُف! آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ رات کے سناٹے والا بھیانک منظر میری آنکھوں میں مقید ہے بلکہ میں تو حیران ہوں کہ اس رات ڈر اور خوف کی زیادتی سے میری حرکتِ قلب کیسے نہ بند ہو گئی؟ مریم کی آنکھیں کسی بھی طرح انسانی آنکھیں کہلائے جانے کے قابل نہیں تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھیں جو اس وقت انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں! مریم نے مجھے شانوں سے پکڑا اور جھنجوڑتے ہوئے زور سے غرائی۔ ”مجھے اکیلا چھوڑ دو!!!“ اس کے ساتھ ہی اس کمزور سی لڑکی نے مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ میں کسی فٹبال کی طرح اڑتی ہوئی گیٹ کے سامنے جا گری جو کم سے کم بھی دس قدم دور تھا۔ فرش سے ٹکراتے ہی میں جیسے ٹرانس کی کیفیت سے نکل آئی اور اس کے ساتھ ہی میری دلدوز چیخوں سے گھر کے در و دیوار لرز اٹھے۔ رات کے وقت آپا کی ہدایت کے مطابق چوکیدار گیٹ سے باہر کرسی ڈال کر بیٹھا کرتا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے آخری منظر جو میری آنکھوں نے دیکھا وہ گیٹ سے اندر داخل ہوتی آپا کی گاڑی تھی اور ساتھ چوکیدار کے دوڑتے قدموں کی آواز بھی آ رہی تھی۔

اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے پایا۔ امی اور آپا بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ امی پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں جبکہ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور امی اس طرح میرے پاس کیوں بیٹھی ہیں۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو آپا نے فوراً میرے پیچھے تکیے کا سہارا لگا دیا۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور شدید نقاہت ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے سر کے پچھلے حصے پر ہلکا سا دباؤ محسوس کیا تو بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اس جگہ چھوا، وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اچانک۔۔۔ چھونے سے ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی تو میں نے سوالیہ نظروں سے امی کی جانب دیکھا جو ابھی تک خاموش بیٹھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میری نظروں میں موجود سوال کو پڑھ کر امی نے کہا۔ ”کچھ نہیں، ہلکی سی چوٹ آئی ہے۔ ڈاکٹر نے پٹی کر دی ہے اور کل تک یہ پٹی بھی ہٹ جائے گی۔“

جبکہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امی کیا بول رہی ہیں، میں تو آپا کے گھر میں تھی پھر اپنے گھر کیسے پہنچ گئی اور سر

پر چوٹ کیسے لگی؟ یہ سارے سوال میرے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ اسی اثناء میں کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے مریم اور سارہ کو ایک ساتھ اندر آتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی گزشتہ رات کا واقعہ میری نظروں کے سامنے کسی فلم کی مانند چل پڑا۔ میں نے خوفزدہ نظروں سے مریم کی طرف دیکھا جو فکرمندی کے تاثرات لیے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اس پر کسی خبیث مخلوق کی پرچھائی تک محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہی معصومیت جو اس کی فطرت کا خاصہ تھی اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور امی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

شام تک خاندان والے ملنے کے لیے آتے رہے۔ ان لوگوں کی ہی زبانی مجھے علم ہوا کہ میں پورے تین روز شدید بخار میں پھنکنے کے بعد آج ہوش میں آئی تھی۔ ان کے مطابق میں آپا کے گھر میں سیڑھیوں سے گر گئی تھی جس کی وجہ سے میرا سر پھٹ گیا تھا اور پانچ ٹانکے آئے تھے اور اسی کے نتیجے میں مجھے تیز بخار چڑھ گیا۔

میں سمجھ گئی کہ گھر والوں نے سب کو میری اس حالت کے بارے میں یہی بتایا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی وہ بھی اصل قصے سے آگاہ نہیں تھے اور متجسس تھے کہ میں انھیں بتاؤں لیکن میری حالت کے پیشِ نظر امی نے فی الحال سب کو منع کر دیا تھا۔

دو روز بعد میری حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی اور میں بات کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ سر پر لگی ہوئی چوٹ کا درد بھی اب قابلِ برداشت تھا اور مجھے مسلسل چکر آنے بھی بند ہو گئے تھے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر امی، آپا اور بھائی میرے ساتھ ہی کمرے میں آگئیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے مجھے آہستہ آہستہ موضوع کی طرف لانے لگیں۔ میں ان کے ارادے پہلے ہی بھانپ چکی تھی اسی لیے اپنے خیالات مجتمع کر کے بڑی مشکلوں سے اٹکتے اٹکتے میں نے اپنے اوپر گزرنے والے دہشت ناک واقعے سے انھیں آگاہ کر دیا۔ پورا قصہ جان لینے کے بعد کتنی ہی دیر تک کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ امی، آپا اور بھائی میری جانب پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے مجھ میں ہی اس خبیث چہرے کو تلاش کر رہی ہوں۔ اس سکوت کو آپا کی ایک زوردار سسکاری نے توڑا اور وہ زار و قطار روتی ہوئیں امی سے لپٹ گئیں، وہ صرف ایک ہی بات دُہرا رہی تھیں۔

"امی، میری بچی کو کیا ہو گیا؟ اس کو بچالیں۔"

آپا کی حالت کو دیکھ کر ہم سب بھی رو رہی تھیں لیکن مسئلے کا حل کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اب تک ہم جسے نفسیاتی مسئلہ سمجھے بیٹھے تھے، یک لخت اس نے ایک ڈرامائی موڑ لے لیا تھا اور آسیبی رخ اختیار کر گیا تھا۔

چند دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔ اس دوران آپا نے رو رو کر تیمور بھائی کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا اور فوری طور پر واپس بلوا لیا۔ آپا نے نوکری بھی چھوڑ دی تھی اور دن رات سائے کی طرح مریم کے پیچھے لگی رہتی تھیں۔ اس دوران کئی عاملوں سے بھی رابطہ کیا لیکن کوئی بھی اطمینان بخش علاج نہ کر سکا۔ مریم کی حالت اب اور بگڑتی جارہی تھی، اکثر وہ صبح اٹھتی تو اس کی کہنیاں چھلی ہوئی ہوتیں یا اس کے پیٹ یا کمر کے آس پاس خراشوں کے نشانات ہوتے جن کی وجوہات سے وہ قطعی لاعلم ہوتی۔ اس میں ایک اور حیرت انگیز تبدیلی یہ آئی تھی کہ وہ کسی پہلوان کی طرح کھانے لگی تھی۔ ناشتے میں پانچ انڈے اور تین گلاس دودھ پی کر بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی، کھانا کھانے پر آتی تو کھاتی چلی جاتی اور چھ روٹیاں کھا کر بھی مزید بھوک کی شکایت کرتی۔ آپا اور تیمور بھائی اسے لیے لیے ڈاکٹروں کے پاس پھرتے لیکن کوئی بھی ڈاکٹر علاج تو در کنار وجہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ بوا بھی اپنی بیٹی کے یہاں سے واپس لوٹ چکی تھیں اور مریم کی بدلی ہوئی حالت کو تشویشناک نظروں سے دیکھتی تھیں۔ ایک دو بار انہوں نے آپا کو دبے دبے لفظوں میں بتانے کی کوشش بھی کی کہ وہ ایک نیک بزرگ کو جانتی ہیں جن کے ہاتھوں کئی آسیبی امراض میں مبتلا مریضوں کو افاقہ ہوا ہے لیکن آپا نے ان کی بات پر اتنی توجہ نہ دی۔

وقت کے ساتھ ساتھ مریم کا اسکول بالکل ہی چھوٹ گیا اور وہ حد سے زیادہ بدمزاج اور چڑچڑی ہوتی چلی گئی۔ بس سارا دن اپنے کمرے میں کھڑکی کھولے کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتی رہتی۔ اس کا طبی علاج جاری تھا اور اس دوران ہی گھر میں موجود افراد کے ساتھ کچھ عجیب و غریب واقعات ظہور پذیر ہونے لگے۔ مثلاً سارہ نے کئی بار شکایت کی کہ کوئی اس کی کپڑوں کی الماری میں سوکھے ہوئے پتے اور کوڑا کرکٹ ڈال جاتا ہے۔ تیمور بھائی لندن سے آتے ہوئے لکڑی کا خوبصورت سا فریم لیتے ہوئے آئے تھے جس میں انہوں نے اپنی فیملی کی تصویر لگوا کر بڑے شوق سے اپنے بیڈروم

میں ٹانگی تھی۔ ایک دن آپا اس تصویر کے نیچے بیٹھی کپڑے تہہ کر رہی تھیں کہ انہیں لگا جیسے تیمور بھائی انہیں دوسرے کمرے سے آواز دے رہے ہوں، وہ ان کی بات سننے جیسے ہی کھڑی ہوئیں وہ بھاری بھرکم فریم ان کی پیٹھ کو چھوتا ہوا فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوئی... ہوتی تو وہ فریم آپا کا سر کچل دیتا۔

آپا نے ڈرائنگ روم میں بڑے شوق سے ایک بڑا سا ایکوریم سیٹ کروایا تھا جس میں پچیس کے قریب قیمتی اور نایاب مچھلیاں اپنی بہار دکھاتی تھیں، کوئی بھی گھر آنے والا اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ خود آپا اسے اپنا قیمتی اثاثہ قرار دیتی تھیں اور روزانہ اپنے ہاتھوں سے اس کی صفائی ستھرائی کرتی تھیں۔ ایک دن بوا جھاڑو دینے ڈرائنگ روم میں گئیں اور دو منٹ بعد ہی ان کی چیخوں کی آوازیں سن کر تمام گھر والے پریشان ہو گئے۔ جب یہ لوگ ڈرائنگ روم میں پہنچے تو ایک دلخراش منظر ان کا منتظر تھا۔ صاف و شفاف ایکوریم اپنی جگہ پانی سے بھرا ہوا موجود تھا، نہ کہیں سے ٹوٹا تھا اور نہ ہی اس کا ڈھکن ہٹا ہوا تھا لیکن اس کے اندر ایک بھی مچھلی موجود نہ تھی بلکہ ساری مچھلیاں ڈرائنگ روم کے فرش پر بے جان پڑی تھیں۔ سب سے اندوہناک بات یہ تھی کہ ان کی لاشیں کٹی پھٹی تھیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بلی یا تیز دانتوں والے جانور نے ایک ایک مچھلی کو چبا کر پھینک دیا ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ جانور آیا کہاں سے؟ گھر تو ہر طرف سے بند تھا اور مچھلیاں خود بخود تو باہر نہیں نکل سکتیں۔ مزید یہ کہ اگر یہ واقعی کسی جانور کی کارروائی ہوتی تو ایکوریم کا ڈھکن ہٹا ہوا ہوتا، آس پاس کچھ ہلچل کے آثار نظر آتے لیکن ڈرائنگ روم بالکل سلیقے سے جما ہوا تھا، یہاں تک کہ اس کی... کھڑکیاں تک بند تھیں۔ سارے گھر والے چکرا کر رہ گئے۔ آپا کو تو اتنا صدمہ ہوا کہ تین دنوں تک انہوں نے کچھ نہ کھایا پیا اور مسلسل روتی رہیں۔

ان سارے واقعات سے ہٹ کر گھر والوں کو اکثر شام کے اوقات میں یا دوپہر کے وقت کسی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آتی تھی جبکہ آس پڑوس میں کسی کے گھر چھوٹا بچہ موجود نہ تھا بلکہ گھر کے دونوں طرف کے پلاٹ خالی پڑے تھے۔ گھر کے پیچھے تھوڑی دور تک جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جو جنگلی اور آوارہ کتوں کا مسکن تھیں نیز گھر کے سامنے ایک فرلانگ فٹ چوڑی سڑک تھی جس کی پرلی طرف تین مکان ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔ جس میں سوائے کونے والے گھر کے سب میں لوگ آباد تھے۔ آپا کے سب سے بہت اچھے مراسم تھے اور آنا جانا بھی ہوتا تھا۔ تیمور بھائی کی غیر موجودگی میں سب نے ان کا بہت خیال رکھا تھا۔

آپا کے سسر بھی شام کو اکثر ٹہلتے ہوئے ان کے گھر آجایا کرتے تھے۔ تیمور بھائی نے اس خیال سے کہ وہ... پریشان ہوں گے ابھی تک مریم کی بیماری اور گھر میں رونما... ہونے والے پراسرار واقعات کا ان کے سامنے ذکر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کئی بار مریم کے رویئے میں تبدیلی اور زرد پڑتی ہوئی... رنگت کے بارے میں استفسار بھی کیا لیکن تیمور بھائی اور آپا نے سرسری سا بتا کر ٹال دیا۔ ایک شام وہ ٹہلتے ہوئے آپا کے گھر کی جانب آرہے تھے۔ دھیان میں رہے کہ ان کا گھر آپا کے گھر کے پیچھے تھا اسی لیے ان کو آنے کے لیے جھاڑیوں والا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا جو ایک چھوٹی سی سڑک سے ملحق تھا۔ مغرب کی اذان میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا کہ ان کی نظر ایک کالے رنگ کے جسیم کتے پر پڑی جو حیرت انگیز طور پر پندرہ فٹ اونچی آپا کے گھر کی باؤنڈری وال پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس چیز نے انہیں ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا وہ سڑک پر بنتا اس جسیم کتے کا سایہ تھا جو درحقیقت ایک عورت کا سایہ تھا۔ انہوں نے اپنے آس پاس نگاہ دوڑائی، دور دور تک سڑک خالی پڑی تھی۔ آس پاس محلے والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں مگر کسی انسان کا وجود نہ تھا۔ وہ آگے بڑھے تا کہ سائے کو بغور دیکھ سکیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ واقعی ایک عورت کا ہی سایہ تھا جو باؤنڈری وال پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ انہوں نے حیرت سے کتے کی جانب دیکھا تو وہ ان کو اپنی جانب دیکھتا پا کر خونخوار انداز میں بھونکا اور گھر کے اندر کود گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے اور ایک نظر جھاڑیوں پر ڈالی کہ اس میں کوئی عورت تو نہیں ہے لیکن وہاں چند آوارہ کتے بیٹھے سستا رہے تھے۔ اس کالے کتے کے گھر میں کود جانے کے بعد سڑک پر بنتا عورت کا سایہ بھی چلا گیا تھا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے گھر کے مین گیٹ تک پہنچے اور گھبراہٹ میں بیل بجانے کی بجائے... زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگے۔ چوکیدار کے گیٹ کھولتے ہی وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئے اور اس کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر گھر کے پچھواڑے کی طرف بھاگے جہاں وہ بھیانک کتا کودا تھا۔ تیمور بھائی بھی یہ شور و غل سن کر گھر سے باہر آگئے تھے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ بھی اپنے

والد کے پیچھے دوڑ پڑے۔ جب وہ ان کے پیچھے پہنچے تو ان کو وہاں حیران پریشان کچھ ڈھونڈتا ہوا پایا، ساتھ ہی ساتھ وہ چوکیدار کو بھی ڈانٹ رہے تھے کہ وہ ٹھیک سے گھر کی رکھوالی نہیں کرتا ہے۔

تیمور بھائی نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو اس نے بے چارگی سے کندھے اچکا کر واقعے سے لاعلم ہونے ۔۔۔ کا اعتراف کیا۔ ان کے سوال کرنے پر جب والد صاحب نے انھیں کتے کے گھر میں کودنے کا واقعہ سنایا تو چوکیدار اور تیمور بھائی نے بے اختیار باؤنڈری وال کی جانب دیکھا اور پھر بے یقینی سے والد صاحب کی جانب دیکھا کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ کوئی کتا بغیر کسی سہارے کے پندرہ فٹ اونچی دیوار پھاند لے۔ ان دونوں کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر ان کے والد صاحب تھوڑا خفا ہو گئے اور اپنے ہوش و حواس میں ۔۔۔ ہونے کا دعویٰ کرنے لگے اور پورا قصہ جزئیات کے ساتھ سنا دیا۔

چوکیدار تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب سنتا رہا اور پورا قصہ سن کر اپنے گال پیٹنے لگا جبکہ تیمور بھائی یہ سن کر سوچ میں پڑ گئے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد تیمور بھائی نے اپنے والد کے سامنے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات اور پریشانیاں تفصیل سے بیان کر دیں۔ اس دوران ان کے والد کسی گہری سوچ میں گم رہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ اگلے دن آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ تیمور بھائی اور آپا کو ان کا رویہ کچھ عجیب سا لگا کیونکہ وہ ہمیشہ رات کا کھانا کھا کر ۔۔ چائے پیتے تھے اور کچھ دیر تک باتیں کر کے رات گیارہ بجے تک اٹھتے تھے تو تیمور بھائی انھیں اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑ آتے تھے لیکن آج وہ نو بجے ہی اٹھ گئے تھے اور جانے سے پہلے مریم کو اپنے پاس بٹھا کر دیر تک اس پر کچھ پڑھ پڑھ کر دَم کرتے رہے اور اس کی انگلیوں کو بار بار ناک کے قریب لا کر زور زور سے سونگھتے رہے۔ سارہ نے ان سے لاڈ کرنے کی کوشش کی تو اسے جھڑک کر دور بٹھا دیا۔

اس کے اگلے دن ہم لوگ آپا کے گھر دوپہر کے کھانے پر گئے۔ یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ آپا کے گھر میں خود پر بیتے وحشت ناک واقعے کے بعد یہ پہلی مرتبہ تھا جو میں آپا کے گھر ان کے بے حد اصرار پر آنے کو راضی ہوئی تھی۔ اس بات کو گزرے پانچ ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا لیکن میرا یہ عالم تھا کہ رات کو امی کے ساتھ سوتی تھی، باتھ روم جاتے ہوئے کسی کو دروازے کے باہر کھڑا رکھتی تھی، کبھی پتا بھی زور سے کھڑکتا تو سہم جاتی۔ خوابوں میں وہ جلتی ہوئی، لال انگارہ سی آنکھیں آتیں تو چیخ مار کر اٹھ بیٹھتی۔ اس خبیث شکل کا عکس مجھے اٹھتے بیٹھتے دیواروں میں نظر آتا۔ یہ سب میرا ذہنی خلفشار تھا جو اس واقعے کے بعد مجھے چین سے جینے نہیں دے رہا تھا۔ سب کے سمجھانے اور لگاتار قرآنی آیتوں کا ورد کرنے سے میری حالت میں آہستہ آہستہ مثبت تبدیلی آ رہی تھی لیکن میری حتی الامکان کوشش ہوتی کہ میرا سامنا مریم سے نہ ہو کیونکہ ۔۔ اس کو دیکھتے ہی میں واپس ذہنی اذیت سے دوچار ہو جاتی۔ مریم بھی بہت حد تک میرا مسئلہ سمجھ گئی تھی اس لیے اب وہ خود بھی میرے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی۔

ہم لوگ کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ اچانک ڈور بیل بجی۔ آپا تیمور بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولیں۔ ”اس وقت کون آ گیا؟“

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور آپا کے سسر صاحب کے ہمراہ ایک پُرنور چہرے والے باریش بزرگ اندر داخل ہوئے۔ ہم لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ تیمور بھائی نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے والد کی طرف دیکھا تو انہوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر ان کے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ ان کو اندر بٹھا کر وہ واپس باہر آئے اور ہم لوگوں کی حیرت کو دور کرتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں بولے۔ ”یہ اکبر صاحب ہیں، میرے بہت پرانے واقف کار! انھیں میں یہاں مریم کے علاج کے لیے لایا ہوں۔“ اس کے بعد اکبر صاحب نے تیمور بھائی سے گھر کے متعلق کئی سوالات کیے۔ مثلاً وہ اس مکان میں کب سے رہ رہے ہیں، کس سے خریدا اور اس سے پہلے یہاں کون رہتا تھا وغیرہ۔

قارئین کی آسانی کے لیے میں اس گھر کی مختصر سی معلومات دے دوں کہ چھ سو گز کا یہ عالیشان مکان تیمور بھائی نے اپنے ایک دوست کے توسط سے خریدا تھا۔ تیمور بھائی شادی سے پہلے اچھے مکان کی تلاش میں تھے اور روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اسی لیے دوست کی زبانی انھیں جیسے ہی اس مکان کا پتا چلا انہوں نے اپنے والد کے ساتھ جا کر دیکھا اور ڈیل فائنل کر دی۔ اس مکان کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ یہ ان کے والد کے گھر سے محض چند منٹوں کی دوری پر تھا۔ تیمور بھائی نے مکان کے بارے میں زیادہ معلومات

کروانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ شادی سے پہلے ہی تیمور بھائی نے لندن کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ قسمت سے ان کا ویزا آگیا اور شادی کے دو ماہ بعد ہی وہ آپا کے ساتھ لندن روانہ ہوگئے۔ ان دونوں نے شادی کے بعد بھی زیادہ وقت گھومنے پھرنے اور دعوتیں اڑانے میں گزارا اس لیے گھر کے بارے میں انھیں کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ لندن سے جب یہ لوگ چھٹیوں پر آتے تھے تب بھی ان کا زیادہ وقت اپنی امی کے گھر یا ہمارے گھر گزرتا تھا اور باقی ٹائم شاپنگ اور پکنک میں گزر جاتا تھا۔ غرض یہ پہلی مرتبہ تھا کہ یہ لوگ اس گھر میں تقریباً ایک سال سے اپنا مکمل وقت گزار رہے تھے ورنہ تو وہ یہاں صرف رات سونے کے لیے جاتے تھے اور صبح ہوتے ہی نکل جاتے تھے۔

اکبر صاحب نے اس کے بعد مریم سے اس کے کمرے میں جا کر ملاقات کی۔ اس وقت مریم ان سے بہت اچھے طریقے سے ملی۔ وہ کافی دیر تک اس کے کمرے میں رہے اور مریم سے اس کے مشاغل اور مصروفیات پر باتیں کرتے رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اس کے کمرے سے باہر آئے اور اس کے بعد انہوں نے تیمور بھائی سے مکان کو اچھی طرح دیکھنے کی اجازت مانگی جو تیمور بھائی نے بخوشی دے دی۔ اتنی دیر میں ہم سب کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اکبر صاحب ضرور کوئی پہنچی ہوئی چیز ہیں۔ ان کی آنکھوں میں اتنا جلال تھا کہ مخاطب ان کی نظروں کی تاب نہ لاتا ہوا اپنی نظریں جھکانے پر مجبور ہو جاتا نیز وہ تیمور بھائی کے والد کے بھی پرانے جاننے والوں میں سے تھے تو اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں بچتی تھی۔ اکبر صاحب نے گھنٹے بھر میں آرام سے پورے گھر کا جائزہ لیا۔ اس دوران میں وہ لگاتار کچھ پڑھ رہے تھے اور بار بار ناک اونچی کر کے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم سب لاؤنج میں بیٹھے خاموشی سے ان کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھا اور زیر لب ورد کرتے ہوئے دروازہ کھول کر لان کی طرف بڑھ گئے۔ اب ہم انھیں لاؤنج کے پردے ہٹا کر باہر ٹہلتا دیکھ رہے تھے۔ وہ ویسے ہی ناک اونچی کر کے بار بار کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ عمل دُہراتے دُہراتے وہ گلاب کی کیاریوں کی طرف بڑھے اور نجانے کیا ہوا کہ ہم سب نے انھیں وہاں ٹھٹک کر رُکتے ہوئے دیکھا۔ اب وہ جھک کر بغور

وہاں کسی چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ بالکل وہی جگہ تھی جہاں میں نے اس سرد رات مریم کو کھڑے کسی سے باتیں کرتا دیکھا تھا۔ دہشت کی ایک لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر دوبارہ صوفے پر آبیٹھی۔

کچھ دیر کے بعد اکبر صاحب بھی لان سے واپس آگئے۔ ان کے چہرے پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی لیکن چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہمیں کسی اہم بات سے آگاہ کرنے جا رہے ہوں مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور چند لمحوں بعد وہ واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تیمور بھائی نے فوراً اپنی گاڑی نکالی اور بصد اصرار انھیں خود جا کر گھر چھوڑ آئے۔ تیمور بھائی کے واپس آنے تک گھر میں گہری خاموشی چھائی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں موجود ہر شخص کسی گہری سوچ میں مبتلا ہے۔ جیسے ہی تیمور بھائی لوٹے آپا لپک کر ان کے قریب پہنچیں اور بے تابی سے بولیں۔ ”اکبر صاحب نے کچھ بتایا؟“

جواب میں تیمور بھائی نے جو بات بتائی وہ ہم سب کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اکبر صاحب نے اپنے علم کے ذریعے اس راز سے آگاہی حاصل کر لی ہے جس کی وجہ سے ہم سال بھر سے پریشانی میں مبتلا ہیں۔ دراصل جس جگہ ہمارا گھر ہے اس جگہ اب سے کافی عرصہ پہلے (ہم تقسیم ہند سے پہلے والا وقت) ایک بہت بڑا شمشان گھاٹ ہوا کرتا تھا جہاں ہندو اپنے مُردے جلایا کرتے تھے۔ ہندوؤں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مُردے مکمل طور پر جلانے کے بعد اس کی راکھ اکٹھی کر لیا کرتے ہیں جنھیں وہ استھیاں کہتے ہیں اور انھیں لے جا کر سمندر میں بہا دیتے ہیں۔ ایسی ہی کوئی مُردہ عورت اب سے سالوں پہلے یہاں جلانے کے لیے لائی گئی تھی۔ اس کو جلانے کے بعد نجانے کس مجبوری کے تحت اس کے رشتے داروں نے اس کی استھیاں سمندر میں نہیں بہائیں اور امانتاً وہیں شمشان گھاٹ میں دفن کر دیں اور بعد میں تقسیم ہندوستان کے موقع پر افراتفری میں وہ یہاں سے چلے گئے جس کے بعد انھیں واپس آکر استھیاں لے جانے کا موقع نہ مل سکا اور بعد میں ان کی آنے والی نسلوں کو اس بابت علم نہ ہوا چنانچہ وہ استھیاں یہیں دفن رہیں اور آہستہ آہستہ مذکورہ شمشان گھاٹ کے آثار بھی معدوم ہوتے چلے گئے اور لوگ بالکل ہی بھول گئے کہ

اس جگہ کسی زمانے میں مُردے جلائے جاتے تھے۔ شہر کراچی پہلے اتنے بڑے رقبے پر نہیں پھیلا تھا لیکن تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے وہ علاقے جہاں انسانی آبادیوں کا وجود تک نہ تھا اب دور دور تک گھروں سے پُر تھیں۔ انہی نو آباد علاقوں میں گلستان جوہر بھی آتا ہے جو اب تیزی سے آباد ہو رہا ہے۔

اکبر صاحب کے مطابق آپا نے اس گھر میں مستقل... رہائش اختیار کرنے کے بعد جس جگہ پر خاص طور پر گلاب کی... کیاری لگائی ہے عین اسی مقام پر اس ہندو عورت کی استھیاں دفن ہیں اور کیاری کے لیے کی گئی کھدائی کے نتیجے میں اس کی اپنی استھیوں کی حفاظت پر معمور روح بے چین ہو گئی ہے چنانچہ اب وہ گھر والوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگی ہے تا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں اور اس کی استھیاں محفوظ رہیں۔ جہاں تک مریم کا تعلق ہے تو وہ واقعی اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے گمبھیر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے جو اچانک ماحول کی تبدیلی کی بدولت اس میں پیدا ہوئی ہیں اور اس کی پُراسرار باتیں اس کی الجھی ہوئی ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو کبھی کبھار دوسروں کے لیے خوفناک حد تک حیران کُن ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکبر صاحب نے مجھ پر گزرنے والا واقعہ بھی بغور سنا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ اس رات میں دراصل اسی روح کا نشانہ بنی تھی جو مریم کا روپ دھارے گلاب کی کیاری کے پاس کھڑی تھی۔

تیمور بھائی کی زبانی ان تمام باتوں سے آگاہ ہونے کے بعد جہاں ہم سب پریشان ہو گئے تھے وہیں یہ بات ہمارے لیے انتہائی اطمینان بخش تھی کہ مریم اس روح کے زیر اثر نہیں ہے اور اس کی بدلی ہوئی حالت کی ذمہ دار اس کی اپنی نفسیاتی الجھنیں ہیں جو اس شہر کا ایک نامور سائیکاٹرسٹ سلجھا رہا ہے اور مریم کے بہت جلد ٹھیک ہو جانے کی نوید بھی سنا رہا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ کون گھر کو اس روح کے اثرات سے پاک کرے گا کیونکہ اکبر صاحب نے نرمی سے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ عمر کے اس حصے میں وہ اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ایسے عملیات کر سکیں چنانچہ اب ہمیں خود کسی ایسے نیک بزرگ کو تلاش کرنا تھا جو اپنے عمل کی طاقت سے تیمور بھائی کے گھر کو اس روح سے پاک کر دے۔

بوا جو اب تک خاموش تماشائی کی حیثیت سے اس سارے قصے میں شریک تھیں آہستگی سے آپا سے مخاطب ہوئیں۔ ”دُلہن بیگم، اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرا مشورہ بھی سن لیں۔ میری نظر میں ایک ایسے بزرگ ہیں جو آپ لوگوں کو اس پریشانی سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کو بلا کر دیکھ لیں۔“

آپا نے یہ سن کر سوالیہ نگاہوں سے تیمور بھائی اور اپنے سُسر کی جانب دیکھا۔ تیمور بھائی سے پہلے ان کے والد بول پڑے۔ ”بوا، کہیں آپ نیازی صاحب کا تو ذکر نہیں کر رہیں؟“ بوا پُرجوش ہو کر بولیں۔ ”جی جی بڑے صاحب، آپ نے بالکل درست پہچانا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پانچ سال پہلے میں فریدہ (بوا کی بیٹی کا نام) کے لیے کتنی پریشان تھی لیکن جب سے انہوں نے فریدہ کا علاج کیا ہے۔ آج تین سال ہو گئے ہیں اسے دوبارہ پُراسرار خوابوں کی شکایت نہیں ہوئی ہے۔ جسے بھی میں نے اُن کا پتا بتایا ہے آج اُن کے گُن گاتا نظر آتا ہے۔“

تیمور بھائی کے والد نے اثبات میں سر ہلا کر بوا کے اس بیان کی تصدیق کی اور آپا سے بولے۔ ”بیٹا، نیازی صاحب بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، ان کے سامنے یہ آسیبی اور شیطانی طاقتیں زیادہ دیر ٹھہر نہیں پاتیں۔ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ پہلے ہی فرصت میں نیازی صاحب کو ہی کیوں نہ لے آیا جبکہ اکبر صاحب بچارے اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے پہلے ہی معذرت کر رہے تھے لیکن میرے اصرار اور کچھ پرانی واقفیت کی بناء پر چلے آئے۔ بہر حال اب میں نے سوچ... لیا ہے کہ نیازی صاحب ہی سے رابطہ کرتا ہوں اور جلد از جلد انہیں یہاں لے کر آتا ہوں۔“

تیمور بھائی کے والد کی طرف سے بتائی گئی اتنی معلومات کے بعد گنجائش نہیں رہی تھی کہ انکار کیا جاتا چنانچہ اس دن کے بعد سے تمام گھر والے بے صبری سے نیازی صاحب کا انتظار کرنے لگے۔

اس دوران گھر میں ویسے ہی عجیب و غریب واقعات جنم لیتے رہے بلکہ اب تو ان میں زیادہ تیزی آ گئی تھی۔ شاید اس روح کو بھی یہ علم ہو گیا تھا کہ ہم اس کی حقیقت جان چکے ہیں چنانچہ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ زور و شور سے گھر والوں کو ستانے لگی تھی۔ مریم ان تمام قصوں سے یوں تو بے نیاز نظر آتی تھی لیکن حقیقتاً وہی ان سے زیادہ متاثر نظر آنے لگی۔ اس کی صحت پہلے سے بھی مزید گر گئی تھی اور اب تو اس نے گھر والوں سے بات کرنا بھی ترک کر دیا تھا، بس ہر وقت کھڑکی کھونے

.... سامنے تکتی رہتی۔ ایک دو بار رات کے اندھیرے میں اس نے گھر سے نکلنے کی بھی کوشش کی لیکن چوکیدار کی بروقت کارروائی اور حاضر دماغی سے گھر والے ایک بہت بڑے.... سانحے سے بچ گئے۔ اب مریم کو سونے سے پہلے نیند کی گولی دی جاتی اور اس کے سونے کے بعد تیمور بھائی اس کے پیروں کو ایک مضبوط رسی سے باندھ دیا کرتے تا کہ وہ نظر بچا کر گھر سے نہ نکل کھڑی ہو۔ آپا اپنی نازوں پلی بیٹی کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھیں۔ سائیکاٹرسٹ انھیں یقین دلا رہا تھا کہ مریم بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی لیکن مریم کی ظاہری حالت کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ گو اکبر صاحب کے.. مطابق مریم نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھی لیکن پچھلے چند ہفتوں سے اس پر عجیب طرح کے دورے پڑنے لگے تھے۔ جب اس پر دورہ پڑتا تو وہ اپنے آپ کو نوچ کھسوٹ کر رکھ لیتی اور خود کو کپڑوں کی بندش سے آزاد کر کے دیوانہ وار گھر سے باہر بھاگتی۔ بچاری آپا اور سارہ چادر لے کر اس کے پیچھے دوڑتیں اور اس کو پکڑ کر واپس لاتیں۔ اس دوران مریم ان کو انتہائی غلیظ گالیوں سے نوازتی رہتی جبکہ آپا کے گھر میں کوئی ایسی گندی زبان نہیں بولتا تھا۔ تیمور بھائی اور ان کے والد بیوپاری ہونے کے باوجود نہایت نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ ہمارے گھر میں بھی گالم گلوچ کا رواج نہ تھا اور مریم تو ایسے فراٹے سے گالیاں دیتی کہ سننے والوں کی عقل دنگ رہ جاتی اور وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ تنگ آ کر آپا نے مریم کی دیکھ... بھال اور اس پر مکمل نظر رکھنے کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی جو ہر وقت اس پر کڑی نگاہ رکھتی اور دورہ پڑنے کی صورت میں آپا کو فوراً انٹرکام پر آگاہ کر دیتی۔ اب ہمیں نیازی صاحب کا انتظار تھا کہ وہ آئیں اور ان لوگوں کو اس پریشانی سے نکالیں لیکن آپا کے سُسر کے مطابق وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں پنجاب گئے ہوئے تھے اور ان کی واپسی کی کوئی حتمی تاریخ نہ تھی۔ نیازی صاحب کا انتظار کرتے ہوئے یہ دوسرا مہینا تھا لیکن ان کی واپسی کے فی الحال کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

ادھر آپا کا گھر طرح طرح کے پُراسرار واقعات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک صبح جب یہ لوگ جاگے تو انہوں نے دیکھا ایک بڑا سا گِدھ ان کے لاؤنج میں بیٹھا خون آشام نظروں سے انھیں گھور رہا ہے۔ تیمور بھائی نے سب کو واپس اپنے کمروں میں جانے کی ہدایت کی اور اپنے بیڈروم سے انٹرکام پر چوکیدار سے بات کی کہ وہ باہر سے آ کر گھر کا دروازہ کھول دے تا کہ یہ آپ ہی باہر نکل جائے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ گھر ہر طرف سے بند تھا اور کوئی کھڑکی یا دروازہ بھولے سے بھی کھلا نہیں تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ منحوس پرندہ اپنے دو گز لمبے پر لے کر اندر آیا تو کہاں سے؟ اور اس قسم کے رہائشی علاقوں میں اس کی موجودگی الگ ایک سوالیہ نشان تھی۔ لیکن گھر کے اندر اتنے تواتر سے جنم لینے والے پُراسرار واقعات کے بعد گھر والوں نے اس کو بھی اسی سلسلے کی کڑی جانا اور چوکیدار کے دروازہ کھولنے کی اطلاع کا انتظار کرنے لگے۔ دو منٹ بعد ہی انٹرکام بجا اور چوکیدار کی سہمی ہوئی آواز اُبھری۔ ”صاحب، یہاں تو لان میں بھی ان منحوسوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور ایک تو بالکل دروازے کے پاس ہی پہرہ دینے کے انداز میں کھڑا ہے۔ میں نے اندر آنے کی کوشش کی تو انہوں نے اپنے بڑے بڑے پر پھیلا کر مجھے خبردار کر دیا کہ آگے بڑھنا میرے لیے ٹھیک ثابت نہ ہوگا چنانچہ میں اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔“

تیمور بھائی نے چوکیدار سے گیٹ کے باہر ہی رُکنے کو کہا اور اپنے والد کو فون کر کے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بچارے بھی پریشانی میں فوراً ان کے گھر آ گئے لیکن گھر کے اندر ان پہرے داروں کو چکمہ دے کر داخل نہ ہو سکے۔

گھر کے اندر موجود افراد بھوکے پیاسے اپنے کمروں میں بند بیٹھے رہے کیونکہ کچن کی طرف جانے والے راستے پر اس خون آشام پرندے کا قبضہ تھا جو کسی طرح بھی وہاں سے ہلنے کا نام تک نہ لے رہا تھا۔ غرضیکہ ایک عجیب صورتِ حال تھی جواب سنگین ہوتی جا رہی تھی کیونکہ سارہ اس سچویشن اور گِدھ کی موجودگی سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اسے تیز بخار چڑھ گیا۔ آپا کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا، وہیں روم فریج میں موجود رات کے بچے ہوئے پانی سے اس کی ٹھنڈی پٹیاں کیں لیکن اس کا بخار بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ شام چار بجے تک یہ نوبت آ گئی کہ سارہ پر نیم غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر آپا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس دوران تیمور بھائی کئی مرتبہ نیچے کا چکر لگا آئے تھے لیکن ہر مرتبہ ہی ان پہرے دار کو چوکس پایا تھا۔ سارہ کی پل پل بگڑتی ہوئی حالت کے پیشِ نظر انھیں جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ ابھی آپا روتی ہوئی تیمور بھائی سے کوئی حل تلاش کرنے کا بول ہی رہی تھیں کہ ان کے کمرے میں لگا

انٹرکام بج اٹھا اور مریم کی نگرانی پر معمور ملازمہ کی پریشان آواز اُبھری۔ ''بی بی صاحبہ جلدی آیئے، مریم بی بی کو زبردست دورہ پڑا ہے۔ نجانے کیا اول فول بک رہی ہیں۔''

یہ سن کر آپا سارہ کو تیمور بھائی کے حوالے کر کے مریم کے کمرے کی طرف بھاگیں۔ جب وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں تو ایک دہشت ناک منظر ان کا منتظر تھا۔ مریم اپنے آپ کو ایک کانچ کے ٹکڑے سے بُری طرح زخمی کر چکی تھی۔ اس نے یہ کانچ کا ٹکڑا ملازمہ کی آنکھ بچا کر شیشے کا گلاس توڑ کر حاصل کر لیا تھا اور اس سے پہلے کہ ملازمہ اسے قابو کرتی اس نے اپنی دونوں کلائیاں کانچ سے کاٹ ڈالی تھیں جن سے تیزی سے بہتا خون اس کے بستر پر بچھی چادر اور اس کے کپڑوں کو رنگین کر رہا تھا۔ آپا اس کی یہ حالت دیکھ کر بے ساختہ چیخ پڑیں اور اسے سنبھالنے دوڑیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ مریم کو تھامتیں وہ بھرّائی ہوئی آواز میں ان سے مخاطب ہوئی، ''بول، یہ گھر چھوڑ کر کب جائے گی؟''

یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز سوال تھا جو مریم نے اپنی ماں سے پوچھا تھا لیکن صبح ہی سے جو آپا کے گھر والوں پر بیت رہی تھی اس نے آپا کے ہوش اڑا کر رکھ دیئے تھے۔ آپا حیرت سے مریم کو دیکھنے لگیں تو وہ دوبارہ ویسی ہی بدلی ہوئی آواز میں چلائی۔ ''جواب دے! تیرے منہ میں زبان نہیں ہے کیا؟''

آپا اور ملازمہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مریم کی طرف دیکھ رہی تھیں کیونکہ یہ بات تو یقینی تھی کہ یہ آواز مریم کبھی بنا کر بھی نہیں بول سکتی تھی، یہ تو خالصتاً مردانہ آواز تھی جو اس کے منہ سے برآمد ہو رہی تھی۔ آپا کو اپنی طرف حیرت سے تکتا پا کر مریم کے حلق سے بھیانک قہقہے نکلنے لگے جو قطعی مردانہ آواز میں تھے۔ اس سے پہلے کہ آپا بیہوش ہو جاتیں اچانک مریم نے زوردار چیخ ماری اور چکرا کر گرنے لگی۔ آپا اور ملازمہ نے اسے سنبھالا اور بستر پر لٹا دیا۔ ملازمہ دوڑ کر تیمور بھائی کو بلا لائی، اس وقت کچھ سننے سنانے کا وقت قطعی نہیں تھا کیونکہ مریم کی دونوں کلائیوں سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ایک طرف آپا دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں، سارہ الگ تیز بخار کی وجہ سے نیم غشی کی کیفیت میں تھی۔ تیمور بھائی نے ملازمہ کی مدد سے مریم کو تیزی سے چادر میں لپیٹا کیونکہ آپا تو اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھیں اور اسے گود میں اٹھا کر نیچے دوڑے۔

لاؤنج میں وہی منحوس پرندہ ڈیرے ڈالے بیٹھا تھا۔ اس نے تیمور بھائی کو یوں نیچے آتے دیکھا تو اپنے بڑے بڑے پر پھیلا کر کریہہ آواز میں چیخا جیسے اُنھیں انجام سے خبردار کر رہا ہو۔ تیمور بھائی کے تیزی سے بڑھتے قدم رک گئے اور وہ کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ گدھ نے ان کو رکتا ہوا دیکھا تو مطمئن ہو کر بیٹھ گیا، اسی اثناء میں آپا بپھری ہوئی سیڑھیوں سے اتریں، ان کے ہاتھ میں چینی کا وزنی گلدان تھا۔ اپنی بیٹیوں کو اس حالت میں دیکھ کر ان پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ انہوں نے وہ گلدان گھما کر پوری قوت سے گدھ کی طرف پھینکا جو ٹھیک نشانے پر لگا اور گدھ کریہہ آوازیں نکالتا ہوا فرش پر گر کر لوٹنے لگا۔ عام حالات ہوتے تو شاید آپا اس مکروہ پرندے کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر ہی بیہوش ہو جاتیں اور اس کو مارنے کا تصور بھی کرنا ایک حماقت ہوتی لیکن بے پناہ غصے اور جنون میں انہوں نے یہ کام کر دکھایا۔ وہ وقت آپا کو داد و تحسین دینے کا نہیں تھا چنانچہ مریم کو گود میں اٹھائے تیمور بھائی تیزی سے باہر کی جانب دوڑے جہاں مزید ایسی ہی کریہہ مخلوق ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ ابھی انہوں نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک دروازہ خود بخود کھل گیا اور تیمور بھائی کے والد حیران پریشان سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے چوکیدار کی گھبرائی ہوئی صورت نمودار ہوئی۔ لان میں موجود گدھ ایک منٹ قبل حیرت انگیز طور پر غائب ہو گئے تھے اور یہ تب ہوا تھا جب آپا نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس گدھ کو زخمی کر دیا تھا جو صبح سے کسی ڈھیٹ مہمان کی طرح ان کے لاؤنج پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔

فوری طور پر مریم اور سارہ کو اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ان دونوں کو ایڈمٹ کر لیا گیا، خود آپا کی بھی حالت کافی مخدوش تھی چنانچہ ڈاکٹر نے انھیں بھی ڈرپ چڑھا دی۔ ہمیں تیمور بھائی نے اسپتال سے ہی فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا۔ ہم لوگ گرتے پڑتے فوراً اسپتال پہنچ گئے جہاں تین طرف ایک ہی خاندان کے افراد ایڈمٹ تھے۔ سارہ کو تو ڈاکٹرز نے دو دن بعد چھٹی دے دی مگر مریم جو پہلے ہی بیماری کے باعث کمزور تھی، اب اتنا سارا خون بہہ جانے کے سبب انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل تھی۔ اسے دو بوتل خون چڑھایا گیا تھا لیکن اس کی مسلسل

بیہوشی کے باعث اس کی زندگی کو خطرہ لاحق تھا۔ ڈاکٹرز نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ خدانخواستہ اس کی بیہوشی نہ ٹوٹی تو وہ کومے میں بھی جا سکتی ہے۔ آپا اور تیمور بھائی نے بڑے پیمانے پر قرآن خوانی کا اہتمام کیا جس کے اختتام پر مریم کی زندگی اور گھر والوں کے سکون کی خصوصی دعائیں کرائی گئیں۔ غریبوں کی بستیوں میں خیرات تقسیم کی گئی اور مساجد میں ضرورت مندوں کو کھانا کھلایا گیا۔ آپا یا امی دن بھر اس کے سرہانے بیٹھ کر قرآن پاک پڑھا کرتیں۔ غرض ہر ممکن کوشش کی گئی کہ مریم کی زندگی خطرے سے باہر آجائے۔ بہت سی دعاؤں اور ڈاکٹرز کی سرتوڑ کوششوں کے بعد آخر کار مریم کو پانچ دن بعد ہوش آگیا اور اس کی زندگی کو لاحق خدشات ختم ہو گئے۔ سب گھر والوں نے سجدۂ شکر ادا کیا اور مریم کے دادا نے اس کی صحت مندی کی خوشی میں ایک دعوت کا اہتمام کرڈالا جس میں دونوں طرف کے خاندانوں کے سبھی افراد مدعو تھے۔ اس شور ہنگامے اور مصروفیت میں وقتی طور پر یہ لوگ اپنی پریشانیاں بھول گئے۔ آپا نے مریم کی مردانہ آواز والا قصہ ہم کو بھی سنایا تھا، امی نے تو یہ سن کر صاف کہہ دیا تھا کہ یہ سو فیصد آسیبی معاملہ ہے جسے نفسیاتی مسئلوں کے ساتھ الجھایا جارہا ہے۔

مریم کی صحت یابی کی خوشی میں دی جانے والی دعوت کے بعد یہ نواں دن تھا۔ مریم انتہائی کمزوری کے باعث فی الحال چلنے پھرنے سے قاصر تھی چنانچہ ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق اس کے لیے وہیل چیئر کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کا روز کا وہی معمول تھا کہ صبح اٹھ کر ملازمہ سے فرمائش کر کے اپنی وہیل چیئر کھڑکی کے پاس لگوالیتی اور دن بھر کھڑکی کے باہر کسی نادیدہ نقطے کو گھورتی رہتی۔

شام کا وقت تھا، آپا اس وقت سارہ کو پڑھانے میں مصروف تھیں اور تیمور بھائی کاروبار کے سلسلے میں حیدرآباد گئے ہوئے تھے کہ اچانک گھر میں جیسے بھونچال آگیا۔ پہلے تو ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی آہستہ آہستہ رو رہا ہو، پھر یہ آوازیں اونچی ہوتی چلی گئیں اور اس کے ساتھ ہی کچن میں رکھی ہوئی چیزیں خود بخود زمین بوس ہونے لگیں۔ کانچ کے برتن چھناکے سے ٹوٹنے لگے اور دیگچیوں کے شور سے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی شخص اپنے شدید غصے کے اظہار کے لیے اٹھا پٹخ کر رہا ہو۔ سسکیوں کی آوازیں اب باقاعدہ بین کی آوازوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور گھر کا ماحول اچانک رنجیدہ ہو گیا تھا۔ آپا اور سارہ وہیں بیٹھیں ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ بوا اور ملازمہ جو وہیں لاؤنج میں بیٹھیں سبزیاں کاٹتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھیں، اب زرد رنگت اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ ساکت بیٹھیں یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔

یہ تماشا کوئی پانچ منٹ تک چلا، پھر آہستہ آہستہ بین کی آوازیں دھیمی پڑتی شروع ہو گئیں اور سسکیوں کی صورت اختیار کرتی ہوئیں بالآخر دم توڑ گئیں۔ گھر کے ماحول پر جو اچانک رنجیدگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی وہ بھی چھٹ گئی جیسے شدید بارش کے بعد سورج بادلوں کی اوٹ سے جلوہ گر ہوتا ہے اور لمحوں میں اپنی روشنی سے ہر طرف پھیلا اندھیرا اور سیلن ختم کر دیتا ہے۔

سب سے پہلے آپا نے جو اب دل کی کافی مضبوط ہو چکیں تھیں اٹھ کر ڈرتے ڈرتے کچن میں جھانکا۔ وہاں کوئی... موجود نہ تھا البتہ وسیع و عریض کچن میں ہر طرف ٹوٹے ہوئے قیمتی برتنوں کی کانچ بکھری ہوئی تھی۔ بوا بھی زیرِ لب قرآنی آیتوں کا ورد کرتے ہوئے ہمت کر کے اٹھیں اور سب سے پہلے اوپر مریم کو کمرے میں جا کر دیکھا جو حسبِ معمول سارے ہنگامے سے بے نیاز سکون سے باہر دیکھنے میں مصروف تھی۔ ملازمہ تو پہلے ہی گھر سے رفو چکر ہو چکی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایسے کئی قصے دیکھ چکی تھی لیکن یہ والا تو اب تک کا سب سے بھیانک واقعہ تھا جس میں گھر والوں کے لیے کسی انجان مخلوق کی جانب سے کھلی دھمکی تھی۔ آپا نے اپنے سسر کو اور امی کو فون کر کے گھر پر بیتنے والی اس نئی اُفتاد کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ اب مزید اس گھر میں ایک لمحہ نہیں رکیں گی اور ابھی کے ابھی وہ اپنا اور بچیوں کا ضروری سامان لے کر یہاں سے جارہی ہیں۔

ان کے سسر انہیں لے جانے کے لیے فوراً وہاں پہنچ گئے۔ دونوں نے مل کر ضروری سامان باندھا۔ سارہ جو اس واقعے کے بعد سے اب تک زاروقطار رونے میں مصروف تھی اسے بوا کے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ پھر ان کے سسر آپا کو بھی نیچے جا کر گاڑی میں بیٹھنے کی ہدایت کرتے ہوئے مریم کے کمرے کی جانب بڑھے۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے تو مریم مرکری بلب کے دھیمے اجالے میں اسی پوزیشن میں بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے پیار سے مریم کو آواز

دی لیکن اس نے جنبش تک نہ کی، اس کو متوجہ نہ پا کر وہ آگے بڑھے اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ لوگ کچھ دنوں کے لیے دادا کے گھر رہنے جارہی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ مریم وہیل چیئر سے ایک جھٹکے سے اٹھ گئی جیسے کسی نادیدہ ہستی نے اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا ہو پھر دادا کی طرف پلٹی اور شعلہ بار نگاہوں سے انھیں گھورتی ہوئی بولی۔ ''کان کھول کر سُن لے بڈھے۔ ہماری اجازت کے بغیر تو اسے کہیں نہیں لے جاسکتا! اور کسی نے ایسی غلطی کی تو انجام بہت بُرا ہوگا۔''

آپا کے سسر حیرت سے منہ کھولے یہ گفتگو سن رہے تھے لیکن خود بھی ان چیزوں پر یقین رکھتے تھے اور پڑھنے پڑھانے والے آدمی بھی تھے اس لیے فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ سر جھکا کر انتہائی مودبانہ انداز میں بولے۔ ''معافی کا طلبگار ہوں جناب، جاہل آدمی ہوں اس لیے نہیں جانتا تھا کہ بچی آپ کی حفاظت میں ہے۔ اگر بات کی نزاکت کو سمجھتا تو آپ کی شان میں اس بے ادبی کی جرأت ہی کہاں کرتا۔'' ان کا یہ عاجزانہ اندازِ گفتگو کام کر گیا۔ مریم کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شعلے دھیمے پڑ گئے اور وہ حکمیہ لہجے میں بولی۔ ''اب تو سمجھ گیا ناں۔ جا یہاں سے چلا جا اور دوبارہ اس گستاخی کی جرأت نہ کرنا بلکہ اس کے ماں باپ کو بھی سمجھا دینا کہ یہ بچی اب ہماری ہے اور وہ اسے بھول جائیں۔'' مریم کے منہ سے نکلنے والے اس آخری جملے نے انھیں اندر تک ہلا کر رکھ دیا اور وہ سمجھ گئے کہ معاملہ کتنا گمبھیر ہو چکا ہے۔

وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکلے اور نیچے پورچ میں پہنچے جہاں آپا وغیرہ گاڑی میں بیٹھے بے صبری سے ان کا اور مریم کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب آپا نے اپنے سسر کو یوں اکیلے آتے دیکھا تو گاڑی سے اتر گئیں اور مریم کا پوچھنے لگیں۔ انہوں نے مریم کے کمرے میں ہونے والی گفتگو نہایت نپے تلے الفاظ میں آخری جملے کو حذف کرتے ہوئے آپا کو سنا دی، جس کو سن کر آپا وہیں پورچ میں ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے آپا کو ڈھارس دی اور چوکیدار سے کہہ کر سارا سامان گاڑی سے اتروا کر واپس گھر میں پہنچوایا۔ وہ رات گئے تک وہیں بیٹھے رہے۔ تیمور بھائی جب رات دو بجے کے قریب حیدرآباد سے واپس آئے تو اپنے والد کو غیر متوقع طور پر وہاں دیکھ کر پریشان ہو گئے پھر آپا نے انھیں ان کی غیر موجودگی میں گھر پر بیتنے والے تمام واقعات سنائے تو وہ بھی ششدر رہ گئے۔ معاملہ اب ان سب کی توقعات سے بڑھ کر سنگین رخ اختیار کر چکا تھا۔

اکبر صاحب کے علم پر کسی کو شبہ نہ تھا لیکن انہوں نے بھی گھر میں موجود بدروح کے متعلق تحقیقات کی تھیں جبکہ مریم کا معاملہ اس سے بالکل الگ تھا۔ اس پر کسی بدروح کا نہیں بلکہ ایک آتشی مخلوق کا قبضہ تھا جو اکبر صاحب کو جُل دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یعنی اب کسی ایسے عامل کو تلاش کرنا تھا جو بیک وقت دو محاذوں پر لڑ سکے۔ ایک طرف تیمور بھائی کے گھر کو اس بدروح کی گرفت سے آزاد کرائے اور ساتھ ہی ساتھ مریم کو بھی اس موذی کے پنجے سے چھڑائے۔ گھر والے ایک دُہری مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ آپا جو نماز روزے کی اتنی پابند نہ تھیں اب پنج وقتہ نمازی ہو گئی تھیں بلکہ تہجد بھی پابندی سے پڑھنے لگی تھیں۔ ہر نماز میں وہ دامن پھیلا کر بلک بلک کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گھر والوں کی عافیت کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ وہ جنھیں دعوتوں، شاپنگ اور پکنکس کا کریز تھا اب ہر وقت تلاوتِ قرآن میں مشغول نظر آتیں۔ ہر آئے گئے سے دعا کی درخواست کرتیں اور مریم کے غم میں دن بدن گھلتی جارہی تھیں۔ تیمور بھائی کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھا، ان کی بھی صحت گرتی جارہی تھی اور آئے دن کی پریشانیوں نے انھیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ ہم لوگ بھی ان کے لیے بے انتہا فکرمند تھے، ابو ایک صاحب کو اپنے ساتھ آپا کے گھر عمل کے لیے لے گئے تھے۔ انہوں نے گھر پر عمل شروع بھی کر دیا تھا لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ اچانک انہوں نے بھی اکبر صاحب کی طرح اس معاملے سے ہاتھ اٹھا لیے۔ امی اب اکثر آپا کے گھر پر رہنے لگی تھیں تاکہ ان کی موجودگی سے آپا کا بھی حوصلہ بنا رہے۔

ان حالات سے سب سے زیادہ متاثر سارہ ہو رہی تھی اس کی پڑھائی پر بھی منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ وہ اچھی خاصی ذہین بچی تھی لیکن سالانہ امتحانات میں بمشکل پاس ہو سکی۔ اس مایوس کن کارکردگی کے نتیجے میں اسے اپنے والدین اور پرنسپل سے اچھی خاصی جھاڑ بھی پڑی تو پڑھائی اور گھریلو پریشانیوں سے دلبرداشتہ ہو کر ایک رات اس نے گیلری سے کودنے کی کوشش کی مگر اللہ نے کرم کیا اور وہ سیدھی نیچے گرنے کے بجائے نیم کے گھنے پیڑ میں الجھ کر گری جو شروع سے آپا کے لان میں کھڑا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ خوب پھل پھول گیا تھا۔ اس کی دردناک چیخوں سے

گھر والوں کو اس معاملے کی خبر ہوئی تو اسے اٹھا کر فوراً اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کے پیر پر پلستر چڑھایا گیا اور تھوڑی کے پاس دو ٹانکے آئے۔ امی کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے آپا اور تیمور بھائی کو ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پلائی کہ بجائے تم لوگ بچی کی پریشانی کو سمجھو الٹا اس کا جینا حرام کر رہے ہو اور سارہ کو چند دنوں کے لیے اپنے گھر لے آئیں تا کہ گھر سے دور رہ کر وہ کچھ سنبھل جائے اور اس کا دل بھی بہلا رہے۔

مریم کی حالت پر البتہ ایک سوالیہ نشان لگا ہوا تھا کیونکہ وہ بہتر ہو کر بھی بہتر نہ تھی۔ اس کی بیماری الگ ہی نوعیت کی تھی۔ تیمور بھائی نے اپنے والد کے کہنے پر فی الحال سائیکاٹرسٹ سے مریم کا علاج رُکوا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مریم پر قابض مخلوق کو کسی قسم کی شکایت ہو یا شرارتاً وہ ڈاکٹر کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے جو ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ اب مریم گھنٹوں بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی، بھی کبھار اس کے کمرے سے مردانہ آوازیں بھی آتیں۔ وہ اپنے حال میں مگن تھی، یوں لگتا تھا یہ سب اس کی مرضی سے ہو رہا ہو۔ لیکن حقیقت سے سب واقف تھے کہ مریم انتہائی اذیت سے گزر رہی ہے اور اس کا جلد از جلد مداوا بھی بیحد ضروری تھا۔ گھر کے اندر ہونے والے پُراسرار واقعات میں بھی اب شدت آگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس ہندو عورت کی بدروح ان لوگوں کو زیادہ دن اس گھر میں رہنے نہیں دینے والی تھی جبکہ وہ لوگ مریم کی وجہ سے یہ گھر بھی چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ آپا اور تیمور بھائی کی حالت اس زمانے میں کسی مُردے سے بھی بدتر ہو گئی تھی، دونوں کو نہ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ کپڑے بدلنے کا۔ امی یا تیمور بھائی کے والد جب دونوں کو زبردستی کھانا کھلاتے تو دونوں میاں بیوی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے اور اللہ سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتے۔ خاص طور پر جب مریم کی حالت بگڑتی یا اس کے کمرے سے مردانہ قہقہوں کی آوازیں آتیں تو ان کے چہرے دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ جاتے۔

اب تو مریم نے کمرے سے باہر قدم رکھنا بھی بند کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا کمرا ہی اس کی کُل کائنات ہے۔ آپا یا تیمور بھائی اس کے کمرے میں جاتے بھی تو تھوڑی ہی دیر بعد وہ انہیں صاف صاف کمرے سے جانے کو کہہ دیتی۔ اس رات کے بعد سے تو وہ کھل کر سامنے آگیا تھا جو دھوکے سے

مریم پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ شہر میں موجود ہر چھوٹے بڑے عامل سے رابطہ کر کے دیکھ لیا گیا۔ کچھ نے صاف منع کر دیا تو کوئی اگلے دن ہی بھاگ گیا۔ جس نے بھی کسی عامل کا پتا بتایا اسے فوری طور پر علاج کے لیے بلایا گیا لیکن کوئی ایسا اللہ کا بندہ نہیں مل پایا جو ان کے دکھوں کا مداوا کر دے۔ یہ نہیں تھا کہ وہ جن جو مریم پر عاشق تھا اس سے اچھا سلوک کرتا تھا۔ جس کا خمیر ہی آتش سے اٹھا ہو اس سے بھلائی کی کیا اُمید رکھی جا سکتی ہے؟ وہ جن مریم کو رات بھر جاگا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اگر وہ سو جاتی تو اس پر نادیدہ تھپڑوں کی بارش ہو جاتی۔ کبھی وہ کھانا کھانا چاہتی تو اس شدت سے اس کا گلا دباتا کہ وہ نشانات تین سے چار دن بعد بھی واضح طور پر نظر آتے۔ کبھی وہ پڑھنے کے لیے کوئی کتاب اٹھاتی تو اس کو اندھا کر دیتا، تا وقتیکہ وہ رو رو کر اس سے معافی مانگے۔ آپا اور تیمور بھائی اس کو یوں تڑپتا ہوا دیکھتے تو خون کے آنسو روتے لیکن کچھ کر نہیں پاتے۔

مریم کو شروع ہی سے لمبے بالوں کا شوق تھا اور قدرت بھی اس پر مہربان تھی چنانچہ اس کے گھنے، ریشمی بال جو کمر سے نیچے تک آتے تھے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتے اور اکثر وہ بال کھول کر اتراتی اتراتی گھومتی۔ لیکن اب یہی بال روکھے اور بے جان ہو کر اس کے شانوں تک پہنچ گئے تھے کیونکہ وہ کئی کئی دنوں تک نہا نہیں پاتی تھی اور کبھی اگر وہ زبردستی نہانے گھس بھی جاتی تو وہ اس کو ایسی ایسی اذیتیں دیتا کہ وہ بیہوش ہو کر وہیں واش روم میں گر جاتی پھر آپا اسے اٹھا کر لاتیں۔ اگر وہ اس کی مرضی کے خلاف آپا یا تیمور بھائی سے بات کر لیتی تو وہ اس کے بالوں کو اس زور زور سے جھٹکے دیتا کہ اکثر اس کے سر سے خون بہنے لگتا۔ [illegible] بت کا اثر اس کی آنکھوں پر بھی پڑا تھا اور وہ ہلکا سا ترچھا دیکھنے لگی تھی نیز اس کو دکھائی دینا بھی کم ہو گیا تھا۔ اس کی صاف وشفاف رنگت اب آہستہ آہستہ جھلسنے لگی تھی۔ وہ گھٹ گھٹ کر مر رہی تھی اور اس کی خاموش آنکھوں میں اپنے والدین کے لیے ایک پیغام ہوتا جو وہ اچھی طرح پڑھ سکتے تھے لیکن ان کے بس میں کچھ نہ تھا کیونکہ ان کا پالا ایک ایسی مخلوق سے پڑا تھا جو آگ کی پیداوار تھی۔

صرف اور صرف ایک قادر مطلق کی ذات تھی جس پر بھروسا تھا اور جس کے آگے ہاتھ پھیلائے دونوں میاں بیوی پچھلے دو سالوں سے کسی معجزے کے منتظر تھے۔ شاید ان کا

یہی کامل ایمان اور آنسو بھری فریادیں اس ذاتِ برحق کے دربار میں قبولیت کا باعث بن گئیں۔ ایک صبح تیمور بھائی کے والد کا فون آیا کہ وہ اپنے ساتھ نیازی صاحب کو لے کر ایک گھنٹے میں ان کے گھر پہنچ رہے ہیں اور نیازی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ان کے پہنچنے تک مریم کو نہلا دھلا کر، صاف ستھرے کپڑے پہنا دیئے جائیں۔ ان کی اس ہدایت کے بعد حیرت انگیز طور پر مریم نے آرام سے غسل کرلیا اور کسی اذیت سے دوچار نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر نیازی صاحب کے لیے گھر والوں کی عقیدت اور بڑھ گئی۔

دراصل نیازی صاحب کا ابھی پنجاب سے واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ وہاں ان کے تینوں شادی شدہ بیٹے رہتے تھے اور ان کے بچوں کے ساتھ نیازی صاحب کا دل لگا رہتا تھا۔ یہاں وہ تنہا ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے لیکن تیمور بھائی کے والد سے دیرینہ تعلقات کی بناء پر وہ مریم کا علاج کرنے اور گھر کو اثرات سے پاک کرنے کے لیے کراچی آنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ بعد میں ہمیں اس بات کا علم ہوا کہ تیمور بھائی کے والد گزشتہ آٹھ ماہ سے نیازی صاحب سے رابطے میں تھے اور انہیں یہاں آنے پر آمادہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپا کے گھر پر بیتنے والے تمام واقعات سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔ نیازی صاحب اللہ کے نیک بندے ہونے کے ساتھ ساتھ عملیات کے بھی ماہر تھے اور اس سلسلے میں اکثر ان کا بیرونی ممالک بھی جانا ہوتا رہتا تھا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے اور علاج کے لیے کوئی مناسب شخص نہیں مل رہا ہے تو وہ فوری طور پر کراچی آ گئے اور اب وہ بس تھوڑی ہی دیر میں یہاں پہنچنے والے تھے۔

گھر کے اندر اس وقت امی، آپا، تیمور بھائی اور ریوا موجود تھے جبکہ سارہ پچھلے دو ماہ سے ہمارے ہی گھر میں رہ رہی تھی کیونکہ آپا کے گھر کا ماحول تو کسی کو بھی پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میرے اور بھیا کے بے حد اصرار پر آپا اس بات کے لیے تیار ہو گئی تھیں کہ حالات ٹھیک ہونے تک سارہ ہمارے پاس ہی رکے۔ خود سارہ پر بھی اس تبدیلی کے مثبت اثرات نظر آ رہے تھے۔ اب وہ اپنے گھر کے پُرتناؤ اور ڈراؤنے ماحول سے نکل کر بہت خوش نظر آتی تھی اور واپس جانے کے لیے فی الحال خود بھی تیار نہ تھی۔

ابھی نیازی صاحب راستے میں ہی ہوں گے کہ اچانک گھر میں گاڑھا گاڑھا سا دھواں بھرنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر کی دیواروں نے اچانک دھواں اگلنا شروع کر دیا ہو۔ گھر کے تمام کھڑکی اور دروازے کھول دیئے گئے لیکن دھواں تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس دھوئیں میں جلے ہوئے گوشت کی بو بھی تھی جس سے سب کا جی متلانے لگا تھا۔ دھوئیں سے پریشان ہو کر مجبوراً سب کو گھر سے باہر نکل کر لان میں جانا پڑا جبکہ مریم اوپر اپنے کمرے ہی میں موجود تھی۔ دھواں اتنا شدید تھا کہ باہر سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا گویا گھر کے اندر خطرناک آگ بھڑک اٹھی ہو لیکن آگ کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ آس پڑوس والوں نے پریشان ہو کر گھر کی بیل بجائی جنہیں آپا اور تیمور بھائی نے بڑی مشکلوں سے مطمئن کر کے ٹالا۔ ان لوگوں کو لان میں کھڑے ہوئے بیں منٹ گزرے ہوں گے کہ تیمور بھائی کے والد کی گاڑی تیزی سے گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور اگلے ہی لمحے اس میں سے پریشان چہرہ لیے ان کے والد اترے۔ ان کے ساتھ ہی سفید رنگ کے کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر عمامہ باندھے ایک پُرجلال شخصیت بھی گاڑی سے اتری جو یقیناً نیازی صاحب تھے۔ انہوں نے ہاتھ میں عصا تھاما ہوا تھا اور گھر کی جانب دیکھتے ہوئے زیرِ لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ بوا کی تقلید میں سب نے فوراً آگے بڑھ کر ان کو سلام کیا جس کا جواب انہوں نے نہایت بارعب لہجے میں دیا اور دوبارہ گھر کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔

جب آپا کے سسر کو صورتحال کا علم ہوا تو وہ نیازی صاحب کی طرف پلٹے اور عاجزی سے بولے۔ ”آپ نے سنا نیازی صاحب، میں آپ سے انہی واقعات کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک طرف گھر میں بدروح کی طرف سے پیدا کردہ پریشانیاں ہیں اور دوسری طرف مریم پر اس خبیث نے پچھلے ڈیڑھ سال سے تسلط جما رکھا ہے۔ آخر ہم لوگ جائیں تو جائیں کہاں؟“ نیازی صاحب نے پڑھتے پڑھتے ہاتھ کے اشاروں سے ہوا میں کچھ دائرے بنائے یا شاید کچھ لکھا اور سب کو گھر کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جب گھر والوں نے پلٹ کر گھر کی جانب دیکھا تو حیرت سے اچھل پڑے کیونکہ چند لمحے قبل جو مکان دھوئیں کے مرغولوں میں چھپ گیا تھا۔ اچانک اب وہاں سے دھواں غائب ہو چکا تھا اور یہ صرف چند سیکنڈوں میں ہوا تھا۔ گھر والے حیران پریشان اور دلوں میں نیازی صاحب کے لیے گہری عقیدت کے جذبات لیے

گھر میں داخل ہو گئے۔ گھر کے اندر بھی دھوئیں کا نام ونشان تک نہ تھا بلکہ وہ جی کو متلا دینے والی بُو بھی مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔

نیازی صاحب کا ہاتھ تھامے تیمور بھائی کے والد بھی ان لوگوں کے پیچھے گھر کے اندر داخل ہوئے تھے۔ نیازی صاحب نے اپنی بارعب آواز میں ایک گلاس سادہ پانی مانگا جو انہیں پیش کر دیا گیا لیکن انہوں نے پینے کے بجائے اس گلاس کو اونچا کر کے اس کے اندر موجود پانی کو دیکھنے لگے جیسے اس پانی میں کسی چہرے کا عکس دیکھ رہے ہوں۔ گھر والے خاموشی سے ایک طرف بیٹھے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ گھر میں اس وقت سناٹے کا راج تھا۔ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سے شاید سب اچھل پڑتے۔ اچانک گھر کے درو دیوار کسی عورت کی لرزہ خیز چیخ سے گونج اٹھے جس نے وہاں موجود تمام افراد کو بے ساختہ اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ نیازی صاحب البتہ ویسے ہی اطمینان سے بیٹھے رہے جیسے وہ ایسی کسی صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ اس کے بعد نیازی صاحب فوراً سنبھل کر بیٹھ گئے اور انہوں نے زیرِ لب ورد کا آغاز کیا۔ دو منٹ بعد ہی ان کے ہاتھ میں موجود شیشے کا گلاس انہیں پانی سے شرابور کرتا ہوا ایک زوردار چھناکے سے پھٹ گیا۔ گھر والے ایک مرتبہ پھر اچھل جانے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے پہلی مرتبہ نیازی صاحب کے چہرے پر برہمی کے تاثرات دیکھے۔ نیازی صاحب نے بوا سے ایک اور گلاس پانی منگوایا مگر اس سے پہلے کہ وہ بوا کے ہاتھ سے گلاس لیتے وہ زمین پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ بوا حیرانی سے اپنی صفائی میں کچھ کہنے ہی جارہی تھیں کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ کہنے سے روک دیا اور خود باورچی خانے میں جا کر پانی سے بھرا گلاس لے آئے۔ تمام گھر والے ساکت بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس مرتبہ نیازی صاحب نے گلاس کو اوپر سے تھاما ہوا تھا اور وہ زیرِ لب کسی ورد میں مصروف تھے۔ ان کی دونوں آنکھیں بند تھیں مگر ان کی پتلیاں پپوٹوں کے اندر تیزی سے گردش کرتی صاف محسوس ہو رہی تھیں۔ تقریباً پانچ منٹ تک ماحول پر گہرا سکوت طاری رہا پھر گھر والوں کو ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ کسی تیز بھڑکتی آگ کے سامنے بیٹھے ہوں، آگ کی تپش انہیں اپنے چہروں پر محسوس ہو رہی تھی اور اس کی شدت سے آنکھوں میں جلن ہونے لگی تھی۔ اسی اثناء میں

نیازی صاحب کی بارعب آواز نے ماحول کا سکوت توڑا، وہ کسی نادیدہ مخلوق سے مخاطب تھے کیونکہ گھر والوں کے علاوہ وہاں کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ نیازی صاحب جس انداز سے گفتگو کر رہے تھے وہ یہی ظاہر کرتی تھی کہ وہ کسی عورت سے مخاطب ہیں۔ نیازی صاحب کسی گائتری نامی عورت سے مخاطب تھے اور اسے یہ جگہ چھوڑ جانے کا حکم دے رہے تھے۔

ماحول میں اچانک تناؤ بڑھ گیا تھا، وہاں پر موجود تمام لوگ عجیب سی بے چینی کا شکار ہو گئے تھے کیونکہ آگ کی تپش اب انہیں براہِ راست اپنے جسموں اور چہروں کو جلاتی محسوس ہو رہی تھی۔ نیازی صاحب گھر والوں کی بے چینی سے واقف تھے چنانچہ اشارے سے انہیں صبر سے بیٹھے رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ گائتری نامی اس بدروح نے ان کے سامنے اعتراف کیا کہ جس روز آپا نے لان کے گوشے کو گلاب کی کیاری کے لیے کھودا وہ اسی روز سے ان لوگوں کو گھر سے نکالنے کے درپے ہو گئی تھی کیونکہ اسی مقام پر کہیں زمین کی گہرائیوں میں اس کی استھیاں دفن تھیں جو اس کے گھر والے تقسیم ہند کے بعد کی افراتفری میں نکالنا بھول گئے اور برسوں سے اس کی بے چین روح اس کی حفاظت پر معمور ہے کیونکہ آپا نے اپنے عمل سے اس کو تکلیف پہنچائی اور اس کی استھیوں کو خطرہ لاحق ہو گیا چنانچہ وہ اب ان لوگوں کو یہاں سے نکال کر ہی دم لے گی۔ نیازی صاحب یہ تمام باتیں گھر والوں کو بتاتے جارہے تھے۔ جب وہ آخری جملے پر پہنچے تو آپا بے اختیار بول پڑیں۔

”اگر گائتری کی روح کو میرے عمل سے تکلیف پہنچی ہے تو میں اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ میرا مقصد کسی کو نقصان پہنچانے کا یا کسی کا دل دُکھانے کا قطعی نہیں تھا، میرا یہ عمل مجھ سے نادانستگی میں سرزد ہوا اور اس کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ بس اس سے کہیں کہ میری بچی سے دور رہے۔“

یہ سن کر نیازی صاحب بے اختیار مسکرا دیئے اور آپا کو اشارے سے مزید کچھ کہنے سے منع کر دیا۔ پھر وہ واپس گائتری کی روح سے مخاطب ہوئے۔ ”تُو نے سنا، اس کا مقصد تجھے یا تیری استھیوں کو نقصان پہنچانے کا نہیں تھا اور وہ اس بات سے ناواقف تھی کہ وہاں تیرا قبضہ ہے۔ اب تُو بتا کہ اپنی ضد پر اڑی رہے گی یا ان کا پیچھا چھوڑے گی؟“

اس کا جواب یقیناً نیازی صاحب کے مزاج کو ناگوار گزرا کیونکہ ان کی آنکھیں اچانک شعلے اگلنے لگیں اور انہوں نے تیزی سے ورد کرتے ہوئے گلاس کا تمام پانی اپنے سامنے اچھال دیا، اس کے ساتھ ہی وہاں بیٹھے تمام لوگوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔

وہ پانی فرش پر گرنے کے بجائے اچانک بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ پانی کے بھاپ بن کر اڑنے کے عمل کو بمشکل دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ نیازی صاحب گرجدار آواز میں بولے۔ ''بول، اتنا کافی ہے یا تجھے اور چاہیے؟'' اس کے بعد یوں لگا جیسے وہ کسی کی بات غور سے سن رہے ہوں، وقفے وقفے سے ماحول میں پھیلی خاموشی کو ان کا ہنکارا توڑ دیتا۔ نیازی صاحب دس منٹ تک اس نادیدہ گائتری کی روح سے خاموش سامع کی حیثیت سے ہمکلام رہے پھر بولے۔ ''ٹھیک ہے۔ تیری اس شرط کو گھر والے بخوشی پورا کریں گے لیکن تجھے بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ آج کے بعد تیری ذات سے انھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' اس کے بعد نیازی صاحب آنکھیں بند کر کے یوں سر ہلانے لگے گویا اس کی بات کی تائید کر رہے ہوں۔ اس دوران گھر والوں کو آگ کی تپش میں واضح کمی محسوس ہونے لگی اور رفتہ رفتہ جلن اور تپش کا احساس بالکل ختم ہو گیا۔

نیازی صاحب نے پانچ منٹ بعد اپنی آنکھیں کھولیں اور گھر والوں پر نظر دوڑائی جو بے چینی سے کچھ سننے کے منتظر تھے۔ انہوں نے تیمور بھائی کو قریب آنے کا اشارہ کیا، وہ فوراً ان کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ نیازی صاحب نے انتہائی دھیمے لہجے میں انھیں کچھ ہدایات دیں اور تیمور بھائی اسی وقت گھر سے روانہ ہو گئے۔ اب نیازی صاحب گھر والوں سے مخاطب ہوئے اور بولے۔ ''گائتری کی روح چند شرائط پر مان گئی ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ اب وہ گھر اور گھر والوں کی زندگی میں مخل نہیں ہوگی لیکن اس کی استھیوں کو دوبارہ چھیڑا گیا یا اس جگہ پر کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی گئی تو اس بار نتیجہ بہت بھیانک ہوگا۔ اس نے اسی مقام پر ایک کالے بکرے کی قربانی مانگی ہے اور گھر والوں سے یہ مانگ کی ہے کہ وہ اسی وقت اس مقام پر اینٹوں کی دیوار کا احاطہ بنا دیں تاکہ اسے اطمینان رہے کہ اب کوئی اس کی استھیوں کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

سب نے سکھ کی سانس لی کہ اب کم از کم گائتری کی طرف سے سکون ہو گیا تھا کہ وہ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی تاوقتیکہ گھر والوں کی طرف سے کوئی بے احتیاطی سرزد ہو جو ایک ناممکن سی بات تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد تیمور بھائی کی ایک موٹے تازے کالے بکرے اور دو مزدوروں کے ساتھ واپسی ہوئی۔

نیازی صاحب کی ہدایت کے مطابق کالا بکرا اس مقام پر کاٹا گیا اور اس کو وہاں اس وقت تک ایسے ہی رکھا گیا جب تک اس کے خون کا آخری قطرہ تک گلاب کی کیاری میں جذب نہیں ہو گیا پھر مزدوروں کو فوراً وہاں دیوار بنانے کے کام پر لگا دیا گیا جو پہلے ہی یہ سارا عمل حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ نیازی صاحب نے اپنی نگرانی میں دیوار کا کام مکمل کروایا۔ وہ ہر اینٹ پر پڑھ کر دم کرتے اور مزدوروں کو تھماتے جاتے۔ دیوار مکمل ہونے تک شام ہو گئی اور مسجدوں سے مغرب کی اذانیں بلند ہونے لگیں۔ مزدور اپنی اُجرت لے کر رخصت ہو گئے تو نیازی صاحب گھر کے اندر واپس آئے۔ ہم سب کے بےحد اصرار کے باوجود وہ کھانا کھائے بغیر ہی اگلے دن مریم کو دیکھنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔

وہ رات انتہائی سکون سے گزری تھی۔ آپا اور تیمور بھائی بار بار جا کر اینٹوں کی دیوار کو دیکھ کر یوں اطمینان کی سانس لیتے جیسے انھیں ڈر ہو کہ کہیں یہ دیوار خود بخود ڈھیر نہ ہو جائے اور دوبارہ گھر میں نت نئی پریشانیاں جنم لینے لگیں۔ مریم بھی سکون سے اپنے کمرے میں تھی اور آپا دس منٹ پہلے ہی اسے کھانا کھلا کر اپنے کمرے میں آئی تھیں۔ گیارہ بجے کے آس پاس کا وقت ہو رہا تھا کہ اچانک مریم کے کمرے سے اذیت ناک چیخیں بلند ہونے لگیں جیسے کوئی اسے شدید تشدد کا نشانہ بنا رہا ہو۔ آپا اور تیمور بھائی بے حد پریشانی کے عالم میں اس کے کمرے کی جانب دوڑے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے، دروازہ یکا یک زناٹے سے بند ہو گیا۔ وہ دونوں حیران پریشان ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ اندر سے مریم کی ایک اور چیخ بلند ہوئی، اس دفعہ آواز میں اتنی اذیت تھی گویا کوئی اسے ذبح کر رہا ہو۔ تیمور بھائی بے چین ہو کر دروازے کو کندھے سے زوردار ضربات لگا کر کھولنے کی کوشش کرنے لگے مگر وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جما ہوا تھا اور مریم کی چیخوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ آپا پوری شدت سے قرآنی آیتوں کا ورد کر رہی تھیں اور مریم کو آوازیں دے رہی تھیں۔ کوئی پانچ منٹ تک یہ ڈراما چلتا رہا پھر

اچانک خاموشی چھا گئی۔ آپا اور تیمور بھائی گھبرا کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ تیمور بھائی نے ایک مرتبہ پھر دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور اس مرتبہ دروازہ آسانی سے کھل گیا۔

کمرے کے اندر یوں لگ رہا تھا گویا کسی نے بلڈوزر چلایا تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر سلامت نہیں تھی، یہاں تک کہ پنکھا بھی چند تاروں کی مدد سے چھت پر جھول رہا تھا۔ فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا، کھڑکی کا ایک پٹ نیچے گرا پڑا تھا اور دیواروں میں جا بجا سوراخ پڑے تھے۔ غرض وہ کمرا کسی سو سال پرانے کھنڈر کا نقشہ پیش کر رہا تھا اور یہ ساری تخریب کاری صرف پانچ منٹ کے اندر ہوئی تھی۔ آپا مریم کو دیکھنے کے لیے دوڑیں جو کمرے کے بیچوں بیچ اوندھے منہ پڑی تھی۔ انہوں نے تیمور بھائی کی مدد سے اسے سیدھا کیا تو دونوں میاں بیوی غم و غصے سے تھرا اٹھے۔ اس ظالم نے ان کی پھول سی بچی کے ساتھ جو ظلم اور بربریت کا سلوک کیا تھا اس نے دونوں کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا تھا اور دل کے سو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ مریم کے سر سے خون جاری تھا اور اس کے بال گچھوں کی صورت میں فرش پر پڑے تھے جیسے کسی نے بڑی بیدردی سے انہیں نوچ کر پھینک دیا ہو۔ اس کے دونوں گالوں اور گردن پر انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے جبکہ زخمی ناک اور ہونٹوں سے خون جاری تھا۔ تیمور بھائی فوراً اپنے والد کو فون کرنے دوڑے اور آپا روتی بلکتی ہوئیں مریم کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگیں۔

ڈیڑھ گھنٹے کے اندر تیمور بھائی کے والد نیازی صاحب کے ہمراہ ان کے گھر پہنچ چکے تھے۔ میں بھی امی اور بھیا کے ساتھ آپا کے گھر پہنچ گئی جہاں انتہائی حیرت انگیز نظارے ہمارے منتظر تھے۔ نیازی صاحب لاؤنج میں بیٹھے بلند آواز میں تلاوت کر رہے تھے جبکہ مریم ان کے سامنے صوفے پر بیٹھی انہیں ٹکٹکی باندھے غصیلی نظروں سے گھور رہی تھی۔ ہم لوگ بھی خاموشی سے صوفے پر ٹک گئے۔ آپا اور تیمور بھائی بھی وہیں نڈھال سے بیٹھے تھے۔ دونوں میاں بیوی کے چہروں پر موت کی سی زردی کھنڈی تھی اور برسوں کے بیمار نظر آتے تھے............ دوسری جانب نیازی صاحب کی تلاوت رفتہ رفتہ بلند تر ہوتی جا رہی تھی، یہ کلام پاک کے جلال کا اثر تھا کہ مجھے اپنے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہوتا محسوس ہونے لگا اور دل کی کیفیت عجیب ہونے لگی۔ رات کے ایک بجے کا عمل ہوگا، ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا گھر کے در و دیوار سے بھی تلاوت کی سحر انگیز آواز پھوٹ رہی ہو اور آہستہ آہستہ ہمارے اندر بھرتی جا رہی ہو۔ جیسے کلامِ پاک کے یہ الفاظ ہمارے خون میں شامل ہو کر جسم کے ہر حصے میں پہنچ رہے ہوں اور ہمارے گناہ آلودہ جسموں کو اِک نئی تازگی بخش رہے ہوں۔ ہم سب تلاوتِ الٰہی کے زیرِ اثر ٹرانس کی سی کیفیت میں تھے کہ اچانک نیازی صاحب نے تلاوت روک دی اور ہم سب چونک اٹھے۔ نیازی صاحب اس وقت مریم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے تھے جو پہلے ہی ان کی جانب کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔ انہوں نے براہِ راست مریم سے سوال کیا۔ ’’کیوں اس معصوم کی جان کے درپے ہے؟ خود بھی تو بچوں والا ہے۔ کیا تجھے اس کے ماں باپ کا درد نظر نہیں آتا؟‘‘

مریم نے زوردار ہنکارا بھرا اور مردانہ آواز میں بولی۔ ’’لو آ گیا ایک اور تیس مار خان! میری مان تو تو بھی جس طرح آیا تھا ویسے ہی واپس چلا جا اور اگر تو اپنی ضد پر اڑا رہا تو آج اس بچی کو اس کے ماں باپ کے سامنے ذبح کر دوں گا۔‘‘

ہم سب اپنے دل کو تھامے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ مریم کے آخری جملے نے تو جیسے ہماری جان ہی نکال دی، آپا سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ دھیمی آواز سے سسکنے لگیں۔ تیمور بھائی کی آنکھیں صبر و ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں کہ کوئی ان کے سامنے ان کی بیٹی کو قتل کرنے کا عزم دکھا رہا تھا اور وہ کتنے بے بس تھے۔

نیازی صاحب نے اپنے سر کو یوں جھٹکا گویا اس کی بات کو ہوا میں اڑا رہے ہوں پھر مریم کے اور قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا اور سورہ بقرہ کی تلاوت شروع کر دی۔ مریم کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی گویا یہ سب کچھ اس کے لیے کسی کھیل تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ نیازی صاحب کی آنکھیں بند تھیں اور وہ پوری تندہی سے سورہ بقرہ کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ہم سانس روکے یہ ناقابلِ یقین مناظر دیکھ رہے تھے۔ اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے مگر ہمارے گھر میں دن کا سماں تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد نیازی صاحب نے ایک جھٹکے

سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اگلے ہی لمحے مریم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور تلاوت جاری رکھتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ مریم جو اتنی دیر سے تمسخرانہ نظروں سے نیازی صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ ان کے اچانک آنکھیں کھولنے پر چونکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتی نیازی صاحب کا ہاتھ اس کے سر پر جم چکا تھا۔ مریم نے ایک زوردار جھرجھری لی اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوگئے۔ اس نے اپنے ہاتھ چھڑانے کے لیے زور مارا لیکن نیازی صاحب کی فولادی گرفت کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ جیسے جیسے تلاوت آگے بڑھتی گئی مریم کی حالت غیر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اس کے منہ سے وحشت ناک چنگھاڑیں نکلنے لگیں اور وہ چیخ چیخ کر نیازی صاحب سے تلاوت روکنے کی التجائیں کرنے لگی۔ ہم لوگ مبہوت بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ مریم نے ایک ہچکی لی اور بے ہوش ہوگئی۔ میں اور آپا اسے پکڑنے کو اٹھیں تو نیازی صاحب نے اشارے سے منع کردیا اور اسے فرش پر قبلہ رو لٹا کر ایک گلاس پانی منگوایا پھر تلاوت کا سلسلہ وہیں سے جوڑتے ہوئے پانی پر دَم کیا اور مریم پر چھڑکا۔ پانی کے چھینٹے مریم پر پڑے تو وہ اپنی جگہ سے کئی فٹ اونچی اچھلی۔ اس کے بعد تو جیسے یہ تماشا ہی ہوگیا۔ نیازی صاحب ہر آیت کے اختتام پر پانی چھڑکتے اور مریم کئی فٹ اونچی اچھلتی، یہاں تک کہ گلاس میں پانی ختم ہوگیا۔

اب نیازی صاحب نے تلاوت کا سلسلہ روکتے ہوئے مریم کی بند آنکھوں کے پپوٹوں کو آہستگی سے اوپر کرکے ان میں جھانکا اور زیرِ لب مسکرا کر بولے۔ ”ڈھونگی! مکر کررہا ہے۔“

نیازی صاحب نے دوبارہ مریم کے سر پر اپنا داہنا ہاتھ جمایا اور کچھ وِرد کرنے لگے۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ مریم نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اس مرتبہ اس کی آنکھوں میں وہ غرور اور طنطنہ نہ تھا۔ اس کے برعکس بے بسی اور لاچاری ہلکورے لے رہی تھی۔ انہوں نے اس کے سر سے ہاتھ ہٹا دیا اور مسکرا کر بولے۔ ”چل اب بتا! اور کھیلے گا یا ہار مانتا ہے اپنی؟“ مریم نے ہلکی سی جھرجھری لی اور بالکل دھیمے لہجے میں کچھ بولی۔ نیازی صاحب کڑکتی ہوئی آواز میں بولے۔

ستاروں کے نام

یہ جو آپ آسمان پر روشن ستارے دیکھتے ہیں اور ان کے ناموں سے بھی واقف ہیں جیسے جیوپیٹر، وینس، مارس وغیرہ۔ تو یہ نام کہاں سے آئے۔ ان کی ایک الگ اور طویل داستان ہے۔ بس اتنا جان لیں کہ یہ نام، ان ستاروں کے نام یونانی دیوی دیوتاؤں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ صرف ایک ستارہ یا سیارہ ایسا ہے جسے دیوی دیوتا کے نام پر نہیں رکھا گیا اور وہ ہے ہماری آپ کی زمین ارتھ۔ آپ نے پھانسیوں کے بارے میں تو بہت کچھ سنا ہوگا۔ فلموں میں دیکھا ہوگا کہ فلاں مجرم کو پھانسی دے دی گئی۔ آج کل ہمارے یہاں بھی ایسی خبریں آنے لگی ہیں کہ فلاں جیل میں فلاں کو پھانسی ہوگئی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ 1838ء میں فرانس میں ایک خنزیر کو بھی باقاعدہ پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک بچے کی جان لے لی تھی۔ پھر کیا تھا۔ عدالت نے اس کے خلاف فیصلہ سنا کر اس کی موت کا حکم جاری کردیا۔ بپھرے ہوئے جانوروں کو گولیوں، تیروں، نیزوں وغیرہ سے تو مار دیا جاتا تھا اور آج بھی مارا جاتا ہے لیکن باقاعدہ عدالت لگا کر پھانسی شاید پہلی بار دی گئی ہوگی۔

مرسلہ: ارشد علی۔ کراچی

”کہاں گئے تیرے وہ تیور؟ زور سے بول، معافی مانگ اس کے ماں باپ سے!“

اس بار مریم قدرے اونچی آواز میں بولی۔ ”میں اس بچی کے والدین سے معافی مانگتا ہوں۔ نجانے کیوں میں خود بھی بچوں کا باپ ہوتے ہوئے بھی کیسے اتنا ظالم اور سنگدل ہوگیا تھا۔ میرا مسکن اس کونے والے خالی مکان میں ہے جہاں میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہوں۔ ایک شام یہ بچی کھڑکی کے سامنے کھڑی اپنے لمبے، ریشمی بال سکھا رہی تھی۔ تب میری نظر اس پر پڑی، اس کی معصومیت اور کم عمری نے مجھے ایک لمحے میں اپنا اسیر بنا لیا اور میں یہ بھی بھول

گیا کہ میں کتنی شرمناک حرکت کرنے جارہا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب میری ذات سے اس بچی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ میں وہ کونے والا گھر بھی اپنے خاندان کے ساتھ چھوڑ جاؤں گا۔'' مریم کے منہ سے یہ روح فرسا انکشافات ہم لوگ منہ پھاڑے انتہائی حیرت اور خوف سے سن رہے تھے۔ جب وہ چپ ہوئی تو ہم سب خوف کے زیرِ اثر معمولی جنبش تک کرنے کے قابل نہ تھے۔

نیازی صاحب نے ڈپٹ کر کہا۔'' چل اب جا! خاندان والا ہے اس لیے تیرے بچوں کے صدقے تجھے معاف کررہا ہوں ورنہ تجھے وہ سزا دیتا کہ تجھے کہیں امان نہ ملتی اور جاتے ہوئے اپنے جانے کی کوئی نشانی چھوڑ جاورنہ تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس بار تیرا انجام کیا ہوگا!''

اس گفتگو کے بعد مریم نے ایک گہری سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ہم سب اسے دَم سادھے دیکھ رہے تھے۔ گھر میں اتنی خاموشی تھی کہ ہمیں ایک دوسرے کے دھڑکتے دلوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ایسے میں ایک زوردار دھماکے نے ہمیں اپنی نشستوں سے اچھال دیا۔ آواز لان سے آئی تھی چنانچہ ہم باہر دوڑے جہاں ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ آپا کے لان میں لگا برسوں پرانا نیم کا گھنا درخت اپنی جڑوں سمیت اکھڑا پڑا تھا اور پورے لان میں دھول کے بادل چھائے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی انتہائی طاقتور مخلوق نے اسے جڑوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دیا ہو۔ ہماری سوالیہ نظریں نیازی صاحب کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جو وہیں کھڑے آنکھیں بند کیے ورد میں مصروف تھے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں جو خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں اور تیمور بھائی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولے۔'' مبارک ہو تیمور میاں، وہ خبیث اپنی خباثت سمیت یہاں سے چلا گیا ہے۔ اپنے خاندان کا فوری صدقہ نکالو اور اپنی خوشی میں ضرورت مندوں کو بھی شامل رکھنا کہ یہی میرے آقا کا بھی حکم ہے۔''

بے پناہ خوشی کی ایک لہر تھی جس نے تمام گھر والوں کو یک لخت اپنے گھیرے میں لے لیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ مسلسل پریشانیوں اور مصیبتوں کے دن پورے ہو چکے تھے اور اللہ نے اپنا کرم کردیا تھا۔ تیمور بھائی تو فورِ جذبات سے نیازی صاحب سے لپٹ کر رونے لگے۔ آپا تو اتنے طویل سجدے میں گئیں کہ انھیں اٹھانا مشکل ہوگیا۔ غرض ہم سب ہنس کر اور رو کر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کررہے تھے۔

ایسے میں فجر کی دلکش اذانوں نے پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا اور تشکر کے شدید احساس نے ہمیں سرتا پا بھگو دیا۔ کوئی دو سال کی کڑی آزمائش کے بعد یہ خوشگوار صبح طلوع ہوئی تھی جس میں کوئی ڈر کوئی پریشانی نہ تھی بس خوشی سے دَمکتے چہرے تھے اور اپنے مہربان خالق کی حمد و ثناء میں ڈوبے دل۔

نیازی صاحب نے مریم کا علاج جاری رکھا اور اس پر پابندی سے دَم کرتے رہے۔ ایک ہفتے بعد انہوں نے مریم کو اللہ کے کرم سے بالکل صحت مند اور گھر کو بھی تمام اثرات سے پاک قرار دے دیا۔ تیمور بھائی اور آپا تو نیازی صاحب کے آگے اپنا سب کچھ ڈھیر کردینے کو تیار تھے لیکن اس بندۂ خدا نے ان سے ایک پھوٹی کوڑی تک نہ لیتے ہوئے واپس پنجاب کی راہ لی۔

آج اس واقعے کو گزرے عرصہ بیت چکا ہے۔ تیمور بھائی کے والد اور نیازی صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ آپا، تیمور بھائی اور سارہ اسی گھر میں رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے بڑی دھوم دھام سے سارہ کی منگنی بھی کی ہے۔ مریم اکثر اپنے شوہر اور دو سالہ بیٹے کے ساتھ اپنے والدین کے گھر آتی ہے تو ننھے شاہ زیب کی معصوم کلکاریوں سے ان کا گھر گونج اٹھتا ہے اور آپا اپنے نواسے کی بلائیں لیتی نہیں تھکتیں۔ اور ہاں! لان کے ایک کونے میں اینٹوں کی وہ دیوار اب بھی موجود ہے جس کو دیکھ کر آج بھی اس ہولناک رات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور میں اس سے نظریں چرا کر آگے بڑھ جاتی ہوں۔

شمارہ دسمبر 2015ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆ اول: درست غلط فیصلہ......رومانہ شعیب (کراچی)

☆ دوم: نفرتوں میں پھول......حبیب محسود (لوئر دیر)

☆ سوم: کہاں جاؤں......صفدر علی (سرگودھا)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے